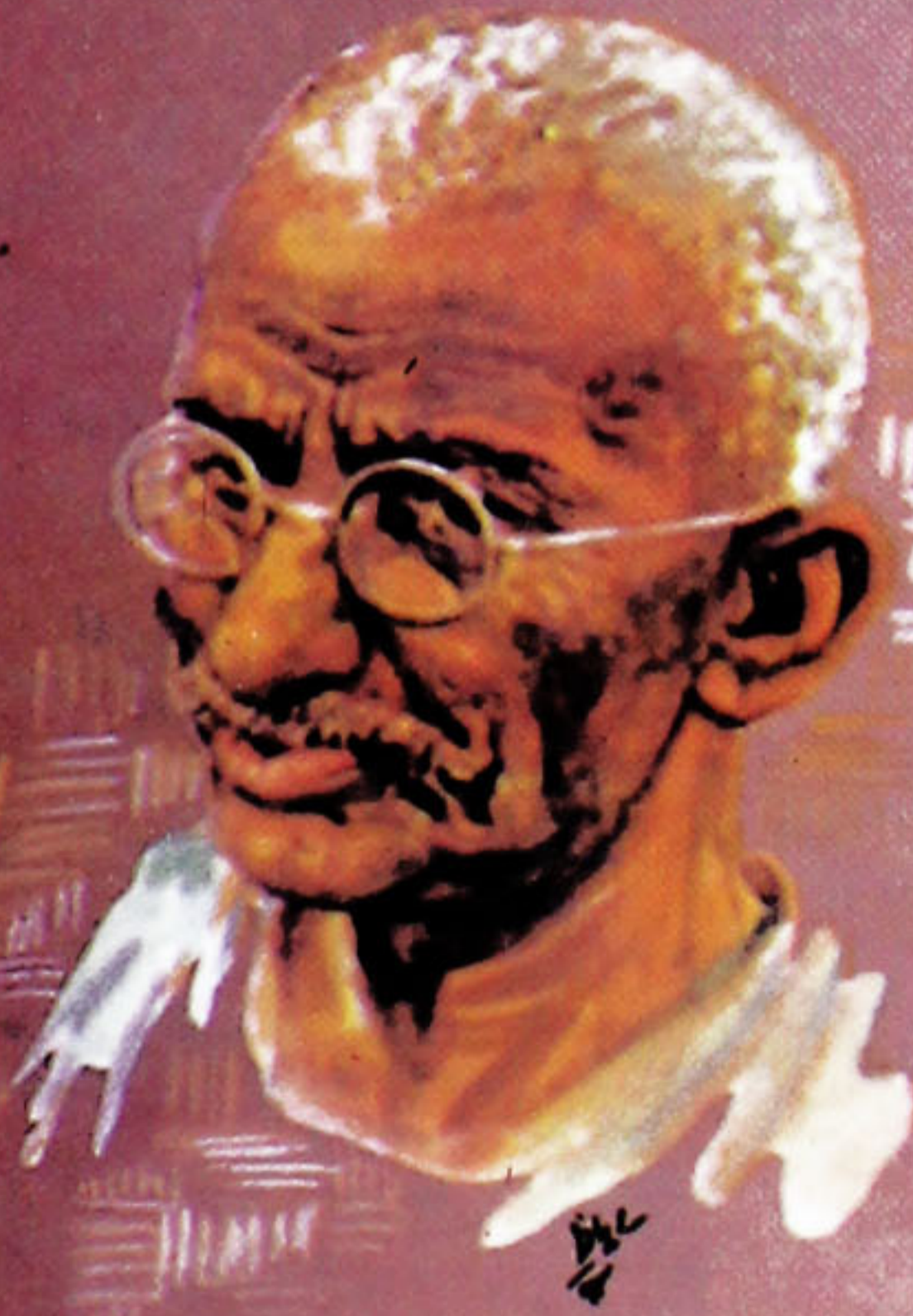


آپ بیتی

تاریخی



مہاتما گاندھی



3899

تلاش حق



آپ بیتی
ہما مٹا گاندھی

فکشن ہاؤس

۱۸۔ فرنگ روڈ، لاہور



3899

STORY OF MY EXPERIMENT WITH TRUTH

87054

6968 4

جملہ حقوق محفوظ ہیں۔

تلاش حق (آپ بیتی) =	نام کتاب
ڈاکٹر سید عابد حسین =	مترجم
نکشن ہاؤس =	پبلشرز
18 - مزنگ روڈ لاہور فون 7237430	
المحمود کمپیوٹر کمپوزنگ سرورس =	کمپوزنگ
المطبعة العسکریة =	پرنٹرز
۲- نیشنل ہائیڈرو پاور مل، لاہور، پاکستان	
1993 =	تاریخ اشاعت
ریاض =	سرورق
250/- روپے =	قیمت

3999

3



فہرست مضامین

حصہ اول

17	تمہید
19	پیدائش اور نسب
23	بچپن
25	بچپن کی شادی
29	شوہری کے لٹاٹھ
33	ہائی اسکول کی تعلیم
39	ایک المناک واقعہ
43	ایک المناک واقعہ نمبر ۲
47	چوری اور اس کا کفارہ
51	میرے والد کی وفات اور میری دہری فضیحت
55	مذہب کی جھلک
61	انگلستان کی تیاریاں
67	برادری سے خارج
71	لندن میں داخلہ
75	میرے ایک عقیدے کی تبدیلی
79	انگریز نوابی

83	تبدیلیاں
87	غذائیات کے تجربے
91	حجاب میری سیر بن گیا
95	جھوٹ کا ناسور
99	مختلف مذہبوں کا مطالعہ
103	نرمل کے بل رام
107	نراین ہیم چندر
111	عظیم الشان نمائش
113	بیر ستر تو ہو گئے مگر اب؟
117	میری بے بسی اور مایوسی

حصہ دوم

123	رائے چند بھائی
127	میں نے زندگی کیونکر شروع کی
131	پہلا مقدمہ
135	پہلا دھچکا
139	جنوبی افریقہ جانے کی تیاریاں
143	نٹال • ہینچنا
147	چند تجربے
151	پریٹوریا کا سفر
155	مزید تکلیفیں
161	پریٹوریا میں پہلا دن
165	عیسائیوں کی صحبت
169	ہندوستانیوں سے ملاقات کی کوشش
173	تلیوں کی درگت

177	مقدمے کی تیاریاں
181	مذہبی جوش
185	آدمی کیا سوچتا ہے اور خدا کیا کرتا ہے۔
189	نشال میں مستقل سکونت
195	رجب کی تمیہ
199	نشال انڈین کانگریس
203	بالا سندرم
207	تین پاؤنڈ کا محصول
211	مختلف مذاہب کا مطالعہ
215	خانہ داری
219	وطن کا رخ
223	ہندوستان میں
227	وفاداری کا جوش اور تیمارداری کا جذبہ
231	بہیسی کا سفر
235	پونا اور مدراس
239	جلد واپس آؤ
حصہ سوم	
245	طوفان کی گرج
249	طوفان
253	آزمائش
259	طوفان کے بعد سکون
263	بچوں کی تعلیم
267	جوش خدمت
271	پرہیزگاری (۱)

275	برہمچاریہ (۲)
279	سادہ زندگی
283	جنگ بوڑ
287	حفظانِ صحت کا اہتمام اور قحط کا امدادی کام
289	ہندوستان کو واپسی
293	پھر ہندوستان میں
297	محرر اور خدمت گار
301	کانگریس میں
305	لارڈ کرزن کا دربار
307	ایک مہینہ گو کھلے کی صحت میں (۱)
311	ایک مہینہ گو کھلے کی صحت میں (۲)
315	ایک مہینہ گو کھلے کی صحت میں (۳)
319	بنارس میں
323	بھئی میں بس جانے کا ارادہ
327	دھرم کی آزمائش
331	پھر جنوبی افریقہ چلا

حصہ چہارم

337	محبت کے سارے جتن بیکار گئے
341	ایشیا سے آئے ہوئے صاحب بہادر
343	ذلت چپ چاپ سہہ لی
347	جوش ایثار میں ترقی
349	مشاہدہ نفس کا نتیجہ
353	نباتاتی مشرب کے لئے ایک قربانی
357	مٹی پانی کے علاج کے تجربے

- 361 تنبیہ
- 365 حکومت سے مقابلہ
- 369 ایک گناہ اور اس کی ندامت
- 373 فرنگیوں سے میل جول
- 377 فرنگیوں سے میل جول نمبر (۲)
- 381 انڈین اوپینین
- 385 قلیوں کے بازے یا گھیٹو
- 389 کالا طاعون
- 393 کالا طاعون نمبر (۲)
- 397 ہندوستانی محلے میں آگ لگ گئی
- 399 ایک کتاب کا جادو
- 403 فنیکس کی بستی
- 407 پہلی رات
- 411 پولک آگے بڑھے
- 415 خدا حافظ حقیقی ہے
- 419 گھر گر بستی کی ایک جھلک
- 423 زولو بغاوت
- 427 اعتبار نفس
- 431 ستیاگرہ کا آغاز
- 433 غذائیات کے مزید تجربے
- 435 کستوری بائی کی ہمت
- 439 گھر کے اندر ستیاگرہ
- 443 ضبط نفس کی کوشش
- 447 فاتحہ
- 451 معلم کی حیثیت سے

- 455 ادبی تعلیم
- 459 روحانی تربیت
- 463 پھولوں میں کانٹے
- 465 فاقہ کفارے کی حیثیت سے
- 469 گو کھلے سے ملنے کے لئے سفر
- 473 جنگ عظیم میں میرا حصہ
- 477 روحانی کشمکش
- 481 چھوٹی سی ستیاگرہ
- 485 گو کھلے کی رواداری
- 489 پسلی کے ورم کا علاج
- 493 وطن کو واپسی
- 495 دکالت کے زمانے کی چند قابل ذکر باتیں
- 499 چابازی
- 501 موکل رفیق بن گئے
- 503 میں نے ایک موکل کو کیونکر بچایا
- حصہ پنجم
- 509 پہلا تجربہ
- 511 گو کھلے کے ساتھ پونا میں
- 515 کیا یہ دھمکی تھی۔
- 519 شانتی نکتہیں
- 523 تیسرے درجے کے مسافروں کی مصیبت
- 525 محبت کی کشمکش
- 527 کبہ کامیلا
- 531 لکشمی جھولا

- 535 آشرم کی بنیاد
- 537 مشکلے نیست کہ آساں نہ شود
- 541 ”پابند مزدوروں کی“ موقوفی
- 545 نیل کا دھبہ
- 549 بہاریوں کی شرافت اور نیک دلی
- 553 ”اہمساکانظارہ
- 557 مقدمہ واپس لے لیا گیا۔
- 561 کام کے طریقے
- 565 میرے ساتھی
- 569 دیہت کی اصلاح
- 573 گورنر کی نیک دلی
- 575 مزدوروں سے سابقہ
- 579 آشرم کی ایک جھلک
- 581 اپاس
- 585 کھید کی ستیاگرہ
- 587 پیاز کا چور
- 591 کھید کی ستیاگرہ کا انجام
- 593 اتحاد کی گرمائی
- 497 رنگروٹوں کی بھرتی
- 603 قریب مرگ
- 607 رولٹ بل اور میری کشمکش
- 611 وہ شاندار منظر
- 615 وہ یادگار ہفتہ
- 621 وہ یادگار ہفتہ نمبر (۲)
- 625 میری ہمالیہ برابر غلطی

627	"نوجیون" اور "ینگ انڈیا"
631	پنجاب میں
635	علاقہ کے بدلے گنور کشا؟
639	امر تسر کانگریس
643	کانگریس کے اندرونی حلقے میں
647	کھدر کی تحریک کا حتم
651	مل گیا
655	ایک سبق آموز مکالمہ
659	چڑھتا دریا
663	ناگپور میں
665	خدا حافظ

تمہید

چار پانچ سال ہوئے میں نے اپنے چند عزیز رفیقوں کے کہنے سے اپنی زندگی کے حالات لکھنے کا ارادہ کیا۔ ابتدا تو میں نے کر دی مگر ابھی پہلا درق اٹھنے کی بھی نوبت نہ آئی تھی کہ بمبئی میں بلوے شروع ہو گئے اور یہ کام رک گیا۔ اس کے بعد اور واقعات پیش آئے جن کا انجام یہ ہوا کہ میں قید ہو کر یراودا کی جیل میں پہنچ گیا۔ اسی جیل میں میرے ساتھ جیرام داس جی بھی قید تھے۔ انہوں نے فرمائش کی کہ تم سب کام چھوڑ کر آپ بیٹی کو ختم کر دو۔ میں نے کہا بھیجا کہ میں اپنے لئے مطالعے کا پروگرام بنا چکا ہوں اور جب تک اسے پورا نہ کر لوں کسی اور کا خیال بھی دل میں نہیں لاسکتا۔ اگر میں قید کی میعاد یراودا میں گزارتا تو آپ بیٹی ضرور ختم ہو جاتی کیونکہ جب میں چھوٹا ہوں تو ایک سال اس کام کے لئے باقی تھا۔ اب سوامی آندھ جی نے پھر اسرار شروع کیا ہے اور میں بھی جنوبی افریقہ کی ستیاگرہ کی تاریخ سے فارغ ہو گیا ہوں اس لئے جی چاہتا ہے کہ نو جیون میں چھاپنے کے لئے آپ بیٹی لکھنا شروع کر دوں۔ سوامی جی یہ چاہتے تھے کہ میں اسے الگ لکھوں اور کتب کی صورت میں چھپواؤں۔ مگر مجھے اتنی فرصت نہیں ہے میں تو بس اتنا کر سکتا ہوں کہ ہفتہ وار ایک باب لکھتا جاؤں۔ آخر نو جیون کے لئے ہر ہفتہ کچھ نہ کچھ لکھنا پڑتا ہے، پھر آپ بیٹی ہی کیوں نہ لکھ دیا کروں؟ سوامی جی اس پر راضی ہو گئے۔ لیجیے میں نے بھی محنت سے کام شروع کر دیا۔

مگر میرے ایک باغدا (1) دوست کو اس بارے میں کچھ شیپے تھے جو انہوں نے میری خاموشی کے دن (2) مجھ سے بیان کئے۔ انہوں نے مجھ سے کہا یہ آپ کو کیا سوچھی کہ اس جھگڑے میں پڑ گئے۔ آپ بیٹی لکھنا مغربی ملکوں کا دستور ہے میں نے آج تک نہیں سنا کہ مشرق میں سو ان لوگوں کے جن پر مغرب کا اثر ہو گیا ہے، کسی نے آپ بیٹی لکھی ہو اور آپ لکھیں گے کیا؟ فرض کیجیے آج آپ جن اصولوں کے قائل ہیں انہیں کل ترک کر دیں یا اب جو تجویزیں آپ کے سامنے ہیں وہ آئندہ بدل جائیں تو کیا اس کا اندیشہ نہیں کہ جو لوگ آپ کی تحریر اور تقریر پر عمل کرتے ہیں وہ دھوکے میں پڑ جائیں

گے؟ کیا آپ کے خیال میں یہ بہتر نہ ہو گا کہ آپ ابھی اس قسم کی کتاب نہ لکھیں بلکہ کبھی نہ لکھیں؟ ان دلیلوں کا مجھ پر کچھ اثر ضرور ہوا لیکن اصل میں میرا مقصد اس قسم کی کتاب لکھنا نہیں ہے جو آپ بیٹی کہلاتی ہے میں تو صرف یہ چاہتا ہوں کہ میں نے حق کی تلاش میں جو تجربے کئے ہیں ان کی کہانی سنا دوں۔ یہ سچ ہے کہ ساری عمر انہی تجربوں میں گزری ہے۔ اس لئے یہ کہانی آپ بیٹی بن جائے گی۔ لیکن اگر کتاب کے ہر صفحہ میں سو ان تجربوں کے کسی چیز کا ذکر نہ ہو تو میں ایسی آپ بیٹی لکھنے میں کوئی ہرج نہیں سمجھتا۔ اب چاہے یہ میرے نفس کا فریب ہو مگر مجھے یقین ہے کہ ان تجربوں کا ایک مسلسل بیان پڑھنے والوں کے لئے فائدے سے خالی نہ ہو گا۔ سیاست کے میدان میں جو تجربے میں نے کئے ہیں وہ ہندوستان میں بلکہ ایک حد تک ”مہذب“ دنیا میں مشہور ہو گئے ہیں، میری نظر میں نہ ان تجربوں کی کوئی وقعت ہے اور نہ ”مہاتما“ کے لقب کی جو ان کی بنا پر مجھے لوگوں نے دے رکھا ہے مجھے اکثر اس لقب سے بہت دکھ پہنچا ہے اور جہاں تک مجھے یاد ہے کبھی ایک لمحے کے لئے بھی اس نے میرے دل کو نہیں لہرایا۔ البتہ ان روحانی تجربوں کو میں خوشی سے بیان کروں گا جو صرف مجھی کو معلوم ہیں اور جن کی بدولت مجھے سیاسی میدان میں کام کرنے کے لئے تھوڑی بہت قوت حاصل ہوئی۔ اگر یہ تجربے واقعی روحانی ہیں تو خود ستائی کی ذرا بھی گنجائش نہیں۔ ان کا کچھ اثر میری ذات پر ہو سکتا ہے تو یہی کہ میری عاجزی اور بڑھ جائے گزرے ہوئے زمانے پر میں جتنا زیادہ غور کرتا ہوں اتنی ہی مجھ پر اپنی نارسائی کھنتی جاتی ہے۔

وہ چیز جس کی مجھے تلاش ہے جس کی آرزو اور سعی میں تیس سال سے بے چین ہوں، معرفت نفس، دیدار الہی، حصول ”موکشا“ (1) ہے۔ یہی تلاش، یہی کوشش میرا اوڑھنا بچھونا ہے، یہی میری زندگی ہے۔ میری تحریر و تقریر کا میری ساری سیاسی جدوجہد کا یہی مقصد ہے۔ لیکن چونکہ مجھے ہمیشہ سے یقین ہے کہ جو کام ایک شخص کے لئے ممکن ہے وہ سب کے لئے ممکن ہے۔ اس لئے میں نے جتنے تجربے کئے وہ خلوت کی تاریکی میں نہیں بلکہ جلوت کی روشنی میں کئے؟ اور میرے خیال میں اس سے ان کی روحانی قدر و قیمت میں کوئی کمی نہیں ہوئی۔

بعض معاملے بندے اور خدا کے درمیان ایسے ہوتے ہیں جن کی کسی اور کو خبر نہیں ہوتی۔ ظاہر ہے کہ یہ چیزیں بیان میں نہیں آسکتیں۔ جن تجربوں کا میں ذکر کرنا چاہتا ہوں یہ ایسے نہیں ہیں۔ مگر میں یہ بھی روحانی بلکہ یوں کہیے کہ اخلاقی تجربے، کیونکہ اخلاق ہی مذہب کی جان ہے۔

اس کہانی میں صرف ان مذہبی باتوں کا ذکر ہو گا جنہیں بچے اور بوڑھے دونوں ابھی طرح سمجھ سکیں۔

اگر میں ان کو جذبات سے الگ ہو کر سچائی اور عاجزی سے بیان کر سکا تو ان سے اور بہت سے تجربہ کرنے والوں کو روحانی ترقی میں مدد ملے گی۔ میرا پرگزیہ دعویٰ نہیں کہ یہ تجربے مکمل ہیں۔ میں انہیں اس سے زیادہ قابل وثوق نہیں سمجھتا جتنا ایک دیانت دار سائنس داں اپنے تجربوں کو سمجھتا ہے۔ وہ بہت زیادہ صحت کے ساتھ خوب سمجھ بوجھ کر ذرا ذرا سی باتوں کا خیال رکھتے ہوئے تجربے کرتا ہے۔ مگر پھر بھی اسے یہ دعویٰ نہیں ہوتا کہ جو نتیجے اسے حاصل ہوئے وہ آخری اور قطعی ہیں بلکہ وہ ان میں ترمیم اور اصلاح کی گنجائش سمجھتا ہے۔ میں نے بہت گہرے مشاہدہ باطن سے کام لیا ہے، اپنے نفس کو اچھی طرح ٹٹولا ہے اور ہر نفسیاتی حالت کی تحلیل کی ہے لیکن یہ بات میرے دہم و گمان میں بھی نہیں کہ میں جن نتیجوں پر پہنچا ہوں وہ آخری اور قطعی یا خطا سے بری ہیں۔ البتہ امتداد دعویٰ مجھے ضرور ہے کہ میری ذات کے لئے یہ نتیجے بظاہر بالکل صحیح اور فی الحال قطعی ہیں۔ کیونکہ اگر ایسا نہ ہوتا تو میں ان پر اپنے عمل کی بنیاد نہ رکھتا لیکن میں نے ہمیشہ ہر قدم اٹھانے سے پہلے غور کر لیا ہے کہ کس نتیجے کو قبول کر دوں اور اس کے بعد جو رائے قائم ہوئی اس پر عمل کیا ہے، جہاں تک میری افعال میری عقل اور میرے دل کو مطمئن کر سکیں میرا فرض ہے کہ اپنے پچھلے فیصلوں پر مضبوطی سے قائم رہوں۔

اگر مجھے محض علمی اصولوں پر بحث کرنا ہوتا تو ظاہر ہے کہ مجھے آپ بیتی لکھنے کی کوشش نہیں کرنا چاہیے تھی چونکہ میرا مقصد یہ ہے کہ ان اصولوں پر جس طرح مختلف صورتوں میں عمل کیا گیا اس کا حال سناؤں اس لئے میں نے ان چند بابوں کا جو میں لکھ رہا ہوں، یہ نام رکھا ہے ”ان تجربوں کی کہانی جو میں نے تلاش حق میں کئے“ (1) ظاہر ہے کہ اس میں عدم تشدد، تجرد کی زندگی وغیرہ اخلاقی اصولوں کے تجربے بھی شامل ہیں جنہیں لوگ حق سے جدا سمجھتے ہیں۔ لیکن میرے نزدیک حق اصل اصول ہے۔ جس میں اور بہت سے اصول شامل ہیں۔ یہاں حق سے مراد محض لفظوں کی سچائی نہیں بلکہ خیال کی سچائی بھی ہے اور سچائی بھی ہمارے ادراک کی اعتباری سچائی نہیں بلکہ حق محض۔ جو ہر ابدی یعنی خدا کی بے شمار تعریفیں کی گئی ہیں کیونکہ اس کے نور کی تجلیاں بے شمار ہیں۔ ان کے تصور سے مجھ پر رعب اور حیرت طاری ہو جاتی ہے اور میں ایک لمحے کے لئے ان میں محو ہو جاتا ہوں۔ لیکن خدا کی پرستش میں اسے حق محض سمجھ کر کرتا ہوں۔ میں نے اسے اب تک نہیں پایا مگر میں اسے برابر ڈھونڈ رہا ہوں۔ میں اس جستجو کی راہ میں ان سب چیزوں کو قربان کرنے کے لئے تیار ہوں جو مجھے عزیز ہیں۔ یہاں تک کہ اگر میری جان کی قربانی طلب کی جائے تو انشاء اللہ مجھے اس میں بھی تامل نہ ہو گا۔ لیکن جب تک میری رسائی حق محض تک نہ ہو اس دقت تک مجھے بھی لازم ہے کہ اعتباری حق کا جو تصور میرے ذہن میں ہے اس

پر مضبوطی سے قائم رہوں۔ اس دولت کی اعتباری حق میرے لئے شمع ہدایت ہے اور یہی میرا زرہ بکتر۔ اگرچہ یہ راہ کٹھن ہے اور تنگ اور تلوار کی دھار کی طرح تیز مگر میرے لئے یہی سب سے سیدھی اور سہل ثابت ہوئی ہے۔ میری ہملیہ کے برابر غلطیاں بھی میری نظر میں بچ ہیں کیونکہ میں نے اس راہ سے ذرا بھی قدم نہیں ہٹایا۔ اسی راہ نے مجھے اس سفر سے بچایا اور میں اپنے ایمان کی روشنی میں آگے بڑھتا چلا گیا۔ اکثر مجھے اس سفر میں حق یعنی خدائے برحق کی جھلک نظر آئی اور مجھے روز بروز یقین ہوتا جاتا ہے کہ صرف اس کی ذات حتمی وجود رکھتی ہے اور سب چیزیں غیر حتمی ہیں۔ جس کا جی چاہے دیکھے کہ مجھے یہ یقین کیونکر حاصل ہوا ہے۔ آئے اور میرے تجربوں میں شریک ہو اور اگر اس سے ہو سکے تو میرے اس یقین میں بھی اس کے علاوہ مجھے یہ بھی یقین ہوتا جاتا ہے کہ جو چیز میرے لئے ممکن ہے وہ ایک بچے تک کے لئے ممکن ہے اور میرے اس قول کی معقول وجہیں ہیں۔ تلاش حق کی راہیں دشوار بھی ہیں اور آسان بھی، ممکن ہے کہ ایک مغرور آدمی کے لئے ان راہوں پر چلنا ناممکن ہو اور ایک معصوم بچے کے لئے ممکن ہو۔ طالب حق کو خاک راہ سے بھی زیادہ خاکسار ہونا چاہیے۔ دنیا خاک کو پیروں سے کھلتی ہے لیکن طالب حق کو ایسی عاجزی اختیار کرنا چاہیے کہ خاک بھی اسے کھل سکے۔ تبھی اس کو حق کی جھلک دکھائی دے گی۔ بے اس کے کسی نہیں۔ داسشتا اور دشواستر کی گفتگو میں یہ بات خوب ثابت کی گئی ہے۔ ہیسائیت اور اسلام بھی اس کی تائید کرتے ہیں۔

جو کچھ میں ان صفحوں میں لکھ رہا ہوں اگر اس میں سے کسی چیز میں پڑھنے والوں کو غرور کا شائبہ بھی نظر آئے تو انہیں سمجھ لینا چاہیے کہ میری تلاش میں کوئی کھوٹ ہے اور جو جھلک مجھے نظر آیا کرتی ہے وہ محض ایک سراب ہے۔ چاہے مجھ جیسے سینکڑوں کی شہرت خاک میں مل جائے مگر حق کا بول بالا ہے۔ مجھ جیسے فانی انسانوں کے اعمال کا محاسبہ کرنے میں آپ کو حق کے معیار سے بال برابر بھی نہیں ہٹنا چاہیے۔ مجھے امید ہے کہ کوئی شخص ان نصیحتوں کو جو آئندہ بابوں میں جا بجا کی جائیں گی۔ محض میرے قول یا فعل کی سند پر قبول نہ کرے گا اور میری دعا ہے کہ کوئی ایسا نہ کرے۔ جن تجربوں کا میں نے ذکر کیا ہے انہیں مثال کے طور پر سمجھنا چاہیے اور ان کی روشنی میں ہر شخص کو اپنی خواہش اور اپنی استعداد کے مطابق خود تجربے کرنا چاہئے۔ انشاء اللہ یہ تھوڑی سی مدد میرے تجربوں سے لوگوں کو ضروری سہ کی کیونکہ میں کسی ناگوار بات کو جس کا بیان کرنا ضروری ہے نہ تو چھپاؤں اور نہ گھٹا کر بیان کروں گا۔ مجھے امید ہے کہ میں پڑھنے والوں کو اپنے سارے صیہوں اور ساری غلطیوں سے آگاہ کر دوں گا۔ میرا مقصد لوگوں کو یہ بتانا نہیں کہ دیکھو میں کتنا اچھا ہوں بلکہ فن ستیاگرہ کے تجربوں کو بیان کرنا ہے۔ میں اپنے اعمال کا

حسابہ کرنے میں حق کی طرح سخت گیر ہونے کی کوشش کروں گا اور یہی میں دوسروں سے چاہتا ہوں، جب میں اپنے آپ کو اس پیمانے پر ناپتا ہوں تو مجھے بے اختیار سورداس کا ہم زبان ہو کر کہنا پڑتا ہے۔

کہاں ہے کوئی ایسا کمبخت
قابل نفرت گنہگار جیسا میں ہوں؟
میں نے چھوڑ دیا اپنے خالق کو
یہ حال ہے میری بیوفائی کا

کیونکہ یہ خیال میرے لئے ہمیشہ سوبان روح رہتا ہے کہ میں اب تک اپنے خدا سے اتنا دور ہوں جو مجھے خوب معلوم ہے۔ میری زندگی کے ہر سانس کا مالک و مختار ہے، جس کے دریا کا میں ایک قطرہ ہوں مجھے معلوم ہے کہ یہ میری ہوائے نفس ہی ہے جو مجھے اس سے دور رکھتی ہے۔ لیکن پھر بھی مجھ سے یہ نہیں ہوتا کہ اس سے دامن چھڑالوں۔

اب یہ تمہید مجھے ختم کر دینا چاہیے۔ اصل کہانی آئندہ باب میں شروع ہوگی۔

م۔ ک۔ گاندھی

سابرمتی آشرم

26 - نومبر 1925ء

نوائے نجات

- 1- انگریزی میں جس کا ترجمہ خدا ترس کرنا چاہئے مگر مہاتما جی جب اردو میں گفتگو کرتے ہیں تو قلمی پر میزگار کی جگہ یا خدا کا لفظ استعمال کرتے ہیں اس لئے ہم نے بھی یہی لفظ رکھا۔
- 2- ہفتہ میں ایک دن دو شنبہ کو مہاتما جی کسی سے بات نہیں کرتے اور یہ دن ینگ انڈیا اور نو جیوں کے لئے مضمون لکھنے میں صرف کرتے ہیں (ع)
- 3- لفظی معنی پیدائش اور موت سے چھٹکارا (م) اردو میں نجات ابدی کہہ سکتے ہیں (ع)، (م) سے مراد ہیں مہادیو ڈیسائی جنہوں نے اس کا گجراتی سے انگریزی میں ترجمہ کیا اور (ع) سے مترجم اردو مراد ہے۔
- 4- ہم نے اختصار کے خیال سے اردو ترجمے کا نام "تلاش حق" رکھا ہے (ع)

تلاشِ حق

حصہ اول

پیدائش اور نسب

گاندھی خاندان کے لوگ ذات کے بنیے ہیں اور ابتدا میں پنساری کی دکان کرتے تھے لیکن تین پشتوں سے یعنی میرے دادا کے وقت سے وہ کاٹھیادار کی مختلف ریاستوں میں دیوان رہے ہیں۔ معلوم ہوتا ہے میرے دادا تم چند گاندھی عرف اوتا گاندھی اپنے اصول کے بڑے پکے تھے۔ ریاست کی سازشوں سے مجبور ہو کر انہیں پور بندرے جہاں وہ دیوان تھے جونا گڑھ جانا پڑا۔ وہاں انہوں نے نواب صاحب کو بائیں ہاتھ سے سلام کیا۔ کسی شخص کی نظر اس حرکت پر پڑ گئی جو بظاہر بے ادبی معلوم ہوتی تھی اس نے اس کی وجہ پوچھی تو میرے دادا نے کہا ”سیدھا ہاتھ پور بندر کے راجہ کی خدمت کا پابند ہو چکا ہے۔“ اوتا گاندھی کی پہلی بیوی کا انتقال ہو گیا اور انہوں نے دوسری شادی کی۔ پہلی بیوی سے ان کے چار لڑکے تھے اور دوسری سے دو لڑکے جہاں تک مجھے یاد ہے بچپن میں مجھے کبھی یہ محسوس نہیں ہوا کہ اوتا گاندھی کے یہ سب لڑکے ایک ماں سے نہیں ہیں۔ ان چھ بھائیوں میں تلمسی داس گاندھی سب سے چھوٹے تھے اور ان سے بڑے کرم چند گاندھی عرف، کبا گاندھی تھے۔ یہ دونوں بھائی آگے پیچھے پور بندر کے دیوان رہے۔ کیا گاندھی میرے والد تھے، وہ راجستانی عدالت کے رکن بھی تھے۔ یہ عدالت اب ٹوٹ گئی ہے مگر ان دنوں والیان ریاست اور ان کی برادری والوں کے باہمی جھگڑوں کو نبھانے کے لئے یہ ایک بڑی بااثر جماعت تھی۔ کیا گاندھی کچھ دن راجکوٹ میں دیوان رہے اور اس کے بعد دکن میں بھی۔ جب ان کا انتقال ہوا اس زمانے میں وہ ریاست راجکوٹ سے پنشن پاتے تھے۔

انہوں نے یکے بعد دیگرے چاشادیاں کیں کیونکہ ان کی تین بیویاں ایک ایک کر کے مر گئیں۔ ان کی پہلی اور دوسری بیوی سے دو لڑکیاں ہوئیں جو تھی بیوی سے ایک لڑکی اور تین لڑکے

ہوئے جن میں سب سے چھوٹا نہیں ہوں۔

میرے والد اپنی برادری کے بڑے خیر خواہ اور بہادر اور فیاض آدمی تھے لیکن نازک مزاج بھی بہت تھے۔ شاید وہ کسی حد تک جسمانی لذتوں کے دلدادہ تھے۔ کیونکہ چالیس برس سے زیادہ کی عمر میں انہوں نے چوتھی شادی کی۔ لیکن وہ کبھی رشوت نہیں لیتے تھے اور اپنوں اور بیگانوں میں ان کی منصف مزاجی کی دھوم تھی۔ ریاست کے ساتھ ان کی وفاداری مشہور تھی۔ کسی اسسٹنٹ پولیٹیکل ایجنٹ نے ان کے سردار ٹھاکر صاحب راجکوٹ کا ذکر توہین آمیز الفاظ میں کیا تو انہوں نے کہا کہ معافی مانگو۔ کیا گاندھی نے صاف انکار کیا۔ اس لئے وہ چند گھنٹے تک حراست میں رکھے گئے۔ لیکن جب ایجنٹ نے ان کی ثابت قدمی دیکھی تو اسے رہائی کا حکم دینا پڑا۔

میرے والد کو دولت جمع کرنے کی ہوس نہ تھی۔ انہوں نے ہمارے لئے بہت کم جائیداد ترکے میں چھوڑی۔ انہوں نے سوائے تجربے کے مدرسے سے کہیں تعلیم نہیں پائی۔ زیادہ سے زیادہ ان کی لیاقت گجراتی کے پانچویں درجے کے برابر ہوگی۔ تاریخ اور جغرافیہ سے وہ بالکل ناواقف تھے۔ لیکن عملی کاموں میں بہت وسیع تجربے رکھتے تھے جس سے انہیں بڑی بڑی پیچیدہ گتھیوں کو سلجھانے اور سینکڑوں آدمیوں سے نبٹنے میں بہت مدد ملتی تھی ان کی مذہبی تعلیم بہت کم تھی لیکن ان میں وہ دینداری موجود تھی جو مندروں میں آنے جانے اور مذہبی تقریروں کے سننے سے بہت سے ہندوؤں میں پیدا ہو جاتی ہے۔ آخر عمر میں وہ ایک عالم برہمن کے کہنے سے جو ہمارے خاندان کے دوست تھے بھگت گیتا کی تلاوت کرنے لگے تھے اور پوجا کے وقت اس کے چند شلوک زور سے پڑھا کرتے تھے۔

والدہ صاحبہ کے متعلق میرے حافظہ میں سب سے گہرا نقش ان کی عبادت اور پرہیزگاری کا ہے۔ وہ بڑی پکی دیندار تھیں ناممکن تھا کہ وہ کبھی ان دعاؤں کے جو وہ روز پڑھا کرتی تھیں، کھانا کھالیں۔ ”توبیلی“ یعنی دشمنوں میں جانانا کے روزانہ فرائض میں داخل تھا۔ جہاں تک میری یاد رکھتی ہے انہوں نے کبھی ”چتراس“ (1) قضا نہیں کیا۔ وہ سخت سے سخت ریاضتوں کی نذرمان لیتی تھیں اور اسے انتہائی ثابت قدمی سے پورا کرتی تھیں۔ بیماری کے سبب سے وہ کبھی اس میں ڈھیل نہیں ڈالتی تھیں۔ بیمار ہونا ان کے لئے کوئی عذر نہ تھا۔ مجھے یاد ہے کہ ایک بار وہ ”چندریانا“ (2) کی نذرمان کے بعد بیمار ہو گئیں مگر انہوں نے اپنی نذر میں غل نہ پڑنے دیا۔ دو تین دن روزے پر روزہ رکھنا ان کے نزدیک کوئی بات نہ تھی۔ ”چتراس“ میں دن میں صرف ایک وقت کھانا ان کی عادت میں داخل تھا۔ ایک ”چتراس“ میں انہیں اس سے تسکین نہ ہوئی تو انہوں نے ایک دن پورا روزہ رکھنے کی نذر

مان لی۔ ایک بار اسی زمانے میں انہوں نے یہ نذرمانی کہ جب تک سورج نہ دیکھ لوں گی کھانا نہیں کھاؤں گی ہم سب بچے ان دنوں آسمان کی طرف ٹلٹکی باندھے اس انتظار میں کھڑے رہتے تھے کہ سورج نکلتے دیکھیں تو والدہ کو خبر کر دیں۔ سب جانتے ہیں کہ جب برسات کا موسم شباب پر ہوتا ہے تو سورج اکثر بے اتفالی سے منہ چھپا لیتا ہے۔ مجھے یاد ہے کہ کئی بار ایسا ہوا کہ یک بیک سورج کو بادلوں سے نکلتے دیکھ کر ہم لوگوں نے دوڑ کر انہیں خبر دی۔ وہ دوڑی ہوئی آئیں کہ اپنی آنکھ سے دیکھیں مگر اتنی دیر میں سیلاب دش سورج غائب ہو گیا اور انہیں کھانا نصیب نہ ہوا۔ مگر وہ ہمیشہ خندہ پیشانی سے یہی کہتی تھیں ”کوئی ہرج کی بت نہیں خدا کی مرضی نہ تھی کہ میں آج کھانا کھاؤں۔“ اور جا کر روزمرہ کے دھندوں میں مصروف ہو جاتی تھیں۔

میری والدہ بڑی سمجھ دار تھیں۔ انہیں ریاست کے معاملوں کے متعلق اچھی معلومات تھی اور محل کی خواتین ان کی ذہانت کو بہت مانتی تھیں۔ میں اکثر بچپن کے حقوق سے فائدہ اٹھا کر ان کے ساتھ محل میں جایا کرتا تھا اور مجھے اب تک یاد ہے کہ ان سے اور ٹھاکر صاحب کی والدہ سے بارہا خوب خوب بحثیں ہوئیں۔

میں ان ماں باپ کے گھر میں 2 اکتوبر 1869ء کو بہ مقام پور بندر جسے سدا میری بھی کہتے ہیں پیدا ہوا۔ میرا بچپن کا زمانہ پور بندر ہی میں گزرا۔ مجھے یاد ہے کہ میں مدرسے میں بٹھایا گیا تھا۔ مجھے پہاڑے یاد کرنے میں کسی قدر دقت ہوئی مجھے اس زمانے کے متعلق اس سے زیادہ کچھ یاد نہیں کہ میں دوسرے لڑکوں کے ساتھ اپنے استاد کو برا بھلا کہا کرتا تھا۔ اس سے ظاہر کہ میرا ذہن کند تھا اور عاقلہ کمزور۔

حوالہ جات

- 1- لفظی معنی چار مہینے کا زمانہ اس نذر کو کہتے ہیں جس کی رو سے برسات کے چار مہینوں میں برابر پورے آدھے روزے رکھے جاتے ہیں (م)
- 2- ایک طرح کا روزہ جس میں کھانے کی مقدار چاند کے گھٹتے بڑھنے کے حساب سے گھٹتی بڑھتی ہے (م)

87154

~~87154~~

بچپن

میری عمر سات برس کی ہوگی کہ میرے والد راجستانی عدالت کے رکن ہو کر پور بندر سے راجکوٹ گئے۔ وہاں میں ایک ابتدائی مدرسے میں داخل کیا گیا۔ مجھے وہ دن اچھی طرح یاد ہیں اور استادوں کے نام اور ان کی بہت سی باتیں بھی ذہن میں محفوظ ہیں۔ پور بندر کی طرح یہاں بھی میری پڑھائی کے متعلق کوئی بات قابل ذکر نہیں۔ اس سے یہی ثابت ہوتا ہے کہ میں معمولی سا طالب علم تھا۔ اس مدرسے سے میں مضافات کے ایک اسکول اور وہاں سے بارہ برس کی عمر میں ہائی اسکول گیا۔ جہاں تک مجھے یاد ہے اس قلیل عرصے میں میں نے کبھی اپنے استادوں سے اپنے ہم مکتبوں سے جھوٹ نہیں بولا۔ میں بہت شرمیلا تھا اور کسی سے ملتا جلتا نہ تھا۔ سوا میری کتابوں اور میرے کام کے کوئی میرا رفیق نہ تھا۔ گھنٹہ بچتے ہی اسکول پہنچ جاتا اور چھٹی ہوتے ہی گھر بھاگتا میرا روزمرہ کا معمول تھا۔ میں سچ بچا بھگتا ہوا جاتا تھا کیونکہ مجھے کسی سے بات کرنے کی تاب نہ تھی۔ یہ بھی خوف رہتا تھا کہ کوئی میری ہنسی نہ اڑائے۔

ہائی اسکول میں پہلے سال امتحان کے موقع پر ایک واقعہ پیش آیا جو قابل ذکر ہے۔ مسٹر جانس انسپکٹر اسکول معائنے کے لئے آئے تھے۔ انہوں نے ہمیں بچے کی مشق کے لئے پانچ لفظ لکھوائے ان میں سے ایک لفظ (cristle) (1) تھا۔ میں نے اس کے بچے غلط لکھے۔ استاد نے مجھے اپنے بوٹ کی نوک سے ٹھکرا کر آگاہ کرنا چاہا مگر میں باخبر نہ ہوا۔ یہ بات کسی طرح میری سمجھ میں نہیں آسکتی تھی کہ وہ چاہتے ہیں میں اپنے ساتھی کی سلیٹ سے بچے نقل کر لوں کیونکہ میرے خیال میں استاد وہاں تھے ہی اس لئے کہ ہمیں نقل نہ کرنے دیں۔ نتیجہ یہ ہوا کہ میرے سوا سب بڑکوں کے یہاں ہر لفظ کے بچے صحیح لکھے۔ ایک میں ہی جو قوف ثابت ہوا۔ بعد میں استاد نے مجھے میری یہ بیوقوفی سمجھانا چاہی مگر مجھ پر کچھ اثر نہ ہوا۔ مجھے نقل کرنے کا فن کبھی نہ آیا۔

تاہم استاد کی جو عزت میرے دل میں تھی اس میں اس واقعے سے کوئی فرق نہ آیا۔ مجھ میں یہ قدرتی بات تھی کہ بڑوں کی برائی نظر نہ آتی تھی۔ آگے چل کر مجھے ان استاد کی اور کمزوریاں بھی معلوم ہوئیں مگر میں اسی طرح ان کا ادب کرتا رہا کیونکہ میں نے بڑوں کی فرمانبرداری سیکھی تھی۔ ان کے کاموں پر نکتہ

چینی کرنا نہیں سیکھا تھا۔

اس زمانے کے دو اور واقعات میرے حلقے میں ہمیشہ نقش رہے عام طور سے سوائے اسکول کی کتابوں کے اور کسی کتاب میں میرا جی نہ لگتا تھا۔ مجھے اپنا روزانہ سبق چار و ناچار یاد کرنا پڑتا تھا۔ مجھے استاد کی خفگی بڑی لگتی تھی اور انہیں دھوکا دینا بھی پسند نہ تھا اس لئے میں سبق یاد کر لیتا تھا لیکن بے دلی سے۔ غرض جب سبق ہی جیسا چاہیے یاد نہ ہوتا تھا تو اور کتابوں کے پڑھنے کا ذکر کیا ہے مگر خدا جانے کیونکر میری نظر ایک کتاب پر پڑی جو میرے والد نے خریدی تھی۔ یہ شرون پتری بھگتی نانک (شرون کے احترام والدین کا نانک) تھا، میں نے اسے بعد شوق سے پڑھا۔ اس زمانے میں ہمارے یہاں سفری نانک والے آئے۔ میں نے جو سین دیکھے ان میں سے ایک یہ تھا کہ شرون اپنے کندھوں پر ایک بہنگی رکھے اپنے اندھے ماں باپ کو جاترا کے لئے لے جا رہا ہے۔ یہ کتاب اور یہ منظر میرے دل پر ایسے نقش ہو گئے کہ مٹائے نہ مٹے۔ میں نے اپنے دل میں کہا دیکھ یہ مثال ہے جس کی تجھے تقلید کرنا چاہیے۔ شرون کے مرنے پر اس کے والدین نے جو دردناک بین کئے تھے ان کی یاد بھی میرے دل میں اب تک تازہ ہے اس د لگداز لے نے مجھے تڑپا دیا اور میں اسے اپنے ارگن باجے پر جو مجھے میرے والد نے خرید دیا تھا بجایا کرتا تھا۔

اسی قسم کا ایک واقعہ ایک اور نانک کا ہے۔ اسی زمانے میں اپنے والد کی اجازت سے میں ایک نانک کی کمپنی کا تماشہ دیکھنے گیا۔ اس تماشے ”ہریش چندر“ نے میرے دل کو موہ لیا۔ میں اسے بار بار دیکھتا تھا اور نہ تھکتا تھا۔ مگر آخر مجھے کہاں تک جانے کی اجازت ملا کرتی؟ یہ تماشہ میرے جی میں بس گیا تھا اور خدا جانے کتنی بار میں نے دل ہی دل میں ہریش چندر کا پارٹ کیا ہو گا ”سب لوگ ہریش چندر کی طرح سچے کیوں نہ ہو جائیں؟“ یہ سوال میں اپنے دل میں دن رات کیا کرتا۔ حق کی پیروی کرنا اور وہ سب کچھ سہنا جو ہریش چندر نے سہا تھا۔ بس یہی ایک نصب العین تھا جس کی لگن اس تماشے نے میرے دل کو لگا دی تھی۔ میں ہریش چندر کے قصے کو لفظ بہ لفظ سچ سمجھتا تھا۔ اس کا خیال کر کے میں رونے لگتا تھا۔ آج میری عقل مجھ سے کہتی ہے کہ ہریش چندر کوئی تاریخی شخص نہیں ہو سکتا۔ مگر میرے لئے ہریش چندر اور شرون دونوں جیتی جاگتی حقیقت ہیں اور مجھے یقین ہے کہ اگر میں اب ان نائٹوں کو پھر پڑھوں تو مجھ پر اتنا ہی اثر ہو جتنا پہلے ہوا تھا۔

حوالہ

1- انگریزی میں کتلی کو کہتے ہیں (ع)

بچنے کی شادی

میرا بہت جی چاہتا ہے کہ مجھے یہ باب لکھنا نہ پڑے لیکن میں جانتا ہوں کہ اس کہانی کے دوران میں مجھے بہت سے ایسے تلخ گھونٹ پینا ہیں اور اگر مجھے حق کی پرستاری کا دعویٰ ہے تو سوا اس کے چارہ بھی نہیں۔ میرا دردناک فرض ہے کہ اپنی شادی کا بیان کروں جو تیرہ برس کی عمر میں ہوئی تھی۔ جب میں اس عمر کے لڑکوں کو دیکھتا ہوں جو میری نگرانی میں ہیں تو مجھے اپنے اوپر افسوس ہوتا ہے اور دل چاہتا ہے کہ انہیں عہد کباب دوں کہ وہ اس مصیبت سے محفوظ رہے ہیں جو مجھ پر پڑی تھی مجھے اتنی کمسنی کی شادی کے لئے کوئی اخلاقی دلیل نظر نہیں آتی۔

کہیں اس کتاب کے پڑھنے والوں کو غلط فہمی نہ ہو۔ میری منگنی نہیں بلکہ شادی ہوئی تھی۔ کاٹھیا دار میں منگنی اور شادی دوا لگ لگ رسمیں ہیں۔ منگنی اسے کہتے ہیں کہ لڑکے اور لڑکی کے والدین ان کی شادی کا وعدہ کر لیں اور یہ ہونے کے بعد چھٹ بھی سکتی ہے۔ منگنی کے بعد لڑکا مر جائے تو لڑکی بیوہ نہیں ہوتی۔ یہ معاہدہ دونوں کے والدین آپس میں کر لیتے ہیں، لڑکے لڑکی کو اس میں کوئی دخل نہیں ہے اکثر انہیں اس کی اطلاع تک نہیں دی جاتی۔ بعد میں معلوم ہوا کہ میری منگنی تین بار ہوئی حالانکہ مجھے مطلق خبر نہیں کہ یہ کب ہوا۔ مجھ سے صرف اتنا کہا گیا کہ دو لڑکیاں جو میرے لئے پسند کی گئی تھیں مر گئیں۔ اس سے میں نے یہ نتیجہ نکالا کہ میری نسبت تین بار ہوئی۔ مجھے کچھ خفیف سا یاد ہے کہ میری تیسری منگنی اس وقت ہوئی جب میں ساتویں سال میں قدم رکھ چکا تھا۔ مگر جہاں تک میرا حافظہ کام کرتا ہے۔ کسی نے مجھ سے اس کا ذکر نہیں کیا۔ اس باب میں اپنی شادی کا ذکر کر رہا ہوں جو مجھے بہت اچھی طرح یاد ہے۔

آپ کو یاد ہو گا کہ میرے دو بھائی تھے۔ بڑے بھائی کی شادی پہلے ہی ہو چکی تھی اب بزرگوں نے

یہ فیصلہ کیا کہ میرے منجھلے بھائی کا جو مجھ سے دو تین سال بڑے تھے میرے ایک رشتے کے بھائی کا جو شاید ایک سال بڑے تھے اور میرا بیواہ ساتھ ساتھ کر دیا جائے۔ اس فیصلہ میں ہماری بہتری کا کوئی خیال نہیں رکھا گیا اور ہماری مرضی کا تو ذکر ہی کیا ہے۔ انہیں تو محض اپنی آسانی اور کفایت سے بحث تھی۔

ہندوؤں کے یہاں شادی کوئی کھیل نہیں ہے۔ اکثر دولہا اور دلہن کے والدین اس میں تباہ ہو جاتے ہیں۔ وہ اپنا دھن دولت برباد کرتے ہیں۔ اپنا دولت ضائع کرتے ہیں۔ مہینوں تیاری ہوا کرتی ہے۔ کپڑے اور زیور بنائے جاتے ہیں۔ دعوتوں کے خرچ کا حساب لگایا جاتا ہے۔ ہر شخص کی یہ کوشش ہوتی ہے کہ اتنے بہت سے اور اتنے قسم کے کھانے پکوانے کہ اردوں سے بڑھ جائے۔ عورتیں چاہے ان کی آواز اچھی ہو یا نہ ہو، اتنا گاتی ہیں کہ ان کا گلا پیٹھ جاتا ہے اور ہمسایوں کی جان عذاب میں پڑ جاتی ہے لیکن یہ لوگ چپ چاپ سارا شور و غل برداشت کرتے ہیں۔ ان کے گھروں میں دعوت کا بچا کچھ سزا گلا کھانا پھینکا جاتا ہے اور وہ دم نہیں مارتے کیونکہ وہ جانتے ہیں کہ ایک دن خود انہیں بھی یہی حرکتیں کرنا ہیں۔

میرے بزرگوں نے سوچا بہتر یہ ہے کہ یہ سارا بکھیرا ایک ہی مرتبہ ہو جائے اس میں خرچ کم ہے اور شہرت زیادہ۔ کیونکہ اگر تین بار خرچ کرنے کے بجائے ایک خرچ کرنا ہو تو آدمی خوب جی کھول کر کر سکتا ہے۔ میرے باپ اور چچا دونوں بوڑھے تھے اور ہم تینوں کے سوا انہیں کسی اور بچے کی شادی کرنا باقی نہ تھا۔ غالباً وہ چاہتے تھے کہ اپنی زندگی کی آخری رنگ ریاں منالیں۔ ان سب باتوں کو مد نظر رکھتے ہوئے اکٹھی تین شادیوں کا فیصلہ کیا گیا اور جیسا کہ میں پہلے کہہ چکا ہوں مہینوں تیاری ہوتی ہے۔

ہمیں ان تیاریوں سے آنے والی تقریب کی خبر ہوئی۔ میرے نزدیک اس کی اہمیت بس اتنی تھی کہ اچھے اچھے کپڑے پہننے میں آئیں گے۔ ڈھونگ بجے گی، بارات نکلے گی، عمدہ عمدہ کھانے پکیں گے اور ایک اجنبی لڑکی ساتھ کھیلنے کو ملے گی۔ شہوانی خواہش آگے چل کر پیدا ہوئی۔ میں اپنی اس شرمناک حالت پر پردہ ڈالنا مناسب سمجھتا ہوں۔ البتہ دو ایک باتیں جن کا بیان کرنا ضروری ہے آگے چل کر بیان کروں گا۔ لیکن یہاں ان باتوں سے اصل مدعا سے کوئی تعلق نہیں۔

غرض مجھ کو اور میرے بھائی کو لوگ راجکوٹ سے پور بندر لے گئے۔ آخری ٹھکانے سے پہلے جو ابتدائی تماشے ہوئے۔ ان میں بعض باتیں دلچسپ ہیں مثلاً ہمارے سارے جسم پر پانی میں پسی ہوئی ہلدی کا ملا جانا لیکن انہیں نظر انداز کرنا پڑے گا۔

میرے والد دیوان سہی مگر پھر بھی نوکر تھے اور چونکہ ان پر ٹھاکر صاحب کی خاص نگرانی تھی اس لئے ان کی نوکری اور بھی سخت تھی، ٹھاکر صاحب نے انہیں آخر دقت تک جانے نہیں دیا۔ پھر جب اجازت دی تو ان کے لئے گاڑیوں کی ڈاک بٹھادی کہ سفر میں دو دن کم لگیں مگر تقدیر کو کچھ اور ہی منظور تھا۔ پور بندر سے راجکوٹ ایک سو بیس میل ہے۔ بیل گاڑی میں پانچ دن کا سفر ہے میرے والد نے یہ راہ تین دن میں طے کی۔ لیکن تیسری منزل میں گاڑی الٹ گئی اور انہیں بہت سخت چوٹ آئی۔ جب وہ آئے تو ان کے سارے جسم پر پینیاں بندھی ہوئی تھیں۔ انہیں اور ہم سب کو شادی کی جو خوشی تھی وہ آدھی رہ گئی۔ مگر رسم تو پوری کرنا ہی پڑی کیونکہ بھلا شادی کی تاریخ کیسے ٹل سکتی تھی؟ شادی کی طفلانہ دلچسپیوں میں میں اپنے والد کے زخمی ہونے کا رنج بھول بھال گیا۔

مجھے اپنے والدین سے بڑی محبت تھی اور دل و جان سے ان کی اطاعت کرتا تھا مگر اسی کے ساتھ نفسانی خواہشوں کا بندہ بھی تھا۔ ابھی میں نے یہ نہیں سیکھا تھا کہ مجھے اپنے والدین کی بندگی اور خدمت کی خاطر اپنی راحت و مسرت قربان کر دینا چاہیے مگر ایک واقعہ جسے میری لذت پرستی کی سزا سمجھنا چاہیے ایسا ہوا جس کی چہن میرے دل سے آج تک نہیں گئی۔ اسے میں آگے چل کر بیان کروں گا۔ نیشنل آنڈ کا ایک دوہا ہے ”دنیا کی چیزوں کا ترک بغیر خواہشوں کے ترک کے کاغذ کی ناؤ ہے، تھوڑی دیر سے زیادہ نہیں چلتی، تم لاکھ کوشش کرو“ میں جب کبھی اسے گاتا ہوں یا دوسروں کو گاتے سنتا ہوں تو یہ ناگوار تلخ واقعہ یاد آجاتا ہے اور میں شرم سے پانی پانی ہو جاتا ہوں۔

میرے والد کو بہت چوٹ آئی تھی مگر انہوں نے ہمت اور ضبط سے کام لے کر ظاہر نہ ہونے دیا اور شادی میں پورا حصہ لیا۔ آج بھی میں اس زمانے کو یاد کرتا ہوں تو میری آنکھوں کے سامنے ان جگہوں کی تصویر پھرتی ہے جہاں بیٹھ کر انہوں نے شادی کی مختلف رسمیں انجام دیں۔ اس دقت مجھے شان و گمان بھی نہ تھا کہ ایک دن اپنے والد پر سختی سے نکتہ چینی کروں گا کہ انہوں نے میری شادی بچپن میں کر دی۔ اس روز تو مجھے ہر چیز درست اور بجا اور بھلی معلوم ہوتی تھی، آج بھی وہ سماں میری نظر میں ہے۔ ہمارا شادی کی چوکی پر بیٹھنا ”اسپتد“ (1) کی رسم ادا کرنا دو لہا دلہن کا ایک دوسرے کو بیٹھا کھنڈ (2) کھلانا اور پھر ہم دونوں کی غلوت۔ آہ وہ پہلی رات! دد معصوم بچے بے جانے بوجھے زندگی کے سمندر میں کود پڑے۔ میری بھانج نے مجھے اچھی طرح سکھا دیا تھا کہ مجھے پہلی رات کیا کرنا چاہئے۔ مجھے معلوم نہیں کہ میری بیوی کو کس نے سکھایا تھا۔ میں نے اس سے اس بارے میں کبھی کچھ نہیں پوچھا اور نہ اب پوچھنے کو جی چاہتا ہے۔ آپ سمجھ سکتے ہیں کہ ہم ایک دوسرے کے سامنے جاتے ہوئے کس

قدر سمجھتے تھے۔ ہماری شرم حد سے بڑھی ہوئی تھی میں دل میں سوچتا تھا کہ میں اپنی بیوی سے کیسے باتیں کروں گا اور کیا کہوں گا۔ جو کچھ مجھے سکھایا گیا تھا اس سے کہاں تک کام چلتا۔ مگر سچ پوچھئے تو ان باتوں میں سکھانے کی کوئی ضرورت نہیں۔ ہمارے پہلے جنم کے نقش اس قدر قوی ہیں کہ سکھانا پڑھانا بالکل فضول ہے۔ رفتہ رفتہ ہم ایک دوسرے سے واقف ہو گئے۔ بے تکلف بات چیت کرنے لگے۔ ہم دونوں کم سن تھے مگر میں نے بہت جلد شوہرانہ حکومت سے کام لینا شروع کر دیا۔

حوالہ جات

- 1 - استبدی سے مراد ہے، ہندو دو لہاد لہن کال کر سات قدم چلنا اور چلنے میں ایک دوسرے سے محبت اور وفاداری کا عہد و پیمان کرنا۔ جس کے بعد دونوں کا عقد کبھی نہیں ٹوٹ سکتا
- 2 - کلر گہوں سے بنتا ہے۔ عقد کے بعد اسے دو لہاد لہن ساتھ کھاتے ہیں۔

شوہری کے ٹھاٹھ

جب میری شادی ہوئی اس زمانے میں چھوٹے چھوٹے رسالے ایک پیسہ یا ایک پائی کو (مجھے ٹھیک یاد نہیں) بکا کرتے تھے جن میں بیوی میاں کی محبت کفایت شعاری بچپن کی شادی اور اسی قسم کی اور باتوں پر بحث ہوتی تھی۔ جب مجھے کوئی اس قسم کا رسالہ ملتا تھا تو میں اسے شروع سے آخر تک پڑھتا تھا اور میری عادت تھی کہ جو بات پسند نہ آتی اسے بھول جاتا اور جو پسند آتی اس پر عمل کرتا ان رسالوں میں شوہر کا یہ فرض بتایا گیا تھا کہ عمر بھر بیوی کا وفادار رہے اور یہ بات ہمیشہ کے لئے میرے دل پر نقش ہو گئی۔ اس کے علاوہ حق کا عشق میرے خمیر میں تھا اور یہ کسی طرح ممکن نہ تھا کہ میں اپنی بیوی کو دھوکا دوں۔ پھر اس چھوٹی سی عمر میں مجھے بے وفائی کا موقع ملنا بھی مشکل تھا۔

مگر اس وفاداری کے سبق کا ایک برا نتیجہ بھی ہوا۔ میں نے اپنے دل میں کہا کہ اگر میں اپنی بیوی سے وفاداری کرنے کا پابند ہوں تو انہیں بھی اس کا پابند ہونا چاہیے کہ مجھ سے وفاداری کریں۔ اس خیال نے مجھے بدگمان شوہر بنا دیا۔

وفاداری کرنا ان کا فرض تھا مگر میں نے اسے لپٹا لپٹا بنا لیا کہ ان سے وفاداری کا مطالبہ کروں اور اس مطالبے کو پورا کرانے کے لئے ہر وقت چو کسی رکھنا ضروری سمجھا۔ مجھے اپنی بیوی کی پاکدامنی پر شبہ کرنے کی مطلق کوئی وجہ نہ تھی لیکن بدگمانی وجہ اور سبب کی پابند نہیں۔ میں ہمیشہ ان کی حرکات و سکنات کی نگرانی کرنے لگا تھا۔ اس لئے وہ بغیر میری اجازت کے کہیں جا نہیں سکتی تھیں۔ اس نے ہمارے آپس میں سخت نزاع کا بیج بو دیا۔ میری نگرانی اصل میں ایک طرح کی قید تھی اور کستور ابائی وہ لڑکی نہ تھی جو ان چیزوں کو چپ چاپ برداشت کر لے۔ انہوں نے ابداً کر کہنا شروع کیا جس وقت جی چاہا چلی گئیں۔ میں نے زیادہ سختی کی تو انہوں نے اور بے باکی سے کام لیا اور میری جھنجھلاہٹ اور بڑبڑ گئی، نتیجہ یہ ہوا کہ ہم دونوں شادی شدہ بچے اکثر ایک دوسرے سے بول چال ترک کر دیتے تھے، بیچ

پوچھئے تو میری بندشوں کی خلاف ورزی کرنے میں کستور ابائی پر کوئی الزام نہیں آتا۔ بھلا ایک صاف دل لڑکی یہ کیوں نگرگوارا کر سکتی تھی کہ اس کے مندر جانے یا ہجوسیوں سے ملنے جلنے پر روک ٹوک کی جائے۔ اگر مجھے ان پر بندشیں عائد کرنے کا حق تھا تو کیا انہیں اس کا حق نہ تھا؟ آج میں یہ سب باتیں اچھی طرح سمجھتا ہوں مگر اس زمانے میں تو مجھے شوہر نہ اختیار ہرستے کا ضبط تھا۔

مگر یہ نہ سمجھئے گا کہ ہماری زندگی میں سوائے تلخی اور ناکامی کے کچھ نہ تھا میری سختیوں کی بنیاد آخر محبت ہی تو تھی۔ میں اپنی بیوی کو زبردستی زوجیت کا مکمل نمونہ بنانا چاہتا تھا۔ میں انہیں اس پر مجبور کرنا چاہتا تھا کہ عفت کی زندگی بسر کریں۔ جو میں سیکھوں وہ بھی سیکھیں اور اپنی زندگی کو میری زندگی میں اپنے خیالات کو میرے خیالات میں ضم کر دیں۔

مجھے معلوم نہیں کہ کستور ابائی کی بھی یہ آرزو تھی یا نہیں۔ وہ ان پڑھ تھیں ان کے مزاج میں غلطی طور پر سادگی، خود داری، استقلال اور کم سخی تھی یا کم سے کم مجھ سے وہ زیادہ گفتگو نہیں کرتی تھیں۔ انہیں اپنی جہالت کا کوئی غم نہ تھا اور جہاں تک مجھے یاد ہے کبھی انہیں میری دیکھا دیکھی پڑھنے لکھنے کا شوق نہیں ہوا۔ اس لئے میں سمجھتا ہوں کہ میرے حوصلے یک طرفہ تھے۔ میرے سارے جوش الفت کا مرکز یہی ایک عورت تھی اور میں چاہتا تھا کہ ادھر سے بھی ایسی ہی محبت کا اظہار ہو۔ جانہن سے گرم جوشی نہ سہی پھر بھی ہمارے تعلقات سراسر رنج و کلفت پر مبنی نہ تھے کیونکہ کم سے کم ایک طرف سے تو بے قراری محبت تھی۔

مجھے اعتراف ہے کہ میں ان پر دل و جان سے فریفتہ تھا اسکول میں بھی انہیں کے خیال میں محور رہتا تھا اور آنے والی رات اور خلوت کا تصور ہر وقت میرے دل و دماغ پر مسلط رہتا تھا۔ ان کی جدائی ناقابل برداشت تھی۔ رات کو میں بڑی دیر تک فضول باتیں کر کے ان کی نیند حرام کر دیتا تھا۔ اگر اس جوش جنون کے ساتھ میرے دل میں فرض شناسی کی لگن نہ ہوتی تو یا تو میں بیماریوں میں مبتلا ہو کر قبل از وقت موت کا شکار ہو جاتا یا میری زندگی ایسی ہو جاتی جس سے موت بہتر ہے مگر روزمرہ کے فرائض ادا کرنا ضروری تھا اور یہ مجھ سے ناممکن تھا کہ جھوٹ بولوں۔ اسی آخری چیز نے مجھے بہت سے گڑھوں میں گرنے سے بچایا۔

میں پہلے ہی کہہ چکا ہوں کہ کستور ابائی ان پڑھ تھیں۔ میرا بہت جی چاہتا تھا کہ انہیں پڑھاؤں مگر شہوانی محبت سے فرصت نہ ملتی تھی۔ پھر ایک وقت یہ تھا کہ مجھے ان کی مرضی کے خلاف پڑھانا پڑتا تھا اور وہ بھی رات کے وقت۔ بزرگوں کے سامنے گفتگو تو درکنار میری اتنی مجال نہ تھی کہ انہیں دیکھ بھی

سکوں۔ ان دنوں کاٹھیادار میں ایک خاص قسم کا بیکار اور وحشانہ بردہ رائج تھا اور ایک حد تک اب بھی ہے۔ غرض پڑھائی کے لئے صورت حال ہر طرح ناموافق تھی مجھے یہ اعتراف کرنا پڑتا ہے کہ نوجوانی کے زمانے میں میں نے کستور ابائی کو پڑھانے کی جتنی کوششیں کیں وہ زیادہ تر ناکام رہیں۔ جب میں ہوائے نفس کی نیند سے چوٹا تو میری قومی خدمت کی زندگی شروع ہو چکی تھی۔ جس سے مجھے بہت کم فرصت ملتی تھی۔ میں نے چاہا کہ اتالیق رکھ کر انہیں پڑھواؤں مگر اس میں کامیابی نہ ہوئی۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ کستور ابائی کو سیدھے سادھے خط لکھنے میں اور آسان گجراتی سمجھنے میں بھی دقت ہوتی ہے۔ مجھے یقین ہے کہ وہ محبت جو مجھے ان سے تھی ہوائے نفس سے پاک ہوتی تو وہ آج ایک تعلیم یافتہ خاتون ہوتیں۔ کیونکہ اس صورت میں ان کی بد شوقی دور کرنے میں کامیاب ہو جاتا مجھے معلوم ہے کہ پاک محبت کے آگے کوئی چیز ناممکن نہیں۔

میں نے ایک چیز کا ذکر کیا ہے جس نے مجھے شہوانی محبت کے مہلک نتیجوں سے کم و بیش محفوظ رکھا۔ اس سلسلے میں یہ امر قابل ذکر ہے۔ بہت سی مثالیں دیکھ کر مجھے یقین ہو گیا ہے کہ جس شخص کی نیت خالص ہو اسے خدا ایک نہ ایک دن ضرور نجات دیتا ہے۔ ہندوؤں میں بچپن کی شادی کی ظالمانہ رسم کے ساتھ ایک اور رسم ہے جس کی وجہ سے اس کے برے نتائج میں ایک حد تک کمی ہو جاتی ہے۔ والدین نوجوان میاں بیوی کو زیادہ دن تک ساتھ نہیں رہنے دیتے۔ کس بیوی سال کے آدھے سے زیادہ میکے میں بسر کرتی ہے۔ یہی صورت ہمیں بھی پیش آئی۔ یعنی شادی کے پہلے پانچ سال میں (تیرہ برس سے اٹھارہ برس کی عمر تک) ہم دونوں سب ملا کر تین سال سے زیادہ اکٹھے نہ رہے ہوں گے۔ ہماری یکجائی کو چھ مہینے بھی نہیں ہونے پاتے تھے کہ میری بیوی کے میکے سے بلاوا آ جاتا تھا۔ اس زمانے میں یہ بہت گراں گزرتا تھا۔ لیکن اسی نے ہم دونوں کو بچا لیا۔ اٹھارہ برس کی عمر میں میں انگلستان چلا گیا۔ اس طرح ایک عرصہ کے لئے جدائی ہو گئی اور ہم دونوں کی صحت کے لئے بہت مفید تھی۔ انگلستان سے میری واپسی کے بعد بھی ہم دونوں کے ساتھ چھ مہینے سے زیادہ نہیں رہا کیونکہ مجھے اکثر راجکوٹ سے بمبئی آنا جانا پڑتا تھا اس کے بعد مجھے جنوبی افریقہ سے بلاوا آیا اور وہاں سے واپسی کے بعد میں بڑی حد تک نفسانی خواہشوں سے نجات پا چکا تھا۔

ہائی اسکول کی تعلیم

میں کہہ چکا ہوں کہ جس زمانے میں میری شادی ہوئی میں اسکول میں پڑھتا تھا۔ ہم تینوں بھائی ایک ہی اسکول میں تھے۔ بڑے بھائی بہت اونچے درجے میں تھے اور جن بھائی کی شادی میری شادی کے ساتھ ساتھ ہوئی وہ مجھ سے صرف ایک درجہ آگے تھے۔ شادی کے سبب سے ہم دونوں کا ایک سال ضائع ہوا۔ بلکہ میرے بھائی کے لئے اس کا نتیجہ اور بھی برا ہوا کیونکہ انہوں نے پڑھنا بالکل چھوڑ ہی دیا۔ خدا جانے کتنے لڑکوں پر یہ مصیبت آتی ہے جو ان پر آئی۔ یہ صرف آج کل کی ہندو سماج ہی کا دستور ہے کہ طالب علمی اور شادی کی زندگی ساتھ ساتھ چلتی ہے۔

میری پڑھائی جاری رہی۔ ہائی اسکول میں میں کودن نہیں سمجھا جاتا تھا۔ میرے استادوں کو ہمیشہ مجھ سے محبت رہی۔ تعلیمی ترقی اور چال چلن کے سرٹیفکیٹ ہر سال لڑکوں کے والدین کے پاس بھیجے جایا کرتے تھے مجھے کبھی خراب سرٹیفکیٹ نہیں ملا۔ بلکہ دوسرا درجہ پاس (1) کرنے کے بعد میں نے انعام بھی پائے۔ پانچویں درجے میں مجھے چار روپے کا اور چھٹے میں دس روپے کا وظیفہ ملا۔ اس میں میری قابلیت سے زیادہ میری خوش قسمتی کو دخل تھا کیونکہ وظیفے عام نہ تھے بلکہ کاٹھیادار کے علاقہ سورٹھ کے لڑکوں میں جو سب سے اچھے طالب علم تھے ان کے لئے مخصوص تھے اور ان پچاس سالہ طالب علموں کی جماعت میں سورٹھ کے لڑکے زیادہ نہ ہوں گے۔

مجھے تو یہ یاد پڑتا ہے کہ میرا خیال اپنی قابلیت کے متعلق کچھ اچھا نہ تھا۔ مجھے انعام اور وظیفہ پا کر بہت تعجب ہوا کرتا تھا۔ لیکن اپنے چال چلن کی دیکھ بھال میں بہت سختی سے کیا کرتا تھا۔ اس پر اگر خفیف سا دھبہ بھی آگیا تو میری آنکھوں میں آنسو بھر آتے تھے۔ جب کبھی میری کوئی حرکت واقعی یا

استاد کے خیال میں قابل سرزنش ہوتی تو مجھے ایسا دکھ ہوتا تھا کہ میں برداشت نہیں کر سکتا تھا۔ مجھے یاد ہے کہ ایک بار مجھے جسمانی سزا دی گئی۔ سزا کی مجھے اتنی پروا نہ تھی جتنی اس بات کی کہ میں سزا کا مستحق ٹھہرا۔ میں اس رنج میں بہت رویا یہ اس زمانے کا ذکر ہے جب میں پہلی یا دوسری جماعت میں تھا۔ ساتویں جماعت میں مجھے اسی قسم کا ایک اور واقعہ پیش آیا۔ ان دنوں داراب جی ایڈل جی سی ہیڈ ماسٹر تھے وہ ادب قاعدے میں بہت سخت اور اپنے اصول کے بڑے پابند تھے اور پڑھاتے بھی خوب تھے اس لئے ان کے ان سے خوش رہتے تھے انہوں نے اونچی جماعتوں کے لڑکوں کے لئے کرکٹ اور جمناسٹک کو لازمی کر دیا تھا۔ مجھے دونوں چیزیں ناپسند تھیں۔ میں کسی ورزش یا کرکٹ فٹ بال میں ان کے لازمی ہونے سے پہلے کبھی شریک نہیں ہوا تھا۔ اس علیحدگی کی حس کے نیچا ہونے کا مجھے اب احساس ہے ایک وجہ یہ بھی تھی کہ میں چھپتا تھا۔ ان دنوں میں اس خیال غام میں مبتلا تھا کہ جمناسٹک کو تعلیم سے کوئی تعلق نہیں۔ اب مجھ پر روشن ہو گیا ہے کہ نصاب تعلیم میں جسمانی تربیت کا بھی اتنا ہی حصہ ہونا چاہیے جتنا دماغی تربیت کا۔

مگر ورزش میں شریک نہ ہونے سے میری صحت کو کوئی نقصان نہیں پہنچا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ میں نے کتابوں میں کھلی ہوئی ٹہلنے کے فوائد پڑھے تھے اور یہ ہدایت مجھے پسند آگئی تھی اس لئے میں نے ٹہلنے کی عادت ڈال لی تھی جو اب تک چلی جاتی ہے۔ پابندی سے ٹہلنے کی وجہ سے میرا جسم خاصا مضبوط ہو گیا۔

میں جمناسٹک کو اس لئے ناپسند کرتا تھا کہ مجھے اپنے والد کی تیمارداری کی دل سے خواہش تھی اسکو بند ہوتے ہی میں سیدھا گھر پہنچتا تھا اور ان کی خدمت میں مصروف ہو جاتا تھا لازمی ورزش اس خدمت میں حائل ہونے لگی میں نے جسمی صاحب سے درخواست کی مجھے جمناسٹک سے مستثنیٰ کر دیں تاکہ میں اپنے والد کی تیمارداری کر سکوں مگر انہوں نے کچھ توجہ نہ کی۔ ہر سنیچر کو صبح کالدرسہ ہوا کرتا تھا۔ ایک سنیچر کو ایسا اتفاق ہوا کہ مجھے سہ پہر کو چار بجے جمناسٹک کرنے گھر اسکول جانا تھا۔ میرے پاس گھڑی نہیں تھی اور بادل کے سبب سے وقت کا اندازہ غلط ہوا۔ جب میں اسکول پہنچا تو دیکھا سب لڑکے جا چکے ہیں۔ دوسرے دن جسمی صاحب نے حاضری کار جسٹر دیکھا تو مجھے غیر حاضر پایا۔ جب مجھ سے انہوں نے غیر حاضری کا سبب پوچھا تو میں نے سارا واقعہ بیان کیا۔ انہیں میری بات یقین نہ آئی اور انہوں نے مجھ پر ایک آنہ یاد دہانی (مجھے ٹھیک یاد نہیں) جرمانہ کر دیا۔

مجھ پر جھوٹ کا الزام! اس بات سے مجھے بہت سخت دکھ پہنچا۔ میں اپنی بے گناہی کیسے ثابت

کرتا؟ کوئی صورت نظر نہ آئی تھی۔ مجھے معلوم ہو گیا کہ سچے کو چوکس بھی رہنا چاہیے۔ اسکول میں میری غفلت کی یہ پہلی مثال تھی اور یہی آخری بھی تھی۔ مجھے کچھ دھندلا سا خیال ہے کہ اخیر میں میں نے جرمانہ معاف کرایا۔

میں ورزش سے مستثنیٰ کر دیا گیا کیونکہ خود میرے والد نے ہیڈ ماسٹر صاحب کو لکھ دیا کہ انہیں مدرسے کے وقت کے بعد گھر پر میری ضرورت ہوتی ہے، ورزش میں غفلت کرنے سے تو مجھے کوئی نقصان نہیں ہوا لیکن ایک اور غفلت کی سزا میں اب تک بھگت رہا ہوں، خدا جانے میرے دماغ میں یہ خیال کہاں سے آ گیا کہ خط اچھا ہونا تعلیم کا کوئی ضروری جز نہیں لیکن اتنا جانتا ہوں کہ انگلستان جانے تک میں اس خیال پر قائم رہا۔ آگے چل کر خصوصاً جنوبی افریقہ میں جب میں نے وہاں کے وکیلوں اور خاص وہاں کے رہنے والے نوجوانوں کا خوب صورت خط دیکھا تو مجھے بڑی شرم آئی اور اپنی غفلت پر بہت پختایا مجھے معلوم ہو گیا برے خط کو ناقص تعلیم کی علامت سمجھنا چاہیے۔ میں نے اپنا خط درست کرنے کی کوشش کی لیکن دقت گزر چکا تھا، لڑکپن کی غفلت کی کبھی تلافی نہ ہو سکی۔ ہر نوجوان مرد اور عورت کو میری مثال سے عبرت حاصل کرنا چاہیے اور یہ جان لینا چاہیے کہ اچھا خط تعلیم کا لازمی جز ہے۔ اب میری رائے یہ ہے کہ بچوں کو لکھنا سکھانے سے پہلے ڈرامنگ سکھانا چاہیے۔ وہ حرفوں کو مشاہدے سے اچھی طرح پہچانیں جیسے چیزوں مثلاً پھولوں، چیزوں وغیرہ کو پہچانتے ہیں اور لکھنا اس وقت سیکھیں جب انہیں چیزوں کی تصویر بنانا آجائے۔ تب ان کا خط خوبصورت ہو گا۔

مجھے اسکول کے زمانے کی جو باتیں یاد ہیں ان میں دو اور قابل ذکر ہیں میں نے اپنی شادی کے سبب سے ایک سال ضائع کر دیا تھا اور میرے استاد کی خواہش تھی کہ میں اس کی تلافی میں ایک سال میں دو درجے بڑھا دیا جاؤں۔ یہ رعایت عموماً محنتی لڑکوں کے ساتھ کی جاتی ہے۔ اس لئے میں تیسرے درجے میں صرف چھ مہینے رہا اور ششماہی امتحان پاس کر کے جس کے بعد گرمیوں کی چٹھی ہوتی ہے۔ چوتھے درجے میں پڑھا دیا گیا۔ اس درجے میں اکثر مضمون انگریزی میں پڑھائے جاتے تھے۔ میں بدحواس ہو گیا۔ اقلیدس بالکل نیا مضمون تھا جس میں کمزور تھا اور چونکہ پڑھائی انگریزی میں ہوتی تھی اس لئے اور بھی دقت تھی۔ استاد اپنے مضمون کو خوب پڑھاتے تھے مگر میری سمجھ میں کچھ نہ آتا تھا۔ اکثر میرا دل چھوٹ جاتا تھا اور میں سوچتا تھا کہ پھر تیسرے درجے میں چلا جاؤں، مجھے ایسا معلوم ہوتا تھا کہ دو سال کی پڑھائی ایک سال میں سمیٹنا میرے بس کی بات نہیں مگر اس میں نہ صرف میری دقت تھی بلکہ میرے استاد کی بھی سب کی ہوتی تھی کیونکہ انہوں نے میری محنت پر بھروسہ کر کے میری ترقی کی سفارش کی

تھی۔ اس دوہری ذلت کے خوف سے میں میدان میں جا رہا۔ آخر جب بڑی کوششوں سے میں اقلیدس کی تیرہویں شکل تک پہنچا تو مجھ پر ایک بیک یہ حقیقت کھل گئی کہ یہ مضمون بالکل سہل اور سادہ ہے۔ جس مضمون میں انسان کو محض اپنی سمجھ سے کام لینا ہو وہ ہرگز مشکل نہیں ہو سکتا۔ اس کے بعد سے ہمیشہ اقلیدس مجھے سہل بھی معلوم ہوئی اور دلچسپ بھی۔

البتہ سنسکرت ذرا ٹیڑھی کھیر تھی۔ اقلیدس میں کوئی چیز زبانی یاد کرنے کی نہ تھی اور سنسکرت میں میں سمجھتا تھا کہ سب کچھ حفظ یاد کرنا پڑتا ہے۔ یہ مضمون بھی چوتھے درجے سے شروع ہوتا تھا۔ چھٹے درجے میں پہنچ کر میری ہمت نے جواب دے دیا، جو استاد اس مضمون کو پڑھاتے تھے وہ کام لینے میں بہت سخت تھے اور مجھے یہ معلوم ہوتا تھا کہ وہ لڑکوں پر بڑا جبر کرتے ہیں۔ سنسکرت اور فارسی کے استادوں میں باہم ایک طرح کی رقابت تھی۔ فارسی کے استاد لڑکوں کے ساتھ نرمی کرتے تھے۔ لڑکے آپس میں باتیں کیا کرتے تھے کہ فارسی بہت آسان ہے اور فارسی کے استاد بڑے اچھے آدمی ہیں اور طالب علموں کا بہت خیال رکھتے ہیں۔ اس "آسانی" نے مجھے لہجہ اور ایک دن میں فارسی کی جماعت میں جا بیٹھا۔ سنسکرت کے استاد کو اس سے رنج پہنچا۔ انہوں نے بلا کر کہا "تم یہ بھول گئے کہ تم ویشنو باپ کے بیٹے ہو؟ اپنے مذہب کی زبان نہیں پڑھو گے؟ اگر تمہیں کوئی بات مشکل نظر آتی ہے تو میرے پاس آ کر کیوں نہیں پوچھتے؟ میں تم سب طالب علموں کو سنسکرت پڑھانے میں اپنی مقدور بھر کوشش کرتا ہوں جب تم آگے بڑھو گے تو اس میں بڑی دلچسپ چیزیں نظر آئیں گی۔ دیکھو ہمت نہ ہارو۔ آؤ پھر سے سنسکرت کی جماعت میں شریک ہو جاؤ۔"

اس مہربانی نے مجھے شرمندہ کر دیا۔ بھلا کیسے ممکن تھا کہ مجھے استاد کی اس محبت کا لحاظ نہ ہو۔ اب میں کرشن شنکر پانڈیا کو ہمیشہ شکر گزاری کے ساتھ یاد کرتا ہوں۔ کیونکہ جو تھوڑی بہت سنسکرت میں نے اس زمانے میں سیکھ لی اگر وہ نہ سیکھتا تو ہندو دھرم کی مقدس کتابوں میں میرا جی مشکل ہے، لگتا۔ بلکہ مجھے بہت افسوس ہے کہ میں نے اس سے زیادہ استعداد حاصل نہیں کی کیونکہ اب مجھے یقین ہو گیا کہ ہر ہندو لڑکے اور لڑکی کو سنسکرت اچھی طرح جاننا چاہیے۔

اب میری رائے یہ ہے کہ ہندوستان کی اعلیٰ تعلیم کے نصاب میں مقامی زبان کے علاوہ ہندی، سنسکرت، فارسی، عربی، انگریزی کی بھی جگہ ہونی چاہیے۔ کوئی صاحب اس لمبی فہرست کو دیکھ کر نہ ڈریں۔ مجھے یقین ہے کہ اگر ہماری تعلیم کے نظام پر زیادہ توجہ کی جائے اور لڑکوں پر سارے مضامین غیر زبان کے ذریعہ پڑھنے کا بوجھ نہ ڈالا جائے تو ان زبانوں کے حاصل کرنے میں دقت نہ ہوگی بلکہ بننے

کھیلے سیکھ لی جائیں گی۔ اگر کوئی شخص ایک زبان علمی اصول کے مطابق سیکھ لے تو اسے اور زبانیں آسانی سے آجاتی ہیں۔

اصل میں ہندی، گجراتی اور سنسکرت کو ہم ایک زبان سمجھ سکتے ہیں اور اسی طرح عربی فارسی کو بھی۔ اگرچہ فارسی آری اور عربی سامی خاندان السنہ ہے لیکن عربی فارسی دونوں کی پوری نشوونما اسلام کی ترقی کے طفیل میں ہوئی کیونکہ اس نے صرف و نحو ہندی کی اختیار کی ہے اور الفاظ زیادہ تر عربی فارسی سے لئے ہیں۔ اس لئے جو شخص اچھی اردو سیکھنا چاہے اسے لازم ہے کہ عربی فارسی پڑھے، اور جو شخص اچھی ہندی، گجراتی، بنگالی یا مرہٹی سیکھنا چاہے اسے لازم ہے کہ سنسکرت پڑھے۔

حوالہ

1 - معلوم ہوتا ہے ان دنوں کاٹھیادار کے ہائی اسکولوں میں آٹھ درجے ہوتے تھے اور آٹھواں انٹرنس تھا۔

ایک المناک واقعہ

ہائی اسکول میں جن لڑکوں سے مجھ سے مختلف اوقات میں دوستی رہی ان میں سے دو قلبی دوست کہے جاسکتے ہیں۔ ایک سے میری دوستی زیادہ دن نہیں رہی۔ میں نے اسے نہیں چھوڑا بلکہ اس نے مجھے چھوڑ دیا اس تصور پر کہ میں نے دوسرے سے میل جول پیدا کیا۔ اس دوسری دوستی کو میں اپنی زندگی کا ایک المناک واقعہ سمجھتا ہوں۔ یہ بہت دن قائم رہی۔ میں نے اسے اصلاح کے جوش میں شروع کیا تھا۔

میرا یہ رفیق اصل میں میرے منجھلے بھائی کا دوست تھا۔ یہ دونوں ہم سبق تھے میں اس کی کمزوریوں سے واقف تھا مگر اسے وفادار دوست سمجھتا تھا۔ میری ماں نے، میرے بڑے بھائی نے، میری بیوی نے مجھے متنبہ کیا کہ تمہاری صحبت خراب ہے۔ بیوی کی بات تو میں شوہری کے غرور میں سبک سنا تھا لیکن ماں اور بڑے بھائی کی رائے کے خلاف عمل کرنے کی مجھ میں ہمت نہ تھی پھر بھی میں نے ان سے عذر معذرت کی اور کہا ”میں جانتا ہوں کہ اس میں وہ کمزوریاں ہیں جو آپ نے بتائیں۔ مگر آپ کو اس کی اچھائیوں کی خبر نہیں۔ وہ مجھے گمراہ نہیں کر سکتا کیونکہ میں اس سے اس نیت سے ملتا ہوں کہ اس کی اصلاح کروں۔ مجھے یقین ہے کہ اگر وہ اپنے اطوار درست کر لے تو بڑا اچھا آدمی ہو جائے گا۔ میری التجا ہے کہ آپ میری طرف سے تردد نہ کریں۔“

اس سے ان کا اطمینان تو نہیں ہوا مگر انہوں نے میری توجیہ مان لی۔ اور مجھے میری راہ چلنے دیا۔ آگے چل کر مجھے معلوم ہوا کہ میرا اندازہ غلط تھا۔ جو شخص کسی کی اصلاح کرنا چاہتا ہے وہ اس کے ساتھ شیر و شکر ہو کر نہیں رہ سکتا۔ سچی دوستی روحانی اتحاد کا نام ہے جو اس دنیا میں بہت کم ہوتا ہے۔ صرف

انہی لوگوں میں جن کی طبیعت ایک سی ہو۔ دوستی پوری طرح مکمل اور پائیدار ہو سکتی ہے۔ دوستوں میں ہر ایک کا اثر دوسروں پر پڑتا ہے، اسی لئے دوستی میں اصلاح کی گنجائش بہت کم ہے۔ میری رائے میں کسی ایک شخص سے ایک جان دو قالب ہو جانے سے پرہیز کرنا چاہیے کیونکہ انسان پر بہ نسبت نیکی کے بدی کا اثر جلد پڑتا ہے اور جو شخص خدا کا دوست ہونا چاہتا ہے اسے لازم ہے کہ یا تو اکیلا رہے یا ساری دنیا سے دوستی کرے۔ ممکن ہے میری رائے غلط ہو مگر مجھے تو قلبی دوستی پیدا کرنے میں ناکامی ہوئی۔

جن دنوں میں میری ملاقات اس دوست سے ہوئی راجکوٹ میں ”ریفارم“ کا بڑا زور تھا اس نے مجھے بتایا کہ ہمارے بہت سے استاد چھپ کر شراب اور گوشت کا استعمال کرتے ہیں اس نے راجکوٹ کے بہت سے مشہور آدمیوں کے نام بھی لئے جو اس جماعت میں شریک تھے۔ اس نے کہا کہ اس زمرے میں ہائی اسکول کے بعض لڑکے بھی ہیں۔

مجھے یہ سن کر تعجب اور رنج ہوا۔ میں نے اپنے دوست سے اس کا سبب پوچھا تو اس نے کہا ہماری قوم گوشت نہیں کھاتی اس لئے کمزور ہے، انگریز لوگ گوشت کھاتے ہیں اسی لئے وہ ہم پر حکومت کرنے کے قابل ہیں۔ تم جانتے ہو میں کیسا مضبوط ہوں اور کتنا تیز دوڑتا ہوں۔ اس کا سبب یہی ہے کہ میری غذا گوشت ہے۔ گوشت کھانے والوں کے پھوڑے پھنسی نہیں نکلتے اور کبھی نکل بھی آئیں تو جلد اچھے ہو جاتے ہیں۔ ہمارے استاد اور ہمارے دوسرے بڑے آدمی جو گوشت کھاتے ہیں احمق نہیں ہیں۔ وہ جانتے ہیں کہ اس میں کیا خوبیاں ہیں۔ تمہیں بھی اس کی تقلید کرنا چاہیے۔ آخر آزمائش کرنے میں کیا برج ہے؟ تم آزما دیکھو کہ گوشت کھانے سے کیسی طاقت آتی ہے۔

گوشت کھانے کی تائید میں یہ ساری دلیلیں ایک ہی نشست میں پیش نہیں کی گئیں۔ یہ اس طول طویل استدلال کا خلاصہ ہے جس سے میرا دوست مجھ پر دو تھما اثر ڈالتا رہا۔ میرے منجھلے بھائی پہلے ہی مغلوب ہو چکے تھے۔ اس لئے وہ میرے دوست کی دلیلوں کی تائید کرتے تھے۔ میں واقعی اپنے بھائی اور اس دوست کے مقابلہ میں بالکل مرہل معلوم ہوتا تھا۔ وہ مجھ سے زیادہ قوی اور جفاکش بھی تھے اور جری بھی۔ اس دوست کے کارناموں نے مجھ پر جاودسا کر دیا وہ بہت دور تک اور بڑی تیزی سے دوڑ سکتا تھا، کود پھاند (1) میں بہت مشتاق تھا اور سخت سے سخت جسمانی سزا برداشت کر لیتا تھا۔ وہ مجھے اکثر اپنے کارنامے دکھایا کرتا تھا اور یہ قاعدے کی بات ہے کہ انسان دوسروں میں وہ صغنیں دیکھ کر، جو اس میں نہ ہوں، دنگ رہ جاتا ہے۔ اس کے بعد میرے دل میں دلولہ اٹھا کہ اس کا چھسا بنوں میں نہ کود سکتا

تھا۔ نہ دوز سکتا تھا میں نے سوچا کہ میں بھی اس کی طرح مضبوط کیوں نہ ہو جاؤں؟
 پھر میں بزدل بھی تھا۔ مجھے ہر وقت چوروں، بھوتوں اور سانپوں کا کھٹکارہتا تھا۔ رات کو گھر سے
 باہر قدم رکھنے کی ہمت نہ پڑتی تھی۔ اندھیرے سے میری روح فنا ہوتی تھی۔ میرے لئے اندھیرے میں
 سونا تقریباً ناممکن تھا کیونکہ مجھے وہم ہوتا تھا کہ ایک طرف سے بھوت چلے آ رہے ہیں، دوسری طرف
 سے چور، تیسری طرف سے سانپ، بغیر کمرے میں روشنی رکھے مجھے سے سوتے نہ بنتا تھا۔ میں اپنے خوف
 کو اپنی کسین بیوی پر جو میرے پہلو میں سوتی تھی کیونکر ظاہر کرتا؟ میں جانتا تھا کہ ان میں مجھ سے زیادہ
 ہمت ہے اور مجھے اپنے اوپر شرم آتی تھی، انہیں سانپوں اور بھوتوں کا کوئی ڈر نہ تھا۔ وہ اندھیرے میں ہر
 جگہ چلی جاتی تھیں۔ میرے دوست کو میری ان کمزوریوں کا حال معلوم تھا۔ وہ کہتا تھا کہ میں زندہ سانپ
 ہاتھ پر رکھ سکتا ہوں۔ چوروں کا مقابلہ کر سکتا ہوں اور بھوتوں کا قائل ہی نہیں ہوں۔ یہ گوشت کھانے کی
 برکت کہے۔

ہم اسکول کے لڑکوں میں زندگی یہ تک بندی بہت مقبول تھی۔

لمبا فرنگی راجا ہے

ٹھنگنا دسی پر جا ہے

اور پانچ ہاتھ لمبا ہے

کیونکہ وہ گوشت لاتا ہے

ان سب باتوں کا مجھ پر کافی اثر پڑا۔ میں نے ہتھیار ڈال دیئے۔ مجھے رفتہ رفتہ یقین ہونے لگا کہ
 گوشت کھانا اچھا ہے۔ اس سے مجھ میں قوت اور جرات پیدا ہو جائے گی اور اگر سارا ملک گوشت کھانے
 لگے تو انگریز مغلوب ہو جائیں گے۔

اب تجربہ شروع کرنے کے لئے ایک دن مقرر ہوا۔ اسے پوشیدہ رکھنا بہت ضروری تھا۔ سارا
 گاندھی خاندان ویشنو تھا اور میرے والدین تو بڑے پکے ویشنو تھے۔ وہ پابندی سے "تویلی" جایا کرتے
 تھے بلکہ خود ہمارے خاندان کے جداگانہ مندر بھی تھے۔ جین مت کا گجرات میں بہت زور تھا اور اس کا
 اثر ہر وقت ہر جگہ نظر آتا تھا۔ گجرات کے جین اور ویشنو لوگوں کو گوشت کھانے سے جتنی سخت نفرت
 تھی اس کی مثال نہ ہندوستان میں ملتی ہے اور نہ کسی اور ملک میں۔ میری ولادت اور پرورش اس ماحول
 میں ہوئی تھی اور مجھے اپنے والدین سے بڑی محبت تھی۔ میں جانتا تھا کہ جس دم وہ میرے گوشت کھانے
 کی خبر سن پائیں گے صدمے کے مارے مر جائیں گے۔ سچائی کی محبت نے مجھے اور بھی زیادہ احتیاط پر
 مجبور کر دیا میں یہ نہیں کہہ سکتا کہ مجھے اس وقت اس کا احساس نہ تھا کہ اگر میں نے گوشت کھانا شروع کر
 دیا تو والدین کو دھوکا دینا پڑے گا۔ لیکن میں نے دل میں ٹھان لی کہ "ریفارم" ضرور کروں گا اس میں

زبان کی چاٹ کو دغل نہ تھا۔ میں نے گوشت کے مزے کی کوئی خاص تعریف نہیں سنی تھی۔ مگر میں چاہتا تھا کہ میں قوی اور بہادر ہو جاؤں اور میرے دیس کے لوگ بھی ایسے ہی ہو جائیں تاکہ ہم انگریزوں کو شکست دیں اور ہندوستان کو آزاد کرالیں "سوراج" کا لفظ میں نے اب تک نہیں سنا تھا مگر آزادی کے معنی جانتا تھا "ریفارم" کے جوش نے مجھے اندھا کر دیا۔ میں نے اس بات کو مخفی رکھنے کا بندوبست کیا اور اپنے دل کو سمجھایا کہ محض اس فعل کو والدین سے چھپانا حق سے انحراف نہیں ہے۔

حوالہ

Higher and doing Jumping - 1

ایک المناک واقعہ (۲)

(پچھلے باب کا سلسلہ)

آخر وہ دن آگیا۔ اس وقت میرا جو حال تھا اسے پوری طرح بیان کرنا مشکل ہے۔ ایک طرف تو ”ریفارم“ کا جوش اور زندگی میں ایک اہم تبدیلی کی جدت کا لطف تھا اور دوسری طرف اسی کام کو چوروں کی طرح چھپ کر کرنے کی شرم تھی۔ میں نہیں کہہ سکتا دونوں میں سے کون سی چیز مجھ پر غالب تھی۔ ہم نے دریا کے کنارے جا کر ایک گوشہ تنہائی ڈھونڈھا اور میں نے اپنی عمر میں پہلی بار گوشت ----- دیکھا اس کے ساتھ تنوری روٹی بھی تھی مجھے دونوں چیزوں میں سے کوئی چیز پسند نہ آئی۔ بکری کا گوشت چمڑے کی طرح سخت تھا۔ مجھ سے کسی طرح نہیں کھایا جاتا تھا۔ مجھے قے ہو گئی اور کھانا چھوڑ کر اٹھنا پڑا۔

اس کے بعد کی رات بڑی بری طرح گزری۔ مجھے بڑا ہونناک خواب نظر آیا جب آنکھ لگتی تھی تو ایسا معلوم ہوتا تھا کہ زندہ بکری میرے پیٹ کے اندر میا رہی ہے اور میں گھبرا کر اچھل پڑتا تھا مگر میں اپنے دل کو سمجھاتا تھا کہ گوشت کا کھانا فرض ہے اور اس سے مجھے کچھ تسکین ہو جاتی تھی۔

میرا دوست آسانی سے ہار مانتے والا آدمی نہ تھا۔ اب عمدہ مسالے ڈال کر گوشت کے مزیدار کھانے پکانے لگا کھانا کھانے کے لئے ہمیں اب دریا کے کنارے سونی جگہ ڈھونڈھنے کی ضرورت نہ تھی بلکہ ایک ریاست کے مکان میں کھاتے تھے۔ جس میں کھانے کا علیحدہ کمرہ میز کرسی سے سجا ہوا تھا۔ میرے دوست نے وہاں کے بڑے باورچی سے ساز باز کر کے یہ انتظام کیا تھا۔

میں اس لالچ میں آگیا۔ مجھے روٹی سے کراہت تھی وہ دور ہو گئی، بکری پر ترس آتا تھا وہ جاتا رہا اور شت کی بوٹی میں تو نہیں مگر سالن میں مزا آنے لگا۔ یہ سلسلہ قریب قریب ایک سال تک چلتا رہا

لیکن اس عرصہ میں گوشت کی دعوتیں سب ملا کر چھ سے زیادہ نہیں ہوئیں کیونکہ ریاست کا مکان روز روز نہیں ملتا تھا اور پھر یہ دقت بھی تھی کہ گوشت کے مزیدار کھانوں میں اکثر صرفہ بہت ہوتا تھا۔ میرے پاس اس ریفارم کی قیمت ادا کرنے کے لئے دام نہ تھے اس لئے ہر مرتبہ خرچ کا انتظام میرے دوست ہی کو کرنا پڑتا تھا۔ مجھے کچھ خبر نہ تھی کہ وہ کہاں سے اتنا روپیہ لاتا ہے مگر کسی نہ کسی طرح وہ لے ہی آتا تھا کیونکہ وہ اس پر تلا ہوا تھا کہ مجھے گوشت کھانے کا عادی کر دے، مگر آخر اس کی آمدنی بھی محدود ہی ہوگی اس لئے بہت کم دعوتیں ہو سکیں اور وہ بھی طویل وقفوں کے بعد۔

جب کبھی میں یہ چوری کی دعوتیں اڑاتا تھا تو ظاہر ہے کہ گھر آ کر کھانا نہیں کھا سکتا تھا۔ میری والدہ قدرتی طور پر کھانے کے لئے اصرار کرتی تھیں اور خواہش نہ ہونے کا سبب پوچھتی تھیں میں ان سے کہہ دیتا تھا ”آج مجھے بھوک نہیں ہے میرے ہاضمے میں کچھ خرابی ہے۔“ یہ بہانے کرنے پر میرا دل مجھے ملامت کرتا تھا میں جانتا تھا کہ جھوٹ بول رہا ہوں اور وہ بھی اپنی والدہ سے۔ مجھے یہ بھی معلوم تھا کہ اگر میرے باپ کو میرے گوشت کھانے کی خبر ہو گئی تو انہیں بہت سخت صدمہ ہو گا۔ یہ خیال میرے لئے سوہان روح تھا۔

اس لئے میں نے اپنے دل میں کہا: ”اگرچہ گوشت کھانا بہت ضروری چیز ہے اور یہ بھی بہت ضروری ہے کہ ملک میں غذا کی اصلاح کی جائے لیکن اپنے ماں باپ کو دھوکا دینا اور ان سے جھوٹ بولنا گوشت نہ کھانے سے بھی بدتر ہے۔ جب تک وہ زندہ ہیں گوشت کھانا ممکن نہیں۔ جب وہ نہ رہیں گے اور میں آزاد ہو جاؤں گا تو کھلم کھلا گوشت کھاؤں گا لیکن اس دقت تک میں اس سے پرہیز کروں گا۔“

اس فیصلے کی اطلاع میں نے اپنے دوست کو کر دی۔ اس دن سے آج تک میں نے پھر کبھی گوشت نہ کھایا۔ میرے والدین کو مرتے دم تک معلوم نہیں ہوا کہ ان کے دو لڑکوں نے گوشت کھانا شروع کر دیا تھا۔ اس پر خلوص خواہش کی وجہ سے کہ اپنے والدین سے جھوٹ نہ بولوں میں نے گوشت چھوڑ دیا مگر اپنے دوست کی صحبت نہ چھوڑی۔ اس کی اصلاح کرنے کے جوش نے مجھے برباد کر دیا تھا۔ مگر مجھے اس کا بالکل احساس نہ تھا۔

اس شخص کی صحبت نے مجھے بیوی سے بیوفائی کرنے پر اکسایا میں بال بال بچ گیا۔ یہ دوست مجھے ایک بار ایک قبوہ خانے میں لے گیا۔ اس نے مجھے ضروری ہدایتیں دے کر اندر بھیجا۔ سب باتیں پہلے ہی طے ہو چکی تھیں، روپیہ پہلے ہی ادا کر دیا گیا تھا میں گناہ کے منہ میں جا چکا تھا۔ مگر خدا نے اپنی رحمت کا لہ سے مجھے میرے نفس سے بچا لیا۔ میں اس بدکاری کے گھر میں پہنچ کر قریب قریب اندھا اور گوتا

ہو گیا میں پلنگ پر اس عورت کے قریب بیٹھ گیا مگر گرم سم۔ ظاہر ہے کہ اسے غصہ آ گیا اور اس نے مجھے گالیاں دے کر گھر سے نکال دیا۔ اس وقت مجھے یہ معلوم ہوتا تھا کہ میری مردگی کو بڑھ لگ گیا اور شرم کے مارے جی چاہتا تھا کہ زمین پھٹے اور میں سما جاؤں لیکن اس کے بعد میں نے ہمیشہ خدا کا شکر کیا کہ اس نے مجھے بچایا۔ مجھے اپنی زندگی میں اس قسم کے چار واقعات یاد ہیں اور ان میں سے اکثر میں اپنی کوشش سے نہیں بلکہ خوش قسمتی سے محفوظ رہا۔ خالص اخلاقی نقطہ نظر سے تو چاروں مرتبہ میں لغزش کا مرتکب قرار پاؤں گا۔ کیونکہ شہوانی خواہش موجود تھی اور یہ ارتکاب فعل سے کم نہیں لیکن عام خیال یہ ہے کہ جو شخص جسم کو گناہ میں آلودہ ہونے دے وہ گویا گناہ سے بچ گیا۔ میں بھی بس اسی حد تک بچا۔ بعض فعل ایسے ہوتے ہیں جن سے محفوظ رہنا خود انسان کے لئے اور آس پاس کے لوگوں کے لئے لطیفہ غیبی سے کم نہیں۔ جیسے ہی اس کا اخلاقی احساس جاگتا ہے وہ خدا کا شکر ادا کرتا ہے کہ اس نے اپنے فضل سے بچایا۔ جس طرح ہم یہ دیکھتے ہیں کہ انسان اکثر انتہائی کوشش کے باوجود خواہش گناہ سے مغلوب ہو جاتا ہے اسی طرح یہ بھی دیکھنے میں آتا ہے کہ وہ خود گناہ کی طرف راغب ہوتا ہے مگر خدا کی قدرت سے محفوظ رہتا ہے۔ یہ کیونکر ہوتا ہے۔ انسان کس حد تک فاعل مختار ہے اور کس حد تک واقعات کا کھلونا ہے، تدبیر کہاں تک چلتی ہے اور تقدیر کہاں تک دخل دیتی ہے۔ یہ سب باتیں بھید ہیں اور ہمیشہ بھید ہی رہیں گی۔

آدم برسر مطلب۔ اس واقعے کے بعد بھی میری آنکھیں نہیں کھلیں اور مجھے اپنے دوست کی بدکاری کا احساس نہیں ہوا۔ اس لئے مجھے اور بہت سے کڑے گھونٹ پینا پڑے۔ یہاں تک کہ میں نے اپنی آنکھ سے اس کی وہ حرکتیں دیکھیں جن کا مجھے شان و گمان بھی نہ تھا مگر اس کا ذکر آگے چل کر کروں گا کیونکہ میں واقعات سلسلہ وار بیان کروں گا۔

البتہ ایک بات یہیں کہہ دینا چاہیے کیونکہ اس کا تعلق اسی زمانے سے ہے۔ مجھ میں اور میری بیوی میں جو ناپاکی تھی اس کی ایک وجہ یقیناً اس دوست کی صحبت بھی تھی۔ میں اپنی بیوی کا عاشق تھا مگر اس کے ساتھ بدگمان بھی بہت تھا اور اس دوست نے میری بدگمانی کی آگ کو اور بھڑکایا مجھے اس کی راست گوئی میں بھی شبہ نہیں ہوا۔ اکثر میں نے اس کی چغل خوری کی بنا پر اپنی بیوی کو دکھ دیا ہے۔ جس پر مجھے آج تک ندامت ہے۔ صرف ایک بیوی ہی ان سختیوں کو سہہ سکتی ہے۔ اس لئے میں عورت کو مجسم صبر و تحمل سمجھتا ہوں۔ اگر کسی نوکر پر بیجا شبہ ہو تو وہ نوکری چھوڑ سکتا ہے۔ اگر بیٹے پر ہو تو وہ باپ کا گھر چھوڑ سکتا ہے۔ اگر دوست پر ہو تو وہ دوستی ترک کر سکتا ہے۔ بیوی کو شوہر پر شبہ ہو تو

وہ خاموش رہتی ہے لیکن جہاں شوہر کو اس پر شبہہ ہوا تو اس بے چاری کی موت ہی آ جاتی ہے۔ وہ جائے تو کہاں جائے؟ ہندو بیوی کو یہ حق نہیں کہ عدالت میں طلاق کی درخواست دے اس غریب کے لئے قانون نے کوئی تدبیر نہیں بتائی۔ مجھے یہ ہمیشہ یاد رہے گا اور عمر بھر پچھتا رہوں گا کہ میں نے اپنی بیوی کو اس مصیبت میں ڈالا جس سے نکلنے کی کوئی راہ نہ تھی۔

بدگمانی کا ناسور میرے دل سے اس دقت گیا جب میں نے "اہمسا" (1) کے سب پہلوؤں کو اچھی طرح سمجھ لیا۔ اس دقت مجھے "برہمچاریہ" (2) کی عظمت اور شوکت کی خبر ہوئی اور مجھ پر یہ حقیقت کھلی کہ بیوی شوہر کی لونڈی نہیں بلکہ اس کی رفیق اور مددگار اور اس کی رنج و راحت میں برابر کی شریک ہے، وہ بھی اپنے راہ عمل کے انتخاب میں اسی طرح آزاد ہے جیسے اس کا شوہر۔ جب کبھی مجھے وہ شک اور شبہ کے بھیا نک دن یاد آتے ہیں تو مجھے اپنی حماقت اور اپنے شہوانی ظلم سے انتہائی نفرت ہوتی ہے اور اپنے دوست کی اندھی تقلید پر سخت افسوس ہوتا ہے۔

حوالہ جات

- 1 - "اہمسا" کے لفظی معنی میں عصمت، عدم تشدد (م)
- 2 - "برہمچاریہ" کے لفظی معنی ہیں وہ کام جس سے انسان خدا تک پہنچتا ہے۔ اس کے اصطلاحی معنی ہیں "ضبط نفس" خصوصاً شہوانی خواہش کو قابو رکھنا (م)

چوری اور اس کا کفارہ

مجھے ابھی اپنی چند اور لغزشوں کا ذکر کرنا ہے جو گوشت کھانے کے زمانے میں اور اس سے پہلے مجھ سے سرزد ہوئیں۔ ان کا سلسلہ میری شادی کے وقت سے یا اس کے تھوڑے ہی دن بعد شروع ہوتا ہے۔

میرے ایک عزیز کو اور مجھے سگریٹ پینے کا چمکا لگ گیا۔ یہ بات نہ تھی کہ ہم اس عادت کو اچھا سمجھتے ہوں یا سگریٹ کی خوشبو پر ریجے ہوں۔ ہمیں تو صرف منہ سے دھواں نکالنے میں ایک خیالی لطف آتا تھا۔ میرے چچا اس کے عادی تھے اور جب ہم انہیں سگریٹ پیتے دیکھتے تھے تو ہمارا جی چاہتا تھا کہ ان کی طرح ہم بھی پیئیں۔ مگر ہمارے پاس دام تو تھے نہیں اس لئے ہم نے ابتداً اس طرح کی کہ ہم سگریٹ کے ٹکڑے جو ہمارے چچا پی کر پھینک دیتے تھے چرالالتے تھے۔

مگر یہ ٹکڑے بردت نہیں مل سکتے تھے اور ان سے دھواں بھی زیادہ نہیں نکلتا تھا۔ اس لئے ہم نے نوکروں کی جیب خرچ میں سے پیسے چرانا شروع کئے کہ ہندوستانی سگریٹ خریدیں۔ مگر مصیبت یہ تھی کہ انہیں رکھیں کہاں۔ کیونکہ ظاہر ہے کہ ہم بڑوں کے سامنے تو سگریٹ پی نہیں سکتے تھے چند ہفتہ تک تو ہم کسی نہ کسی طرح ان چرائے ہوئے پیسوں سے کام چلاتے رہے۔ اس عرصے میں ہم نے سنا کہ ایک درخت کی ڈال میں مسامت ہوتے ہیں اور اس کے ٹکڑے سگریٹ کی طرح پئے جاسکتے ہیں ہم انہیں لے آئے اور پینا شروع کر دیا۔

لیکن ان چیزوں سے ہماری تسلی نہ ہوتی تھی، آزادی نہ ہونا ہمیں کھلنے لگا۔ ہم سے یہ برداشت نہ ہوتا تھا کہ ہم بغیر بڑوں کی اجازت کے کچھ نہ کر سکیں۔ آخر زندگی سے متنفر ہو کر ہم نے خود کشی کی ٹھان

لی۔

مگر اب یہ سوال تھا کہ خود کشی کیسے کی جائے؟ زہر کھائیں تو زہر کہاں سے لائیں؟ ہم سے کسی نے کہا کہ دھتورے کے بیج زہر قاتل ہیں۔ ہم دوڑے ہوئے جنگل میں گئے اور یہ بیج لے آئے۔ ہم نے شام کے وقت کو اس کام کے لئے مبارک سمجھا۔ ہم ”کیدار جی مندر“ میں گئے وہاں کے چراغ میں گھی ڈالا ”درشن“ لئے اور کوئی سوئی جگہ ڈھونڈنے لگے۔ مگر ہماری ہمت نے جواب دے دیا۔ فرض کر دو کہ ہم فوراً نہ مرے؟ اور آخر مرنے سے فائدہ ہی کیا؟ آزادی نہیں ہے تو نہ کسی اسی حالت کو کیوں نہ برداشت کریں؟ پھر بھی ہم دو تین بیج نکل ہی گئے۔ ہم دونوں موت سے ڈر گئے اور ہم نے طے کیا کہ ”رام جی مندر“ جا کر حواس درست کریں اور خود کشی کا خیال چھوڑ دیں۔

مجھے معلوم ہو گیا کہ خود کشی کرنا اتنا سہل نہیں جتنا اس کا ارادہ کرنا اور اس دن سے جب کبھی میں سنتا ہوں کہ فلاں شخص خود کشی کی دھمکی دے رہا ہے تو مجھ پر بہت کم اثر ہوتا ہے۔

خود کشی کے خیال کا نتیجہ یہ ہوا کہ ہم دونوں نے سگریٹ کے ٹکڑے پینا اور سگریٹ کے لئے نوکروں کے پیسے چرانا چھوڑ دیا۔ جب سے میں بالغ ہوا ہوں مجھے کبھی تمباکو پینے کی خواہش نہیں ہوئی اور میں اس عادت کو تہذیب کے خلاف صفائی کے خلاف اور مضر سمجھتا ہوں۔ یہ بات میری سمجھ میں کبھی نہ آئی کہ ساری دنیا میں لوگ تمباکو پینے پر کیوں جان دیتے ہیں۔ مجھ سے تو ریل کے ڈبے میں جہاں تمباکو پینے والے بھرے ہوں نہیں بیٹھا جاتا۔ میرا دم گھٹنے لگتا ہے۔

لیکن اس سے کہیں بڑی چوری کا میں کچھ دن بعد مرتکب ہوا جب میں نے پیسے چرائے تو میری عمر بارہ تیرہ سال کی بلکہ اس سے بھی کم تھی۔ دوسری چوری کے وقت میں پندرہ برس کا تھا۔ اس بار میں نے اپنے گوشت کھانے والے بھائی کی بازو بند سے ایک سونے کا ٹکڑا چرایا۔ یہ بھائی پچیس روپے کے مقروض تھی۔ وہ بازو پر خالص سونے کا بازو بند باندھا کرتے تھے۔ اس میں سے ایک ٹکڑا کاٹ لینا کوئی مشکل بات نہ تھی۔

چنانچہ ایسا کیا گیا اور قرض ادا ہو گیا لیکن اتنا سنگین جرم تھا کہ مجھ سے کسی طرح برداشت نہیں ہو سکتا تھا۔ میں نے عہد کر لیا کہ پھر کبھی چوری نہ کروں گا میرا یہ بھی ارادہ ہوا کہ اپنے والد کے سامنے جرم کا اعتراف کر لوں مگر ہمت نہ پڑتی تھی۔ یہ بات نہ تھی کہ مجھے والد کے ہاتھ سے مار کھانے کا ڈر ہو۔ جہاں تک مجھے یاد ہے انہوں نے ہم لوگوں کو کبھی نہیں مارا۔ خوف تھا تو یہ کہ انہیں بہت دکھ ہو گا۔

آخر میں نے یہ فیصلہ کیا کہ میں اعتراف نامہ لکھ کر اپنے والد کو دوں اور ان سے معافی کی درخواست

کروں۔ میں نے سارا واقعہ ایک کاغذ پر لکھا اور خود لے جا کر انہیں دیا۔ اس رقعے میں میں نے نہ صرف اپنے جرم کا اعتراف کیا بلکہ یہ خواہش بھی کی کہ مجھے اس کی کافی سزا دی جائے اور آخر میں ان سے درخواست کی کہ میرے قصور کے بدلے وہ اپنا دل نہ کڑھائیں۔ میں نے اس بات کا عہد کیا کہ پھر کبھی چوری نہ کروں گا۔

میں نے اعتراف نامہ انہیں دیا تو میں کانپ رہا تھا۔ وہ ان دنوں ناسور میں مبتلا تھے اور صاحب فراش ہو گئے تھے۔ ایک کھرے تخت پر لیٹے رہتے تھے۔ میں نے رقعہ انہیں دے دیا اور چوکی کے سامنے بیٹھ گیا۔

انہوں نے اسے اول سے آخر تک پڑھا اور موتیوں کے قطرے ٹپ ٹپ ان کے رخساروں پر اور کاغذ پر گرنے لگے۔ دم بھر وہ آنکھیں بند کر کے سوچتے رہے اس کے بعد انہوں نے رقعہ پھاڑ کر پھینک دیا۔ وہ اسے پڑھنے کے لئے بیٹھ گئے تھے

اب وہ پھر لیٹ گئے۔ میں بھی رونے لگا۔ میں دیکھ رہا تھا کہ انہیں کیسا دکھ ہے۔ اگر میں نقاش ہوتا تو آج اتنے دن کے بعد بھی پورے مستر کی تصویر کھینچ دیتا۔ اس واقعے کی یاد میرے دل میں اب تک تازہ ہے۔

ان محبت کے موتیوں نے میرے دل کو پاک کر دیا اور میرے گناہ کو دھو ڈالا۔ اس محبت کو وہی خوب جانتا ہے جس نے اس کا لطف اٹھایا ہے جیسا اس بھجن میں ہے:

صرف وہ شخص

جس نے محبت کے تیر کھائے ہیں اس کی قوت کا انداز کر سکتا ہے
یہ میرے لئے "اہمسا" کا عملی سبق تھا اس وقت تو مجھے اس میں سوائے باپ کی محبت کے کچھ نظر نہ آتا تھا مگر آج میں جانتا ہوں کہ یہ خالص "اہمسا" تھا جب یہ "اہمسا" ہمہ گیر ہو جاتا ہے تو جس چیز کو چھوٹا ہے اس کی کایا پلٹ دیتا ہے۔ اس کی قوت کی کوئی انتہا نہیں۔

اس طرح کا شاندار عفو میرے والد کی طبیعت سے بعید تھا۔ میرا خیال تھا کہ وہ خفا ہو جائیں گے، سرپیٹ لیں گے، مجھے سخت سست کہیں گے، لیکن ان کا سکون دیکھ کر حیرت ہوتی تھی اور یقیناً اس کی وجہ یہی تھی کہ میں نے صاف صاف اپنے گناہ کا اعتراف کر لیا۔ گناہ کا پورا اعتراف اور آئندہ اس سے باز رہنے کا عہد ایسے شخص کے سامنے جو انہیں قبول کرنے کا اہل ہے، توبہ کی خالص ترین صورت ہے۔ مجھے معلوم ہے کہ میرے اس اعتراف سے والد کو میری طرف سے پورا اطمینان ہو گیا اور انہیں مجھ سے جو محبت تھی وہ بے انتہا بڑھ گئی۔

میرے والد کی وفات اور میری دوسری فضیحت

جس زمانے کا میں ذکر کر رہا ہوں مجھے سو لہواں برس شروع ہو گیا تھا۔ میں کہہ چکا ہوں کہ میرے والد ناسور میں مبتلا اور صاحب فراش تھے۔ زیادہ تر میری والدہ، گھر کا ایک پرانا نوکر اور میں ان کی خدمت کرتے تھے۔ میرے سپرد تیمارداری کا کام تھا جو زخم کی مرہم پٹی کرنے، دوا پلانے اور جب ضرورت ہو، دوا تیار کرنے پر مشتمل تھا۔ روز رات کو میں اپنے والد کے پیر دبا کر تا تھا اور اس وقت تک نہ اٹھتا تھا جب تک وہ خود نہ کہیں یا انہیں نیند نہ آجائے۔ میں یہ خدمت بڑے شوق سے کرتا تھا۔ جہاں تک مجھے یاد ہے میں نے اس میں کبھی کوتاہی نہیں کی۔ روز مرہ کے فرائض سے جو دولت بچتا تھا وہ میں کچھ تو اسکول میں اور کچھ اپنے والد کی خدمت میں صرف کرتا تھا۔ شام کو ٹہلنے میں صرف اسی وقت جایا کرتا تھا جب وہ اجازت دیں یا جب ان کی طبیعت اچھی ہو۔

اسی زمانے میں میری بیوی کے بچے ہونے والا تھا۔ اب مجھے محسوس ہوتا ہے کہ یہ بات میرے لئے دو طرح سے شرمناک تھی۔ ایک تو یہ کہ میں نے طالب علمی کے زمانے میں منصب نفس سے کام نہیں لیا۔ دوسرے یہ کہ شہوانی خواہش تحصیل علم کے مشعلے پر جسے میں اپنا فرض سمجھتا تھا اور اس سے بڑے فرض یعنی والدین کی خدمت پر جسے میں نے شردن کی تقلید میں بچپن سے اپنا نصب العین بنایا تھا، غالب آگئی۔ روز رات کو میرے ہاتھ تو والد کے پیر دبانے میں مشغول رہتے تھے مگر میرا دل سونے کے کمرے میں لگا رہتا تھا اور وہ بھی ایسے وقت میں جب مذہب طب اور عقل سب کی رو سے جماع کی ممانعت تھی مجھے اپنی خدمت سے چھٹی ملنے کی بڑی خوشی ہوتی تھی اور اپنے والد کو سلام کر کے میں سیدھا سونے کے کمرے میں پہنچتا تھا۔

ادھر میرے والد کی طبیعت روز بروز خراب ہوتی جاتی تھی۔ دید اپنے سارے مرہم، یونانی طبیب

اپنے ضماد، مقامی نیم حکیم اپنی عطائی دوائیں آزما چکے تھے۔ ایک انگریز سرجن بھی اپنی قابلیت ختم کر چکا تھا۔ آخری تدبیر اس نے یہ بتائی تھی کہ آپریشن کیا جائے لیکن ہمارے غاندانی طبیب نے مخالفت کی۔ انہوں نے کہا کہ اس ضمنی میں آپریشن ٹھیک نہیں۔ یہ بڑے قابل اور مشہور طبیب تھے اس لئے انہیں کی رائے مانی گئی۔ آپریشن کا خیال ترک کر دیا گیا اور اس کے لئے جو دوائیں خریدی جا چکی تھیں وہ بیکار گئیں۔ میرا خیال ہے کہ اگر طبیب آپریشن کی اجازت دے دیتے تو زخم آسانی سے اچھا ہو جاتا۔ آپریشن کے لئے سرجن بھی وہ تجویز ہوا تھا جس کی ان دنوں بمبئی میں بڑی شہرت تھی، مگر خدا کی مرضی کچھ اور تھی جب موت ہی آجائے تو صحیح علاج کیسے سوچتا؟ میرے والد بمبئی سے لوٹ آئے تھے ان کے ساتھ سارا آپریشن کا سامان تھا جو اب کسی مصرف کا نہ تھا۔ وہ اب زندگی سے مایوس ہو گئے تھے۔ کمزوری روز بروز بڑھتی جاتی تھی۔ یہاں تک کہ آخر ان سے یہ کہنا پڑا کہ بستر ہی پر ضروری حاجتوں سے فارغ ہو لیا کریں۔ لیکن انہوں نے آخر وقت تک انکار کیا اور بستر سے اٹھ کر جانے کی تکلیف برداشت کرتے رہے۔ دیشنودہرم میں ظاہری صفائی کے قاعدے اتنے سخت ہیں۔

اس میں شک نہیں کہ یہ صفائی بہت ضروری ہے لیکن مغربی طب نے ہمیں یہ سکھایا ہے کہ انتہائی صفائی کا خیال رکھتے ہوئے ضروری حاجتیں بستر ہی پر پوری ہو سکتی ہیں۔ مریض کو مطلق تکلیف نہیں ہوتی اور بستر پر خفیف سادھہ بھی نہیں آنے پاتا۔ میرے نزدیک یہ صفائی دیشنودہرم کے بالکل مطابق ہے لیکن اس زمانے میں اپنے والد کا بستر سے اٹھنے پر یہ اصرار دیکھ کر دنگ رہ گیا اور میرا دل ان کی تعریف سے معمور ہو گیا۔

آخر وہ خوفناک رات آگئی۔ میرے چچا اس دن راجکوٹ ہی میں تھے مجھے خفیف سا خیال ہے کہ وہ یہ بری خبر سن کر کہ میرے والد کی طبیعت گرتی جاتی ہے۔ راجکوٹ آئے تھے، دونوں بھائیوں میں بڑی محبت تھی۔ میرے چچا دن بھر والد کی پیٹی کے پاس بیٹھے رہتے تھے اور بڑے اصرار سے ہم سب کو سونے کے لئے رخصت کر کے خود وہیں سوتے تھے۔ کسی کو شان و گمان بھی نہ تھا کہ آج کی رات قیامت کی رات ہے البتہ خطرہ تو روز ہی رہتا تھا۔

کوئی ساڑھے دس یا گیارہ کا وقت تھا۔ میں پیر دبارا تھا۔ میرے چچا نے کہا اب تم جاؤ میں دباتا ہوں۔ میں خوش ہوا سیدھا سونے کے کمرے میں پہنچا۔ میری بیوی بیچاری غافل سو رہی تھی مگر بھلا جب میں پہنچ گیا تو وہ کب سونے پاتی تھیں؟ میں نے انہیں جگا دیا۔ ابھی پانچ چھ منٹ ہوئے ہوں گے کہ نوکر نے دروازہ پر دستک دی میں ڈر سے چونک پڑا۔ نوکر نے کہا ”اٹھو بابا کی طبیعت بہت خراب

ہے۔ ”میں جانتا تھا کہ ان کی طبیعت بہت خراب ہے۔ اس دقت ”بہت خراب“ کے جو معنی تھے میں سمجھ گیا میں اچھل کر بستر سے اٹھا اور دروازے کی طرف چھپنا۔

”کیا ہو گیا؟ خدا کے لئے بتادو۔“

”باگزر گئے۔“

آخر وہی ہوا جس کا ڈر تھا! اب میں تھا اور کف افسوس ملنا! میرا دل شرم اور درد سے معمور تھا میں ددڑ کر والد کے کمرے میں گیا۔ مجھے یہ خیال آ رہا تھا کہ اگر شہوانی خواہش مجھے اندھانہ کر دیتی تو میں اس روحانی کرب سے بچ جاتا جو آخری لمحوں میں اپنے والد کے پاس حاضر نہ رہنے سے مجھے ہوا میں ان کے پیر دباتا ہوتا اور میری گود میں ان کا دم نکلتا۔ مگر اب یہ عزت میرے چچا کو نصیب ہوئی۔ انہیں اپنے بڑے بھائی سے ایسی محبت تھی کہ آخری دقت ان کی خدمت کرنے کے وہی مستحق قرار پائے۔ میرے والد کو ہونے والے واقعے کا کچھ اندازہ ہو گیا تھا۔ انہوں نے اشارے سے کاغذ اور قلم دوات مانگ کر یہ الفاظ لکھے تھے ”دفن کفن کی تیاری کر دو“ پھر انہوں نے اپنے بازو سے بازو بند اور گلے سے ٹلسی کے دانوں کی طلائی مالا کھول کر پھینک دی اس کے ایک لمحے کے بعد ان کا دم نکل گیا۔

وہ فضیحت جس کا میں نے اس باب کی ابتدا میں ذکر کیا ہے یہی شرمناک واقعہ ہے کہ شہوانی خواہش نے اس نازک دقت بھی مجھے نہ چھوڑا جب میرے والد جاں بلب تھے اور مجھے ان کی خدمت میں رہنا چاہیے تھا یہ وہ دھبہ ہے جسے میں نہ کبھی مناسک نہ بھول سکا اور میرا ہمیشہ یہ خیال رہا کہ اگرچہ مجھے اپنے والدین سے بے حد محبت تھی اور میں اس کی خاطر سب کچھ قربان کرنے کو تیار تھا لیکن جب وہ خدا کی ترازو میں تولی گئی تو بہت کم نکلی، کیونکہ اس کے ساتھ ہی میرے دل پر شہوانی خواہش کا قبضہ تھا۔ اس لئے میں ہمیشہ یہ سمجھتا رہا کہ میں اس زمانے میں وفادار مگر شہوت پرست شوہر تھا۔ مجھے شہوانی خواہش کے سنجے سے چھوٹنے میں بہت دن لگے اور اسے مغلوب کرنے سے پہلے بڑے بڑے امتحانوں سے گزرنا پڑا۔

قبل اس کے کہ میں اس باب کو جس میں دوہری فضیحت کا ذکر ہے ختم کروں یہ بھی بتا دوں کہ میری بیوی نے جو چوہے کا سا بچہ جنا وہ تین چار دن سے زیادہ نہیں جیا۔ اس کے سوا اور کیا توقع ہو سکتی تھی؟ جن لوگوں کی شادی ہو گئی ہے وہ میری مثال سے عبرت حاصل کریں۔

مذہب کی جھلک

چھ سات برس کی عمر سے سولہ (1) برس کے سن تک میں اسکول میں رہا۔ اس عرصہ میں مجھے دنیا بھر کی چیزیں سکھائی گئیں سوائے مذہب کے۔ یوں کہنا چاہیے کہ مجھے ان کی صحبت سے، بغیر ان کی کوشش کے، جو کچھ حاصل ہو سکتا تھا وہ میں نے حاصل نہیں کیا۔ البتہ اپنے ماحول (2) سے میں (مذہب کے متعلق) ادھر ادھر کی باتیں سیکھتا رہا۔ میری مراد یہاں مذہب کے لفظ سے اس کا وسیع ترین مفہوم معرفت نفس ہے۔

میں دیشنوماں باپ کے یہاں پیدا ہوا اس لئے مجھے اکثر ”تویلی“ جانا پڑتا تھا لیکن یہ مندر میرے دل کو نہیں لگتا تھا۔ اس کی شان دشوکت اور چمک دمک مجھے پسند نہ تھی۔ میں نے یہ افواہیں بھی سنیں کہ وہاں بدکاری ہوتی ہے اس لئے مجھے اس سے کوئی دلچسپی نہ رہی۔ اس وقت سے میں ”تویلی“ سے کوئی روحانی فیض حاصل نہیں کر سکتا تھا۔

لیکن جو چیز مجھے وہاں نہیں ملی وہ اپنی کھلائی سے حاصل ہوئی۔ یہ ہمارے خاندان کی بڑی پرانی خادمہ تھی۔ جس کی محبت مجھے آج تک یاد ہے۔ میں پہلے کہہ چکا ہوں کہ میں بھوت پریت سے ڈرتا تھا۔ رمیھا (یہ کھلائی کا نام تھا) نے اس خوف کو دور کرنے کی ایک سہل سی تدبیر بتائی یعنی ”رام نام“ (3) کا چننا، مجھے اس کی بتائی تدبیر پر اتنا عقیدہ نہ تھا جتنا خود اس پر۔ اس لئے اس کمسنی میں میں نے ”رام نام“ چننا شروع کیا کہ بھوت پریت کے خوف سے نجات ملے۔ ظاہر ہے کہ یہ خوف تھوڑے دن کے بعد جاتا رہا۔ لیکن جو بچپن میں بویا گیا تھا وہ ضائع نہیں گیا۔ میرا خیال ہے کہ یہ اسی نیک عورت رمیھا کے بولے ہوئے بیج کا اثر ہے کہ اب ”رام نام“ میرے لئے حکمی تدبیر کا اثر رکھتا ہے۔

اسی زمانے میں میرے ایک رشتہ کے بھائی نے جو راماین پر بڑا گہرا عقیدہ رکھتے تھے میرے اور میرے بھائی کے لئے رام رکشا سکھنے کا انتظام کیا۔ ہم نے اسے زبانی یاد کر لیا اور روز صبح اٹھانے کے بعد اسے پڑھنے کا ورد کر لیا جب تک ہم پور بندر میں رہے یہ سلسلہ جاری رہا۔ راجکوٹ پہنچنے کے بعد ہم اسے بھول بھال گئے مجھے اس پر کچھ عقیدہ بھی نہ تھا میں تو اسے ایک حد تک اس لئے پڑھتا تھا کہ مجھے رام رکشا صحیح تلفظ سے ادا کرنے پر گھمنڈ تھا۔

البتہ جس چیز نے میرے دل پر گہرا اثر کیا وہ راماین کی تلاوت تھی جو والد صاحب کے سامنے ہوا کرتی تھی۔ اپنی بیماری کے کچھ دن میرے والد نے پور بندر میں بسر کئے۔ وہاں وہ روز شام کو راماین سنتے تھے۔ پڑھتے بلیشور کے لدھ مہاراج تھے جو رام چندر جی سے بڑی عقیدت رکھتے تھے۔ لوگ کہتے ہیں کہ انہوں نے اپنے کوڑھ کا علاج کسی دوا سے نہیں کیا بلکہ ”بلوا“ کی پتیاں لگانے سے بلیشور کے مندر میں مہادیو کی مورت پر چڑھا کر پھینک دی جاتی تھیں اور ”رام نام“ چینے سے یہ ان کے عقیدے نے ان کے مرض کو اچھا کر دیا۔ خدا جانے یہ صحیح ہے یا غلط بہر حال لوگ اس قصے کو سچ سمجھتے تھے اور یہ تو واقعہ ہے کہ جس زمانے میں لدھ مہاراج راماین پڑھتے تھے ان کا کوڑھ بالکل جا چکا تھا۔ ان کی آواز سریلی تھی وہ دوہے اور چوپائی گاتے تھے اور ان کا مطلب اس ذوق و شوق سے بیان کرتے تھے کہ انہیں اپنی کچھ خبر نہ رہتی تھی اور سننے والے بھی بے خود ہو جاتے تھے۔ میری عمر اس زمانے میں تیرہ برس کی ہو گی مگر مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ انہیں راماین پڑھتے سن کر میں وجد کیا کرتا تھا اسی سے اس گہری عقیدت کی بنیاد پڑی جو مجھے راماین سے ہے۔ آج میں تلمسی داس کی راماین کو دعا اور وٹیفے کی کتابوں میں سب سے بڑھ کر سمجھتا ہوں۔

اس کے چند مہینے بعد ہم لوگ راجکوٹ آئے۔ یہاں راماین نہیں پڑھی جاتی تھی۔ البتہ ہراکادشی (5) کو بھگوت گیتا کی تلاوت ہوتی تھی۔ میں شریک ہوتا تھا مگر پڑھنے والا ایسا نہ تھا جو سننے والوں میں جوش پیدا کر سکے۔ اب مجھے معلوم ہو گیا ہے کہ بھگوت گیتا وہ کتاب ہے جو دلوں میں مذہبی ذوق و شوق پیدا کرتی ہے، میں نے اسے گجراتی میں بڑے شوق سے پڑھا ہے۔ لیکن جب میں نے اپنے اکیس دن کے روزہ کے دوران میں اصل سنسکرت کتاب کے کچھ حصے پنڈت مدن موہن مالوی کی زبان سے سننے تو دل میں کہا کاش میں اسے بچپن میں ایسے بھگت کی زبان سے سنتا تاکہ مجھے کسنی ہی میں اس کا مذاق پیدا ہو جاتا۔ اس عمر میں انسان جو سنتا یاد لکھتا ہے اس کے نقش دل میں بہت گہرے ہوتے ہیں اور میں ہمیشہ افسوس کرتا رہتا کہ بد قسمتی سے مجھے اس زمانے میں اس قسم کی اور کتابیں سننے کا موقع نہیں ملا۔

البتہ راجکوٹ میں یہ فائدہ ضرور ہوا کہ مجھے ابتدا ہی سے ہندو مذہب کی تمام شاخوں اور دوسرے مذہبوں کے ساتھ رواداری برتتے کی تربیت ملی۔ کیونکہ میرے والدین ”حویلی“ میں بھی جاتے تھے اور شیوا اور رام کے مندر میں بھی اور ہم سب لڑکوں کو ساتھ لے جاتے تھے۔ میرے والد کے پاس جین سادھو بھی آیا کرتے تھے وہ میرے والد سے دینی اور دنیوی موضوعوں پر گفتگو کیا کرتے تھے۔

اس کے علاوہ ان کے مسلمان اور پارسی دوست بھی تھے جو ان سے اپنے اپنے مذہب کی باتیں کیا کرتے تھے اور وہ ہمیشہ ادب سے اور اکثر دلچسپی سے سنا کرتے تھے، میں ان کا تیمار دار تھا اس لئے مجھے اکثر یہ گفتگوئیں سننے کا موقع ملتا تھا۔ ان سب باتوں نے مل کر مجھے سب مذہبوں سے رواداری کرنا سکھایا۔

صرف عیسائیت اس زمانے میں اس سے مستثنیٰ تھی میں اسے ایک لحاظ سے ناپسند کرتا تھا اور اس کی معقول وجہ تھی۔ اس زمانے میں عیسائی مشنری ہائی اسکول کے قریب ایک نکلڑ پر کھڑے ہو کر وعظ کہتے تھے اور بندوؤں کو اور ان کے دیوتاؤں کو دل کھول کر گالیاں دیتے تھے۔ میں یہ سن کر بہت بد ہوا۔ میں نے ان کی تقریر صرف ایک بار کھڑے ہو کر سنی۔ مگر یہ بھی اس بات کے لئے کافی تھا کہ میں نے عہد کر لیا کہ آئندہ کبھی یہ تجربہ نہ کروں گا۔ اسی زمانے میں میں نے ایک مشہور بندو کے عیسائی جانے کی خبر سنی۔ سارے شہر میں چرچا تھا کہ سبتیسہ کے دمت اسے شراب پلائی گئی اور گائے کا گوشت کھلایا گیا۔ اس کا لباس تبدیل کر دیا گیا اور اب وہ ہمیشہ یورپی کپڑے پہنتا ہے اور ہیٹ لگاتا ہے۔ ان باتوں سے میرے دل میں غلش پیدا ہو گئی۔ میں نے سوچا کہ جو مذہب گائے کا گوشت کھانے پر، شراب پینے پر اور لباس بدل دینے پر مجبور کرتا ہے وہ مذہب کھلانے کا مستحق نہیں، میں نے یہ بھی سنا کہ ایک نو عیسائی نے اپنے باپ دادا کے مذہب ان کے رسم و رواج اور ان کے ملک کو گالیاں دینا شروع کر دیا ہے۔ ان سب چیزوں نے میرا دل عیسائیت سے پھیر دیا۔

لیکن میرے دوسرے مذہبوں سے رواداری کرنے کے یہ معنی نہیں تھے کہ میں خدا پر جیتا جاگتا عقیدہ رکھتا تھا۔ اس زمانے میں میری نظر سے منوسمرتی (6) گزری جو میرے والد کے کتب خانے میں تھی اس میں تخلیق اور اسی قسم کے دوسرے مسائل کا ذکر پڑھ کر میں زیادہ متاثر نہیں ہوا بلکہ اس کے برعکس میرا رجحان دہریت کی طرف ہو گیا۔

ان دنوں میں اپنے ایک رشتے کے بھائی (جو اب بھی زندہ ہیں) کی قابلیت کا بہت قائل تھا۔ میں نے ان سے اپنے شیے بیان کئے۔ مگر وہ انہیں دور نہ کر سکے انہوں نے مجھے یہ جواب دے کر ٹال دیا

”جب تم بڑے ہو جاؤ گے تو تم خود ان شبہوں کو رفع کر سکو گے۔ اس عمر میں تمہیں اس قسم کے سوال نہ کرنا چاہئیں“ میں خاموش ہو گیا مگر میری تشفی نہیں ہوئی ”منوسمرتی“ کے جواب غذا وغیرہ کے متعلق ہیں وہ مجھے روزمرہ کے عمل کے خلاف معلوم ہوتے تھے۔ اس بارے میں میں نے اپنے شیپے بیان کئے تو وہی جواب ملا۔ میں نے اپنے جی میں کہا ”جب میرے ذہن میں پختگی آجائے گی اور میرا مطالعہ وسیع ہو جائے گا تو یہ باتیں میری سمجھ میں آجائیں گی۔“

بہر حال ”منوسمرتی“ سے مجھے اس زمانے میں ”اہمسا“ کا سبق نہیں ملا۔ میں اپنے گوشت کھانے کا قصہ بیان کر چکا ہوں ”منوسمرتی“ سے بظاہر اس فعل کی تائید ہوتی تھی۔ میرا یہ بھی خیال تھا کہ سانپ، کھنسل وغیرہ کو مارنا بالکل جائز ہے۔ مجھے یاد ہے کہ میں نے اس زمانے میں بارہا کھنسل اور دوسرے کیزے فرض سمجھ کر مارے ہیں۔

لیکن ایک عقیدے نے میرے دل میں گہری جڑ پکڑ لی کہ اخلاق ساری زندگی کی بنیاد سے اور حق اخلاق کا لب لباب ہے۔ حق ساری کوششوں کا مرجع بن گیا یہ میری نظر میں روز بروز بلند تر اور برتر ہوتا گیا اور اس کی جو تعریف میرے ذہن میں تھی وہ بھی وسیع تر ہو گئی۔

اسی طرح چند گہرائی اشعار نے میرے دل و دماغ کو مسخر کر لیا ان میں بدی کے بدلے نیکی کرنے کی تلقین تھی جو میرے لئے شمع ہدایت بن گئی۔ اس کا میرے دل میں اتنا جوش تھا کہ میں نے اس کے مطابق عملی تجربے شروع کر دیئے۔ وہ اشعار جو میری نظر میں لاجواب ہیں یہ ہیں:

جو کوئی تجھ کو پانی پلائے اس کو اچھا کھانا کھلا
جو کوئی تجھ سے ہنس کر بولے اس کے آگے سر کو جھکا
تانے کا جو پیہ دے تو اس کو کیسہ زر دے دے
جان بچائے جو تیری تو اس کی خاطر سر دے دے
ہے یہ قول حکیموں کا اور اس پر عمل بھی کرتے ہیں
ایک کے بدلے دس دیتے ہیں، نیکی کا دم بھرتے ہیں
پر جو سچے داتا ہیں ہے ان کا سب سے ایک سلوک
پاپ کے بدلے پن کرنا اور بد سے کرنا نیک سلوک

حوالہ جات

- 1 - یہ صحیح نہیں معلوم ہوتا کیونکہ گیارہویں باب میں لکھا ہے کہ انٹرنس ۱۸۸۷ء میں پاس کیا اور اس وقت حساب سے اٹھارہ برس کی عمر ہوتی ہے۔
- 2 - Surroundings
- 3 - راجندر جی کے مختلف ناموں کا وظیفہ (ع)
- 4 - ایک دما (ع)
- 5 - چاند کے مہینے کی گیارہویں تاریخ ہندی تقویم میں مہینے کے ددھے ہوتے ہیں۔ (روشن اور تاریک) دونوں میں تاریخیں ایک سے چودہ یا پندرہ تک گنی جاتی ہیں (ع)
- 6 - منو کے قانون۔ منو ایک ہندو وضع قانون تھے اور ان کے قانون مذہبی اہمیت رکھتے ہیں (م)

انگلستان کی تیاریاں

میں نے انٹریس کا امتحان 1887ء میں پاس کیا۔ اس زمانے میں یہ امتحان دو جگہ ہوا کرتا تھا احمد آباد میں اور بمبئی میں۔ ملک کے عام افلاس کی وجہ سے کانٹھیا وار کے طلبہ احمد آباد جایا کرتے تھے کیونکہ یہ قریب بھی پڑتا تھا اور یہاں خرچ بھی کم ہوتا تھا۔ میرا خاندان بھی مجلس تھا اس لئے میں بھی یہی صورت اختیار کرنے پر مجبور تھا۔ یہ پہلا سفر تھا جو میں نے راجکوٹ سے احمد آباد تک کیا اور وہ بھی بغیر کسی ساتھی کے۔

میرے بزرگ چاہتے تھے کہ میں انٹریس پاس کرنے کے بعد کلج میں پڑھوں کلج بہاول نگر میں تھا اور بمبئی میں بھی مگر چونکہ بہاول نگر میں خرچ کم تھا اس لئے میں نے یہ طے کیا کہ وہاں جا کر اس کلج میں داخل ہو جاؤں۔ جانے کو تو میں چلا گیا لیکن وہاں پہنچ کر میرے حواس جاتے رہے۔ ہر چیز میرے لئے مشکل تھی۔ پروفیسروں کے لیکچروں میں دلچسپی ہونا تو درکنار میں انہیں سمجھ بھی نہ سکتا تھا۔ اس میں ان کا کوئی قصور نہ تھا۔ اس کلج کے پروفیسر اعلیٰ درجے کے سمجھے جاتے تھے یہ میری ہی خامی تھی کہ میں ان کے درس سے استفادہ نہ کر سکا۔ پہلی ٹرم ختم ہوتے ہی میں گھر چلا آیا۔

ماوچی دیوا ایک عالم اور دانشمند برہمن اور ہمارے خاندان کے قدیم دوست اور مشیر تھے۔ ان کے تعلقات ہم لوگوں سے والد کے انتقال کے بعد بھی باقی رہے۔ اتفاق سے وہ میری تعطیل کے زمانے میں ایک دن تشریف لائے اور والدہ اور بڑے بھائی سے باتیں کرنے لگے۔ گفتگو کے دوران میں انہوں نے میری تعلیم کا حال پوچھا۔ جب انہیں معلوم ہوا کہ میں سالہا اس کلج میں پڑھتا ہوں تو انہوں نے کہا ”اب زمانہ بدل گیا ہے اور تم میں سے کوئی بغیر معقول تعلیم حاصل کئے اپنے والد کی گدی پانے کی توقع

نہیں کر سکتا۔ اس لڑکے کی تعلیم ابھی جاری ہے اس لئے اسی کی ذات سے تمہیں یہ امید ہو سکتی ہے کہ یہ گدی کو قائم رکھے گا۔ بی اے پاس کرنے میں اسے چار پانچ سال لگیں گے اور سند ملنے کے بعد زیادہ سے زیادہ ساٹھ کی نوکری ملے گی دیوان کا عہدہ ملنے سے رہا اگر میرے لڑکے کی طرح اس نے قانون پڑھا تو اور بھی زیادہ دن لگیں گے اور اتنے عرصے میں خدا جانے کتنے آدمی وکالت پاس کر کے اس عہدے کے امیدوار ہو جائیں گے۔ میری رائے میں اس سے کہیں بہتر ہے کہ تم اسے انگلستان بھیج دو۔ میرا بیٹا کیول آرام کہتا ہے کہ بیرسٹری کا امتحان بہت سہل ہے۔ تین سال میں یہ لوٹ آئے گا خرچ بھی چار پانچ ہزار سے زیادہ نہ ہو گا۔ ذرا اس بیرسٹر کو دیکھو جو ابھی انگلستان سے آیا ہے۔ کیسی شان سے رہتا ہے! وہ جس دن چاہے دیوان ہو جائے۔ میں تو تمہیں بہت اصرار کے ساتھ مشورہ دیتا ہوں کہ موہن داس کو اسی سال انگلستان بھیج دو۔ کیول آرام کے بہت سے دوست وہاں ہیں۔ وہ ان کے نام تعارف کے خطوط دے دے گا اور موہن داس وہاں بڑے آرام سے رہے گا۔

جوشی جی (اسی لقب سے ہم لوگ ماڈرن دیو کو پکارتے تھے) پورے اطمینان کے ساتھ میری طرف متوجہ ہوئے اور انہوں نے پوچھا "کیا تم انگلستان جانے کو یہاں پڑھنے پر ترجیح نہیں دیتے؟" میرے لئے اس سے بڑھ کر اور کیا چیز ہو سکتی تھی میں اپنی مشکل پڑھائی سے یوں ہی جی چراتا تھا جھٹ سے اس تجویز پر راضی ہو گیا۔ میں نے کہا "مجھے کل کے بھجے آج بھیج دیجئے مگر اتنی جلدی جلدی قانون کے امتحان پاس کرنا مشکل ہے۔ کیا یہ نہیں ہو سکتا کہ میں ڈاکٹری پڑھنے جاؤں۔"

میرے بھائی نے میری بات کاٹ کر کہا "والد کو یہ پیشہ بالکل پسند نہیں تھا تمہارا ہی خیال کر کے انہوں نے کہا تھا کہ ہم ویشنو لوگوں کو مردوں کی چیر پھاڑ کے پاس نہ پھٹکنا چاہیے۔ وہ یہی چاہتے تھے کہ تم قانون پڑھو۔"

جوشی جی بولے "میں گاندھی جی کی طرح ڈاکٹری پیشہ کا مخالف نہیں ہوں ہمارے شاستروں نے اس کی ممانعت نہیں کی لیکن ڈاکٹری پڑھ کر تم دیوان نہیں بن سکتے اور میں چاہتا ہوں کہ تمہیں دیوان کا عہدہ بلکہ اس سے بڑھ کر رتبہ ملے۔ یہی ایک صورت ہے کہ تم اتنے بڑے خاندان کی پرورش کر سکو۔ زمانہ روز بروز بدل رہا ہے اور بڑے سخت دن آرہے ہیں اس لئے دانشمندی کا تقاضا یہی ہے کہ تم بیرسٹر بنو۔" میری ماں سے مخاطب ہو کر انہوں نے کہا "جو بات میں نے کہی ہے مہربانی سے اس پر غور کیجئے اب کی جب میں یہاں آؤں گا تو امید ہے کہ انگلستان کی تیاریاں ہو رہی ہوں گی۔ اگر میرے لائق کوئی کام ہو تو مجھے ضرور بتائیے گا۔"

جوشی جی چلے گئے اور میں شیخ چلی کے سے منصوبے باندھنے لگا۔

میرے بڑے بھائی بہت متفکر تھے۔ مجھے انگلستان بھیجنے کے مصارف کہاں سے آئیں؟ یہ تردد بھی تھا کہ میرے جیسے کمسن لڑکے کو تنہا پردیس میں بھیجنا مناسب ہے یا نہیں ادھر میری والدہ عجب شش و پنج میں تھیں۔ انہیں میری جدائی بہت ناگوار تھی۔ انہوں نے اس معاملے کو ٹالنے کی کوشش کی۔ کہنے لگیں۔ ”اب تمہارے چچا گھر بھر میں سب سے بڑے ہیں پہلے ان سے صلاح لینا چاہیے۔ اگر وہ راضی ہو گئے تو دیکھا جائے گا۔“

میرے بھائی کو ایک اور خیال آیا۔ انہوں نے مجھ سے کہا ”ریاست پور بندر پر ہمارا حق ہے۔ لیلیٰ صاحب آج کل ریاست کے منتظم ہیں وہ ہمارے خاندان کی بڑی عزت کرتے ہیں اور چچا سے بہت خوش ہیں ممکن ہے وہ ریاست میں سفارش کر دیں کہ تمہیں انگلستان میں تعلیم دلانے کے لئے کچھ مدد دی جائے۔“

مجھے یہ بات پسند آئی اور میں پور بندر جانے کے لئے تیار ہو گیا۔ ان دنوں ریل نہ تھی بیل گاڑی میں پانچ دن کا راستہ تھا۔ میں کہہ چکا ہوں کہ میں بزدل تھا لیکن اس وقت انگلستان جانے کے شوق میں جس سے میرا دل مغمور تھا یہ بزدلی کافور ہو گئی۔ میں نے دھوراجی تک جانے کے لئے بیل گاڑی کرایہ پر لی اور دھوراجی سے ادنٹ پر سفر کیا کہ ایک دن پہلے پور بندر پہنچ جاؤں مجھے ادنٹ پر بیٹھنے کا یہ پہلا اتفاق تھا۔

غرض کسی نہ کسی طرح میں پہنچ گیا چچا کو آداب کر کے میں نے سارا ماجرا سنایا۔ انہوں نے کچھ دیر سوچ کر کہا ”مجھے یقین نہیں کہ آدمی انگلستان میں رہ کر اپنے دہرم پر قائم رہ سکتا ہے۔ جو کچھ میں نے سنا ہے اس سے تو بہت شبہ ہوتا ہے جب میں ان بڑے بڑے بیرسٹروں کو دیکھتا ہوں تو مجھے ان کی اور یورپینوں کی زندگی میں کوئی فرق نہیں معلوم ہوتا انہیں کسی چیز کے کھانے پینے میں باک نہیں، سگار ان کے منہ سے کبھی جدا نہیں ہوتا۔ لباس ویسا ہی بے شرمی کا ہے جیسا کہ انگریزوں کا۔ یہ سب باتیں ہمارے خاندان کے رواج سے میل نہیں کھاتیں۔ میں چند روز میں جاترا کے لئے جا رہا ہوں اور میری زندگی تھوڑی رہ گئی ہے بھلا ایسے وقت میں کہ موت سر پر ہے میں تمہیں کیونکر سمندر پار انگلستان جانے کی اجازت دوں؟ مگر میں تمہیں روکنا بھی نہیں چاہتا اصل میں اجازت جو کچھ ہے تمہاری ماں کی ہے۔ اگر وہ کہہ دیں تو شوق سے سدھا رو اللہ نگہبان۔ ان سے کہہ دینا کہ میں دخل نہیں دوں گا اگر تم گئے تو میری دعائیں تمہارے ساتھ جائیں گی۔“

میں نے کہا کہ ”میں جانتا تھا کہ آپ اس سے زیادہ کچھ نہ کریں گے اب میں والدہ کو راضی کرنے کی کوشش کروں گا۔ مگر کیا آپ سلی صاحب سے میری سفارش بھی نہ کریں گے؟“

انہوں نے کہا ”میں یہ کیسے کر سکتا ہوں مگر وہ بڑے اچھے آدمی ہیں۔ تم انہیں اپنے خاندانی تعلقات بتاؤ اور ملنے کی درخواست کرو۔ وہ یقیناً تم سے ملیں گے بلکہ ممکن ہے کہ مدد بھی کریں۔“

میں نہیں کہہ سکتا کہ میرے چچا نے سفارش کا خط کیوں نہیں دیا۔ کچھ خفیف سا خیال ہے کہ شاید وہ میرے انگلستان جانے میں جوان کے خیال میں دہرم کے خلاف تھا براہ راست مدد دیتے ہوئے رکتے تھے۔

میں نے سلی صاحب کو لکھا اور انہوں نے مجھے اپنے گھر بلایا۔ وہ جب مجھ سے ملے تو سیر ڈھیوں پر چڑھ رہے تھے۔ چلتے چلتے انہوں نے مجھے دو نوک جواب دے دیا ”پہلے بی اے پاس کرو پھر میرے پاس آنا۔ اس وقت تمہیں کوئی مدد نہیں دی جاسکتی۔“ میں نے ان سے ملنے کی بڑی تیاریاں کی تھیں۔ بہت سوچ سمجھ کر چند جملے یاد کئے تھے اور سب ان کے سامنے آیا تو زمین دوز ہو کر دونوں ہاتھوں سے سلام کیا۔ مگر یہ سب بیکار گیا۔

مجھے اپنی بیوی کے زیور کا خیال آیا اور اپنے بھائی کا خیال آیا جن پر مجھے بڑا بھروسہ تھا۔ ان کی فیاضی حد سے بڑھی ہوئی تھی اور مجھ سے وہ اپنے بیٹے کی طرح محبت کرتے تھے۔

میں پور بندر سے راجکوٹ آیا اور سارا ماجرا کہہ سنایا۔ میں نے جوشی جی سے مشورہ لیا۔ ظاہر ہے کہ انہوں نے جانے پر اصرار کیا اور کہا کہ اگر ضرورت ہو تو قرض لینے میں تامل نہ کرنا چاہیے۔ میں نے اپنی بیوی کا زیور بیچنے کی تجویز پیش کی جس سے دو تین ہزار روپیہ مل جاتا۔ میرے بھائی نے وعدہ کیا کہ کسی نہ کسی طرح روپے کا بندوبست کر دیں گے۔

مگر میری والدہ اب تک راضی نہ تھیں انہوں نے لوگوں سے کھود کھود کے انگلستان کے حالات پوچھے۔ کسی نے ان سے کہہ دیا کہ نوجوان وہاں بگڑ جاتے ہیں۔ کسی نے کہا کہ وہ گوشت کھانے لگتے ہیں۔ کسی نے کہا وہاں بغیر شراب کے گزر نہیں ہوتا۔ انہوں نے مجھ سے پوچھا ”جب یہ حال ہے تو کیسے کام چلے گا؟“ میں نے کہا ”آپ کو مجھ پر اعتبار نہیں؟ میں آپ سے جھوٹ نہیں بولوں گا۔ میں قسم کھا کر کہتا ہوں کہ ان چیزوں کو ہاتھ بھی نہ لگاؤں گا۔ اگر ایسا خطرہ ہوتا تو بھلا جوشی جی مجھے جانے دیتے؟“

انہوں نے کہا مجھے تم پر اعتبار ہے۔ مگر پردیس میں کیسے اعتبار کروں؟ میں حیران ہوں سمجھ میں نہیں آتا کہ کیا کروں؟ اچھا بچا راجی سوامی سے پوچھوں گی۔“

بچا رچی سوامی اصل میں مودھی بنے تھے مگر اب جین سادھو ہو گئے تھے وہ بھی جوشی جی کی طرح ہمارے خاندان کے مشیر تھے۔ انہوں نے میری مدد کی اور کہا۔ ”میں اس لڑکے سے تین باتوں کا پکا عہد لوں گا۔ پھر اسے اجازت دینے میں کوئی ہرج نہیں۔“ انہوں نے مجھ سے قسم کھلائی اور یہ عہد لیا کہ میں شراب، عورت اور گوشت کو ہاتھ نہ لگاؤں گا۔ جب یہ ہو گیا تو میری ماں نے جانے کی اجازت دے دی۔ ہائی اسکول میں مجھے رخصت کرنے کے لئے جلسہ کیا گیا۔ راجکوٹ کے ایک نوجوان کا انگلستان جانا ایک غیر معمولی بات تھی۔ میں نے چند لفظ شکرے کے لکھ لئے تھے۔ مگر بڑی دقت سے ہکلا ہکلا کر میری زبان سے نکلے۔ مجھے یاد ہے جب میں انہیں پڑھنے کھڑا ہوا تو میرے سر میں چکر تھا اور میں سارے بدن سے کانپ رہا تھا۔

بزرگوں کی دعاؤں کے ساتھ میں بمبئی روانہ ہوا۔ راجکوٹ سے بمبئی تک میرا پہلا سفر تھا۔ میرے بھائی مجھے پہنچانے گئے تھے لیکن مثل ہے کہ آسمان سے گرا کھجور میں اٹکا۔ ابھی بمبئی میں بڑی دقتوں کا سامنا کرنا تھا۔

برادری سے خارج

اپنی ماں سے اجازت اور دعائیں لے کر، اپنی بیوی اور تین چار مہینے کے بچے سے رخصت ہو کر میں خوشی خوشی بمبئی روانہ ہوا لیکن وہاں میرے بھائی کے دوستوں نے ان سے کہا کہ جون اور جولائی میں بحر ہند میں طلاطم رہتا ہے اور یہ اس لڑکے کا پہلا بحری سفر ہے اس لئے احتیاط کا تقاضا ہے کہ یہ نومبر سے پہلے روانہ ہو۔ کسی نے یہ خبر سنائی کہ حال ہی میں کوئی جہاز طوفان میں ڈوب گیا ہے۔ میرے بھائی یہ سن کر گھبرا گئے اور انہوں نے میری فوری روانگی میں خطرہ سمجھ کر اجازت دینے سے انکار کر دیا۔ وہ مجھے بمبئی میں ایک دوست کے پاس چھوڑ کر راجکوٹ چلے گئے اور اپنے کام میں مصروف ہو گئے۔ انہوں نے میرا سفر خرچ اپنے نسبتی بھائی کے پاس رکھوا دیا اور اپنے دوستوں سے کہہ دیا کہ مجھے جس قسم کی مدد کی ضرورت ہو دیتے رہیں۔

بمبئی میں مجھ سے دلت کاٹے نہ کٹا تھا۔ میں ہمیشہ انگلستان جانے کے خیال میں رہا کرتا تھا۔ اس عرصہ میں ذات برادری کے لوگوں میں میرے سمندر پار جانے کی خبر سے بے چینی پھیل گئی۔ کوئی مودہ بنیاب تک انگلستان نہیں گیا تھا۔ لوگ میری اس جرات کا مواخذہ کرنے پر تل گئے۔ برادری کا ایک عام جلسہ ہوا اور میں اس کے سامنے طلب کیا گیا۔ میں نے تعمیل کی۔ خدا جانے مجھ میں ایک دم سے کہاں کی جرات آگئی۔ جلسے کے سامنے جانے میں، میں ذرا بھی نہیں ڈرا۔ مجھے خفیف سی جھک بھی محسوس نہ ہوئی۔ برادری کے سردار سیٹھ صاحب نے جو میرے دور کے رشتہ دار اور میرے والد کے دوست تھے، مجھ سے اس طرح خطاب کیا:

”برادری کی نظر میں تمہارا انگلستان جانا ٹھیک نہیں ہے، ہمارے دھرم میں سمندر پار جانے کی ممانعت ہے۔ ہم نے سنا ہے کہ وہاں آدمی دھرم کے خلاف کام کرنے پر مجبور ہوتا ہے۔ اسے

انگریزوں کے ساتھ کھانا پڑتا ہے!۔

میں نے اس کا یہ جواب دیا:۔ میرے خیال میں انگلستان جانا ہرگز دہرم کے خلاف نہیں ہے، میں وہاں آگے پڑھنے کے لئے جا رہا ہوں اور میں اپنی والدہ سے عہد کر چکا ہوں کہ ان تین چیزوں سے جن کا آپ لوگوں کو زیادہ ڈر ہے پر میز کر دوں گا۔ مجھے یقین ہے کہ یہ عہد مجھے برائی سے محفوظ رکھے گا۔

سیٹھ جی نے فرمایا مگر میں جو تم سے کہتا ہوں کہ وہاں دہرم پر قائم رہنا ممکن نہیں۔ تمہیں معلوم ہے کہ تمہارے باپ سے مجھ سے کیا تعلقات تھے۔ تمہارا فرض ہے کہ میری بات مانو۔

میں نے کہا: ”مجھے ان تعلقات کا حال معلوم ہے اور میں آپ کو بزرگ سمجھتا ہوں، مگر میں اس معاملے میں مجبور ہوں۔ میں انگلستان جانے کا عزم کر چکا ہوں اور اسے ترک نہیں کر سکتا۔ میرے والد کے دوست اور مشیر نے جو ایک عالم برہمن ہیں میرے انگلستان جانے کو جائز رکھا ہے اور میری والدہ اور بھائی نے بھی اجازت دے دی۔“

”مگر تمہیں برادری کے حکم کا لحاظ نہیں؟“

”میں سچ سچ مجبور ہوں۔ میرے خیال میں برادری کو اس معاملے میں دخل نہیں دینا چاہیے۔“
اس پر سیٹھ جھنجھلا گئے وہ مجھے سخت سست کہنے لگے۔ میں جب بیٹھا رہا۔ آخر سیٹھ نے حکم سنایا : ”آج سے یہ لڑکا برادری سے باہر سمجھا جائے گا جو کوئی اس کی مدد کرے گا اسے بہخانے کھاڑی جائے گا وہ سواروپہ جرمانہ کا مستوجب ہو گا۔“

مجھ پر اس حکم کا کوئی اثر نہیں ہوا اور میں سیٹھ سے رخصت ہو کر چلا آیا۔ مگر مجھے یہ فکر تھی کہ میرے بھائی کیا کہیں گے خوش قسمتی سے وہ ثابت قدم رہے اور انہوں نے اپنے خط میں یقین دلایا کہ باوجود سیٹھ کے حکم کے ان کی اجازت بدستور قائم ہے۔

اس واقعے سے مجھے اور بے چینی پیدا ہو گئی کہ کسی طرح جلدی چلا جاؤں۔ اگر ان لوگوں نے میرے بھائی پر دباؤ ڈالا تو خدا جانے کیا صورت ہو؟ اور فرض کرو ناگہانی حادثہ پیش آگیا۔ میں اس الجھن میں تھا کہ میں نے سنا ایک جو ناگڑھ کے وکیل بیرسٹری کرنے انگلستان جا رہے ہیں اور 4 ستمبر کے جہاز سے روانہ ہو جائیں گے، میں اپنے بھائیوں کے دوستوں سے جن کے سپرد وہ مجھے کر گئے تھے ملا۔ ان کی بھی یہی رائے ہوئی کہ مجھے ایسے شخص کی ہمراہی کا موقع ہاتھ سے نہ دینا چاہیے۔ وقت بہت کم تھا۔ میں نے اپنے بھائی کو تار دے کر اجازت مانگی اور انہوں نے دے دی، میں نے اپنے نسبتی بھائی سے روپیہ مانگا۔ انہوں نے سیٹھ کے حکم کا حوالہ دیا اور کہا مجھ میں برادری سے خارج ہونے کی ہمت نہیں۔ تب میں اپنے

خاندان کے ایک دوست کے پاس گیا اور ان سے درخواست کی کہ مجھے اتنا روپیہ قرض دے دیں جو کرایہ اور ادپر کی ضروریات کے لئے کافی ہو اور میرے بھائی سے وصول کر لیں۔ انہوں نے مہربانی سے نہ صرف میری درخواست منظور کر لی بلکہ مجھے بہت تسلی بھی دی۔ میں نے فوراً آہواز کا ٹکٹ لیا۔ اب مجھے سفر کا سامان کرنا تھا۔ ایک اور دوست کو ان باتوں کا تجربہ تھا انہوں نے مجھے کپڑے بنوادئے اور دوسری چیزیں فراہم کر دیں۔ بعض کپڑے مجھے پسند تھے اور بعض ناپسند۔ نکٹائی سے جسے میں آگے چل کر شوق سے باندھنے لگا اس وقت مجھے سخت نفرت تھی۔ چھوٹا کوٹ پہنتا مجھے بے حیائی معلوم ہوتی تھی لیکن انگلستان جانے کی لگن میرے دل میں ایسی تھی کہ یہ ناپسندیدگی کوئی حقیقت نہیں رکھتی تھی۔ راستے کے کھانے پینے کا سامان میرے ساتھ بہت کافی تھا۔ میرے دوستوں نے اسی کیمین (1) میں ایک برتھ (2) محفوظ کر لی تھی۔ جس میں جو ناگزہ کے وکیل تری امیک رائے جی مضمون دار تھے۔ انہوں نے مجھے مضمون دار جی کی حفاظت میں دیا اور کہا یہ ابھی اٹھارہ برس کا لڑکا ہے جسے دنیا کا کوئی تجربہ نہیں۔ مضمون دار جی نے کہا آپ اس لڑکے کی طرف سے مطمئن رہیے۔

خدا خدا کر کے ہم 4 ستمبر کو بمبئی سے روانہ ہوئے۔

حوالہ جات

Cabin - 1

Birth - 2

لندن میں داخلہ

مجھے سمندر کے سفر میں متلی بالکل نہیں ہوئی۔ لیکن کچھ دن کے بعد میری طبیعت میں الجھن اور بے چینی پیدا ہونے لگی۔ میں اسٹور ڈیک سے باتیں کرنے جھپٹتا تھا۔ مجھے انگریزی بولنے کی بالکل عادت نہ تھی اور دوسرے درجے میں سوا مضموندار جی کے سب مسافر انگریز تھے۔ میں ان سب سے باتیں نہیں کر سکتا تھا۔ کیونکہ جب وہ مجھ سے مخاطب ہوتے تھے تو میں ان کے الفاظ کم سمجھتا تھا اور اگر سمجھ بھی گیا تو جواب نہیں دے سکتا تھا۔ مجھے بولنے سے پہلے ایک ایک لفظ سوچنا پڑتا تھا۔ میں چھری کانٹے کے استعمال سے نادائق تھا اور مجھ میں اتنی جرأت بھی نہ تھی کہ کسی سے پوچھوں کن کن کھانوں میں گوشت نہیں ہے۔

اس لئے میں لوگوں کے ساتھ میز پر کبھی کھانا نہیں کھاتا تھا۔ بلکہ اپنے کیمین میں کھالیا کرتا تھا اور میری غذا زیادہ تر مٹھائی اور پھل تھے جو میں ساتھ لایا تھا مضموندار جی کو اس قسم کی کوئی دقت نہ تھی اور وہ سب سے ملتے جلتے تھے وہ بے تکلف ڈیک پر پھرتے تھے اور میں کیمین میں چھپا بیٹھا رہتا تھا۔ اور ڈیک پر صرف اس وقت جاتا تھا جب وہاں دو چار آدمیوں سے زیادہ نہ ہوں۔ مضموندار جی مجھے برابر سمجھاتے تھے کہ مسافروں سے ملا کر اور ان سے بے تکلف باتیں کیا کرو۔ وہ کہتے تھے کہ وکیل کی زبان تیز ہونا چاہئے اور اپنے پیشے کے تجربے سنایا کرتے تھے۔ ان کی نصیحت تھی کہ انگریزی بولنے کے ہر موقع سے فائدہ اٹھاؤ اور غلطیوں کی پروا نہ کرو۔ غیر زبان میں غلطیاں تو ہوتی ہی ہیں لیکن میں اپنی جھپٹنے کی عادت کسی طرح دور نہ کر سکا۔

ایک انگریز مسافر مجھ سے اتنی مہربانی سے پیش آیا کہ مجھے گفتگو کرنا ہی پڑی وہ مجھ سے عمر میں بڑا تھا۔ اس نے مجھ سے بہت سی باتیں پوچھیں تم کون ہو، کیا کام کرتے ہو، کیا کھاتے ہو، کہاں جا رہے

ہو، اتنا جھپٹتے کیوں ہو وغیرہ وغیرہ مجھے مشورہ دیا کہ میز پر آیا کرو۔ وہ میرے اتنی سختی سے گوشت سے پرہیز کرنے پر بہت ہنسا اور ایک دن جب ہم بحر تلزم میں تھے اس نے دوستانہ لہجہ میں کہا ”ابھی تو خیر کام چلتا ہے مگر جب ظلیج بسکے میں پہنچو گے تو تمہیں اپنے فیصلہ پر پھر سے غور کرنا پڑے گا۔ اور انگلستان میں تو اتنی سزوی پڑتی ہے کہ کوئی بے گوشت کھائے زندہ نہیں رہ سکتا۔ میں نے کہا ”مگر میں نے سنا ہے کہ لوگ وہاں بے گوشت کھائے بھی رہ سکتے ہیں اور رہتے ہیں۔“

وہ بولا ”یقین جانو یہ من گھڑت ہے جہاں تک مجھے یاد ہے وہاں کوئی شخص نہیں رہتا جو گوشت نہ کھاتا ہو دیکھو آخر میں تم سے شراب پینے کو تو نہیں کہتا حالانکہ میں پیتا ہوں مگر یہ میں ضرور کہتا ہوں کہ تمہیں گوشت کھانا چاہئے کیونکہ بے اس کے تم زندہ نہیں رہ سکتے۔“

”آپ کے ہمدردانہ مشورہ کا شکریہ لیکن میں اپنی ماں سے صدق دل سے وعدہ کر چکا ہوں کہ گوشت کو ہاتھ نہ لگاؤں گا اس لئے میں اس کے کھانے کا خیال بھی دل میں نہیں لاسکتا اگر میں دیکھوں گا کہ اس کے بغیر کام نہیں چلتا تو میں ہندوستان واپس چلا جاؤں گا مگر یہاں رہنے کے لئے گوشت کھانا قبول کروں گا۔“

ہم ظلیج بسکے میں داخل ہو گئے لیکن مجھے نہ تو گوشت کی ضرورت پیدا ہوئی۔ شراب کی۔ وطن میں مجھے یہ مشورہ دیا گیا تھا کہ میں لوگوں سے تصدیق کر لوں کہ میں نے گوشت نہیں کھایا۔ میں نے اس انگریز دوست سے تصدیق نامہ مانگا۔ اس نے خوشی سے دے دیا اور میں نے اسے بہت دن تک احتیاط سے رکھا لیکن جب میں نے آگے چل کر دیکھا جو لوگ کھاتے ہیں انہیں بھی ایسے تصدیق نامے مل جاتے ہیں تو میری نظر میں اس کی کوئی اہمیت نہ رہی اگر کسی کو میری بات کا اعتبار نہ ہو تو تصدیق نامے سے کیا فائدہ؟

غرض ہم کھپن پہنچ گئے۔ جہاں تک مجھے یاد ہے سینچر کا دن تھا جہاز میں کالا سوٹ پہنتا تھا۔ سفید فلائین کا سوٹ جو میرے دوستوں نے بنوایا تھا اس لئے اٹھار کھا گیا تھا کہ جہاز سے اتر کر پہنا جائے۔ میرا خیال تھا کہ جب ساحل پر اتروں گا تو سفید کپڑے پہنتا زیادہ مناسب ہو گا۔ اس لئے میں نے فلائین کا سوٹ پہنا۔ یہ ستمبر کے آخری دنوں کا ذکر ہے۔ میں نے دوسروں کو دیکھا تو معلوم ہوا کہ سوائے میرے کوئی سفید کپڑے پہنے ہوئے نہیں ہے۔ میں نے دیکھا کہ سب نے اپنا اپنا سامان مع کنبیوں گرنڈلے کمپنی کے ایک ایجنٹ کے سرد کر دیا۔ اس لئے میں نے بھی یہی کیا۔

میرے پاس چار تعارف کے خط تھے ڈاکٹر پ۔ ج مہتا کے نام۔ دلپت رام جی شکل کے نام، پرنس رنجیت سنگھ جی کے نام اور دادا بھائی نوروجی کے نام۔ چہار پر کسی نے ہمیں یہ مشورہ دیا تھا کہ لندن میں وکٹوریہ ہوٹل میں ٹھہریں۔ اس لئے مضموندار جی نے اور میں نے وہاں قیام کیا۔ مجھے پہلے ہی کیا کم شرم تھی کہ میں اکیلا سفید کپڑے پہنے ہوں۔ جب ہوٹل میں مجھے معلوم ہوا کہ گرینڈ کے ہاں سے میرا اسباب کل اتوار کے سبب سے نہیں مل سکتا تو میں بے حد پریشان ہوا۔ ابھی دن شام کو آٹھ بجے کے قریب ڈاکٹر مہتا جنہیں میں نے سٹھپٹن سے تار دیا تھا، تشریف لائے۔ انہوں نے نہایت گرجو شئی سے میرا خیر مقدم کیا۔ وہ میرے سفید کپڑوں کو دیکھ کر ہنسے۔ ان سے باتیں کرتے کرتے میں نے شکل کے طور پر ان کی ٹاپ ہیٹ اٹھالی اور اس پر الٹی طرف ہاتھ پھیرنے لگا۔ جس سے اس کے بال ادھر ادھر مٹ گئے۔ ڈاکٹر مہتا نے میری اس حرکت کو کسی قدر غصے کی نظر سے دیکھا اور مجھے روک دیا۔ لیکن جو نقصان ہونا تھا وہ ہو ہی گیا۔ اس واقعے سے مجھے آئیندہ کے لئے عبرت ہو گئی۔ یہ میرا یورپی آداب مجلس کا پہلا سبق تھا۔ جس کی بار یکیاں ڈاکٹر مہتا نے مجھے دل لگی کے پیرائے میں سمجھادیں۔ انہوں نے کہا کہ ”دوسروں کی چیزیں نہ چھوا کرو، پہلی ملاقات میں اس قسم کے سوال نہ کیا کرو جیسے ہم ہندوستان میں کرتے ہیں چلا کر بات نہ کیا کرو، لوگوں سے گفتگو کرتے وقت انہیں ”سر“ نہ کہا کرو، یہ ہندوستان ہی کا دستور ہے۔ یہاں تو صرف نوکر چاکرا اپنے آقا کو ”سر“ کہتے ہیں اور اسی قسم کی بہت سی باتیں انہوں نے مجھے بتائیں۔ انہوں نے یہ بھی کہا کہ ہوٹل کے رہنے میں بہت خرچ ہے اور مجھے مشورہ دیا کہ میں کسی خاندان کے ساتھ رہوں۔ ہم نے یہ فیصلہ کیا کہ اس معاملہ کو پیر تک ملتوی رکھیں۔

مضموندار جی کو اور مجھے ہوٹل میں تکلیف تھی اور خرچ بھی بہت تھا مانٹا سے ہمارے ہمسفر ایک سندھی تھے۔ جن سے مضموندار جی کی دوستی ہو گئی تھی وہ لندن میں اجنبی نہ تھے۔ اس لئے انہوں نے کہا کہ اگر کہو تو تمہارے لئے کمرے تلاش کر دوں۔ ہم راضی ہو گئے اور پیر کے دن جیسے ہی اسباب آیا ہم ہوٹل کا بل ادا کر دیا اور ان کمروں میں اٹھ گئے جو سندھی دوست نے ہمارے لئے کرایہ پر لئے تھے۔ مجھے یاد ہے کہ میرے ہوٹل کا بل تین پاؤنڈ کے قریب تھا جسے دیکھ کر میرے ہوش اڑ گئے اتنا روپیہ دینا پڑا اور لطف یہ کہ میں تقریباً فاقہ سے رہا، کیونکہ مجھے کوئی کھانا پسند نہیں آتا تھا۔ اگر مجھے ایک چیز نا پسند ہوئی تو میں دوسری منگاتا تھا اور دونوں کے دام دینا پڑتے تھے۔ اصل میں میرا گزارا اب تک ان چیزوں پر تھا جو میں بمبئی سے ساتھ لایا تھا۔

نئے کمروں میں بھی میں پریشان تھا۔ مجھے اپنا گھر اور اپنا ملک بہت یاد آتا تھا۔ ماں کی محبت کا خیال دم بھر دل سے جدا نہیں ہوتا تھا۔ رات کو میرے رخساروں پر آنسوؤں کا تار بندھ جاتا تھا اور گھر کی ایک ایک چیز کی یاد نیند حرام کر دیتی تھی کہ اپنا درد پہناں سناتا اور فرض کیجئے سناتا بھی تو فائدہ کیا ہوتا؟ کوئی ایسی چیز نظر نہیں آتی تھی جس سے تسکین ہو۔ ہر چیز اجنبی تھی۔ لوگ ان کے طور پر جانے یہاں تک کہ ان کے گھر بھی۔ میں انگریزی آداب و رسوم کے معاملے میں بالکل مبتدی تھا اور مجھے وقت احتیاط سے کام لینا پڑتا تھا۔ پھر ترکاری کے سوا کچھ نہ کھانے کا عہد ایک اور مصیبت تھی۔ کھانے میں کھا سکتا تھا۔ وہ بے مزہ اور پھیکے تھے۔ غرض میں عجب ٹھکے میں پھنسا تھا نہ پائے رفتن نہ جائے ماندن انگلستان میں رہنا مجھ سے برداشت نہیں ہوتا تھا اور ہندوستان واپس جانا محال تھا میرا ضمیر کہتا تھا کہ اب تو تم آہی گئے ہو، کسی نہ کسی طرح یہ تین سال پورے کرو۔

حوالہ

1 - ادنیٰ نوپا جو لندن میں مہذب طبقے کے لوگ رسمی لباس کے ساتھ پہنتے ہیں۔

میرے ایک عقیدے کی تبدیلی

ڈاکٹر مہتا پیر کے دن دکتوریہ ہوٹل پہنچے۔ ان کا خیال تھا کہ میں وہیں ملوٹکا۔ یہاں انہیں معلوم ہوا کہ ہم لوگ جاچکے ہیں۔ وہ ہمارا نیا پتہ معلوم کر کے ہمارے مکان پہنچے۔ مجھے جہاز پر محض حماقت سے داد کی شکایت ہو گئی تھی۔ وہاں ہمیں منہ دھونے اور نہانے کے لئے سمندر کا پانی ملتا تھا جس میں صابن حل نہیں ہوتا۔ مگر میں صابن کو تہذیب کی نشانی سمجھ کر استعمال کرتا تھا۔ نتیجہ یہ ہوتا تھا کہ جلد بجائے صاف ہونکی چکنائی سے آلودہ ہو جاتی تھی۔ اسی سے میں داد میں مبتلا ہو گیا۔ میں نے ڈاکٹر مہتا کو دکھایا تو انہوں نے کہا سر کہ کاتیزاب لگاؤ مجھے یاد ہے کہ تیزاب کی جلن سے میں بلبلا اٹھا تھا۔ ڈاکٹر مہتا نے میرے کمرے کو اور اس کے سلمان کو دیکھا تو ناپسندیدگی سے سر ہلا کر بولے اس سے کام نہیں چلے گا انگلستان آنے میں ہمارا مقصد پڑھنے لکھنے سے زیادہ یہاں کی زندگی اور معاشرت کا تجربہ حاصل کرنا ہے اور اس کے لئے تمہارا کسی خاندان کے ساتھ رہنا ضروری ہے لیکن اس سے پہلے یہ مناسب ہے کہ تم کچھ دن (1)۔۔۔۔۔ کے ساتھ بطور امیدوار کے رہو میں تمہیں وہاں لے چلوں گا۔

میں نے اس رائے کو شکرے کے ساتھ قبول کیا اور ان دوست کے یہاں اٹھ گیا۔ وہ مجھ سے بہت مہربانی اور اطلاق سے پیش آئے۔ انہوں نے مجھے اپنے بھائی کے برابر سمجھا۔ مجھے انگلستان کے طور طریقے سمجھائے اور انگریزی بولنے کی مشق کرائی۔ مگر میری غذا کا مسئلہ بہت پیچیدہ تھا۔ مجھے بغیر نمک سالے کے اہلی ہوئی ترکاری پسند نہ آتی تھی۔ مکان والی حیوان تھی کہ میرے لئے کیا چیز پکائے صبح ناشتے میں ہم جئی کادلیہ کھاتے تھے جس سے پیٹ بھر جاتا تھا۔ لیکن دوپہر اور شام کے کھانے سے میں ہمیشہ بھوکا اٹھتا تھا میرے دوست سمجھتے اکثر سمجھاتے تھے کہ گوشت کھایا کرو مگر میں ہمیشہ اپنے عہد کا عذر پیش کر کے خاموش ہو رہتا تھا۔ دوپہر اور شام کے کھانے میں پاک ڈبل روٹی اور مرہ ملتا تھا۔

میری خوراک اچھی تھی اور معدہ بڑا تھا۔ لیکن میں شرم کے مارے ڈبل روٹی کے دو تین ٹکڑوں سے زیادہ نہ مانگ سکتا تھا کیونکہ یہ بد تمیزی معلوم ہوتی تھی۔ اس پر یہ طرہ کہ دودھ نہ دوپہر کو ملتا تھا نہ شام کو میرے دوست یہ حالت دیکھتے دیکھتے ایک دن اکتا کر کہنے لگے اگر تم میرے سگے بھائی ہوتے تو میں تمہیں کھڑے کھڑے نکال دیتا۔ وہ عہد بھی کوئی چیز ہے جو ایک جاہل ماں کے سامنے کیا گیا ہو اور وہ بھی ایسی حالت میں کہ یہاں کی حالت سے متعلق واقفیت نہ تھی؟ یہ میرے سے عہد ہی نہیں ہے قانون اسے ہرگز عہد تسلیم نہ کریگا ایسے وعدے کی پابندی محض ضعیف الاعتقادی ہے اور میں تم سے کہے دیتا ہوں کہ اس طرح کی ضد سے تمہیں یہاں کچھ بھی حاصل نہ ہوگا۔ تم اس سے پہلے گوشت کھا چکے ہو اور تمہیں اس کا مزہ پسند آیا تھا۔ جہاں کوئی ضرورت تھی وہاں تک تم نے کھایا اور جہاں سخت ضرورت ہے وہاں نہیں کھاتے۔ کتنے انوس کی بات ہے!

مگر میں بس سے مس نہیں ہوا۔

روز میرے دوست یہی بحث کرتے تھے مگر میری طرف سے ہمیشہ ایک جواب تھا۔ قطعی انکار جتنی زیادہ وہ بحث کرتے تھے اتنا ہی میں اپنے عقیدے میں سخت ہوتا جاتا تھا۔ میں روز خدا سے دعا کرتا تھا کہ وہ مجھے بچائے اور وہ مجھے بچاتا تھا۔ اس کے یہ معنی نہیں کہ میں خدا کو پہچانتا تھا۔ یہ محض عقیدے کا کھیل تھا۔ وہ عقیدہ جس کا بیج میری کھلائی رہبھانے میرے دل میں بویا تھا۔

ایک دن میرے دوست نے مجھے ہینیتھم کا "نظریہ افادیت" پڑھ کر سنانا شروع کیا۔ میں نے بہت چکرایا۔ عبارت اتنی مشکل تھی کہ میری سمجھ میں نہ آتی تھی میرے دوست اس کا مطلب سمجھانے لگے۔ میں نے کہا "مجھے تو معاف ہی رکھئے یہ پیچیدہ مسئلے میرے بس کے نہیں۔ میں مانتا ہوں کہ گوشت کھانا ضروری ہے مگر میں اپنا عہد نہیں توڑ سکتا۔ اس میں بحث کی گنجائش نہیں، مجھے یقین ہے کہ میں بحث میں آپکا مقابلہ نہیں کر سکتا، مگر خدا کے لئے آپ مجھے بے وقوف اور ضدی سمجھ کر چھوڑ دیجئے میں آپ کی محبت کی قدر کرتا ہوں۔ میں جانتا ہوں کہ آپ میرے خیر خواہ ہیں۔ مجھے یہ بھی معلوم ہے کہ آپ میری ہمدردی کے سبب سے مجھ سے بار بار یہ بات کہتے ہیں۔ مگر میں مجبور ہوں جو عہد کر لیا اب اسے توڑ نہیں سکتا۔"

میرے دوست نے حیرت سے میری طرف دیکھا۔ انہوں نے کتاب بند کر دی اور کہا "بہت اچھا اب میں کبھی بحث نہ کروں گا۔" مجھے بڑی خوشی ہوئی انہوں نے پھر کبھی اس مسئلے پر بحث نہیں کی۔ مگر انہیں میری طرف سے جو تشویش تھی۔ وہ بدستور رہی وہ سگریٹ اور شراب پیتے تھے مگر انہوں نے

مجھ سے ان چیزوں کے استعمال کے لئے کبھی نہیں کہا، بلکہ ان دونوں سے پرہیز کرنے کی ہدایت کی۔ انہیں صرف اس بات کی فکر تھی کہ کہیں ایسا نہ ہو میں گوشت نہ کھانے سے کمزور ہو جاؤں اور انگلستان نے میرا دل اچاٹ ہو جائے۔

اس طرح میں نے ایک مہینہ امیدواری کا زمانہ بسر کیا۔ میرے دوست کا گھر رجمنڈ میں تھا۔ وہاں سے ہفتہ میں ایک دفعہ سے زیادہ لندن جانا ممکن نہ تھا اس لئے ڈاکٹر مہتا اور دلپت رام جی شکل کی رائے ہوئی کہ میں کسی خاندان میں رکھا جاؤں۔ شکل جی نے مغربی کینزنگٹن میں ایک ایٹنگلوانڈین کا گھر تجویز کیا اور وہاں میرے قیام کا بندوبست کر دیا۔ گھر کی مالکہ ایک بیوہ تھیں۔ میں نے ان سے اپنے عہد کا حال بیان کیا۔ بڑی بی نے وعدہ کیا کہ میری خبر گیری اچھی طرح کریں گی اور میں ان کے مکان میں رہنے لگا۔ یہاں بھی مجھے قریب قریب فاقہ ہی رہتا تھا۔ میں نے گھر سے مٹھائی اور دوسری کھانے کی چیزیں منگوائی تھیں مگر ابھی تک کچھ نہیں آیا تھا مجھ پر چیز بد مزہ معلوم ہوتی تھی۔ مالکہ مجھ سے روز پوچھتی تھیں کہ کھانا پسند آیا یا نہیں؟ مگر وہ بچاری کیا کر سکتی تھیں؟ میرے حجاب کا اب تک بھی وہی حال اور جو کچھ بھی میرے سامنے آتا تھا اس سے زیادہ مانگنے کی مجھ میں جرات نہ ہوتی تھیں۔ ان کی دو لڑکیاں تھیں۔ یہ بڑے اصرار سے مجھے ڈبل روٹی کے تین ٹکڑے اور دے دیتی تھیں۔ مگر انہیں کیا خبر تھی کہ میرا پیٹ بھرنے کے لئے ایک پوری روٹی چاہئے۔

مگر اب لندن میں میرے قدم ذرا ذرا جم گئے تھے۔ ابھی باقاعدہ پڑھائی کی ابتدا نہیں ہوئی تھی۔ البتہ میں نے حال ہی میں شکل جی کے کہنے سے اخبار پڑھنا شروع کیا تھا۔ ہندوستان میں میں نے کبھی اخبار نہیں پڑھا تھا۔ لیکن یہاں پابندی سے پڑھتے پڑھتے مجھے شوق پیدا ہو گیا۔ میں روزانہ ڈیلی نیوز، ڈیلی ٹیلیگراف اور پیل میل گزٹ کا سرسری مطالعہ کر لیا تھا۔ اس میں مجھے مشکل سے ایک گھنٹہ لگتا تھا اس لئے میں نے شہر کے چکر لگانا شروع کیا۔ میں نباتاتی ریسٹوران کی تلاش میں نکلا۔ مالکہ مکان نے مجھ سے کہا تھا کہ شہر میں ایسی کئی جگہیں ہیں۔ میں روز دس بارہ میل چلتا تھا اور کسی سستے ریسٹوران میں جا کر روٹی سے پیٹ بھر لیتا تھا۔ مگر طبیعت سیر نہ ہوتی تھی۔ اس روزانہ کشت کے دوران میں مجھ فیرنگڈن اسٹریٹ میں ایسا ریسٹوران مل گیا۔ اسے دیکھ کر مجھے ایسی خوشی ہوئی جیسے کسی بچے کو اپنی من بھاتی چیز پانے سے ہوتی ہے۔ اس میں داخل ہونے سے پہلے مجھے دروازہ کے قریب ایک شیشے کی کھڑکی کے نیچے کچھ کتابیں نظر آئیں جو بکنے کے لئے رکھی تھیں۔ ان میں سے سٹاک کی کتاب "نباتی مشرب (2) کی حمایت" میں نے ایک شلنگ میں خریدی اور سیدھا کھانے کے کمرے میں پہنچا۔ انگلستان آنے کے بعد

سے یہ پہلا دن تھا کہ میں نے سیر ہو کر کھانا کھایا خدا نے میری مدد کی۔

میں نے ساٹھ کی کتاب اول سے آخر تک پڑھی اور مجھ پر اس کا بہت اثر ہوا۔ جس تاریخ سے میں نے یہ کتاب پڑھی میں دعویٰ کر سکتا ہوں کہ میں نے اپنی مرضی سے نباتاتی مشرب اختیار کیا۔ میں نے اس دن کو دعائیں دیں۔ جب میں نے اپنی ماں کے سامنے گوشت نہ کھانے کا عہد کیا تھا۔ اب تک گوشت سے صرف سچائی کی خاطر اور اس عہد کے خیال سے پرہیز کرتا تھا جو میں نے اپنی والدہ کے سامنے کیا تھا مگر میرے دل میں یہ خواہش تھی کہ ہر ہندوستانی گوشت کھانا اختیار کر لے اور مجھ انتقار تھا کہ ایک دن ایسا آئے جب میں کھلم کھلا گوشت کھاؤں اور دوسروں کو اس مبارک کام میں شریک کر لوں اب میں نے نباتاتی مشرب اختیار کر لیا اور آئندہ سے اس کے پھیلائے کو اپنا دہرم بنالیا۔

حوالہ جات

- 1 - ان صاحب کا نام کانندھی نے نہیں لکھا۔ مگر قرینے سے معلوم ہوتا ہے یہ بھی کوئی ہندوستانی طالب علم تھے۔
- 2 - لفظی معنی یہ عقیدہ کے سوائے نباتات کے کوئی چیز نہ کھانا چاہئے مگر اس عقیدے کے لوگ دودھ وغیرہ اور بعض انڈا اور پھلی بھی استعمال کرتے ہیں البتہ گوشت سے سب پرہیز کرتے ہیں۔

انگریز مابنی

میرا عقیدہ نباتاتی مشرب کے بارے میں روز بروز راسخ ہوتا گیا۔ سالٹ کی کتاب پڑھ کر مجھے غذا کے متعلق اور کتابیں پڑھنے کا شوق پیدا ہوا۔ ان میں سے ایک ہاڈرڈ ولیمس کی ”اعلاقیات غذا“ جس میں ”غذائیات“ کی تاریخ عہد قدیم سے آج تک مشاہیر کی سیرت کے آئینے میں پیش کی گئی تھی مصنف نے یہ ثابت کرنے کی کوشش کی تھی کہ فیٹا غورٹ اور حضرت عیسیٰ سے لے کر آج تک جتنے فلسفی اور پیغمبر گزرے ہیں سب نباتاتی مشرب رکھتے تھے ڈاکٹر اپنا کنکس فورڈ کی کتاب ”غذا کا مکمل دستور العمل“ بھی دلچسپ تھی ڈاکٹر ایکنس نے صحت اور حفظان صحت کے متعلق جو کتابیں لکھی ہیں ان سے بھی مجھے بہت مدد ملی۔ وہ اس طریقہ علاج کے حامی تھے جو محض مریضوں کی غذا کی دیکھ بھال تک محدود ہے وہ خود نباتاتی مشرب رکھتے تھے اور اپنے مریضوں کی سختی سے ہدایت کرتے تھے کہ محض نباتات استعمال کریں ان سب کتابوں کو پڑھنے کا نتیجہ یہ ہوا کہ ”غذائیات“ کے تجربے میری زندگی کا ایک اہم جز بن گئے۔ ابتداء میں یہ تجربے زیادہ تر صحت کے نقطہ نظر سے کئے گئے آگے چل کر ان کا اصل محرک باب بن گیا۔

مگر میرے دوست کو اب بھی میری طرف سے تشویش تھی۔ میری محبت کے جوش میں انہیں یہ خیال ہوا کہ اگر میں اسی طرح گوشت کھانے کا مخالف رہا تو ایک تو میرا جسم کمزور ہو جائے گا دوسرے میں بے شعور رہوں گا کیونکہ انگریزوں کی صحبت میں میرا جی نہ لگے گا۔ جب انہیں یہ معلوم ہوا کہ مجھے ”نباتاتی مشرب“ کی کتابوں سے دلچسپی ہو گئی ہے تو وہ ڈرے کہ ایسا نہ ہو کہ ان کے مطالعہ سے میرا دماغ خراب ہو جائے۔ میں اپنا کام بھول کر ان تجربوں میں اوقات ضائع کر دوں اور پورا مرانی بن جاؤں۔ اس

لئے انہوں نے میری اصلاح کی ایک آخری کوشش کی۔ ایک دن انہوں نے مجھے تھیٹر دیکھنے کی دعوت دی۔ تماشے سے پہلے ہم ہوٹن ریستوران میں کھانا کھانے گئے۔ وکٹوریا ہوٹل سے رخصت ہونے کے بعد مجھے بڑے ریستوران میں جانے کا یہ پہلا اتفاق تھا اور مجھے یہ جگہ ایک عالی شان محل معلوم ہوتی تھی۔ ہوٹل میں رہ کر میں نے کوئی مفید تجربہ حاصل نہیں کیا تھا۔ کیونکہ اس وقت تک میرے حواس بجا نہ تھے میرے دوست بظاہر مجھے اس ریستوران میں اس خیال سے لے گئے تھے کہ حجاب کے سبب سے میں کھانے کے متعلق پوچھ گچھ نہ کر سکوں گا۔ وہاں بہت سے لوگ کھانا کھانے کے لئے جمع تھے۔ میرے دوست بھی مجھے لے کر ایک علیحدہ میز پر بیٹھ گئے۔ پہلے شوربا آیا مجھے یہ فکر تھی کہ اس میں کیا کیا چیزیں پڑی ہیں۔ مگر دوست سے پوچھنے کی ہمت نہ ہوتی تھی اس لئے میں نے کھانا لانے والے ملازم کو بلایا میرے دوست میز کے دوسری طرف بیٹھے تھے مگر انہوں نے میرا اشارہ دیکھ لیا اور سختی سے پوچھا کہ کیا بات ہے؟ میں نے بہت جھجکتے ہوئے کہا کہ میں پوچھنا چاہتا ہوں کہ یہ شوربا ترکاری کا ہے یا نہیں۔ میرے دوست نے غصے سے چلا کر کہا ”تم اتنے بے تکے ہو کہ مہذب صحبت کے قبل نہیں اگر تم تمیز سے نہیں بیٹھ سکتے تو بہتر ہے کہ چلے جاؤ کسی اور ریستوران میں جا کر کھانا کھا لو اور باہر میرا انتظار کرو“ میں بہت خوش ہو فوراً اٹھ کر چلا گیا۔ قریب ہی ایک ”نباتی ریستوران“ تھا مگر بند تھا اس لئے میں نے اس رات کو کھانا نہیں کھایا۔ میں اپنے دوست کے ساتھ تھیٹر گیا مگر انہوں نے اس ناگوار واقعے کا جو میرے سبب سے پیش آیا کوئی ذکر نہ کیا اور مجھے تو ظاہر ہے کہ کچھ کہنے کی گنجائش نہ تھی۔

یہ آخری دوستانہ نزاع تھی جو ہم دونوں میں ہوئی۔ اس کا ہمارے باہمی تعلقات پر کوئی اثر نہیں پڑا مجھے معلوم تھا کہ انہوں نے جو کچھ کیا محبت سے کیا اور میں اس کی قدر کرتا تھا۔ جتنا زیادہ ہمارے خیالات اور طرز عمل میں اختلاف تھا اتنی ہی زیادہ میں ان کی عزت کرتا تھا۔

مگر میں نے یہ طے کیا کہ ان کی تشویش رفع کر دوں اور ان کو یقین دلا دوں کہ اب میں بے تکے پن کی حرکتیں نہیں کروں گا۔ بلکہ کوشش کروں گا کہ شائستہ بنوں اور اپنے ترکاری کھانے کی تلافی میں اور آداب سیکھوں جو انسان کو مہذب صحبت کے قابل بنا دیتے ہیں اور اس مقصد کے لئے میں نے ایک ناممکن کام کا بیڑا اٹھایا یعنی انگریز جنٹلمین بننے کا۔

میں نے سوچا کہ بمبئی کے بنے ہوئے کپڑے جو میں پہنے ہوں انگلستان کی سوسائٹی کے قابل نہیں ہیں اس لئے میں نے آرمی اینڈ نیوی کی کوٹھی سے نئے کپڑے خرید لئے۔ ایک لمبی ریشمی بیٹ بھی

انیں شلنگ میں خریدی جو اس زمانے کے لحاظ سے بڑی قیمتی تھی مجھے اس پر بھی تخاصمت نہ ہوئی بلکہ دس پاؤنڈ ضلع کر کے ایک ایونگ سوٹ بوٹا اسٹریٹ میں سلوایا جو اس زمانے میں فیشن کا مرکز سمجھی جاتی تھی اور اپنے بھائی سے سونے کی دہری کھڑی زنجیر منگوائی، بندھی بندھائی ٹائی لکانا فیشن کے خلاف تھا اس لئے میں نے خود ٹائی باندھنے کی صنعت سیکھی۔

ہندوستان میں تو آئینہ میرے لئے بڑے تکلف کی چیز تھی مجھے آئینہ دیکھنا صرف اس دن نصیب ہوتا تھا جس دن گھر کا نائی میرے ڈارٹی مونڈا تھا۔ یہاں میں روز دس منٹ ایک بڑے آئینے کے سامنے کھڑے ہو کر ٹائی ٹھیک کرنے اور مانگ نکالنے میں ضلع کرتا تھا۔ بد قسمتی سے میرے بال بھی نرم نہ تھے اور انہیں جمانے میں برش سے خاصی کشتی لڑنا پڑتی تھی۔ جب کبھی میں سر پر ٹوپی رکھتا یا اتارتا تھا تو میرا ہاتھ خود بخود بال درست کرنے کے لئے سر پر پہنچ جاتا تھا۔ اس کے علاوہ ایک مہذب عادت یہ تھی کہ جب ٹائکسٹ سوسائٹی میں بیٹھنا ہوتا تھا تو تھوڑی تھوڑی دیر کے بعد ہاتھ سر پر جا کر مشین کے پرزے کی طرح ہی عمل کر آتا تھا۔

مگر ان سب باتوں کے باوجود بھی جنٹلمین بتنے میں ایک آنچ کی کسر تھی۔ اسلئے میں نے دوسری چیزوں کی طرف توجہ کی جو انگریز جنٹلمین کے لئے ضروری ہیں۔ مجھ سے کہا گیا کہ ناچ، فرانسسی زبان اور خطابت سیکھنا میرے لئے ضروری ہے فرانسسی نہ صرف ہمسایہ ملک فرانس کی زبان تھی بلکہ سارے براعظم یورپ میں سمجھی جاتی تھی جس کی سیاحت کا میں قصد رکھتا تھا۔ میں نے طے کیا کہ ایک رقصی کی کلاس میں ناچ سیکھوں گا اور تین پاؤنڈ ایک ٹرم کی فیس ادا کر دوں گا۔ میں تین ہفتے میں کوئی چھ بار کلاس میں گیا لیکن یہ میرے بس کی بات نہ تھی کہ جسم کی حرکت میں موزونیت پیدا کروں میں پیانو سمجھ نہیں سکتا تھا اس لئے تال کے ساتھ قدم رکھنا میرے لئے ناممکن تھا۔ اب میں کرتا تو کیا کرتا ایک سادھو کا قصہ مشہور ہے کہ اس نے چوہوں کو بھگانے کے لئے بلی پالی بلی کو دودھ پلانے کے لئے گائے رکھی۔ گائے چرانے کے لئے آدمی رکھا غرض اسی طرح سلسلہ بڑھتا گیا۔ میرے حوصلے بھی اس سادھو کے خاندان کی طرح بڑھتے گئے۔ میں نے سوچا کہ مغربی موسیقی کا مذاق پیدا کرنے کے لئے وایولن بجانا سیکھوں۔ اس لئے میں نے تین پاؤنڈ کا ایک وایولن خریدا اور سکھانے والے کی فیس میں بھی کچھ خرچ ہوا۔ میں ایک تیسرے استاد کے پاس خطابت سیکھنے گیا اور ایک گنی ابتدائی فیس کی ادا کی انہوں نے نبیل کی کتاب ”کامل خطیب“ نصاب کے طور پر مقرر کی اور میں نے اسے خرید لیا پٹ کی ایک اسپچ سے میں نے ابتدا کی۔

لیکن بیل کی کتاب نے صدائے جرس بن کر مجھے خواب غفلت سے بیدار کیا میں نے دل میں کہا ”مجھے کچھ انگلستان میں اپنی عمر تو گزارنا نہیں پھر آخر خطابت سیکھنے سے کیا فائدہ؟ اور ناچ سیکھ کر میں جینٹلمین کیسے بن جاؤں گا؟ رہا دایولن تو وہ میں ہندوستان میں بھی سیکھ سکتا ہوں۔ میں طالب علم ہوں مجھے اپنی پڑھائی کی فکر کرنا چاہئے مجھے ”انس آف کورٹ“ میں داخل ہونے کی تیاری کرنا چاہیے۔ اگر میں اپنی سیرت کی بدولت جینٹلمین بن جاؤں تو فہماور نہ مجھے اس حوصلہ سے ہاتھ دھولینا چاہیے۔

اس قسم کے خیالات کا میرے دل میں ہجوم تھا اور میں نے انکار اظہار اپنے خطابت کے استاد کے نام ایک خط میں کیا جس میں ان سے یہ درخواست تھی کہ مجھے آئندہ حاضری سے معذور رکھیں میں نے اب تک صرف دو یا تین سبق لئے تھے اسی طرح کا خط میں نے ناچ سکھانے والی کو لکھا اور دایولن سکھانے والی کے پاس خود جا کر میں نے درخواست کی کہ میرا دایولن جس قیمت پر بکے بیچ دیں۔ وہ مجھ پر مہربان تھیں اس لئے میں نے ان سے کہہ دیا کہ مجھے یکا یک یہ محسوس ہوا ہے کہ میں ایک جھوٹے نصب العین کی پیروی کر رہا ہوں انہوں نے میرے طرز عمل کی کامل تبدیلی میں میری ہمت افزائی کی۔ یہ سودا مجھے کوئی تین مہینہ رہا۔ لباس میں اہتمام اور تکلف برسوں باقی رہا لیکن اس وقت سے میں طالب علم بن گیا۔

تبدیلیاں

کوئی یہ نہ سمجھے کہ یہ زمانہ جس میں میں نے ناچ وغیرہ کے تجربے کئے میری زندگی میں عیش پرستی کا زمانہ تھا۔ آپ نے ملاحظہ کیا ہو گا کہ ان دنوں بھی میرے ہوش و حواس قائم تھے۔ میں فیشن کی ترنگ میں مست سنی مگر کبھی کبھی مشہدہ نفس سے بھی کام لیتا تھا۔ میں پیسے پیسے کا حساب رکھتا تھا اور سمجھ بوجھ سے خرچ کرتا تھا چھوٹی چھوٹی چیزیں مثلاً آسنی بس (1) کا کرایہ یا خط کے ٹکٹ یا اخبار کے پیسے بھی درج کر لیتا تھا اور شام کو سونے سے پہلے میزان دیکر باقی نکال لیتا تھا۔ یہ عادت مجھے ہمیشہ رہی اور اسی کا نتیجہ ہے کہ باوجود یہ کہ میرے ہاتھ میں قومی کاموں کے لئے لاکھوں روپیہ رہا مگر میں نے اس کے خرچ کرنے میں نہایت کفایت شعاری برتی اور جتنی تحریکیں میری نگرانی میں تھیں ان میں سے کسی پر کبھی قرض نہیں رہا بلکہ ہمیشہ بچت ہی رہی ہر نوجوان مجھ سے سبق حاصل کرے۔ اور جتنا روپیہ اس کے ہاتھ میں آئے اور خرچ ہو سب کا حساب رکھے۔ اس سے آگے چل کر بڑا فائدہ ہو گا۔

میں اپنی زندگی کا سختی سے احتساب کرتا تھا اس لئے مجھے یہ محسوس ہو گیا کہ کفایت شعاری برتنے کی ضرورت ہے میں نے فیصلہ کر لیا کہ اپنا خرچ آدھا کر دوں گا حساب دیکھنے سے معلوم ہوا کہ بس وغیرہ کے کرایہ میں کافی خرچ ہوتا ہے۔ اس کے علاوہ خاندان کے ساتھ رہنے میں ہر مہینہ اچھی خاصی رقم کا بل ادا کرنا پڑتا تھا۔ پھر اخلاق کا تقاضا تھا کہ خاندان کے ارکان کو کبھی کبھی کھانا کھلانے لے جاؤں اور ان کے ساتھ دعوتوں میں جاؤں۔ ان باتوں میں سواری کا بہت خرچ تھا۔ خصوصاً اگر کوئی خاتون ساتھ ہو تو دستور کے مطابق کل مصارف مجھی کو ادا کرنا پڑتے تھے۔ کھانے کے لئے باہر جانا ایک جداگانہ مدد تھی کیونکہ گھر پر کھانے کی بنا پر ہفتہ وار بل میں کوئی رقم مجرا نہیں ہوتی تھی۔ میں نے سوچا کہ یہ سب رقمیں بچائی جاسکتی ہیں اور رسمی معاشرت کی بجائے پابندی سے جو بھار میرے جیب خرچ پر پڑتا ہے وہ رد کیا جاسکتا ہے۔

اس لئے میں نے یہ فیصلہ کیا کہ الگ کمرے لے کر رہوں اور اپنے کام کے لحاظ سے تبدیل مقام کرتا رہوں تاکہ کفایت بھی ہو اور تجربہ بھی بڑھے۔ کمروں کا انتخاب میں اس طرح کرتا تھا کہ جہاں مجھے کام کرنا ہو وہاں پیدل چل کر آدھ گھنٹے میں پہنچ جایا کر دوں۔ اس سے پہلے جب مجھے باہر جانا ہو تو مجبوراً سواری پر جاتا تھا اور ٹہلنے کے لئے الگ وقت نکالنا پڑتا تھا۔ نئے انتظام میں ورزش اور کفایت شعاری کا ساتھ ہو گیا۔ کرائے کا کرایہ بچتا تھا اور آٹھ دس میل چل بھی لیتا تھا۔ زیادہ تر اسی پیدل چلنے کی عادت کی بدولت میں قیام انگلستان کے زمانے میں بیماری سے محفوظ رہا اور میرا جسم خاصا مضبوط ہو گیا۔

غرض میں نے دو کمرے کرائے پر لئے ایک سونے کا کمرہ اور ایک نشست کا کمرہ میری زندگی کی تبدیلی کی دوسری منزل تھی۔ تیسری ابھی آنے کو تھی۔

اس سے میرا خرچ آدھا ہو گیا۔ اب یہ سوال تھا کہ وقت کو کس طرح کام میں لاؤں مجھے معلوم تھا کہ بیرسٹری کے امتحانوں کے لئے زیادہ مطالعہ کی ضرورت نہیں اس لئے میرے پاس وقت کی کمی نہ تھی۔ میری انگریزی کمزور تھی۔ اور اس کی مجھے ہمیشہ فکر رہتی تھی لیبیل صاحب (جو آگے چل کر سرفریزر کہلائے) کے الفاظ اب تک میرے کانوں میں گونجتے تھے۔ ”پہلے بی اے پاس کر آؤ“ میں نے سوچا کہ مجھے بیرسٹری کے علاوہ کوئی ادبی سند بھی لینا چاہئے۔ میں نے آکسفورڈ اور کمبرج کے نصاب کے متعلق دریافت کیا اور چند دوستوں سے مشورہ کیا تو معلوم ہوا کہ اگر میں ان دونوں یونیورسٹیوں میں سے کسی میں جاؤں تو بہت خرچ پڑے گا۔ اور انگلستان میں بہت دن ٹھہرنا ہو گا اس لیے میں تیار نہ تھا۔ ایک دوست نے کہا کہ اگر تمہیں واقعی مشکل امتحان دینے کا شوق ہے تو لندن کا میٹریکولیشن پاس کر لو۔ اس میں محنت بھی کافی ہے۔ تمہاری عام استعداد بھی بڑھ جائے گی اور کچھ ایسا زائد خرچ بھی نہیں۔ میں نے اس تجویز کو بہت پسند کیا۔ لیکن اس امتحان کے نصاب نے مجھے ڈرا دیا۔ لاطینی اور کوئی جدید یورپی زبان (علاوہ انگریزی کے) لازمی تھیں میں نے کہا بھلا میں لاطینی کیسے سیکھ پاؤں گا میرے دوست نے اس کے فوائد پر بہت زور دیا ”لاطینی زبان و کیلوں کے لئے بڑے کام کی چیز ہے۔ قانون کی کتابوں کے سمجھنے میں اس سے بڑی مدد ملتی ہے اور بیرسٹری کے امتحان میں رومی (2) قانون کا پورا پرچہ لاطینی میں ہوتا ہے۔ اس کے علاوہ لاطینی جانتے سے انگریزی زبان پر عبور ہو جاتا ہے“ یہ بات میرے دل میں کھب گئی اور میں نے طے کر لیا کہ لاطینی چاہے جتنی مشکل ہو میں اسے سیکھ کر رہوں گا۔ فرانسیسی میں پہلے ہی شروع کر چکا تھا میں نے سوچا کہ جدید زبان میں سے اسی کو لوں میں

میٹریکولیشن کے ایک پرائیویٹ کلاس میں شریک ہو گیا۔ امتحان سال میں دوبارہ ہوا کرتا تھا اور اب لگے امتحان کو پانچ مہینے باقی تھے۔ اتنے عرصہ میں تیاری کر لینا میرے لئے قریب قریب ناممکن امر تھا۔ مگر انگریز جنٹلمین بننے کا شائق اب محنتی طالب علم بننے پر تیار ہو گیا۔ میں نے ایک ایک منٹ کا نقشہ اوقات بنایا لیکن نہ تو میری ذہانت سے اور نہ میرے حائفے سے یہ توقع تھی کہ اتنے دن میں امتحان کے دوسرے مضامین کے ساتھ لاطینی اور فرانسیسی دونوں قابو میں آجائیں گی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ لاطینی میں فیل ہو گیا مجھے بہت افسوس ہوا مگر میں نے ہمت نہ ہاری مجھے لاطینی کا مذاق پیدا ہو گیا تھا میں نے سوچا کہ دوسری بار کوشش کروں گا تو فرانسیسی اور اچھی ہو جائے گی اور اب کے میں سائنس کے حلقے میں بھی کوئی نیا مضمون لے لوں گا۔ کیمیا جو میرا مضمون تھی بہت دلچسپ ہونا چاہئے تھی لیکن تجربات کا موقع نہ ملنے سے اس میں جی نہیں لگتا تھا۔ یہ میرے ہندوستان کے امتحان میں لازمی مضامین میں سے تھی اس لئے میں نے ضدن میٹریکولیشن میں بھی اسی کو لے لیا تھا مگر اس بار میں نے بجائے کیمیا کے روشنی اور حرارت کا انتخاب کیا۔ لوگ کہتے تھے کہ یہ مضمون آسان ہے اور مجھے بھی آسان معلوم ہوا۔

دوبارہ امتحان کی تیاری کے ساتھ ساتھ میں نے کوشش کی کہ اپنی زندگی کو اور سادہ بناؤں مجھے یہ احساس تھا کہ میری زندگی کا معیار ابھی تک میرے خاندان کی محدود آمدنی کی نسبت سے اونچا ہے جب مجھے اپنے بھائی کی مشکلوں کا خیال آتا تھا جو دریا دل سے میرے متواتر مالی ادا کے مطالبے پورے کرتے تھے تو مجھے بہت دکھ ہوتا تھا۔ میں نے دیکھا کہ جو لوگ آٹھ پاؤنڈ سے لے کر پندرہ پاؤنڈ ماہوار تک خرچ کرتے تھے ان میں سے اکثر کو وٹیفی کی امداد ملتی تھی۔ میرے سامنے انتہائی سادگی کی مثالیں تھیں۔ مجھے متعدد غریب طالب علم ملے جو مجھ سے زیادہ تنگی سے بھر کرتے تھے۔ ان میں سے ایک بے چارہ غریبوں کے محلے میں دو شلنگ (3) ہفتہ وار کے کمرے میں رہتا تھا اور لوکھارٹ کی سستی کو کو کی دوکان میں دن میں چند بار دو پینی (4) کی کو کو اور روٹی سے پیٹ بھر لیتا تھا۔ میں اس کا مقابلہ تو کیا کرتا لیکن مجھے یہ خیال ہوا کہ میں یقیناً دو کمروں کے بجائے ایک کمرے سے کام چلا سکتا ہوں اور دو ایک وقت کا کھانا گھر پہ پکا سکتا ہوں اس میں چار پانچ پاؤنڈ ماہوار بچ جائیں گے، میں نے سادہ زندگی کے متعلق بعض کتابیں بھی پڑھیں۔ میں نے یہ کمرے چھوڑ کر ایک کمرہ کرایہ پر لیا۔ ایک گیس کا چولہا خریدا اور اپنا کھانا گھر پر پکانا شروع کیا۔ اس میں مجھے بیس منٹ سے زیادہ نہیں لگتے تھے۔ کیونکہ صرف جی کا دلیہ پکانا تھا اور کو کو بنانا۔ دوپہر کا کھانا میں باہر کھاتا تھا اور شام کو گھر آ کر روٹی اور کو کو پر گزر کرتا تھا اس طرح میرا روزانہ خرچ ایک شلنگ تین پنس رہ گیا۔ یہی زمانہ محنت کی پڑھائی کا بھی تھا۔ سادہ زندگی کے

سبب میرا بہت وقت بچتا تھا اور میں اپنے امتحان میں پاس ہو گیا۔
 پڑھنے والے یہ نہ سمجھیں کہ اس طرح رہنے میں میری زندگی بے لطفی سے گزرتی تھی بلکہ اس کے
 برعکس اس تبدیلی کی بدولت میری بیرونی اور اندرونی زندگی میں ہم آہنگی پیدا ہو گئی۔ اور یہ طریقہ
 خاندان کی آمدنی کے لحاظ سے بھی مناسب تھا میری زندگی زیادہ سچی بن گئی اور میری روحانی خوشی کی
 کوئی انتہا نہ رہی۔

حوالہ جات

Roman Law - 1

(2) (3) (4) لارڈ کرزن کے زمانے میں پاؤنڈ اور روپے کی شرح مبادلہ معین کر دی گئی پاؤنڈ پندرہ
 روپے کا شلنگ بارہ آنے کا اور عینس ایک آنے کا ہوتا تھا۔ اس سے پہلے شرح مختلف رہا کرتی
 تھی۔

غذائیات کے تجربے

جب میں نے اپنے نفس کا زیادہ گہرا احتساب کیا تو مجھے روز بروز اندرونی اور بیرونی تبدیلیوں کی ضرورت محسوس ہونے لگی۔ اپنے طرز زندگی اور اخراجات میں تبدیلیاں کرنے کے ساتھ ہی، بلکہ اس سے بھی پہلے میں نے اپنی غذا میں تبدیلی شروع کر دی۔ میں نے دیکھا کہ جن لوگوں نے ”نباتاتی مشرب پر کتابیں لکھی ہیں انہوں نے اس مسئلے کی بار یکسیوں پر مذہبی، علمی، عملی اور طبی پہلو سے غور کیا ہے۔ اخلاقی نقطہ نظر سے وہ اس نتیجے پر پہنچے تھے کہ انسان کے اشرف المخلوقات ہونے کے معنی یہ نہیں ہیں کہ وہ جانوروں پر ہاتھ صاف کرے بلکہ اعلیٰ مخلوق کو ادنیٰ مخلوق کی حفاظت کرنا چاہئے اور ان دونوں میں ویسا ہی اتحاد عمل ہونا چاہئے جیسا کہ انسانوں میں آپس میں ہوتا ہے۔ انہوں نے اس حقیقت کو بھی واضح کر دیا تھا کہ انسان کی اصلی غرض کھانے سے زبان کامزا نہیں بلکہ زندگی کا قائم رکھنا ہے۔ اس لئے ان میں سے بعض لوگوں کی رائے یہ تھی کہ نہ صرف گوشت سے بلکہ انڈے اور دودھ سے بھی پرہیز کرنا چاہئے اور وہ خود اس پر عمل کرتے تھے۔ سائنس کے نقطہ نظر سے انکا خیال تھا کہ انسان کی جسمانی ساخت ہی سے ظاہر ہے کہ اس کے لئے غذا کو پکا کر کھانا مناسب نہیں بلکہ اسے کچے پھل اور ترکیبوں پر گزر کرنا چاہئے۔ طبی نقطہ نظر سے ان کی رائے تھی کہ ہر قسم کے مسالے سے پرہیز کرنا چاہئے۔ اقتصادی اور عملی دلیلوں سے انہوں نے ثابت کر دیا تھا کہ نباتاتی غذا میں سب سے کم خرچ ہے مجھ پر ان سب باتوں کا اثر ہوا اور مجھے نباتاتی ریستوران میں ان سب قسموں کے نباتاتی (1) ملا کرتے تھے۔ انگلستان میں ایک نباتاتی انجمن تھی۔ جس کا ایک ہفتہ وار اخبار نکلتا تھا۔ میں اس اخبار کا خریدار اور انجمن کا رکن ہو گیا۔ اور تھوڑے ہی دن میں اس کی مجلس انتظامی میں شامل کر لیا گیا۔ یہاں مجھے ان لوگوں

سے ملنے کا اتفاق ہوا جو نباتاتی مشرب کے رکن رکن سمجھے جاتے تھے اور میں نے غذائیات پر تجربے شروع کر دیے۔

میں نے مٹھائی اور مسالے دار چیزیں جو گھر سے آئیں تھیں کھانا چھوڑ دیں طبیعت کارنگ بدل جانے سے چٹپٹی چیزوں کا شوق رفتہ رفتہ کم ہو گیا اور اب مجھے بغیر مسالے کی اہلی ہوئی پاک میں جو رجمند میں سیٹھی معلوم ہوتی تھی مزا آنے لگا۔ اس قسم کے بہت سے تجربوں سے میں نے یہ سیکھا کہ ذائقہ کا تعلق اصل میں زبان سے نہیں بلکہ دل سے ہے۔

ظاہر ہے کہ اقتصادی مصلحت بھی ہمیشہ میری پیش نظر رہتی تھی۔ اس زمانے میں لوگ چائے اور قہوے کو مضر سمجھتے تھے اور کوکو کے موافق تھے اور چونکہ میرا یہ عقیدہ ہو گیا کہ انسان کو صرف وہی چیزیں کھانا چاہئے جو جسم کی قوت کو قائم رکھتی ہیں۔ اس لئے میں نے چائے اور قہوے کی عادت چھوڑ دی اور ان کی جگہ کوکو استعمال کرنے لگا۔

جس ریستوران میں میں جایا کرتا تھا۔ اس کے حصے تھے۔ ایک میں خوشحال لوگ جایا کرتے تھے یہاں بہت سے کھانے تیار رہتے تھے۔ جس میں سے کھانے والا اپنی پسند کی چیزیں چن لیتا تھا اور ان کی قیمت دے دیتا تھا۔ اس طرح ہر ایک کھانے کی قیمت ایک شلنگ سے دو شلنگ تک ہوتی تھی۔ دوسرے حصے میں تین قسم کے کھانے اور ایک روٹی کا ٹکڑا ملتا تھا۔ انتہائی کفایت شکاری کے زمانے میں میں اسی حصے میں کھانا کھایا کرتا تھا۔

اس بڑے تجربے کے ساتھ ساتھ میں بہت سے چھوٹے چھوٹے تجربے بھی کر رہا تھا۔ مثلاً کچھ دن نشاستے دار چیزیں چھوڑ (2) دیں، کچھ دن محض روٹی اور پھل دار چیزیں چھوڑ دیں، کچھ دن محض روٹی اور پھل پر گزارا کیا، کچھ دن پیردودھ اور انڈوں پر۔ یہ آخری تجربہ قابل ذکر ہے یہ دو ہفتے سے بھی کم چلا۔ جس مصلح نے بے نشاستے کی غذا پر زور دیا تھا اس نے انڈے کی بڑی تعریف کی تھی اور اس کی رائے تھی کہ انڈا گوشت میں داخل نہیں۔ بقول اس کے یہ کھلی ہوئی بات ہے کہ انڈا کھانے میں کسی زندہ مخلوق کو نقصان نہیں پہنچتا۔ میں اس دلیل سے میں آگیا اور باوجود یہ کہ گوشت سے پرہیز کرنے کا عہد کر چکا تھا۔ میں نے انڈے کھائے۔ لیکن یہ لغزش عارضی تھی مجھے اس عہد کی تاویل کرنے کا کوئی حق نہ تھا مجھے اس کے وہی معنی سمجھنا چاہئے تھے جو عہد لیتے وقت میری والدہ کے ذہن میں تھے۔ میں جانتا تھا کہ ان کے نزدیک انڈے بھی گوشت میں شامل ہیں جیسے ہی اس عہد کا صحیح مفہوم میری سمجھ میں آیا میں نے انڈے بھی چھوڑ دیے اور اس تجربے سے بھی ہاتھ دھویا۔

اس دلیل میں ایک باریکی ہے جو غور کے قابل ہے۔ میں انگلستان میں گوشت کی تعریفیں سنیں۔ پہلی کی رو سے گوشت سے مراد محض پرندوں اور چوپایوں کا گوشت ہے، جو نباتاتی اس تعریف کے قائل تھے وہ پرندوں اور چوہاؤں کے گوشت سے پرہیز کرتے تھے مگر پھلی اور انڈا کھاتے تھے۔ دوسری تعریف کی رو سے گوشت کے مفہوم میں ہر جانور کا گوشت آجاتا ہے اس لئے پھلی کھانا ناجائز ہے۔ مگر انڈا جائز ہے تیسری تعریف کے مطابق گوشت میں سب جانوروں کا گوشت اور جو چیزیں ان سے پیدا ہوتی ہیں۔ مثلاً انڈا اور دودھ سب داخل ہیں۔ اگر میں پہلی تعریف کو قبول کر لیتا تو میں نہ صرف انڈا بلکہ پھلی بھی کھا سکتا تھا۔ لیکن مجھے یقین ہو گیا کہ میں اسی تعریف کا پابند ہوں جسکی قائل میری والدہ ہیں اس لئے اگر میں اپنے عہد پر قائم رہنا چاہوں تو مجھے دونوں چیزیں چھوڑ دینا چاہئیں۔ چنانچہ میں نے یہی کیا۔ اس سے مجھے بڑی تکلیف ہوئی۔ کیونکہ تحقیق سے معلوم ہوا کہ نباتاتی ریستوران میں بھی بہت سے کھانوں میں بھی انڈا پڑتا ہے۔ مثلاً بہت سی قسم کی پڈنگ اور کیک میں اس کے معنی یہ تھے، کہ اگر مجھے خود نہ معلوم ہو تو پوپھنا پڑتا تھا کہ فلاں چیز میں انڈا ہے یا نہیں اور یہ بہت برا معلوم ہوتا تھا مجھے اپنے فرض کے احساس سے یہ دقت تو ضرور ہوتی مگر میرے کھانے کا مسئلہ اور بھی سہل ہو گیا۔ البتہ بہت چیزیں جن کا مجھے شوق ہو گیا تھا بادل نا خواستہ چھوڑنا پڑیں۔ یہ دقتیں عارضی تھیں کیونکہ اپنے عہد کی سختی سے پابندی کرنے سے مجھے ظاہری مزے کے بدلے باطنی روحانی مزامل جو صریحی طور پر زیادہ صحت بخش زیادہ لطیف اور زیادہ پائیدار تھا۔

اصلی امتحان ابھی باقی تھا یہ دوسرے عہد کے متعلق تھا لیکن جسے خدا بچانا چاہے کس کی مجال ہے کہ اسے گرا سکے۔

یہاں چند کلمے عہد و پیمان کی تاویل کے متعلق کہنا بیجا نہ ہوگا۔ عہدوں کی تاویل سے ساری دنیا میں سیکڑوں جھگڑے پیدا ہوئے ہیں۔ چاہے جتنا ہی صاف عہد ہو لوگ اسے توڑ مروڑ کر اپنے مطلب کا بنا لیتے ہیں۔ ایسے لوگ امیروں سے لے کر غریبوں تک اور راجا سے لے کر پر جاہک سماج کے ہر طبقے میں موجود ہیں۔ خود غرضی انہیں اندھا کر دیتی ہے۔ بہیم لفظوں سے غلط منطقی نتیجے نکال کر وہ اپنے آپ کو دنیا کو اور خدا کو دھوکا دیتے ہیں۔ ایک زریں اصول یہ ہے کہ وہی معنی سمجھے جائیں جو عہد لینے والا ایمانداری سے سمجھتا ہے۔ دوسرا یہ کہ جب ایک عہد کے دو مفہوم ہو سکتے ہوں تو اسے ترجیح دی جائے جو کمزور فریق کے نزدیک صحیح ہو۔ ان اصولوں پر عمل کرنے سے فساد اور بے انصافی پیدا ہوتی ہے جس کی جڑ جھوٹ ہے وہ شخص جو صرف حق کا طالب ہے آسانی سے زریں اصول پر عمل کر سکتا ہے۔ اسے

تادیل کے لئے عالموں کے پاس جانے کی ضرورت نہیں۔ زیریں اصول کے مطابق گوشت کے جو معنی میری والدہ سمجھتی تھیں صرف وہی میرے لئے سچے معنی ہو سکتے تھے نہ کہ وہ مفہوم جو میرے وسیع تر تجربے یا بہتر علم کے غرور نے مجھے سکھایا تھا۔ انگلستان میں جو تجربے میں نے کئے وہ کفایت شعاری اور حفظانِ صحت کے نقطہ نظر سے کئے۔ اس مسئلے کے مذہبی پہلو پر میں نے اس وقت غور کیا جب میں جنوبی افریقہ گیا وہاں میں نے بڑی جفاکشی سے تجربے کئے جن کا ذکر آگے آئے گا۔ مگر ان سب کی بنیاد انگلستان ہی میں پڑ گئی تھی۔

جو آدمی کوئی مذہب نیا نیا اختیار کرتا ہے اس میں اس شخص سے زیادہ جوش ہوتا ہے جس کا وہ آبائی مذہب ہے۔ نباتاتی مشرب انگلستان والوں کے لئے ایک نیا عقیدہ تھا اور میرے لئے بھی۔ کیونکہ میں کہہ چکا ہوں کہ میں پہلے گوشت کھانے کا سختی سے قائل تھا اور نباتاتی مشرب ذہنی عقیدے کی حیثیت سے میں نے بعد میں اختیار کیا۔ نئی عقیدت کے جوش میں میں نے لندن کے اس حصے میں جس میں رہتا تھا ایک نباتاتی کلب قائم کرنے کا ارادہ کیا۔ سرائیڈن ارنلڈ کو جو وہیں رہتے تھے میں نے صدر بنایا اور رسالہ ”نباتاتی“ کے ایڈیٹر اڈلڈ فیلڈ کو نائب صدر میں خود اسے کاممستبر بنا۔ کلب کچھ دن چمکتا رہا۔ مگر چند مہینے کے بعد بند ہو گیا۔ کیونکہ میں اپنی تبدیلی مقام کی عادت کے مطابق اس جگہ کو چھوڑ کر دوسری جگہ چلا گیا۔ مگر اس مختصر اور محدود تجربے سے مجھے انجمنیں قائم کرنے اور چلانے کا تھوڑا بہت سلیقہ ہو گیا۔

حوالہ جات

- 1 - Vegelrian
- 2 - جیسے چاول آلود وغیرہ

حجاب میری سیر بن گئی

میں نباتاتی انجمن کی مجلس انتظامیہ کا رکن منتخب ہوا اور پابندی سے اس کے ہر جلسے میں شریک ہونے لگا۔ مگر ہمیشہ خاموش بیٹھا رہتا تھا۔ ایک بار ڈاکٹر اولڈ فیلڈ نے مجھ سے کہا ”تم مجھ سے تو خوب باتیں کرتے ہو مگر یہ کیا بات ہے کہ تم کمیٹی کے جلسے میں کبھی زبان نہیں کھولتے؟ نکھٹو کی طرح بیٹھے رہتے ہو۔“ میں اس پھبتی کو سمجھ گیا شہد کی مکھیاں ہمیشہ کام میں لگی رہتی ہیں مگر زپورا احدی ہوتا ہے۔ اور واقعی یہ تعجب کی بات نہ تھی کہ میرا جی بولنے کو چاہتا ہو لیکن میری سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ اپنے خیالات کیونکر ظاہر کروں۔ مجھے یہ محسوس ہوتا تھا کہ اور سب ارکان کی معلومات مجھ سے زیادہ ہے۔ پھر اکثر یہ ہوتا تھا کہ جیسے ہی میں نے ہمت کرنے کو بولنا چاہا کوئی نئی بات چھو جاتی تھی یہ صورت عرصہ تک رہی۔

اس اثناء میں ایک بہت اہم مسئلہ بحث کے لئے پیش ہوا۔ میں نے غیر حاضر رہنا فرض شناسی کے خلاف سمجھا اور چپ چاپ رائے دے دینا بزدلی معلوم ہوئی۔ حسب ذیل واقعے سے بحث چھڑی تھی انجمن کے صدر ہلس صاحب تھے جو ٹیمز ائرن در کس (1) کے مالک تھے یہ پیورٹین (2) مذہب رکھتے تھے۔ یہ کہا جاسکتا ہے کہ انجمن کا وجود ان کی مالی امداد پر منحصر تھا کمیٹی کے اکثر ممبران کے اور دے تھے۔ ڈاکٹر ہلنس بھی جن کی نباتاتی حلقوں میں بہت شہرت ہے مجلس انتظامیہ کے رکن تھے۔ یہ انضباط ولادت کی تحریک کے جو اس زمانے میں نئی نئی چلی تھی۔ حامی تھے اور مزدوروں میں اس کے طریقوں کی تلقین کرتے تھے۔ ہلس صاحب کا خیال تھا کہ ان طریقوں سے اخلاق کی جو کٹ جائے گی۔ ان کے نزدیک نباتاتی انجمن کا مقصد محض غذا کی اصلاح نہیں تھا بلکہ اطلاقی اصلاح بھی اور ڈاکٹر ہلنس جیسے شخص کو جو پیورٹین عقیدے کا مخالف تھا اس انجمن کا رکن رہنے دینا نامناسب تھا۔ اس لئے ان

کے اخراج کی تحریک پیش ہوئی۔

مجھے اس مسئلے میں گہری دلچسپی تھی میں ڈاکٹر پلنس جیسے الضباط و لادوت کے طریقوں کو خطرناک سمجھتا تھا اور میرا خیال تھا کہ ہلس صاحب کو یہ حیثیت پورٹین کے ان مخالفت کرنے کا حق ہے۔ یوں بھی میں ہلس صاحب کی فیاضی کی بہت قدر کرتا تھا لیکن میرے نزدیک یہ بے انصافی تھی کہ کوئی شخص ایک نباتاتی انجمن سے محض اس بنا پر خارج کر دیا جائے کہ وہ پیورٹین اطلاق کو انجمن کے مقاصد میں سے نہیں سمجھتا۔ یہ ہلس صاحب کی ذاتی رائے تھی کہ پورٹین مذہب کے مخالف انجمن سے خارج کر دئے جائیں اسے انجمن کے علاوہ مقصد سے کوئی تعلق نہ تھا۔ اس کا مقصد تو محض نباتاتی مشرب کو فروغ دینا تھا نہ کہ کسی خاص نظام اطلاق کی حمایت کرنا۔ اس لئے میری رائے تھی کہ ہر شخص جو اس کا قائل ہے کہ سوائے نباتاتی غذا کے کچھ نہ کھانا چاہئے اس انجمن کا رکن ہو سکتا ہے اس سے کچھ بحث نہیں کہ اور اخلاقی مسائل میں اس کا کیا عقیدہ ہے۔ کمیٹی میں اور لوگ بھی میرے ہمراہ تھے لیکن میں نے اپنا فرض سمجھا کہ میں خود اپنے خیالات کا اظہار کروں اب سوال یہ تھا کہ کیا طریقہ اختیار کیا جائے تقریر کرنے کی مجھ میں ہمت نہ تھی اس لئے میں نے طے کیا کہ اپنے خیالات قلمبند کر لوں جب میں جلسے میں گیا تو یہ کاغذ میری جیب میں تھا۔ جہاں تک مجھے یاد ہے مجھ سے یہ نہ بن پڑا کہ اسے پڑھ کر نادوں۔ بلکہ صدر نے کسی اور سے پڑھوایا۔ ڈاکٹر پلنس ہار گئے۔ یہ میری اداس قسم کی پہلی جنگ تھی اور اس میں ہارنے والے فریق سے ساتھ تھا لیکن مجھے اس خیال سے تسکین تھی کہ ہم حق بجانب ہیں مجھے کچھ خفیف سا خیال ہے کہ اس کے بعد میں نے مجلس انتظامیہ سے استعفادے دیا۔ جب تک میں انگلستان رہا اگر میں کسی سے ملنے بھی جاتا تھا اور وہاں پانچ چھ آدمی موجود ہوتے تھے تو میری زبان نہ کھلتی تھی۔

ایک بار میں مضموندار جی کے ساتھ وینیز گیا۔ یہاں ہم ایک نباتاتی مشرب خاندان کے ساتھ ٹھہرے۔ ”اطلائیات غذا“ کے مصنف ڈاکٹر باورڈ بھی اسی صحت گاہ میں مقیم تھے ہم ان سے ملے اور انہوں نے ہمیں دعوت دی کہ ایک جلسے میں نباتاتی مشرب کی تلقین کے لئے تقریریں کریں۔ میں یہ معلوم کر چکا تھا کہ تقریر لکھ کر پڑھ دینا قابل اعتراض نہیں سمجھا جاتا۔ بہت سے لوگ اپنے خیالات اختصار اور تسلسل کے ساتھ ادا کرنے کے لئے ایسا کرتے تھے۔ زبانی تقریر کرنا میرے لئے ناممکن تھا اس لئے میں اپنی تقریر قلمبند کر لی تھی۔ میں یہ پڑھنے کھڑا ہوا مگر مجھ سے نہیں پڑھی گئی میری آنکھوں میں اندھیرا چھا گیا اور میں سارے بدن سے کانپنے لگا حالانکہ تقریر فلسفہ کے ایک صفحہ سے زیادہ نہ تھی آخر میری طرف سے مضموندار جی کو پڑھنا پڑھی۔ خود

ان کی تقریر بہت اچھی تھی اور لوگوں نے اس کی بڑی تعریف کی۔ مجھے اپنی نالائقی پر شرم آئی اور رنج ہوا۔

انگلستان میں مجمع میں تقریر کرنے کی آخری کوشش میں نے اپنی روانگی سے ایک دن پہلے کی۔ مگر اس بار بھی میں نے اپنا مصحکہ کرایا۔ میں نے ہو برن ریسٹوران میں جس کا ذکر پہلے آچکا ہے اپنے نباتاتی دستوں کی دعوت کی۔ میں نے دل میں سوچا کہ نباتاتی ریسٹوران میں تو نباتاتی دعوت ہوا ہی کرتی ہے کیا وجہ ہے کہ غیر نباتاتی ریسٹوران میں ایسی دعوت نہ ہو اور میں نے ہو برن ریسٹوران کے میجر سے مل کر یہ طے کیا کہ ایسا کھانا پکے جس میں کوئی غیر نباتاتی چیز مطلق نہ ہو۔ نباتاتی مشرب دالوں نے بڑی خوشی سے اس حجبے کا خیر مقدم کیا۔ دعوتیں ہمیشہ صحبت کے لئے ہوتی ہیں لیکن مغرب نے انہیں اتنی ترقی دی ہے کہ ایک مستقل فن بنا لیا ہے۔ وہاں دعوت میں بڑی دھوم دھام ہوتی ہے۔ باجہ بجاتا ہے۔ تقریریں کی جاتی ہیں۔ میری چھوٹی سی دعوت بھی اس طمطراق سے خالی نہ تھی۔ اس لئے تقریروں کا ہونا ضروری تھا۔ جب میری باری آئی تو میں بھی تقریر کرنے کھڑا ہوا۔ میں نے بڑے اہتمام سے ایک تقریر سوچی تھی جس میں چند جملوں سے زیادہ نہ تھے۔ لیکن میں ایک جملے سے آگے نہ بڑھ سکا۔ میں نے ایڈیسن کا قصہ پڑھا تھا کہ جب وہ پہلی بار دارالعلوم میں تقریر کرنے لگا تو اس نے تین بار کہا "مجھے امید ہے" مگر اس کے آگے کچھ نہ کہہ سکا۔ اس پر ظریف نے اٹھ کر کہا "حضرت کو امید (3) تین بار رہی مگر ہوا ہوا یا کچھ نہیں" میرا ارادہ تھا کہ اسی قصے سے ابتدا کر کے ایک ظریفانہ تقریر کروں۔ ابتدا تو میں نے کر دی۔ مگر ایک جملہ کہہ کر اٹک گیا۔ میرے حلقے نے بالکل کام نہ دیا اور ظریفانہ تقریر کرنے کی کوشش میں میں خود آماجگاہ ظرافت بن گیا۔ میں نے سلسلہ کو چھوڑ کر کہا "میں آپ حضرات کا شکریہ ادا کرتا ہوں کہ آپ نے میری دعوت قبول کی" اور بیٹھ گیا۔

جنوبی افریقہ پہنچ کر میرا حجاب کچھ کم ہوا مگر رفع نہیں ہوا۔ فی البدیہہ تقریر کرنا میرے لئے ناممکن تھا۔ جب کبھی اجنبی مجمع کا سامنا ہوتا تو میں جھجکتا اور جہاں تک ہو سکتا تقریر کرنے سے پہلو بچاتا۔ آج بھی نہ مجھ سے یہ ممکن ہے اور نہ میں چاہتا ہوں کہ دستوں کے مجمع کو فضول باتوں میں بھائے رکھوں۔ مگر یہ بات ضرور ہے کہ اس خلقی حجاب سے، سوائے اس کے کہ کبھی کبھی میرا مصحکہ اڑایا گیا مجھے اور کوئی نھان نہیں پہنچا۔ بلکہ مجھے معلوم ہے کہ یہ چیز میرے لئے بڑی مفید ثابت ہوئی۔ رک رک کر تقریر کرنے سے مجھے ایک زمانے میں تکلیف ہوتی تھی مگر اب خوشی ہوتی ہے اس کا سب سے بڑا نائدہ یہ ہے کہ اس نے مجھے لفظوں کی کفایت شعاری سکھائی۔ میں نے خیالات کو قابو میں رکھنے

کی عادت ڈالی اور اب میں دعویٰ سے کہہ سکتا ہوں کہ میری زبان سے یا میرے قلم سے کوئی لفظ بے سوچے سمجھے نہیں نکلتا۔ مجھے یاد نہیں کہ کبھی میں نے اپنی تحریر تقریر میں کوئی لفظ ایسا استعمال کیا ہو جس پر بعد میں پشیمانی ہوئی ہو۔ اس طرح میں خدا جانے کتنی مصیبت سے اور تضحیح اوقات سے محفوظ رہا۔ تجربے نے مجھے سکھایا ہے کہ خاموشی طالب حق کی روحانی تربیت کا جز ہے۔ انسان کی یہ قدرتی کمزوری ہے کہ وہ جان بوجھ کر یا انجان پن میں سچی بات کو گھٹنا بڑھا کر بیان کرتا ہے۔ اور اس پر قابو پانے کے لئے خاموشی ضروری ہے۔ کم سخن آدمی عموماً بے سوچے سمجھے زبان نہیں کھولتا۔ ایک ایک لفظ کو توتا ہے بہت سے لوگوں کو بات کرنے کی بے صبری ہوتی ہے ہر جگہ میں لوگ تقریر کی اجازت کے لئے پرچے لکھ لکھ کر صدر کاناک میں دم کر دیتے ہیں۔ اور جب اجازت ملتی ہے تو عموماً لوگ مقررہ وقت سے آگے بڑھ جاتے ہیں اور وقت مانگتے ہیں اور پھر بغیر اجازت کے تقریر کرتے رہتے ہیں۔ آخر اس قدر باتیں کرنے سے دنیا کو کیسا فائدہ پہنچتا ہے؟ تضحیح اوقات کے سوا کچھ حاصل نہیں ہوتا۔ میرا حجاب دراصل میرا زورہ بکتر ہے اس کے سبب سے مجھے روحانی ترقی کا موقع ملا۔ اس نے مجھے حق و باطل میں تمیز کرنا سکھایا۔

حوالہ جات

- 1- لوہے کا کارخانہ
- 2- پیرولسٹنٹ صیانیوں کا ایک فرقہ جس کے پیر و اطلاق کے امور میں بہت تشدد کرتے ہیں۔
- 3- امید اردو میں حمل کو بھی کہتے ہیں انگریزی میں Concieve کا لفظ تھا جس میں ایسا بہام ہے۔ اس کے معنی خیال کرنے کے بھی ہیں اور حمل سے ہونے کے بھی۔

جھوٹ کا ناسور

چالیس سال پہلے انگلستان میں ہندوستانی طالب علم آج کل کے مقابلے میں بہت کم تھے۔ ان لوگوں کا دستور تھا کہ چاہے بیابے بھی ہوں مگر کنوارے بنتے تھے انگلستان میں اسکول اور کالج کے طالب علم سب کنوارے ہوتے ہیں کیونکہ وہاں کے لوگوں کے نزدیک طالب علمی اور شادی کی زندگی ساتھ ساتھ نہیں چل سکتی۔ ہمارے یہاں بھی پرانے زمانے میں یہی رواج تھا۔ ان دونوں طالب علم پر بھاری کھلتے تھے مگر آج کل بچپن میں شادی ہو جاتی ہے جو انگلستان میں ان سنی بات ہے۔ اس لئے وہاں ہندوستانی طالب علموں کو یہ کہتے شرم آتی تھی کہ ہماری شادی ہو گئی ہے۔ اس سخن سازی کا ایک اور بھی سبب تھا۔ وہ جانتے تھے کہ اگر اصلی حال معلوم ہو گیا تو جس خاندان میں وہ رہتے ہیں اس کی لڑکیوں کے ساتھ سیر کرنے یا ان سے عاشقانہ چھیڑ چھاڑ کرنے کا موقع نہیں ملے گا۔ یہ چھیڑ چھاڑ کم و بیش پاکبازانہ ہوتی تھی۔ خود والدین اس معاملے میں میں شہ دیتے تھے۔ ممکن ہے کہ نوجوان مرد و عورت کا اس طرح ملنا اس ملک میں ضروری ہو کیونکہ وہاں ہر نوجوان کو اپنے رفیق کا انتخاب خود کرنا پڑتا ہے۔ لیکن اگر ہندوستانی نوجوان انگلستان جا کر یہ تعلقات قائم کرتے ہیں جو وہاں کے نوجوان کے لئے بالکل قدرتی ہیں تو نتیجہ عموماً مہلک ہوتا ہے جس کی بہت سی مثالیں ہیں میں نے دیکھا کہ ہمارے نوجوانوں کا قدم ترغیب سے ڈمکا جاتا ہے اور وہ جھوٹ کی زندگی بسر کرتے ہیں اس میل جول کی خاطر جو انگریز نوجوانوں کے لئے کتنا ہی معصومانہ کیوں نہ ہو مگر ان کے لئے اچھا نہیں۔ مجھے بھی یہ روگ لگ گیا میں نے تکلف اپنے آپ کو کنوارا کہتا تھا۔ حالانکہ میں بیابا اور ایک بچے کا باپ تھا لیکن اس بناوٹ میں میرا بلانہ ہوا۔ محض میری دیر آشنائی اور کم سخن نے مجھے بچا یا ورنہ میں قعر گناہ میں گر جاتا۔ جب میں بات ہی

نہیں کرتا تھا تو کوئی لڑکی مجھ سے کیوں بولتی یا میرے ساتھ جانے پر کیوں راضی ہوتی۔

میری بزدلی بھی میری دیر آشنائی سے کم نہ تھی جن لوگوں کے یہاں میں دینیٹرز میں ٹھہرا تھا اس قسم کے خاندانوں میں قاعدہ تھا کہ مالکہ مکان کی لڑکی مہمانوں کو لے کر ٹہلنے جایا کرتی تھی۔ میری میزبان کی لڑکی ایک دن مجھے ان خوبصورت پہاڑیوں پر لے گئی جو دینیٹرز کے گرد واقع ہیں۔ میں خاصا تیز چلتا تھا لیکن میری رفیق مجھ سے بھی تیز رفتار تھی۔ وہ مجھے کھینچنے لے جاتی تھی اور اس کی زبان تینچی کی طرح چل رہی تھی میں اس کی باتوں پر کبھی کبھی آہستہ سے ”ہوں ہوں“ کہ دیتا تھا یا زیادہ سے زیادہ ہاں سچ سچ کیسی خوبصورت جگہ ہے ”وہ پرندے کی طرح اڑی چلی جاتی تھی اور میں اس فکر میں تھا کہ لوٹ کر گھر کب پہنچیں گے۔ اس طرح ہم ایک پہاڑی کی چوٹی پر پہنچ گئے اب یہ سوال تھا کہ نیچے کیسے اتریں۔ یہ پچیس برس کی پھر تیلی لڑکی، اگرچہ اس کے بوٹ اونچی اڑی کے تھے تیر کی طرح زن سے نیچے پہنچ گئی میں جھپٹتا ہوا ٹھوکر میں کھاتا ہوا آہستہ آہستہ اتر رہا تھا۔ وہ پہاڑی کے دامن میں کھڑی مسکرا رہی تھی میری ہمت سبز ہار ہی تھی اور بار بار کہہ رہی تھی کہ کہو تو میں تمہیں ہاتھ پکڑ کر اتار لاؤں۔ بھلا میں ایسی بزدلی بھی کیا کرتا، یہ ہزار دقت زمین پر بیٹھ بیٹھ کر میں کسی نیچے اترا وہ زور سے ہنسی اور ”شباش“

شباش ”پکارنے لگی۔ غرض اس نے مجھے اور بھی شرمندہ کیا اور اسے اس کا حق بھی تھا۔

لیکن یہ کیسے ممکن تھا کہ میں بالکل صاف بیچ جاتا کیونکہ خدا کو تو یہ منظور تھا کہ مجھے جھوٹ کے ناسور سے نجات دے۔ میں ایک بار برائین گیا جو دینیٹرز کی طرح ایک صحت گاہ ہے۔ یہ دینیٹرز جانے سے پہلے کا ذکر ہے۔ وہاں ہوٹل میں ایک متوسط الحال بوڑھی بیوہ سے ملاقات ہوئی۔ یہ انگلستان میں میرا پہلا سال تھا۔ طعام (1) نامے پر جتنے کھانوں کے نام تھے سب فرانسسیسی میں تھے جو میں اس وقت تک نہیں سمجھتا تھا جس میز پر میں تھا اسی پر یہ بوڑھی خاتون بھی تھیں یہ دیکھ کر کہ میں اجنبی ہوں اور اس وقت پریشانی میں ہوں انہوں نے فوراً میری مدد کی۔ انہوں نے کہا ”معلوم ہوتا ہے کہ تم یہاں اجنبی ہو اور اس وقت کسی دقت میں مبتلا ہو تم نے اب تک کھانے کے لئے کوئی چیز کیوں نہیں منگائی؟“ میں طعام نامے کی سچے کر رہا تھا اور ویٹرز کو بلا کر پوچھنے والا تھا کہ ان میں کیا کیا چیزیں ہیں کہ اتنے میں ان نیک خاتون نے مداخلت کی میں نے ان کا شکریہ ادا کیا اور ان سے کہا کہ میں فرانسسیسی نہیں جانتا۔ اس لئے میری سمجھ میں نہیں آتا ان میں نے کون کون سے کھانے نباتاتی ہیں۔

انہوں نے کہا ”آئیے میں آپ کی مدد کروں میں طعام نامہ آپ کو سمجھا دوں گی اور یہ بتا دوں گی کہ آپ کیا کیا چیزیں کھا سکتے ہیں“ میں نے احسانمندی سے ان کی مدد قبول کی۔ اس طرح میری ان کی

ملاقات کی بنیاد پڑی جو آگے چل کر دوستی بن گئی۔ یہ دوستی میرے قیام انگلستان کے زمانے میں بلکہ اس کے بعد بہت دنوں تک قائم رہی۔ انہوں نے مجھے اپنا لندن کا پتہ دیا اور دعوت دی کہ ہر اتوار کو میرے یہاں کھانا کھایا کرو۔ اس کے علاوہ خاص خاص تقریبوں میں وہ مجھے بلایا کرتی تھیں۔ میرے حجاب کو رفع کرنے کی کوشش کرتی تھیں مجھے نوجوان خاتونوں سے ملاقاتی تھیں۔ اور گفتگو اس طرح چھیڑتی تھیں کہ مجھے ان سے باتیں کرنا پڑیں اس گفتگو میں خاص طور پر وہ ایک نوجوان خاتون کو شریک کرتی تھیں جو ان کے گھر میں رہتی تھیں۔ اور اکثر ہم دونوں کو بالکل تنہا چھوڑ دیتی تھیں۔

شروع شروع میں میں ان باتوں سے بہت گھبراتا تھا۔ نہ میں گفتگو شروع کر سکتا تھا اور نہ مجھے مذاق کرنا آتا تھا مگر انہوں نے میری رہنمائی کی اور میں رفتہ رفتہ آداب مجلس سیکھنے لگا۔ کچھ دنوں کے بعد مجھے سنیچر انتظار رہنے لگا اس نوجوان دوست سے گفتگو میں مزا آنے لگا۔

یہ بوڑھی خاتون اسی طرح میرے آس پاس جال بچھاتی رہیں۔ انہیں ہم دونوں کے ملنے سے دلچسپی تھی۔ شاید اس میں ان کا بھی کوئی مقصد تھا۔

میں عجب شش و پنج میں تھا۔ میں نے اپنے دل میں کہا کاش میں اس نیک خاتون سے یہ کہہ دیتا کہ میری شادی ہو گئی ہے۔ تب ہم دونوں کی نسبت کا منصوبہ نہ باندھتیں خیر اب بھی کچھ نہیں گیا ہے اگر میں سچا حال بیان کر دوں تو ممکن ہے کہ آئندہ اس مصیبت سے بچ جاؤں " یہ باتیں سوچ کر میں نے انہیں ایک خط لکھا جس کا مضمون قریب قریب یہ تھا۔

جب سے میری آپ کی ملاقات برائٹن میں ہوئی آپ مجھ پر بہت مہربان رہی ہیں۔ آپ نے اس طرح میری خبر گیری کی جیسے ماں بیٹے کی کرتی ہے۔ آپ کی یہ بھی رائے ہے کہ میں شادی کر لوں اور اس غرض سے آپ نے مجھے نوجوان خاتونوں سے ملایا مجھے یہ گوارا نہیں کہ بات اس سے آگے بڑھے اس سے تو میں یہ اچھا سمجھتا ہوں کہ آپ کے سامنے اعتراف کر لوں کہ میں آپ کی محبت کے قابل نہیں۔ جب میں نے آپ کے یہاں آمدورفت شروع کی مجھے اسی وقت آپ سے کہہ دینا چاہئے تھا کہ میری شادی ہو چکی ہے۔ مجھے معلوم تھا کہ انگلستان میں جو ہندوستانی طالب علم ہیں وہ اپنی شادی کو چھپاتے ہیں اور میں نے بھی ان کی تقلید کی اب میں محسوس کرتا ہوں کہ مجھے ایسا نہیں کرنا چاہئے تھا۔ مجھے یہ بھی کہہ دینا چاہئے تھا۔ کہ میری شادی بچپن میں ہو گئی تھی اور اب میں ایک لڑکے کا باپ ہوں۔ مگر مجھے خوشی ہے کہ اب خدا نے مجھے سچ بولنے کی ہمت عطا فرمائی ہے۔ کیا آپ میرا قصور معاف کر دیں گی؟ میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ میں نے اس نوجوان خاتون سے جن سے آپ نے مجھے ملایا تھا ایسی بے تکلفی

نہیں برتی جو نامناسب ہو۔ میں جانتا تھا کہ دوستی کی حد کہاں تک ہے آپ کو میری شادی کا حال تو معلوم نہیں تھا اس لئے قدرتی طور پر آپ کی خواہش تھی کہ ان کی نسبت مجھ سے ہو جائے۔ میں اپنا فرض سمجھتا ہوں کہ آپ کو سچے واقعات سے مطلع کر دوں تاکہ بات اس سے آگے نہ بڑھنے پائے۔

”اگر یہ خط پہنچنے کے بعد آپ یہ محسوس کریں کہ میں آپ کی مہمان نوازی کا مستحق نہیں ہوں تو یقین مانئیے مجھے ناگوار نہ ہوگا۔ آپ نے اپنی مہربانی اور شفقت سے مجھے ہمیشہ کے لئے زیر بار احسان کر دیا ہے۔ اگر اس کے بعد بھی آپ مجھے اپنے یہاں نہ نکالیں اور بدستور مہمانی کے قابل سمجھیں جس کا مستحق بننے کی میں انتہائی کوشش کروں گا تو ظاہر ہے کہ مجھے بے حد مسرت ہوگی اور میں اسے آپ کی لطف و کرم کی مزید علامت سمجھوں گا۔“

ناظرین کو سمجھ لینا چاہئے کہ میرے لئے ایسا خط لکھنا تھوڑی دیر کا کام نہ تھا میں نے خدا جانے کتنی بار مسودہ بنا بنا کر بدلا ہوگا۔ اسے بھیجنے کے بعد میرے دل پر سے وہ بوجھ ہٹ گیا جس سے وہ دب جاتا تھا۔ تقریباً وہی ڈاک ان کا جواب آیا جس کا مضمون کم و بیش یہ تھا۔

”آپ کا خط آیا جس میں آپ نے بڑی صاف گوئی سے کام لیا ہے۔ ہم دونوں کو خوشی ہوئی اور ہم خوب دل کھول کر رہے۔ جس غلط بیانی کے ارتکاب کا آپ کو اعتراف ہے وہ معافی کے قابل ہے۔ مگر یہ اچھا ہوا کہ آپ نے ہمیں اصلی صورت حال بتادی۔ میری دعوت بدستور قائم ہے۔ امید ہے کہ آپ اگلے اتوار کو ضرور آئیں گے ہمیں اشتیاق ہے کہ آپ کی بچپن کی شادی کے سارے واقعات سنیں اور آپ کا مضحکہ اڑائیں۔ کیا اب بھی یہ کہنے کی ضرورت ہے ہماری دوستی میں اس واقعے سے کوئی فرق نہیں آیا؟“

اس طرح میں نے جھوٹ کے ناسور سے نجات پائی۔ اسکے بعد جب کبھی ضرورت ہوئی میں نے بے تامل لوگوں سے اپنی شادی کا ذکر کیا۔

حوالہ

menu - 1

مختلف مذہبوں کا مطالعہ

میرے قیام انگلستان کے دوسرے سال کے آخر میں دو تھیو موفول سے میری ملاقات ہوئی۔ یہ دو بھائی تھے اور دونوں کنوارے۔ انہوں نے مجھ سے ”بھگوت گیتا“ کا ذکر کیا وہ سرائیڈون ارنلڈ کا ترجمہ ”نغمہ آسمانی“ پڑھ رہے تھے۔ اور انہوں نے مجھ سے یہ خواہش کی کہ اصل کتاب ان کے ساتھ مل کر پڑھوں مجھے بڑی شرمندگی ہوئی کیونکہ میں نے یہ مقدس کتاب نہ سنسکرت میں دیکھی تھی نہ گجراتی میں مجھے ان سے یہ کہنا پڑا کہ میں نے ”گیتا“ ابھی تک نہیں پڑھی مگر میں بڑی خوشی سے آپ کے ساتھ اس کا مطالعہ کروں گا اور اگرچہ میں سنسکرت بہت کم جانتا ہوں لیکن مجھے امید ہے کہ اصل کتاب کو اس حد تک سمجھ لوں گا کہ ترجمے کی مصنوعی غلطیوں کو پہچان لوں۔ غرض میں ان کے ساتھ گیتا کی تلاوت کرنے لگا اور جب دوسرے باب کے یہ اشلوک پڑھے:-

جہاں کسی نے محسوس چیزیں کی طرف توجہ کی

اس کے دل کو ان سے ایک لگاؤ سا ہو جاتا ہے

یہ لگاؤ رفتہ رفتہ خواہش بن جاتا ہے

خواہش بڑھتے بڑھتے لکن بن جاتی ہے اور آدمی کو اندھا کر دیتی ہے حافظ ہر اس ہو کر اونچے مقصد

سے ہاتھ دھولیتا ہے اور دل میں زہر پھیلادیتا ہے۔

یہاں تک کہ انسان کا دل اس کا مقصد اور خود انسان ہلاک ہو جاتا ہے۔ تو میرے دل پر بہت اثر

ہوا اور یہ آج تک میرے کانوں میں گونجتے ہیں۔ مجھے اس کتاب کی انتہائی قدر و قیمت اور عظمت کا

احساس ہوا اور اس دن سے برابر یہ احساس بڑھتا گیا۔ یہاں تک کہ اب میرے نزدیک حق کی معذرت

حاصل کرنے کے لئے اس سے بڑھ کر کوئی کتاب نہیں اس نے مایوسی اور افسردگی کی گھڑیوں میں میری بڑی مدد کی ہے۔ میں نے قریب قریب سب انگریزی ترے پڑھے ہیں اور ان میں میرے خیال میں سر ایڈون ارنلڈ کا ترجمہ بہترین ہے۔ انہوں نے متن کی پوری پابندی کی ہے اور پھر بھی یہ محسوس نہیں ہوتا کہ یہ ترجمہ ہے اگرچہ میں نے ان دوستوں کے ساتھ "گیتا" پڑھی لیکن میں یہ دعویٰ نہیں کر سکتا کہ میں نے اس دفعہ اسکا مطالعہ جیسا چاہئے کیا البتہ چند سال کے بعد میں نے اس کی مزادلت شروع کی۔

ان بھائیوں نے مجھے سر ایڈون ارنلڈ کی "نورایشیا" پڑھنے کی بھی ہدایت کی۔ میں آرنلڈ صاحب کو ایک محض "گیتا" کے مترجم کی حیثیت سے جانتا تھا۔ ان کی "نورایشیا" مجھے "گیتا" سے بھی زیادہ دلچسپ معلوم ہوئی۔ جب میں نے اسے شروع کیا تو بے ختم کئے نہ چھوڑ سکا۔ یہ دونوں بھائی مجھے بلا والسکی لاج میں بھی لے گئی اور میڈم بلا والسکی اور مسز پیمنٹ سے میرا تعارف کرایا۔ مسز پیمنٹ حال ہی میں تھیوسوفی انجمن میں داخل ہوئی تھیں اور ان کے تبدیل عقائد کے متعلق جو نزاع ہو رہی تھی اس کا میں بہت دلچسپی سے مطالعہ کرتا تھا۔ ان دوستوں نے مجھے مشورہ دیا کہ تھیوسوفی انجمن میں شریک ہو جاؤں لیکن میں نے یہ طریق مناسب انکار کر دیا اور کہا "مجھے اپنے مذہب سے بہت کم واقفیت ہے اس لیے میں کسی مذہبی انجمن میں شریک نہیں ہونا چاہتا" مجھے یاد ہے کہ میں نے ان دونوں بھائیوں کے کہنے سے میڈم بلا والسکی کی کتب "تھیوسوفی کی کنجی" بھی پڑھی اس کتاب کو پڑھ کر مجھے ہندو مذہب کی کتابیں پڑھنے کا اور بھی شوق ہو گیا اور میرے دل سے وہ غلط خیال نکل گیا جو مشنریوں نے ہمارا کھا تھا کہ ہندو مذہب میں ضعیف الاعتقادی بھری پڑھی ہے۔

اسی زمانے میں ایک نباتاتی بورڈنگ ہاؤس میں مجھے مانچسٹر کے ایک نیک عیسائی سے ملنے کا اتفاق ہوا انہوں نے مجھ سے عیسائیت کے متعلق گفتگو کی میں نے ان سے راجکوٹ کے واقعات کا جو مجھے یاد تھے، ذکر کیا انہیں یہ سن کر تکلیف ہوئی۔ انہوں نے کہا "میں گوشت نہیں کھاتا ہوں اور شراب بھی نہیں پیتا۔ یہ سچ ہے کہ بہت سے عیسائی گوشت بھی کھاتے ہیں اور شراب بھی پیتے ہیں۔ لیکن کتاب مقدس میں ان دونوں چیزوں کا حکم نہیں دیا گیا۔ مہربانی کر کے آپ بائبل ضرور پڑھئے میں نے ان کا مشورہ قبول کر لیا اور انہوں نے مجھے کتاب کا ایک نسخہ لادیا مجھے کچھ خفیف سا خیال ہے کہ وہ خود بائبل فروخت کرتے تھے اور میں نے ان سے ایک نسخہ خریدا تھا۔ جس میں مقالات کے نئے انڈیکس اور دوسری چیزیں تھیں جن سے پڑھنے والے کو مدد ملے۔ میں نے اس کا مطالعہ شروع کیا لیکن توریث کسی طرح مجھ سے آخر تک نہیں پڑھی جاتی تھی۔ میں نے کتاب تخلیق پڑھ ڈالی لیکن اس کے بعد مجھے

پڑھتے پڑھتے نیند آجاتی تھی مگر صرف یہ کہنے کے لئے کہ میں نے کتاب ختم کر لی ہے۔ دوسرے صبح بھی بہ ہزار دشواری دیکھے مگر مطلق دلچسپی نہیں ہوئی اور نہ کچھ سمجھ میں آیا "کتاب اعداد" کو پڑھ کر مجھے بڑی کوفت ہوئی۔

لیکن انجیل کا مجھ پر کچھ اور ہی اثر ہوا خصوصاً "پہاڑی کا وعظ" تو بالکل دل میں بیٹھ گیا۔ میں نے اس کا مقابلہ "گیتا" سے کیا۔ ان آیتوں کو پڑھ کر "مگر میں تجھ سے کہتا ہوں کہ بدی میں مزاحم نہ ہو بلکہ جو تیرے سیدھے گال پر تانچہ مارے اس کی طرف دوسرا گال بھی پھیر دے۔ اگر کوئی تیری قبائلی لے تو اسے عبا بھی لیجانے دے" مجھے بے حد خوشی ہوئی اور شامل بھٹ کے وہ شعر یاد آئے "جو کوئی تجھ کو پانی پلائے اس کو اچھا کھانا کھلائے" میرے نام کارخمین نے اپنی بساط کے موافق "گیتا" "نور ایشیا" اور "پہاڑی کا وعظ" کی تعلیم کو یکجا کرنے کی کوشش کی۔ یہ بات میرے دل کو لگی کہ ترک دنیا مذہب کا سب سے اونچا درجہ ہے۔

اس کتاب کے مطالعہ سے میرا یہ شوق اور بھی بڑھ گیا کہ دوسرے مذہبی پیشواؤں کی زندگی کے حالات کا مطالعہ کروں۔ ایک دوست نے مجھے کارلائل کی "ہیرو اینڈ ہیروڈور شپ" پڑھنے کی ہدایت کی۔ میں نے اس کا ایک باب "ہیرو بہ حیثیت پیغمبر کے" پڑھا اور مجھ پر پیغمبر اسلام کی عظمت، شجاعت اور زہد و اتقا کی حقیقت منکشف ہوئی۔

اس زمانے میں میں مذہب سے اس سے زیادہ واقفیت نہ حاصل کر سکا کیونکہ امتحان کی کتابوں کے مطالعے سے مجھے اتنا وقت نہیں ملتا تھا کہ کچھ اور پڑھ سکوں لیکن میں نے اپنے دل میں یہ طے کر لیا کہ میں اور مذہبی کتابیں بھی پڑھوں گا اور تمام بڑے مذہبوں سے واقفیت حاصل کروں۔

بھلا یہ کیسے ممکن تھا کہ میں دہریت سے بھی تھوڑا بہت واقف نہ ہو جاتا؟ ہر ہندوستانی بریڈلا کو اور اس کی نام نہاد دہریت کو جانتا تھا۔ میں نے بھی اس کے متعلق ایک کتاب پڑھی تھی جس کا نام مجھے یاد نہیں رہا۔ اس کا مجھ پر کوئی اثر نہیں ہوا کیونکہ میں دہریت کے لقمہ و دق صحرا سے پہلے ہی گزر چکا تھا۔ مسز پیمنٹ نے جن کی اس زمانے میں بڑی شہرت تھی دہریت سے خدا پرستی کی طرف رجوع کیا تھا۔ اس بات سے اس نفرت کو اور تقویت ہوئی جو میں دہریت کی طرف سے رکھتا تھا۔

اسی زمانے میں بریڈلا کا انتقال ہوا اور وہ دوکنگ کے قبرستان میں دفن کیا گیا میں اس کے جنازے میں بٹریک ہوا اور مجھ پر کیا موقوف ہے لندن میں جتھے ہندوستانی تھے سبھی شریک ہوئے۔ چند پادری بھی اسے دفن کرنے آئے تھے۔ قبرستان سے واپس آتے وقت میں ریل کے انتظار میں اسٹیشن پر ٹھہرنا

پڑا مجمع میں ایک دہریہ مجاہد ایک پادری کے پیچھے پڑا ہوا تھا "کیوں صاحب آپ خدا کے قائل ہیں۔
 بے چارے پادری نے آہستہ سے کہا "بے شک ہوں"
 دہرے نے بر خود غلط تبسم کے ساتھ کہا۔ آپ بھی یہ مانتے ہیں کہ کرہ زمین کا قطر اٹھائیس ہزار
 میل ہے۔

"جی ہاں"

"اچھا تو بتائیے آپ کا خدا کتنا بڑا ہے اور کہاں ہے؟"
 "کاش ہم جانتے کہ وہ ہم دونوں کے دل میں رہتا ہے"
 مجاہد نے فخریہ ہم لوگوں کی طرف دیکھ کر کہا۔ "بس بس رہنے دیجئے۔ آپ نے مجھے کوئی پچہ مقرر
 کیا ہے۔"

پادری عاجزی سے خاموش ہو گیا۔
 اس گفتگو نے مجھے دہریت سے اور بھی بدظن کر دیا۔

حوالہ

Jheas Shhisl - 1

نربل کے بل رام

کو ہندو مذہب اور دوسرے مذہبوں سے مجھے کچھ یونہی سے واقفیت ہو گئی تھی مگر مجھے سمجھ لینا چاہئے تھا کہ یہ مجھے آزمائشوں میں ثابت قدم رکھنے کے لئے کافی نہیں ہے۔ امتحان کے وقت انسان مطلق نہیں جانتا کہ کونسی چیز اس کے کام آئی۔ اگر وہ بے دین ہے تو اپنی نجات کو اتفاق سمجھتا ہے۔ اگر دیندار تو ہے کہتا ہے خدا نے بچالیا۔ وہ بعد میں یہ نتیجہ نکالتا ہے کہ مذہبی تعلیم یا روحانی تربیت کی بدولت توفیق الہی نے اس کا ساتھ دیا لیکن عین نجات کے وقت اس کے فرشتوں کو بھی خبر نہیں ہوتی کہ بچانے والی اس کی روحانی تربیت ہے یا کوئی اور چیز، کون ایسا ہے جسے اپنی روحانی قوت پر ناز ہو اور اس نے اسے مٹی میں ملنے نہ دیکھا ہو؟ ان آزمائش کے موقعوں پر دینیات کا علم بغیر دینداری کے جذبے کے پرکھ کے برابر وقعت نہیں رکھتا۔

انگلستان ہی میں مجھ پر یہ حقیقت منکشف ہوئی کہ خالی خولی مذہبی علم محض بیکار ہے۔ میں یہ نہیں کہہ سکتا کہ پہلے متعدد موقعوں پر میں نے کیونکر نجات پائی تھی کیونکہ ان دنوں میری عمر بہت کم تھی۔ مگر اب بیس برس کا ہو چکا تھا اور بیوی بچے والا بھی تھا اس لئے مجھے ان باتوں کا تھوڑا بہت تجربہ تھا۔ جہاں تک مجھے یاد ہے میرے قیام انگلستان کے آخری سال یعنی 1890ء میں پورٹسمتھ میں نباتاتیوں کی کانفرنس تھی جس میں میں اور میرے ایک ہندوستانی دوست مدعو تھے۔ پورٹسمتھ ایک بندرگاہ ہے جس میں بحری افسروں اور غلاصیوں کی بہت بڑی آبادی ہے۔ وہاں بہت سے مکان ایسے ہیں جن میں بد وضع عورتیں رہتی ہیں جو رنڈیاں تو نہیں ہیں مگر اپنے اخلاق کی طرف سے بہت بے پردہ ہیں ہم اسی قسم کے ایک مکان میں ٹھہرائے گئے۔ یہ کہنے کی ضرورت نہیں کہ مجلس استقبالیہ اس بات سے بالکل ناواقف تھی۔ پورٹسمتھ ایسے شہر میں یہ معلوم کرنا بہت مشکل تھا کہ ہمارے جیسے مسافروں کے لئے

جو دو چار دن کے لئے آتے ہیں کون سے مکان اچھے ہیں اور کون سے برے۔

ہم شام کو کانفرنس سے لوٹے۔ کھانے کے بعد ہم برج کھیلنے بیٹھے اور اس میں ہماری مالکہ مکان بھی شریک ہو گئی جیسے کہ انگلستان کے اچھے غاندانوں میں بھی دستور ہے۔ ایسے موقع پر کھیلنے والے آپس میں بے ضرر مذاق بھی کیا کرتے ہیں مگر یہاں میرے دوست میں اور مالکہ مکان میں فحش مذاق ہونے لگا مجھے نہیں معلوم تھا کہ میرے دوست اس فن میں استاد ہیں مجھ پر بھی یہ رنگ چھا گیا اور میں بھی شریک ہو گیا چہن اس وقت جب میں پتے چھوڑ چھاڑ کر حد سے آگے بڑھنے والا تھا خدا نے میرے نیک رفیق کی زبان سے یہ مبارک الفاظ کہاوائے ”صاحبزادے تم میں کہاں سے یہ شیطان سما گیا! جاؤ یہاں سے بھاگ جاؤ“

میں شرم سے پانی پانی ہو گیا۔ میں نے اس تنبیہ پر عمل کیا اور دل ہی دل میں اپنے دوست کا شکر گزار ہوا۔ مجھے وہ عہد یاد آ گیا جو میں نے اپنی ماں سے کیا تھا اور میں وہاں سے بھاگ کھڑا ہوا۔ اس شکار کی طرح جو شکاری سے بچ کر بھاگا ہو پاپتا اپنے کمرے میں پہنچا میرا بند بند لرز رہا تھا اور دل دھڑک رہا تھا۔ یہ پہلا موقع تھا کہ اپنی بیوی کے علاوہ کسی عورت کو دیکھ کر میرے دل میں شہوانی خواہش ہوئی میں نے وہ رات جاگ کر کائی۔ میرے دل میں طرح طرح کے خیالات کا جھوم تھا۔ کیا میں یہ مکان چھوڑ دوں؟ یا اس شہر سے بھاگ جاؤں میں کہاں ہوں؟ اگر میں حواس بجانہ رہے تو کی انجام ہو گا؟ میں نے یہ طے کیا اب بہت احتیاط سے کام لوں گا اس مکان سے اٹھ کر کسی اور مکان میں نہ جاؤں گا بلکہ کسی ترکیب سے پورے لسمتہ ہی سے چل دوں گا۔ کانفرنس صرف دو دن کی تھی۔ مجھے یاد ہے کہ میں دوسرے دن شام کو پورے لسمتہ سے روانہ ہو گیا۔ میرے دوست کچھ دن وہاں اور ٹھہرے رہے۔

مجھے اس وقت تک یہ نہیں معلوم تھا کہ مذہب کی یا خدا کی حقیقت کیا ہے اور خدا ہمارے دلوں پر کیونکر اثر ڈالتا ہے۔ مجھے محض ایک دھندلا سا خیال تھا کہ اس موقع پر خدا نے بجایا۔ ہر امتحان کے وقت اسی نے مجھے بجایا ہے میں جانتا ہوں کہ اب یہ الفاظ ”خدا نے مجھے بجایا“ میرے لئے بڑے گہرے معنی رکھتے ہیں پھر بھی مجھے یہ محسوس ہوتا ہے کہ میں ان کی پوری اہمیت اب تک نہیں سمجھا۔ جب تک میرا روحانی تجربہ اس سے زیادہ وسیع نہ ہو گا بس ان کو کما حقہ سمجھنے سے قاصر رہوں گا۔ لیکن مجھے جتنے امتحان پیش آئے۔ روحانی زندگی میں، وکالت کے پیشے میں، اداروں کے چلانے میں، سیاست میں، سب میں خدا نے مجھے بجایا۔ جب کوئی امید نہیں رہتی جب مددگار کام نہیں آتے اور سہارے ٹوٹ جاتے ہیں ”تو مجھے یہ محسوس ہوتا ہے کہ کہیں سے یہ مدد پہنچی، یہ نہیں معلوم ہوتا کہ کہاں سے الحاح و

زارى عبادت دعا و اداہام نہیں ہیں یہ حقیقی افعال ہیں اور ان میں کھانے پینے، بیٹھنے چلنے سے زیادہ حقیقت ہے۔ اگر یہ کہا جائے تو مبالغہ نہیں کہ صرف یہی چیزیں حقیقی ہیں اور جو کچھ ہے وہ مجازی ہے۔

یہ عبادت یا دعا و خطابت کا طرفان نہیں، محض زبانی اطاعت اور بندگی نہیں یہ وہ چیز ہے جو دل سے نکلتی ہے۔ اگر ہم تزکیہ قلب کی اس منزل پر پہنچ جائیں کہ دل ”سوائے محبت کے ہر چیز سے خالی ہو“

اگر اس کے سب تار کسے ہوئے ہوں تو ان کی لرزش نغمہ بن کر حد نظر سے آگے چل جاتی ہے ”دعا کیلئے الفاظ کی ضرورت نہیں۔ وہ بجائے خود سعی محسوس سے مستغنی ہے۔ مجھے اس میں مطلق شبہ نہیں کہ دعا کو شہوانی جذبات سے پاک کرنے کے لئے اکسیر ہے لیکن شرط یہ ہے کہ اس کے ساتھ انتہائی عاجزی بھی ہو۔“

حوالہ

1 - سورداس کے مشہور مجن کی ٹیپ جو ہر بند کے آخر میں آتی ہے ”اللہ ہے حامی بیکس کا واللہ سہارا بیکس کا۔“

نراین ہیم چندر

اسی زمانہ میں نراین ہیم چندر انگلستان آئے۔ میں نے ان کا نام بہ حیثیت مصنف کے سنا تھا۔ ہم دونوں کی ملاقات مس منیلنگ کے یہاں ہوئی جو نیشنل انڈین ایسوسی ایشن کی رکن تھیں مس منیلنگ جانتی تھیں کہ میں لوگوں سے ملنے جلنے اور بات چیت کرنے میں بہت کچا ہوں جب کبھی میں ان کے ہاں جاتا تو خاموش بیٹھا رہتا تھا اور جب تک کوئی مجھے مخاطب نہ کرے میں کسی سے نہیں بولتا تھا۔ انہوں نے مجھے نراین ہیم چندر سے ملایا۔ وہ انگریزی نہیں جانتے تھے۔ ان کا لباس عجیب تھا۔ بھدا سا ہتلون میلا کچھلا پارسی وضع کا بھورا کوٹ جس میں شکنیں پڑی ہوئی تھیں۔ اس کے ساتھ نہ کارنہ نکلتی، پھندے دار ادنی ٹوپی۔

وہ اکہرے بدن کے پستہ قد آدمی تھے۔ گول چہرے پر چھچک کے داغ، ناک نہ ستواں نہ زیادہ پھیلی ہوئی۔ منہ پر داڑھی تھی جس میں وہ برابر ہاتھ سے کنگھی کرتے رہتے تھے۔ ایسی انوکھی شکل اور زالی پوشاک کے آدمیوں پر خوش وضع لوگوں کے مجمع میں غواہ غواہ نظر ٹھکتی تھی۔ میں نے ان سے کہا ”میں نے آپ کا ذکر اکثر سنا ہے اور آپ کی بعض کتابیں بھی پڑھی ہیں۔ آپ میرے یہاں تشریف لائیں تو بڑی عنایت ہو۔“

نراین ہیم چندر کی آواز بھاری تھی۔ انہوں نے مسکرا کر کہا ”اچھی بات ہے تم رہتے کہاں ہو؟“
”اسٹور اسٹریٹ میں“

تب تو ہم دونوں پاس ہی پاس ڈہتے ہیں۔ میں انگریزی پڑھنا چاہتا ہوں پڑھا دو گے؟“
مجھے جو تھوڑا بہت آتا ہے بڑی خوشی سے اور بڑی محنت سے آپ کو پڑھاؤں گا۔ آپ فرمائیں تو

میں آپ کے یہاں حاضر ہو جایا کروں؟

”جی نہیں میں خود تمہارے یہاں آؤں گا اور ترجمے کی کتاب بھی لیتا آؤں گا“ غرض ہم نے وقت مقرر کر لیا۔ تھوڑے دنوں میں ہم دونوں میں گہری دوستی ہو گئی۔

زاین ہم چند صرف دِنحو کے بکھیرے سے پاک تھے ”گھوڑا“ ان کے نزدیک فعل تھا اور ”دوڑ“ اسم مجھے ایسی بہت سی مصحک مثالیں یاد ہیں۔ مگر وہ اس ناواقفیت کی کب پروا کرتے تھے۔ میرا طرف دِنحو کا ناچیز علم ان کی نظر میں کوئی وقعت نہ رکھتا تھا۔ گرامر نہ جانتا ان کے نزدیک کوئی شرم کی بات نہیں تھی۔

وہ بڑی بے پردائی سے کہا کرتے تھے ”میں نے تمہاری طرح اسکول میں نہیں پڑھا۔ اپنے خیالات ظاہر کرنے کے لئے مجھے کبھی صرف دِنحو کی ضرورت محسوس نہیں ہوئی۔ بنگالی بھی جانتے ہو، میں جانتا ہوں میں ہی نے مہارشی دیوانندر ناتھ نلگور کی تصانیف کا گجراتی میں ترجمہ کیا ہے اور میں چاہتا ہوں کہ اور بہت سی زبانوں کے ادبی خزانے گجراتی میں منقول کر دوں تم جانتے ہو کہ لفظی ترجمہ کبھی نہیں کرتا میں تو بس اصل مطلب کو اپنی زبان میں ادا کر دیتا ہوں۔ ممکن ہے کہ آگے چل کر مجھ سے زیادہ قابل لوگ بہتر ترجمہ کریں۔ مگر میں اپنے اسی کام میں خوش ہوں جو میں نے بغیر صرف دِنحو کے کر لیا ہے۔ میں ہندی، مرہٹی، بنگالی جانتا ہوں اور اب انگریزی پڑھ رہا ہوں بس میری یہی خواہش ہے کہ بہت سے الفاظ سیکھ لوں اور کیا تم سمجھتے ہو کہ میرا حاصلہ بس اتنا ہی ہے؟ میں ابھی فرانس جا کر فرانسیسی سکھوں گا لوگ کہتے ہیں کہ اس زبان کا بڑا وسیع ادب ہے۔ پھر ممکن ہو تو جرمنی جا کر جرمنی زبان سیکھوں گا۔ غرض وہ اسی طرح باتیں کرتے چلے جاتے تھے۔

انہیں زبانیں سکھنے کا اور غیر ملکوں کی سیاحت کا بڑا شوق تھا۔

”آپ امریکہ بھی جائیں گے نہ؟“

”ضرور جاؤں گا بھلا یہ کیسے ممکن ہے کہ بغیر ہی دنیا دیکھے ہندوستان واپس جاؤں؟“

مگر آپ کو روپیہ کہاں سے ملے گا؟

مجھے روپیہ کی کیا ضرورت ہے میں کچھ تمہاری طرح فیشن ایبل آدمی ہوں نہیں مجھے تو بس پیٹ بھرنے کو روٹی اور تن ڈھکنے کو کپڑا چاہئے۔ اور اس کے لئے جو تھوڑا بہت مجھے اپنی کتابوں سے اور دوستوں سے مل جاتا ہے کافی ہے، میں ہمیشہ تیسرے درجہ میں سفر کرتا ہوں۔ امریکہ بھی ”ڈیک“ پر جاؤں گا۔

سادگی "زاین ہیم چندر" کا حصہ تھی اور ان کی صاف گوئی بھی اسی شان کی تھی غرور انہیں چھو کر بھی نہیں گیا تھا۔ البتہ بہ حیثیت مصنف کے وہ اپنی قابلیت کا اندازہ کسی قدر زیادہ کرتے تھے۔

ہم دونوں میں روزانہ ملاقات ہوتی تھی۔ ہمارے خیالات اور طرز عمل میں بہت کچھ مشابہت تھی۔ دونوں نباتاتی تھے۔ اکثر دوپہر کا کھانا ساتھ کھاتے تھے۔ یہ وہ زمانہ تھا کہ میں ستر و شلنگ ہفتہ وار میں گزر کرتا تھا۔ اور اپنا کھانا آپ پکاتا تھا۔ کبھی میں ان کے یہاں چلا جاتا تھا۔ کبھی وہ میرے یہاں چلے آتے تھے۔ میں انگریزی طریقہ پر پکاتا تھا مگر انہیں سوائے ہندوستانی کھانے کے کچھ پسند نہ تھا۔ دال کے بغیر وہ کھانا نہیں کھا سکتے تھے۔ میں کاجر وغیرہ کا شور بہ تیار کرتا تھا اور وہ میرے مذاق پر افسوس کیا کرتے تھے۔ ایک بار انہیں کہیں سے مونگ کی دال مل گئی اور وہ پکا کر میرے یہاں لائے۔ میں نے بڑے شوق سے کھائی۔ اس کے بعد سے ہم دونوں میں مبادلے کا باقاعدہ سلسلہ قائم ہو گیا۔ میں جو اچھی چیز پکاتا تا ان کے لئے لے جاتا تھا اور وہ اپنی محبوب چیزیں میرے لئے لاتے تھے۔

اس زمانے میں کارڈنل میننگ کا نام ہر شخص کی زبان پر کھارے کھاڑی کے مزدوروں کی ہڑتال جان برنس اور کارڈنل میننگ کی کوششوں سے قبل از وقت ختم ہو گئی تھی۔ میں نے نرائین ہیم چندر سے ذکر کیا کہ ڈزرا عملی سے کارڈنل کی سادگی کی بڑی تعریف کی۔ انہوں نے کہا پھر تو میں اس رشتی سے ضرور ملوں گا میں نے کہا وہ بڑے آدمی ہیں۔ آپ کی رسائی ان تک کیسے ہوگی؟

"کیوں اس میں کیا مشکل" ہے تم میری طرف سے انہیں خط لکھوان کو یہ بتاؤ کہ میں مصنف ہوں اور ان سے مل کر انہیں اس کار خیر پر مبارک باد دینا چاہتا ہوں۔ یہ بھی لکھ دینا کہ میں تمہیں ترجمان کے طور پر لاؤں گا کیونکہ میں انگریزی نہیں جانتا۔"

میں نے اس مضمون کا خط لکھا۔ دو تین دن کے بعد اس کے جواب میں کارڈنل صاحب کا کارڈ آیا جس میں انہوں نے کہا تھا کہ فلاں وقت ہم دونوں سے ملیں گے۔ میں نے وہاں جانے کے لئے دستور کے مطابق ملاقات کا سوٹ پہنا نرائین ہیم چندر کے وہی ٹھاٹھ تھے، وہی کوٹ، پتلون میں نے چاہا کہ اس لباس کی ہنسی اڑاؤں۔ مگر انہوں نے اٹنا بھی کو بنا ڈالا۔

جو تم جیسے مہذب لوگ سب بزدل ہوتے ہیں بڑے آدمی کسی شخص کے لباس کو نہیں دیکھتے اس کے دل کو دیکھتے ہیں۔"

ہم کارڈنل کے دولت خانے پر پہنچے۔ ابھی جا کر ہم بیٹھے ہی تھے کہ ایک دبلے پٹلے لمبے سے پیر مرد برآمد ہوئے اور انہوں نے ہم سے مصافحہ کیا۔ نرائین ہیم چندر نے سلسلہ گفتگو یوں شروع کیا۔

”میں آپ کا دولت ضائع کرنا نہیں چاہتا۔ میں نے آپ کی بہت تعریف سنی تھی اور میرا جی چاہتا تھا کہ یہاں آکر اس نیک کام کا شکریہ ادا کروں جو آپ نے ہزرتوں کے لئے کیا ہے۔ میری عادت ہے کہ دنیا میں جتنے رشتی ہیں سب کی خدمت میں جیا کرتا ہوں اسی لئے میں نے آپ کو بھی زحمت دی۔“

ظاہر ہے کہ یہ ان الفاظ کا ترجمہ ہے جو انہوں نے گجراتی میں کہے تھے

”مجھے آپ کے آنے سے خوشی ہوئی۔ خدا کرے آپ کو لندن کا قیام راس آئے اور یہاں کے لوگوں سے ملنے جلنے کا موقع ملے۔ خدا آپ پر برکت نازل کرے۔“

یہ الفاظ کہ کر کارڈنل صاحب اٹھ کھڑے ہوئے اور انہوں نے ہمیں رخصت کر دیا۔ ایک بار نرائن بہیم چندر قمیض اور دھوتی پہنے ہوئے میرے یہاں چلے آئے۔ بچاری مالک مکان نے دروازہ کھولا تو وہ ڈرگئی میرے پاس چلاتی ہوئی آئی (اس کے یہاں میں نیا نیا آیا تھا اس نے وہ نرائن بہیم چندر کو نہیں جانتی تھی) اور کہنے لگی ”ایک پاگل سا آدمی تم سے ملنے آیا ہے میں دروازہ پر گیا تو کیا دیکھتا ہوں کہ نرائن بہیم چندر کھڑے ہیں۔ مجھے سخت تعجب اور صدمہ ہوا۔ مگر ان کے چہرے پر وہی مسکراہٹ تھی جو ہمیشہ رہتی تھی۔“

”مگر یہ تو کہئے آپ کو سڑک پر لڑکوں نے نہیں چھیڑا۔“

”اجی وہ میرے پیچھے دوڑے مگر میں نے کچھ پروا نہیں کی تو وہ بھی چپ ہو رہے۔“

نرائن بہیم چندر چند مہینے لندن میں قیام کرنے کے بعد پیرس گئے انہوں نے فرانسیسی پڑھنا، فرانسیسی کتابوں کا ترجمہ کرنا شروع کر دیا۔ میں اتنی فرانسیسی جانتا تھا کہ ان کے ترجمے پر نظر ثانی کر سکوں۔ اس لئے وہ ترجمہ کر کے مجھ دکھایا کرتے تھے۔ یہ ترجمہ کیا عطا صہ ہوتا تھا۔

آخر انہوں نے امریکہ جانے کا مقصد بھی پورا کیا۔ بڑی مشکل سے انہیں ڈیک کا ٹکٹ ملا۔ وہاں بھی وہ ایک بار قمیض اور دھوتی پہن کر نکلے۔ ان پر ”غیر مہذب لباس پہننے“ کے الزام میں مقدمہ چلایا گیا۔ مجھے یاد پڑتا ہے کہ وہ بری کر دئے گئے تھے۔

عظیم الشان نمائش

1890ء میں پیرس میں ایک عظیم الشان نمائش ہوئی۔ میں نے اس کی دھوم دھام کا حال پڑھا تھا اور مجھے پیرس دیکھنے کا بھی شوق تھا۔ اس لئے میں نے سوچا کہ اس وقت پیرس ہو آؤں تو ایک پنتھ دو کلج کا مضمون ہو گا نمائش کی ایک خاص کش ایفل مینار تھا جو خالص لوہے کا اور ایک ہزار فٹ بلند تھا ظاہر ہے کہ اس کے علاوہ اور بہت سی دلچسپ چیزیں بھی تھیں لیکن یہ مینار سب سے بڑھکر تھا۔ کیونکہ اس وقت لوگوں کا خیال تھا کہ اتنا اونچا مینار قائم نہیں رہ سکتا۔

میں نے پیرس کے نباتاتی ریستوران کا نام سنا تھا۔ میں نے وہاں ایک کمرہ لے لیا اور سات دن ٹھہرا۔ میں نے پیرس کا سفر اور وہاں کی سیر دونوں میں بہت کم خرچ میں کام چلایا۔ میں شہر کا ایک نقشہ اور نمائش کی گائڈ لے کر پیدل پھرا کرتا تھا ان کے ذریعے سے انسان تمام بڑی سڑکوں پر اور خاص دلچسپ جگہوں پر جا سکتا تھا۔

مجھے نمائش کے متعلق سوائے اس کے کچھ یاد نہیں کہ بڑی عظیم الشان تھی اور وہاں مختلف قسم کی دلچسپ چیزیں تھیں۔ ایفل ٹاور مجھے اچھی طرح یاد ہے کیونکہ میں دو تین بار اس پر چڑھا تھا۔ پہلی منزل پر ایک ریستوران تھا اور صرف یہ کہنے کے لئے میں نے اتنی بلندی پر کھانا کھایا ہے میں نے سات شامگ دوپہر کے کھانے پر ضائع کئے۔

پیرس کے پرانے گرجے اب تک یاد ہیں۔ ان رفعت اور شوکت اور ان کا سکون جس نے دیکھا ہے وہ بھول نہیں سکتا۔ نو ترمام کی حیرت انگیز عمارت اور سنگ تراشی کے خوبصورت نمونے جن سے اس کی اندرونی آرائش کی گئی ہے ان چیزوں کی تصویر دل سے نہیں مٹ سکتی۔ مجھے اس

دلت یہ محسوس ہوتا تھا کہ جن لوگوں نے کروڑوں خرچ کر کے یہ گرے بنوائے ہیں ان کے دل میں یقیناً خدا کی محبت ہوگی۔

میں نے پیرس کی تراش خراش اور وہاں کے لہو و لعب کے بہت سے قہے پڑھے تھے۔ یہ چیزیں ہر سڑک پر نظر آتی تھیں لیکن گرے ان مناظر سے الگ تھلگ دوسری ہی شان سے کھڑے تھے۔ جہاں انسان ان میں سے کسی گرے میں داخل ہوا وہ بھول جاتا تھا۔ کہ باہر اتنا شور مچتا ہے اس کا اندازہ بدل جاتا اور جب وہ کسی شخص کے پاس سے گزرتا تھا جو کنواری کے بت کے آگے گھٹنوں کے بل جھکا ہوا ہو تو اس کی نقل و حرکت سنجیدگی اور عقیدت سے معمور ہو جاتی تھیں مجھے جو احساس اس وقت تھا وہ اب اور گہرا ہوتا جاتا ہے کہ یہ تعظیم اور عبادت محض ضعیف الاعتقادی نہیں تھیں اور یہ لوگ جو کنواری بت کے آگے گھٹنوں کے بل جھکے ہوئے تھے محض سنگ مرمر کی پرستش نہیں کر رہے تھے ان کے دل میں سچی عقیدت کا جوش تھا اور وہ ہتھکڑی نہیں بلکہ ذات الہی کو پوجتے تھے جن کا جلوہ انہیں اس میں نظر آتا تھا مجھے یہ خیال کہ اس پرستش سے وہ خدا کے عظمت و جلال کو گھٹانا نہیں رہے بلکہ بڑھا رہے ہیں۔

میں چند الفاظ ایفل مینار کے متعلق بھی کہوں گا مجھے معلوم نہیں کہ اب اس سے کیا کام لیا جاتا ہے۔ مگر اس زمانے میں اس کی تعریف بھی بہت کی جاتی تھی اور مذمت بھی۔ مجھے یاد ہے کہ اس کی مزمت کرنے والوں میں ٹالسٹائی پیش پیش تھا۔ وہ کہتا تھا کہ ایفل مینار انسان کی دانشمندی کی نہیں بلکہ اس کی حماقت کی یادگار ہے۔ وہ تمباکو کو دنیا کا سب سے بڑا نشہ سمجھتا تھا کیونکہ تمباکو پینے والوں سے اس کے نزدیک ایسے جرم سرزد ہوتے ہیں جن کے ارتکاب کی شراہیوں کو کبھی جرات نہیں ہوتی۔ شراب تو انسان کو بالکل دیوانہ کر دیتی ہے مگر تمباکو سے اس کا تخیل دھندلا ہو کر رہ جاتا ہے۔ وہ خیالی پلاؤ پکانے اور پادور ہوا عمارتیں بنانے لگتا ہے۔ ایفل مینار اس کے خیال میں ایسا ہی تخیلی کارنامہ ہے جو انسان تمباکو کے نشے میں کر دکھاتا ہے۔ اس مینار میں آرٹ کی کوئی خوبی نہیں۔ اس سے نائش کی خوبصورتی میں کوئی مدد نہیں ملی۔ لوگ اسے جوق در جوق دیکھنے کو آتے تھے اور اس پر چڑھتے تھے کیونکہ وہ ایک نئی چیز تھی اور اونچائی میں بے نظیر۔ یہ نائش کا کھلونہ تھا۔ جب تک ہم میں بچپن ہے ہم کھلونوں کو دیکھ کر پھسل جاتے ہیں اور یہ مینار اس بات کا ثبوت ہے کہ ہم سب بچے ہیں اور دکھادے کی چیزوں پر جان دیتے ہیں۔ یہی ایفل مینار کا مقصد کہا جاسکتا ہے۔

بیرسٹر تو ہو گئے مگر اب

میں نے اب تک اس چیز کا ذکر نہیں کیا ہے جس کے لئے میں انگلستان گیا تھا۔ یعنی بیرسٹری کا امتحان۔ اب ذرا اس کا بھی مختصر سا حال بیان کر دوں۔

باضابطہ بیرسٹر بننے کے لئے دو شرطیں پوری کرنا پڑتی تھیں۔۔ بارہ ٹرم یعنی تین سال کی حاضری اور امتحانوں میں کامیابی۔ حاضری سے مراد یہ تھی کہ ہر ٹرم کی چوبیس ڈنر کی دعوتوں میں سے کم سے کم چھ میں شرکت کی جائے۔ شرکت کے لئے کھانا کھانے کی ضرورت نہ تھی بلکہ مقررہ وقت پر پہنچ جانا اور ڈنر کے آخر تک موجود رہنا کافی تھا۔ عام طور پر لوگ بہت خوشی سے یہاں کے ڈنر اور نفیس شرابوں سے لطف اٹھاتے تھے۔ اور ڈنر کی قیمت ڈھائی شلنگ سے تین شلنگ تک۔ بہنی دو روپے سے تین روپے تک ہوتی تھی۔ یہ کم سمجھی جاتی تھی کیونکہ ہونٹوں میں اتنے دام فقط شراب ہی کے دینے پڑتے تھے۔ ہمارے ہندوستان میں جو لوگ ”مہذب“ نہیں ہیں انہیں یہ باب عجیب معلوم ہوتی ہے کہ پینے کی چیز کے دام کھانے سے زیادہ ہوں۔ مجھے جب یہ پہلی بار معلوم ہوا تو سخت تعجب اور صدمہ ہوا۔ میں سوچتا تھا کہ یہ لوگ شراب پر اتنا روپیہ ضائع کر دیتے ہیں اور ان کا دل نہیں دکھتا آگے چل کر میں اس راز کو سمجھ گیا، میں اکثر ان دعوتوں میں کچھ نہیں کھاتا تھا۔ میرے کھانے کی چیزیں صرف روٹی و آلو اور گوہی تھیں۔ ابتدا میں یہ چیزیں نہیں کھاتا تھا کیونکہ یہ مجھے پسند نہیں تھیں اور آگے چل کر جب یہ پسند آنے لگیں تو اس دقت تک مجھ میں اتنی جرات بھی پیدا ہو گئی تھی کہ اور کھانوں کی فرمائش کر سکوں۔

منظموں کو طالب علموں سے اچھا کھانا ملتا تھا میں نے اور ایک پارسی طالب علم نے جو میری طرح نباتاتی تھا یہ درخواست دی کہ نباتاتی مشرب کی رعایت سے ہمیں وہ نباتاتی کھانے ملیں جو منظموں کو

دئے جاتے ہیں۔ یہ درخواست منظور ہو گئی اور ہمیں منظموں کی میز سے پھل اور ترکاریاں ملنے لگیں۔ چار چار آدمیوں میں شراب کی دو دو بوتلیں ملتی تھیں۔ اور چونکہ میں انہیں چھو تاکہ نہ تھا اس لئے مجھ سے لوگ ہمیشہ اصرار کرتے تھے کہ ان کے حلقے میں شریک ہو جاؤں تاکہ دو بوتلیں تین آدمیوں کے حصے میں آئیں۔ ہر ٹرم میں ایک ”بڑی رات“ منائی جاتی تھی اور اس موقع پر علاوہ رپورٹ اور شیری کی مقررہ بوتلوں کے شامپین وغیرہ بھی ملتی تھی۔ مجھ سے اس رات کے آنے میں خاص اصرار ہوتا تھا اور سب لوگ مجھے اپنے پاس بٹھانے کی کوشش کرتے تھے۔

میری سمجھ میں نہ اس وقت آیا تھا اور نہ اب تک آیا ہے کہ ڈنر کھا کر طالب علموں میں بیرسٹری قابلیت کیونکر پیدا ہو جاتی ہے۔ ایک زمانے میں ان دعوتوں میں بہت کم طالب علم آیا کرتے تھے اس لئے انہیں منظموں سے گفتگو کا موقع ملتا تھا اور تقریریں بھی ہوتی تھیں۔ اس صحبتوں سے انہیں دنیا کا تجربہ حاصل ہوتا تھا ان کے مذاق میں سحر اپن اور نفاست پیدا ہوتی تھی اور ان کی قوت گویائی بڑھ جاتی تھی لیکن میرے زمانے میں باتیں ناممکن تھیں کیونکہ منظموں کی میز حفظ مراتب کے خیال سے طالب علموں سے دور بچھتی تھیں یہ رسم رفتہ رفتہ بے معنی ہو گئی ہے لیکن قدامت پسند انگلستان نے اسے بدستور قائم رکھا ہے۔

نصاب تعلیم بہت سہل تھا اور بیرسٹروں کو لوگ مذاق میں دو ڈنر بیرسٹر کہتے تھے ہر شخص جانتا تھا کہ امتحان کی کوئی وقت نہیں ہے میرے زمانے میں دو امتحان ہوتے تھے ایک رومی قانون میں اور ایک عام قانون میں۔ ان کے لئے باقاعدہ کتابیں مقررہ تھیں جن میں لوگ کئی بار کر کے امتحان دے سکتے تھے۔ مگر شاید ہی کوئی شخص ان کتابوں کو پڑھتا ہو۔ مجھے معلوم ہے کہ بہت سے لوگوں نے محض خلاصہ اور شرح پڑھ کر رومی قانون کا امتحان دو ہفتے میں اور عام قانون کا دو تین مہینے میں پاس کر لیا۔ سوالات کے پرچے سہل ہوتے تھے۔ اور مطمئن دل کھول کر نمبر دیتے تھے۔ رومی قانون کے امتحان میں پچانوے سے ننانوے فیصد تک اور آخری امتحان میں ستر فیصدی بلکہ اس نے زیادہ امیدوار پاس کئے جاتے تھے۔ اس لئے فیل ہونے کا خوف بہت کم تھا اور امتحان سال میں ایک بار نہیں بلکہ چار بار ہوتا تھا۔ ان سہل امتحانوں میں کسی کو دشواری محسوس نہ ہوتی تھی۔

لیکن میں نے اپنے لئے دشواری پیدا کر ہی لی میں اپنا فرض سمجھتا تھا کہ میں ساری درسی کتابیں پڑھوں۔ میرے لئے کتابوں کو نہ پڑھنا قابلی تھی میں نے ان کے خریدنے میں بہت روپیہ صرف کیا میں نے یہ طے کیا کہ رومی قانون لاطینی کتابوں سے پڑھوں گا۔ جینی لاطینی میں نے لندن کے میٹرکولیشن

امتحان کے لئے پڑھی تھی وہ بہت کام آئی اور اس مطالعہ سے آگے چل کر جنوبی افریقہ میں بڑا فائدہ ہوا کیونکہ وہاں رومی و لندیزی قانون رائج تھا جسٹینین کی کتابیں پڑھنے سے مجھے جنوبی افریقہ کا قانون سمجھنے میں بہت مدد ملی۔

انگلستان کے عام قانون کو پڑھنے میں مجھے نو مہینے تک اچھی خاصی محنت کرنا پڑی۔ کیونکہ بر دم کی "قانون نام" کو (یہ ضخیم کتاب ہے، مگر دلچسپ) پڑھنے میں بہت دن لگ گئے۔ "Equity" دلچسپ تھی۔ اس کا سمجھنا ذرا مشکل تھا۔ دہائٹ اور ٹیوڈر کی کتاب "معرکے کے مقدمے" جس میں سے چند مقدمے نصاب میں تھے دلچسپ اور مفید تھی۔ میں نے ولیم کی "Real Property" اور گوڈایو کی "اصول عدل" کو بھی شوق سے پڑھا۔ ولیم کی کتاب نادل معلوم ہوتی تھی۔ ہندوستان واپس آنے کے بعد میں نے صرف ایک کتاب مین کی "دھرم شاستر" اس قدر شوق سے پڑھی ہے۔ مگر یہاں ہندوستان کی قانونی کتابوں کے ذکر کا موقع نہیں۔

میں نے اپنے امتحان پاس کر لئے 10 جون 1891ء کو مجھے بیرسٹری کی سند ملی۔ 11 جون کو میرا نام ہائی کورٹ میں درج ہوا اور 12 جون کو میں جہاز میں بیٹھ کر ہندوستان روانہ ہو گیا۔ لیکن باوجود تعلیم ختم کرنے کے مجھ پر خوف اور مایوسی طاری تھی۔ میں اپنے آپ میں دکالت کرنے کی قابلیت نہیں پاتا تھا۔

اس یاس اور بے بسی کو بیان کرنے کے لئے ایک علیحدہ باب چاہئے۔

میری بے بسی اور مایوسی

بیرسٹر ہو جانا سہل تھا مگر بیرسٹری کرنا دشوار۔ میں نے قانون پڑھا تھا لیکن قانون سے کام لینا نہیں سیکھا تھا میں نے "قانونی مقولے" شوق سے پڑھے تھے مگر انہیں اپنے پیٹے میں برتنا نہیں جانتا تھا۔ ان میں سے ایک مقولہ تھا "اپنی ملک کو اس طرح استعمال کر دو کہ اس سے دوسروں کی املاک کو نقصان نہ پہنچے" مگر میری سمجھ میں نہ آتا تھا کہ اسے انسان اپنے موکل کے حق میں کیونکہ استعمال کرے۔ اس مقولے کے متعلق جتنے معرکے کے مقدمے تھے میں نے سب کا مطالعہ کیا تھا لیکن مجھے یہ اطمینان نہ تھا کہ میں اسے خود اپنے مقدموں میں کام میں لاسکوں گا۔

علاوہ اس کے میں نے ہندوستان کا قانون بالکل نہیں پڑھا تھا۔ دھرم شاستر اور قانون شرع محمدی کا ایک حرف بھی نہیں جانتا تھا۔ مجھے عرضی دعوے تک لکھنا نہ آتا تھا کہ کیسے کام چلے گا۔ میں نے سنا تھا کہ سرفیروز شاہ مہتا عدالت میں شیر کی طرح گرجتے ہیں۔ میری سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ انہوں نے انگلستان میں یہ کیسے سیکھ لیا۔ ان کی سی قانونی سوج بوج حاصل کرنا تو درکنار مجھے اس میں بھی بہت شبہ تھا کہ میں اس پیٹے سے پیٹ بھرنے کے لائق کما سکوں گا۔

جب میں قانون پڑھتا تھا تو یہ شبہ اور دوسو سے میرے دل میں رہتے تھے میں نے اپنی مشکلیں اپنے چند دوستوں سے بیان کیں۔ ان میں سے ایک نے کہا کہ دادا بھائی نوروجی سے مشورہ کرو۔ میں پہلے کہہ چکا ہوں کہ انگلستان جاتے وقت میرے پاس دادا بھائی نوروجی کے نام تعارف کا خط تھا۔ میں نے اس سے بہت دیر میں کام لیا۔ میں سوچتا تھا کہ مجھے اتنے بڑے آدمی کو زحمت دینے کا کوئی حق نہیں۔ جب کبھی ان کی کسی تقریر کا اعلان ہوتا تھا تو میں وہاں جاتا تھا۔ ہال کے ایک کونے میں بیٹھ کر سنتا تھا اور

دیدار و گفتار کا لطف اٹھا کر چلا آتا تھا۔ طالب علموں سے گہرا تعلق پیدا کرنے کے لئے انہوں نے ایک انجمن قائم کی تھی۔ میں اس کے جلسوں میں جایا کرتا تھا اور دادا بھائی کو طالب علموں سے جو محبت تھی اور ان لوگوں کے دل میں ان کا جو احترام تھا اسے دیکھ کر خوش ہوتا تھا۔ رفتہ رفتہ مجھے اتنی ہمت ہو گئی کہ میں نے تعارف کا خط پیش کر دیا انہوں نے کہا ”تمہارا جب جی چاہے آؤ اور مجھ سے مشورہ لو“ لیکن میں نے اس دعوت سے کبھی فائدہ نہیں اٹھایا۔ میں سمجھتا تھا کہ بغیر اشد ضرورت کے انہیں زحمت دینا مناسب نہیں ان لئے جب میرے دوست نے کہا میں دادا بھائی نوروجی سے مل کر اپنی مشکلیں ان کے سامنے پیش کروں تو مجھے اس کی جرأت نہ ہوئی۔ انہیں دوست یا کسی اور صاحب کی رائے ہوتی کہ میں فریڈرک پنکٹ صاحب سے ملوں۔ یہ قدامت پسند تھے مگر انہیں ہندوستانی طالب علموں سے خاص اور بے غرض محبت تھی۔ بہت سے طالب علم ان سے مشورہ لیا کرتے تھے میں نے بھی ملاقات کی درخواست کی جسے انہوں نے منظور کر لیا۔ میں اس ملاقات کو کبھی نہ بھولوں گا۔ انہوں نے دوستانہ میرا خیر مقدم کیا اور میری مایوسی کو اپنے قہقہوں سے دور کر دیا۔ انہوں نے کہاں تم سمجھتے ہو کہ ہر شخص کے لئے فیروز شاہ مہتا ہونا ضروری ہے؟ فیروز شاہ اور بدرالدین جیسے لوگ بہت کم ہوتے ہیں۔ یقین مانو کہ معمولی وکیل ہونے کے لئے کسی خاص قابلیت کی ضرورت نہیں وہ محض ایمانداری اور محنت کی بدولت گزر کر سکتا ہے۔ سب مقدمے پیچیدہ نہیں ہوتے۔ اچھا یہ بتاؤ تمہارا عام مطالعہ کہاں تک ہے؟

جب میں نے ان سے اپنے محدود ذخیرہ معلومات کا ذکر کیا تو میں نے دیکھا کہ انہیں کسی قدر مایوسی ہوئی۔ اگر یہ حالت محض ایک لمحے تک رہی چشم زدن میں ان کا چہرہ خوشگوار تبسم سے دکنے لگا اور وہ کہنے لگے ”میں تمہاری مشکل سمجھ گیا۔ تمہارا عام مطالعہ بہت کم ہے۔ تمہیں دنیا کا تجربہ مطلق نہیں۔ حالانکہ یہ ایک وکیل کے لئے ناگزیر ہے تم نے ہندوستان کی تاریخ تک نہیں پڑھی۔ وکیل کو انسانی فطرت سے واقف ہونا چاہئے۔ اس میں یہ قابلیت ہونا چاہئے کہ انسان کی سیرت کو اس کی صورت سے پہچان لے اور ہندوستان کی تاریخ جاننا تو ہر ہندوستانی کے لئے ضروری ہے۔ اسے قانونی پیشے سے کوئی تعلق نہیں مگر تمہیں اتنی معلومات ضروری ہونا چاہئے۔ تمہارے کہنے سے معلوم ہوا کہ تم نے کے اور مسیلیں کی تاریخ عذر 1857ء بھی نہیں پڑھی، جاؤ اسے فوراً شروع کر دو اور دو اور کتابیں پڑھو جن سے انسانی فطرت کو سمجھنے میں مدد ملے“ آخر میں ان کا اشارہ لافاڑ اور شمیل پینگ کی کتابوں کی طرف جو علم تھیانہ کے متعلق لکھی گئی ہیں۔

میں ان محترم دوست کا بہت شکر گزار ہوا۔ ان کے سامنے میرا سارا خوف جاتا رہا لیکن جیسے ہی میں

ان سے رخصت ہوا پھر فکروں میں گھر گیا۔ گھر جاتے ہوئے مجھے ان دونوں کتابوں کا خیال آیا اور میں اس اڈھیر بن میں مبتلا ہو گیا کہ انسان کی صورت سے اس کی سیرت کا پتہ کیوں کر چلایا جائے۔ دوسرے دن میں نے لافاٹر کی کتاب خرید لی۔ شمیل پینک والی دو کا نڈار کے یہاں ہی تھی۔ میں نے لافاٹر کی کتاب پڑھی جو مجھے اسینل کی " (Equity) سے بھی زیادہ مشکل معلوم ہوئی میری طبیعت اس میں بالکل نہیں لگی۔ میں نے اس میں شیکسپیر کے تھیانے کا بہت غور سے مطالعہ کیا مگر مجھے یہ ڈھب نہ آیا کہ ان لوگوں میں سے جو لندن کی سڑکوں پر پھرتے تھے شیکسپیر کو جھانٹ لوں۔

لافاٹر کی کتاب سے میرے علم میں کوئی اضافہ نہیں ہوا پنکٹ صاحب کی نصیحت سے مجھے براہ راست بہت کم فائدہ ہوا مگر ان کی محبت بہت کام آئی انکا مسکراتا ہوا بے بناوٹ چہرہ میری آنکھوں میں پھر تار ہا اور مجھے ان کی اس رائے پر بھروسہ ہو گیا کہ وکیل بننے کے لئے اس سوجھ بوجھ قابلیت اور حافظے کی ضرورت نہیں جو فیروز شاہ میں ہے۔ بلکہ ایمانداری اور محنت کافی ہے اور چونکہ مجھ میں ان دونوں باتوں کی کمی نہ تھی اس لئے مجھے کسی قدر طمینان ہو گیا۔

میں کے اور سلبین کی تاریخ انگلستان نہیں پڑھ سکا مگر میں نے جنوبی افریقہ میں پڑھی کیونکہ میں نے طے کر لیا تھا کہ جب موقع لگا اس کتاب کا مطالعہ کروں گا۔

غرض دل میں مایوسی کے ساتھ خفیف سی امید لئے ہوئے میں "آسام" نامی جہاز سے ساحل بمبئی پر اترابندر گاہ میں سمندر میں تلاطم تھا اس لئے مجھے ایک کشتی میں بیٹھ کر کنارے پر جانا پڑا۔

حصہ دوم

رائے چندر بھائی

میں پچھلے باب میں کہ چکا ہوں کہ بمبئی کی بندرگاہ میں سمندر میں تلاطم تھا جون اور جولائی میں بحر ہند کا طوفانی ہونا کوئی غیر معمولی بات نہیں ہے۔ عدن سے یہاں تک کم و بیش ہوا کا زور رہا قریب قریب ہر مسافر مستی اور دوران مسر میں مبتلا تھا۔ البتہ میں بالکل چاق تھا اور ڈک پر کھرا طوفانی سمندر کا تماشہ دیکھتا تھا۔ اور موجوں کے تھپیڑوں کا لطف اٹھاتا تھا تاشے کے وقت میرے علاوہ دو ہی ایک آدمی اور ہوتے تھے۔ جی کادلیہ کھانے وقت رکابوں کو احتیاط سے گود میں رکھ لیتے کہ کہیں سارا دلیہ ان کے جسم پر نہ آن پڑے۔

یہ بیرونی طوفان میرے لئے اندرونی طوفان کی علامت تھا مگر جس طرح پہلے طوفان سے میرے پائے ثبات کو لغزش نہیں ہوئی۔ اسی طرح دوسرے طوفان سے بھی میں نہیں گھبرایا۔ ایک طرف برادری سے نبٹا تھا دوسری طرف دکالت شروع کرنے کی دتھیں تھیں جن کا میں ذکر کر چکا ہوں۔ تیسری طرف مصلح کی حیثیت سے میں دماغ سوزی کر رہا تھا کہ فلاں فلاں اصلاحوں کے شروع کرنے کا بہترین طریقہ کیا ہے لیکن ابھی میرے لئے اور مصیبتیں تھیں جن کی مجھے خبر تک نہ تھی۔

میرے بڑے بھائی مجھ سے ملنے کے لئے بندرگاہ پر آئے تھے۔ وہ ڈاکٹر مہتا اور ان کے بڑے بھائی سے پہلے ہی مل چکے تھے اور چونکہ ڈاکٹر مہتا نے مجھے اپنے یہاں ٹھہرانے پر اصرار کیا اس لئے ہم سیدھے ان کے یہاں گئے۔ اس طرح جو ملاقات انگلستان میں شروع ہوئی تھی وہ ہندوستان میں جاری رہی اور رفتہ رفتہ دونوں میں مستقل دوستی ہو گئی۔

میں اپنی ماں کو دیکھنے کے لئے تڑپ رہا تھا۔ مجھے یہ معلوم نہیں تھا کہ وہ مجھے گلے سے لگانے کے لیے دنیا میں موجود نہیں اب مجھے یہ اندوہناک خبر ملی اور میں نے دستور کے مطابق آشتان وغیرہ کیا۔ ان

کا خیال میرے تمام انگلستان ہی کے زمانے میں ہو چکا تھا مگر میرے بھائی نے مجھ سے یہ خبر پوشیدہ رکھی تھی۔ وہ چاہتے تھے کہ پردیس میں مجھے یہ شدید صدمہ نہ پہنچے۔ پھر بھی جب میں نے یہ خبر سنی تو میرے دل کو بڑا دھچکا لگا مگر اس کا ذکر تفصیل سے کرنا مناسب نہیں مجھے استارنج ہوا کہ والدہ کے مرنے کا بھی نہ ہوا تھا۔ بہت سی امیدیں جنہیں میں نے دل میں جگہ دی تھی خاک میں مل گئیں۔ لیکن مجھے یاد ہے کہ میں نے اظہار غم میں بے اعتدالی نہیں کی میں آنسو تک پی جاتا تھا اور زندگی کے دھندوں میں مصروف رہتا تھا جیسے کچھ ہوا ہی نہ تھا۔ ڈاکٹر مہتا نے مجھے بہت سے دوستوں سے ملوایا۔ ان میں سے ایک ان کے بھائی ریوا شکر جگ۔ جیون تھے جن سے مجھ سے عمر بھر کے لئے دوستی ہو گئی۔ خاص طور پر قابل ذکر ملاقات رائے چندر یاراجا چندر شاعر کی ہے یہ ڈاکٹر مہتا کے بڑے بھائی کے داماد تھے اور اس جوہری کی دوکان میں حصہ دار تھے جو ریوا شکر جگ۔ جیون کے نام سے تھی۔ اس زمانے میں ان کی عمر پچیس سے بھی کم تھی لیکن پہلی ملاقات میں مجھے معلوم ہو گیا کہ یہ ذی علم اور نیک سیرت ہیں۔ وہ "شنتو ذہنی" (1) بھی سمجھے جاتے تھے۔ اور ڈاکٹر مہتا نے مجھ سے اصرار کیا کہ ان کے حلقے کے کارنامے ضرور دیکھوں مجھے یورپ کی زبانوں کے جتنے الفاظ آتے تھے سب میں نے کہہ ڈالے اور پھر ان شاعر سے فرمائش کی کہ انہیں دہرائیں۔ انہوں نے بالکل اسی ترتیب سے جیسے میری زبان سے نکلے تھے دہرائے مجھے ان کی اس قوت پر رشک آیا لیکن میرے دل پر اس کا کچھ زیادہ اثر نہیں ہوا۔ البتہ ایک چیز نے میرے دل کو موہ لیا اور اس کی مجھے بعد میں خبر ہوئی۔ یہ ان کا وسیع مذہبی علم ان کا بے داغ کردار اور ان کا تکمیل نفس کا جوش تھا۔ آگے چل کر مجھے معلوم ہوا کہ یہی آخری چیز ان کی زندگی کا مقصد ہے۔ مکتانند کے یہ شعر ان کے درد زبان رہتے تھے اور ان کے لوح دل پر نقش تھے۔

میں نے اپنے آپ کو سعید صرف اس وقت سمجھوں گا

جب مجھ روزمرہ کے ہر کام میں اس کا جلو نظر آئے۔

سچ تو یہ ہے کہ اس کی ذات پاک مکتانند کا رشتہ حیات ہے۔

رائے چندر بھائی کا تجارتی کاروبار لاکھوں کا تھا وہ میرے موتی کے بڑے مبصر تھے۔ کاروبار کے مشکل سے مشکل مسئلوں کو وہ چٹکیوں میں حل کر دیتے تھے۔ لیکن یہ ساری چیزیں ان کی زندگی کا مرکز اور مدار نہ تھیں۔ اس کا مرکز عرفان الہی تھا۔ ان کی کاروباری میز پر علاوہ اور چیزوں کے مذہبی کتابیں اور ان کا روزنامہ بھی رہتا تھا۔ جیسے ہی انہیں کام سے فرصت ہوتی تھی وہ کوئی مذہبی کتاب یا اپنا روزنامہ کھول کر بیٹھ جاتے تھے۔ ان کی جتنی کتابیں شائع ہوئی ہیں اکثر اسی روزنامے سے نقل کی گئیں

ہیں۔ جو شخص اہم تجارتی معاملوں کی گفتگو ختم کرتے ہیں روح کے پوشیدہ اسرار پر غلبہ فرمائی کرنے لگے۔ ظاہر ہے کہ وہ کاروباری آدمی نہیں بلکہ سچا صاحب حق ہے اور میں نے انہیں ایک دوبار نہیں بلکہ عین کاروبار کے درمیان معرفت الہی کے خیالوں میں ڈوبا ہوا دیکھا ہے۔ میرے سامنے کبھی ایسا نہیں ہوا کہ ان کے اطمینان قلب میں غل آیا ہو۔ مجھ میں اور ان میں کوئی کاروباری یا خود غرضی کے تعلقات نہیں تھے۔ مگر آپس میں بڑا میل جول تھا جب کبھی ان سے ملاقت ہوتی تھی وہ سنجیدہ مذہبی مسائل پر گفتگو چھیڑ دیتے۔ اگرچہ میں اس وقت تک گمراہی میں تھا اور مذہبی بحثوں سے زیادہ دلچسپی نہ رکھتا تھا۔ پھر مجھے ان کی گفتگو میں بے حد لطف آتا تھا۔ جب سے اب تک میں بہت سے مذہبی پیشواؤں اور معلموں سے بلا ہوں۔ میں نے یہ کوشش کی ہے کہ ہر مذہب کے سردار کی زیارت کروں لیکن حقیقت یہ ہے کہ میں کسی سے استامتاثر نہیں ہوا جتنا رائے چندر بھائی سے۔ ان کے الفاظ میرے دل میں اتر جاتے تھے۔ ان کی دماغی قابلیت کی میں اتنی ہی عزت کرتا تھا جتنی ان کے اطلاقی جوش کی اور اور مجھے صمیم قلب سے یقین تھا کہ وہ مجھے جان بوجھ کر گمراہ نہیں کریں گے اور مجھے اپنے دل کے گہرے بھید بتادیں گے۔ اس لئے جب میں روحانی کشمکش میں مبتلا ہوتا تھا تو انہیں کے دامن میں پناہ لیتا تھا۔

مگر باوجود اس کے کہ میں ان کا اس قدر احترام کرتا تھا۔ میں انہیں اپنے دل میں گرد کی جگہ نہیں دے سکتا تھا۔ یہ جگہ اب تک خالی ہے اور میری تلاش جاری ہے۔

میں ہندوؤں کے گرد کے نظر کے قائل ہوں اور اسے تکمیل نفس کے لئے بہت اہم سمجھا جاتا ہوں۔ میرے خیال میں یہ اصول بڑی حد تک صحیح ہے کہ بے گرد کے سچا علم حاصل نہیں ہوتا۔ دنیاوی چیزوں میں تو ناقص استاد پر بھی کثافت کی جاسکتی ہے مگر دینی امور میں بے مرشد کمال کے تسکین نہیں ہوتی۔ گرد کے حنث پر صرف وہی آدمی بٹھایا جاسکتا ہے جو پورا گیانی ہو اس لئے انسان کو خود اپنی تکمیل نفس کی ان تھک کوشش کرنا چاہئے کیونکہ اس گرد اس کے استحقاق کا ملتا ہے تکمیل نفس کی انتہائی کوشش ہر شخص کا حق ہے۔ یہ آپ ہی اپنا اجر ہے۔ باقی جو کچھ ہے خدا کے ہاتھ ہے۔

گو میں رائے چندر بھائی کو اپنے دل میں گرد کی جگہ نہ دے سکا مگر ہم آگے چل کر دیکھیں گے کہ متعدد موقعوں پر وہ میرے رہنا اور مددگار ہے۔ جدید زمانے کے عین شخصوں نے مجھے متاثر کیا اور میرے دل کو موہ لیا۔ رائے چندر بھائی نے اپنے فیض صحبت سے، نالسنائی نے اپنی اس کتب سے "سلطنت الہی تمہارے دل کے اندر ہے" اور سلکن نے اپنے "آخری انجام" سے۔ مگر ان چیزوں کی تفصیل اپنی اپنی جگہ پر آئے گی۔

حوالہ

1- وہ شخص جو ایک دقت میں سو باتیں یاد رکھتا ہے یا سو کاموں کی طرف متوجہ رہتا ہے

میں نے زندگی کیوں نکر شروع کی

میرے بڑے بھائی نے مجھ سے بہت کچھ امیدیں باندھ رکھی تھیں۔ ان کو مال و دولت اور عزت اور شہرت کی بڑی آرزو تھی۔ وہ بڑے فرامدل تھے۔ حد سے زیادہ فیاض ان صفتوں کے علاوہ ان کی طبیعت میں سادگی بہت تھی۔ اس لئے ان سے بہت سے لوگوں سے دوستی تھیں۔ انہیں امید تھی کہ ان دوستوں کے ذریعے سے مجھے مقدمے دلوائیں گے۔ انہوں نے خواہ مخواہ یہ سمجھ رکھا تھا کہ میری وکالت خوب چلے گی اور اس توقع پر گھر کا خرچ بڑھا دیا تھا۔ انہوں نے میری وکالت کے لئے زمین ہموار کرنے میں کوئی دقیقہ نہیں اٹھا رکھا تھا۔

میری برادری کے لوگوں میں میرے پردیس کے سفر کے سبب سے اب تک بلبل بچی ہوئی تھی۔ اس مسئلے نے برادری کو دو فرقوں میں تقسیم کر دیا جن میں سے ایک نے تو مجھے فوراً پھر سے ذات میں شامل کر لیا مگر دوسرا میرے اخراج پر اڑا ہوا تھا۔ پہلے فریق کو خوش کرنے کے لئے میرے بھائی مجھے راجکوٹ لے جانے سے پہلے پاک دریا میں اٹھان کرانے نامک لے گئے اور راجکوٹ پہنچ کر انہوں نے برادری کو دعوت دی مجھے یہ باتیں پسند نہیں تھیں لیکن میرے بھائی کو مجھ سے بے حد محبت تھی اور میں دل و جان سے ان کی اطاعت کرتا تھا۔ اس لئے جو وہ کہتے تھے میں چپ چاپ کرتا تھا اور ان کی مرضی کو قانون سمجھتا تھا۔

جس حلقے نے مجھے داخل کرنے سے انکار کر دیا تھا میں نے اس میں جانے کی کبھی کوشش نہیں کی اور اس کے کسی سرگروہ کی طرف سے میرے دل میں ذرا بھی شکایت نہ تھی۔ ان میں سے بعض مجھے ناپسندیدگی کی نظر سے دیکھتے تھے لیکن میں بہت خیال رکھتا تھا ان کی روئے میرے عزیزوں میں سے

کوئی یہاں تک کہ میرے ساس سسر اور سالی سالیوں بھی مجھے اپنے یہاں نہیں رکھ سکتے تھے اور میں ان کے یہاں پانی نہیں پی سکتا تھا۔ وہ اس کے لئے تیار تھے کہ پوشیدہ طور پر اس مانعت کی خلاف ورزی کریں لیکن یہ بات میری طبیعت کے خلاف تھی کہ جو کام کھلم کھلانہ کر سکوں اسے چھپا کر کروں۔ میری اس احتیاط کا نتیجہ یہ ہوا کہ برادری والوں نے مجھے کبھی نہیں ستایا بلکہ جو لوگ مجھے اب تک برادری سے خارج سمجھتے ہیں ان میں سے اکثر نے میرے ساتھ ہمیشہ لطف و کرم کا برتاؤ کیا ہے۔ یہاں تک کہ انہوں نے میرے کام میں میری مدد کی ہے۔ اور اس کے بدلے میں مجھ سے کبھی یہ توقع نہیں کی کہ میں برادری کی کوئی خدمت کروں میرا عقیدہ یہ ہے کہ ان کا یہ حسن سلوک میرے عدم مزاحمت کا نتیجہ ہے۔ اگر میں برادری میں داخل ہونے کے لئے جدوجہد کرتا اس میں اور تفریق ڈالنے کی کوشش کرتا، برادری والوں کو اشتعال دلاتا تو وہ مجھ سے بدلا لیتے اور انگلستان سے آنے کے بعد میں اس طوفان سے محفوظ رہنے کے بجائے فتنہ و فساد کے گرداب میں مبتلا ہو جاتا اور کوئی عجب نہیں کہ مجھے ظاہر داری اور زمانہ سازی سے کام لینا پڑتا۔

بیوی سے میرے تعلقات اب تک حسب دستور نہیں تھے۔ انگلستان کے قیام سے بھی میری بدگمانی کی عادت دور نہیں ہوئی تھی۔ میں ذرا ذرا سی بات میں بے جا شک اور چڑچڑے پن سے کام لیتا تھا جس کے سبب سے میری دلی خواہشیں پوری نہیں ہوتی تھیں۔ میں نے طے کیا تھا کہ اپنی بیوی کو بڑھنا لکھنا سکھاؤں لیکن میری شہوت پرستی اس میں حائل ہوتی تھیں اور میرے عیبوں کی سزا انہیں بھٹنا پڑتی تھی۔ ایک بار تو میں نے یہاں تک کیا کہ انہیں میکے بھیج دیا اور جب تک بے چاری رنج سے ہلکان نہ ہو گئیں واپس نہیں بلایا۔ آگے چل کر میری سمجھ میں آیا کہ یہ سب باتیں محض میری حالت کا نتیجہ تھیں۔

میں نے بچوں کی تعلیم میں اصلاح کی تجویز سوچی تھی میرے بھائی کے کئی بچے تھے اور میرا لڑکا جسے گھر چھوڑ کر میں انگلستان گیا تھا اب چار برس کا تھا میری خواہش تھی کہ ان سب کو ورزش سکھا کر مضبوط اور جفاکش بناؤں اور خود ان کی نگرانی کیا کروں۔ اس میں میرے بھائی نے بھی مدد کی اور مجھے اپنی کوششوں میں کم و بیش کامیابی ہوئی مجھے بچوں کی صحبت بہت پسند تھی اور ان سے ہنسنے کھیلنے کی مجھے آج تک عادت ہے۔ اس وقت سے میرا یہ خیال ہے کہ بچوں کے لئے اچھا معلم ہو سکتا ہوں۔

عذا کے ”ریفارم“ کی صریح ضرورت تھی چائے اور قہوے کا استعمال گھر میں شروع ہو چکا تھا۔ میرے بھائی جانتے تھے کہ جب میں واپس آؤں تو مجھے تھوڑی بہت انگریزیت کی فضا ملے۔ اس خیال

سے چینی کے برتن وغیرہ جو پہلے خاص خاص موقعوں کے لئے رکھے رہتے تھے اب روزمرہ استعمال ہونے لگے۔ رہی سہی کئی میرے ”ریفارم“ نے پوری کر دی میں نے جی کادلیہ کھانا سکھایا اور کوکو کا استعمال اس نیت سے شروع کرایا کہ یہ چاہ اور قبوے کی قائم مقام ہو جائے لیکن ہوا یہ کہ چاہ اور قبوہ بدستور باقی رہا اور یہ ایک اور اضافہ ہو گیا۔ بٹ اور شوپیلے سے رانچ تھے میں نے انگریزی لباس شروع کر کے فرنگیت کی تکمیل کر دی۔

اس طرح خرچ بڑھتا گیا روز نئی نئی چیزوں کا اضافہ ہوتا گیا۔ ہم نے ایک سفید ہاتھی دروازہ پر باندھ رکھا تھا لیکن سوال یہ تھا کہ اسے کھلائیں کہاں سے؟

راجکوٹ میں دکالت شروع کرنا اپنا مصحکہ کرانا تھا۔ میری قابلیت ایک اچھے وکیل کے برابر نہ تھی اور فیس میں دس گنی چاہتا تھا کون موکل ایسا بیوقوف تھا کہ میرے پاس آتا؟ اور فرض کیجئے کوئی پھنس بھی جاتا تو کیا میں اپنی جہالت پر خود پسندی اور فریب کاری کا بھی اضافہ کر لیتا اور دنیا کا بوجھ اور بڑھا لیتا۔

دوستوں نے مجھے یہ مشورہ دیا کہ کچھ دن کے لئے بمبئی جاؤں وہاں ہائی کورٹ کے کام کا تجربہ حاصل کروں، ہندوستان کے قانون کا مطالعہ کروں اور مقدمے ملنے کے لئے ہاتھ پیر ماروں۔ میں نے ان کے مشورے پر عمل کیا اور بمبئی چلا گیا۔

بمبئی میں گھر بار کے کام میں میرا مددگار ایک روسویا تھا جو میرے ہی جیسا نالائق تھا۔ وہ ذات کا برہمن تھا۔ میں اس سے ایسا برتاؤ نہیں کرتا تھا جیسا نوکروں سے کیا جاتا ہے بلکہ عزیزوں کی طرح پیش آتا تھا۔ وہ اپنے جسم پر پانی ڈالتا تھا مگر نہاتا کبھی نہ تھا۔ اس کی دھوتی اتنی ہی میلی رہتی تھی جتنا اس کا جینیو اور اسے مذہبی کتابوں کی ہوا بھی نہیں لگی تھی لیکن مجھے کھانا پکانے کے لئے اور کوئی آدمی ملنا دشوار نہیں۔

میں اس سے کہا کرتا تھا ”بھئی راوی شنکر تم چاہے کھانا پکانا نہ جانتے ہو مگر ”سندھیا“ (روزمرہ کی پوجا) تو ضرور جانتے ہو گے؟“

”سندھیا“ کبھی بابو صاحب ہماری ”سندھیا“ بل ہے اور ہماری پوجا پھاوڑا ہے۔ میں نے تو ایسا ہی برہمن ہوں۔ آپ کے پاس اسی لئے آتا ہوں کہ آپ کی کرپا سے میری پرورش ہو جائے نہیں تو پھر اپنی کھیتی تو کہیں گئی نہیں۔

غرض مجھے راوی شنکر کا استاد بتنا پڑا۔ میں پکانے کا آدھا کام خود کرتا تھا اور ساگ تیار کرنے میں

انگریزی طریقے سے کام لیتا تھا۔ میں نے ایک گیس کا چولہا خرید لیا۔ اور راوی شکر کے ساتھ مل کر رسوئی بنانے لگا مجھے غیر ذات دالوں کے ساتھ کھانے میں کوئی تامل نہ تھا راوی شکر کا پر میز بھی رفتہ رفتہ جاتا رہا دونوں میں خوب بچنے لگی۔ بس ایک دھت تھی۔ راوی شکر نے قسم کھائی تھی کہ ہمیشہ میلار ہے گا اور کھانے کو بھی میلار کھے گا۔

مگر بمبئی میں میرے لئے چار یا پانچ مہینے سے زیادہ رہنا ناممکن تھا کیونکہ خرچ روز بروز بڑھتا جاتا تھا اور آمدنی کچھ نہ تھی۔

اس طرح میری زندگی شروع ہوئی میں نے بیرسٹری کے پیشے کو برا پایا ناکش بہت اور علم کم مجھے اپنی ذمہ داری کا اتنا احساس تھا کہ میں اس کے بوجھ سے دبا جاتا تھا۔

پہلا مقدمہ

بھئی کے قیام کے زمانے میں ایک طرف تو میں نے ہندوستانی قانون کا مطالعہ شروع کیا اور دوسری طرف غذائیات کے تجربے جس میں میرے اور دوست ویر چند گاندھی میرے شریک تھے۔ اور میرے بھائی میرے لئے مقدمے حاصل کرنے کی کوشش کر رہے تھے۔

ہندوستانی قانون کے مطالعے سے میری طبیعت بہت گھبراتی تھی قانون ضابطہ فوجداری کسی طرح میری سمجھ میں نہیں آتا تھا مگر قانون شہادت میں یہ بات نہ تھی، ویر چند گاندھی سالیئر کا امتحان کی تیاری کر رہے تھے اور وہ مجھے بیرسٹروں اور وکیلوں کے متعلق طرح طرح کے قصے سنایا کرتے تھے۔ سرفیروز شاہ کی قابلیت کارا زہیہ ہے کہ انہیں قانون پر پورا عبور ہے۔ قانون شہادت مجھے حفظ یاد ہے اور دفعہ ہتیس کے متعلق سارے مقدمے نوک زبان میں ہیں۔ بدرالدین کی بحث اس قیامت کی ہے کہ ججوں کے ہوش اڑ جاتے ہیں۔

ایسے ایسے نامی وکیلوں کا حال سن کر میری اہمیت پست ہو جاتی تھی۔ وہ اپنی تقریر کو جاری رکھتے ہوئے کہتے تھے ”بیرسٹر کے لئے پانچ سات برس علی بیٹھے رہنا کوئی غیر معمولی بات نہیں۔ اسی لئے میں نے سالیئر کا کام شروع کیا ہے۔ تمہاری کشتی اگر تین برس میں بھی چل نکلے تو غنیمت سمجھو۔“

خرچ ہر ہر مہینے بڑھتا جاتا تھا بلکہ بیرسٹر کاسٹن بورڈ لگانا اور گھر میں بھی بیرسٹری کا کام سیکھنا مجھے کسی طرح گوارا نہ تھا۔ اس لئے میں یکسوئی سے مطالعہ نہیں کر سکتا تھا۔ مجھے قانون شہادت سے دلچسپی ہو گئی تھی اور متن کی دھرم شاستریوں نے بڑے شوق سے اور غور سے پڑھی تھی لیکن مجھ میں ہمت نہ تھی کہ کسی مقدمے کی پیروی کروں میری بے بسی بیان سے بلہر ہے۔ یہ حال تھا جیسے دلہن نئی نئی سسرال میں آتی ہے!

اس زمانے میں میرے پاس مای بائی نام ایک عورت کا مقدمہ آیا۔ یہ ایک خفیہ معاملہ تھا مجھ سے لوگوں نے کہا ”تمہیں دلال کو کمیشن دینا پڑے گی میں نے قطعاً انکار کر دیا۔

مگر فوجداری کا فلاں نامی وکیل جس کی تین چار ہزار ماہوار کی آمدنی ہے وہ بھی دلالی دیتا ہے ” مجھے ان کی ریس کرنے کی کوئی ضرورت نہیں۔ میرے لئے تین سو کافی ہے میرے والد کی آمدنی بھی اس سے زیادہ نہ تھی ”

”اب وہ دن گئے بمبئی میں خرچ استنا بڑھ گیا ہے کہ کچھ ٹھکانا نہیں تمہیں کاروباری اصول کا لحاظ کرنا چاہیے۔

میں ثابت قدم رہا مای بائی کا مقدمہ بغیر دلالی دئے ہوئے مجھے مل گیا سیدھا سا دھا معاملہ تھا۔ میں نے تیس روپیہ محنتانہ لیا۔ ایک دن سے زیادہ کا کام نہ تھا۔

یہ عدالت خفیہ میں میرا پہلا داخلہ تھا میں مدعا علیہا کی طرف سے تھا اس لئے میرا کام یہ تھا کہ مدعی کے گواہوں سے جرح کروں۔ میں کھرا ہوا لیکن میرا دل بیٹھ گیا۔

میرے سر میں چکر تھا اور معلوم ہوتا تھا کہ ساری عدالت گھوم رہی ہے۔ میری سمجھ میں کوئی سوال نہیں آیا جو میں پوچھتا جاؤں یقیناً ہنسا ہو گا اور وکیلوں کو اس تماشے سے لطف آیا ہو گا۔ مگر مجھے کچھ نظر نہیں آتا تھا۔ میں بیٹھ گیا اور میں نے مختار سے کہا کہ میں پیروی نہیں کر سکتا تم مجھ سے فیس واپس لو اور پنیل کو وکیل کر لو۔ پنیل صاحب نے اکاون روپے لئے اور وکالت نامہ داخل کر دیا۔ ظاہر ہے کہ ان کے لئے یہ مقدمہ بچوں کا کھیل تھا۔

میں عدالت سے جلدی سے اٹھ کر چلا آیا اور مجھے خبر تک نہیں ہوئی کہ میری موکلہ جیتی یا ہاری۔ مگر مجھے بڑی شرم آئی اور میں نے یہ طے کیا کہ آئندہ کوئی مقدمہ اس وقت تک نہ لوں گا جب تک مجھ میں پیروی کرنے کی ہمت نہ پیدا ہو جائے اور سچ مچ میں نے اس کے بعد جنوبی افریقہ ہی میں عدالت میں قدم رکھا۔ اس فیصلے میں میری کوئی تعریف نہ تھی عصمت بی بی از پے چادری کا معاملہ تھا۔ بھلا ایسا کون سا بیوقوف تھا کہ مجھے ہارنے کے لئے مقدمہ دیتا۔

لیکن بمبئی میں مجھے ایک معاملہ اور ملا۔ یہ ایک عرضداشت لکھنے کا کام تھا ایک غریب مسلمان کی زمین پور بندر میں ضبط کر لی گئی تھی۔ وہ مجھے نیک باپ کا سپوت پینا سمجھ کر میرے پاس آیا۔ اس کا دعویٰ بظاہر کمزور تھا لیکن میں اس شرط پر اس کی طرف سے عرضداشت لکھنے پر راضی ہو گیا کہ چھپائی کا خرچ اس کے ذمے رہے میں نے اس مسودہ لکھ کر دوستوں کو سنایا۔ انہوں نے پسند کیا اور اس سے

مجھے تھوڑا بہت اطمینان ہوا کہ میں عرضداشت لکھنے کی قابلیت رکھتا ہوں اور یہ واقعہ بھی تھا۔
 اگر میں بغیر فیس کے عرضداشتیں لکھا کرتا تو مجھے خوب کام ملتا لیکن اس سے پیٹ کا دھندا کیسے
 چلتا؟ اس لئے میں نے یہ سوچا کہ مدرسہ میں میری انگریزی اچھی تھی اور اگر مجھے کسی اسکول میں
 انٹرنس کے لڑکوں کو انگریزی پڑھنے کا کام مل جاتا تو میں بڑی خوشی سے کرتا اس طرح میرے خرچ کا
 کچھ حصہ تو نکل ہی آتا۔ میں نے اشتہار دیکھا "ضرورت ہے، انگریزی کے مدرسے کی ایک گھنٹہ روز
 سبق تنخواہ پچتر روپیہ" یہ اشتہار ایک مشہور اسکول کی طرف سے تھا میں ملاقات کے لئے طلب ہوا اور
 خوش خوش پہنچا۔ مگر جب پرنسپل کو معلوم ہوا کہ میں گریجویٹ نہیں ہوں تو انہوں نے افسوس کے
 ساتھ انکار کر دیا۔

"مگر میں نے لندن میٹریکولیشن پاس کیا ہے اور میری اختیاری زبان لاطینی تھی۔" یہ سچ ہے
 مگر ہمیں تو گریجویٹ چاہئے۔"

ایسی صورت میں مجبوری تھی میں مایوس ہو کر کف افسوس ملنے لگا میرے بھائی کو بھی بڑی تشویش
 تھی ہم دونوں اس نتیجے پر پہنچے کہ اب بمبئی میں رہنے سے کوئی فائدہ نہیں۔ ہمیں راجکوٹ میں رہنا
 چاہئے۔ وہاں میرے بھائی کو دو کالت تھوڑی بہت چلتی ہے اور وہ مجھے درخواستیں اور عرضداشتیں لکھنے
 کا کام دے سکتے ہیں پھر راجکوٹ میں گھر بار موجود ہی ہے اس لئے بمبئی میں گھر لے کر رہنے کا بھاری
 خرچ بچ جائے گا۔ مجھے یہ تجویز پسند آئی اس طرح بمبئی میں چھ مہینے قیام کرنے کے بعد میں بوریہ ستر اٹھا
 کر چل دیا۔

بمبئی میں میں ہائی کورٹ جایا کرتا تھا لیکن میں نے وہاں کچھ بھی نہیں سیکھا میں اتنی قابلیت ہی نہیں
 رکھتا تھا کہ وہاں جانے سے پورا فائدہ اٹھا سکوں۔ اکثر ایسا ہوتا تھا کہ مقدمے میری سمجھ میں نہیں آتے
 تھے اور میں اونگھنے لگتا تھا۔ اس معاملے میں اور لوگ بھی میرے ساتھی تھے اس لئے میری شرم کا بوجھ
 ہلکا ہو گیا تھا۔ بلکہ کچھ دن کے بعد تو شرم کا احساس ہی نہیں رہا کیونکہ مجھے یہ معلوم ہوا کہ ہائیکورٹ میں
 اونگھنا فیشن میں داخل ہے۔

اگر آج کل بھی بمبئی میں میرے جیسے بیکار بیرسٹر ہیں تو میں انہیں زندگی کا ایک عملی نکتہ بتاتا
 ہوں۔ اگرچہ میں گرام میں رہتا تھا لیکن بہت کم ایسا ہوتا تھا کہ گاڑی یا اس کے بغیر میں نے ہائی کورٹ
 پیدل جانے کا معمول کر لیا تھا اور وہاں جانے میں پورے دس روپے روزانہ لگتے تھے اور واپس بھی ہمیشہ
 پیدل ہی آتا تھا۔ دھوپ میں چلنے کی میں نے عادت ڈال لی تھی۔ عدالت پیدل آنے جانے سے خاصی

رقم بچتی تھی اور پھر یہ فائدہ تھا کہ یہاں تک مجھے یاد ہے میری طبیعت کبھی ناساز نہیں ہوئی۔ حالانکہ میرے دوست جو بمبئی میں مقیم تھے بیمار رہا کرتے تھے۔ جب میں روپیہ کمانے لگا تب بھی میں نے پیدل دفتر آنے کی عادت قائم رکھی اور اس سے میری صحت کو جو فائدہ پہنچا اس کا اثر آج تک محسوس ہو رہا ہے۔

چوتھا باب

پہلا دھچکا

میں مایوس ہو کر بمبئی سے راجکوٹ آیا اور یہاں میں نے اپنا دفتر قائم کیا۔ اب میرا کام خاصا چلنے لگا۔ درخواستوں اور عرضداشتوں کے مسودے لکھ کر میں اتنا کمالیتا تھا کہ میری آمدنی کا اوسط تین سو روپیہ ماہوار تھا۔ یہ کام مجھے میری قابلیت کی بدولت نہیں بلکہ تعلقات کی بنا پر ملتا تھا کیونکہ جن دکیلوں کی شرکت میں میرے بھائی کام کرتے تھے ان کی وکالت بہت اچھی چلتی تھی۔ جو درخواستیں وغیرہ ان کے نزدیک واقعی اہم تھیں وہ نامی بیرسٹروں کے پاس بیٹھتے تھے۔ میرے جھے میں غریب موکلوں کی درخواستیں آتی تھیں۔

مجھے یہ اعتراف کرنا پڑتا ہے کہ میرا کمیشن دینے کا اصول جس پر میں بمبئی میں بہت سختی سے عامل تھا۔ یہاں پوری طرح قائم نہیں رہ سکا مجھ سے یہ کہا گیا کہ ان دونوں صورتوں میں بہت اختلاف ہے بمبئی میں کمیشن دلالوں کو دینا پڑتا تھا اور یہاں دکیلوں کو دیا جاتا ہے جن سے مقدمے ملتے ہیں۔ یہاں بھی بمبئی کی طرح سارے بیرسٹراپنی فیس میں سے چند فیصدی کمیشن کے طور پر دیتے ہیں۔ میرے بھائی نے جو دلیل پیش کی اس کا مجھ سے کوئی جواب نہیں بن پڑا۔ انہوں نے کہا تم جانتے ہو کہ میں ایک دکیل کی شرکت میں کام کرتا ہوں میں ہمیشہ یہ چاہوں گا کہ ہمارے مقدموں میں سے جتنے تمہارے بس کے ہوں وہ تمہیں دے دیئے جائیں۔ اب اگر تم میرے شریک کو کمیشن دینے سے انکار کر دو گے تو میں بڑی مشکل میں پڑ جاؤں گا۔ میرا تمہارا گھر بار ایک ہے اس لئے تمہاری فیس ہم دونوں کے کام آتی ہے اور مجھے اس میں سے خود بخود حصہ مل جاتا ہے۔ مگر میرا شریک کہاں جائے فرض کرو جو مقدمہ وہ تمہیں دیتا ہے وہ کسی اور بیرسٹر کو دے تو اسے کمیشن ملے گا یا نہیں ہمیں اس دلیل سے دھوکے میں

آگیا اور میں نے یہ سوچا کہ اگر مجھے بیرسٹری کرنا ہے تو میں ان صورتوں میں اپنے کمیشن والے اصول پر زور نہیں دے سکتا میں نے اس طرح اپنے آپ کو سمجھایا بلکہ تکلف برطرف اپنے ضمیر کو فریب دیا لیکن اتنا اور کہہ دینا چاہیے کہ جہاں تک مجھے یاد ہے میں نے سوائے اس صورت کے کسی مقدمے میں کمیشن نہیں دیا۔

اب میرا خرچ تنگی ترشی سے چلنے لگا۔ مگر اسی زمانے میں مجھے اپنی زندگی میں پہلی بار غم اور غصہ کا دھچکا لگا۔ میں نے سنا تھا کہ برطانوی حاکم کیسے ہوتے ہیں مگر مجھے اب تک کسی سے سابقہ نہیں پڑا تھا۔ میرے بھائی آنجنابی رانا صاحب پور بندر کے تخت نشین ہونے سے پہلے ان کے سکریٹری اور مشیر رہے تھے۔ آج کل ان پر یہ الزام تھا کہ انہوں نے اپنی ملازمت کے زمانے میں ممدوح کو غلط مشورہ دیا تھا۔ معاملہ پولیٹیکل ایجنٹ تک پہنچا جو میرے بھائی سے پہلے سے بدظن تھے۔ میں ان صاحب سے انگلستان میں مل چکا تھا اور وہاں ان کا برٹاؤ مجھ سے خاصا دوستانہ تھا۔ میرے بھائی کا خیال تھا کہ مجھے اس دوستی سے فائدہ اٹھانا چاہیے اور پولیٹیکل ایجنٹ سے مل کر ان کی سفارش کرنا چاہیے تاکہ ان کے دل میں جو بدگمانی ہے وہ دور ہو جائے مجھے یہ بات بالکل پسند نہیں آئی میں نے دل میں سوچا کہ مجھے انگلستان کی معمولی سی ملاقات سے فائدہ اٹھانے کا کوئی حق نہیں۔ اگر میرے بھائی واقعی تصور دار ہیں تو میری سفارش سے کیا فائدہ اور اگر وہ بے تصور ہیں تو انہیں باقاعدہ عرضداشت پیش کرنا چاہیے اور اپنی بے گناہی پر بھروسہ کر کے بے کھٹکے نتیجے کا منتظر رہنا چاہیے۔ میرے بھائی اس مشورے سے خوش نہیں ہوئے۔

انہوں نے کہا "تم ابھی کاٹھیادار کی حالت سے واقف نہیں اور دنیا کا تجربہ بھی نہیں رکھتے۔ یہاں تو بس سفارش ہی سے کام چلتا ہے۔ تم میرے بھائی ہو جب تم صریحاً ایک حاکم کو جانتے ہو اور اس سے میری سفارش کر سکتے ہو تو تمہیں اپنے فرض سے جی چرانا مناسب نہیں۔"

میں اس سے انکار نہیں کر سکتا تھا اس لئے جبراً قہراً پولیٹیکل ایجنٹ کے پاس گیا میں جانتا تھا کہ مجھے اس معاملے میں ان سے کچھ کہنے سے کچھ نہیں اور مجھے پورا احساس تھا کہ میں اپنی خودداری کو نقصان پہنچا رہا ہوں لیکن میں نے ان سے ملاقات کی درخواست کی اور انہوں نے قبول کر لی۔ میں نے انہیں پرانی واقفیت یاد دلائی لیکن مجھے فوراً یہ محسوس ہو گیا کہ کاٹھیادار اور انگلستان میں فرق ہے اور انگریز حاکم رخصت کی حالت میں کچھ اور ہوتا ہے اور اپنے کام پر کچھ اور پولیٹیکل ایجنٹ صاحب نے واقفیت کا اقرار کیا لیکن اس کے یاد دلانے سے وہ مجھ سے کھینچ گئے ان کی یہ کشیدگی اور ان کے تیور

زبان حال سے کہہ رہے تھے کہیں تم اس شناسائی سے بیجا فائدہ اٹھانے تو نہیں آئے ہو اس پر میں نے اپنا مدعا کہہ ڈالا۔ صاحب جھولا کر بولے تمہارا بھائی بڑا فطرتی آدمی ہے میں تم سے اس بارے میں کچھ نہیں سنا چاہتا۔ اگر تمہارے بھائی کو کچھ کہنا ہے تو اس سے کہو کہ ضابطہ کی درخواست پیش کرے۔ یہ جواب کافی تھا اور شاید میں اسی کا مستحق بھی تھا۔ مگر غرض مند اندھا ہوتا ہے۔ میں اپنا دکھڑا روتا رہا اور صاحب اٹھ کھڑے ہوئے اور کہنے لگے اس اب تم یہاں سے چلے جاؤ۔

میں نے کہا مگر میری پوری بات تو سن لیجئے۔ یہ کہنا تھا کہ ان کا پارہ اور چڑھ گیا انہوں نے چیز اسی کو بلا کر حکم دیا کہ مجھے دروازے کے بلبر بہنچادے میں اب تک پس و پیش کر رہا تھا کہ چیز اسی نے آکر دونوں ہاتھ میرے کندھے پر رکھے اور مجھے کمرے سے بلبر نکال دیا۔

صاحب اور چیز اسی دونوں ہٹ گئے اور میں غصے میں بھرا ہوا چلا آیا۔ میں نے فوراً اس مضمون کا رقعہ لکھ کر بھیجا آپ نے میری ہتک کی آپ اپنے چیز اسی کے توسط سے مجھ پر حملہ کرنے کے مرتکب ہوئے۔ اگر آپ نے اس کی تلافی نہ کی تو مجھے قانونی چارہ جوئی کرنا پڑے گی۔

ذرا سی دیر میں ایک سوار کے ہاتھ یہ جواب پہنچا۔

تم نے مجھ سے گستاخی کا برتاؤ کیا۔ میں نے تم سے کہا کہ چلے جاؤ مگر تم نہیں گئے اب سوائے اس کے کوئی صورت نہ تھی کہ میں چیز اسی سے کہوں تمہیں دروازے کے بلبر بہنچادے۔ اس کے کہنے پر بھی تم دفتر سے نہیں بلے۔ اسے مجبور آ اتنی جہلانی قوت سے کام لینا پڑا جتنی تمہیں ہٹانے کے لئے ضروری تھی۔ تمہیں اختیار ہے جس طرح چاہو چارہ جوئی کرو۔

یہ جواب جیب میں رکھے ملول اور دل شکستہ میں گھر آیا اور اپنے بھائی سے سارا ماجرا بیان کیا۔ انہیں بہت رنج ہوا مگر وہ حیران تھے کہ مجھے کیوں نہ تسکین دیں، انہوں نے اپنے ملنے والے وکیلوں سے گفتگو کی کیونکہ مجھے یہ نہیں معلوم تھا کہ صاحب پر مقدمہ کس طرح چلایا جائے۔ اس زمانہ میں اتفاق سے سرفیروز شاہ جہتا کسی مقدمہ میں بمبئی سے راجکوٹ آئے ہوئے تھے۔ مگر میرے جیسے مبتدی وکیل میں اتنی جرأت کہاں تھی کہ ان سے مل سکتا۔ اس لئے میں نے ان وکیل کی معرفت جنہوں نے انہیں بلایا تھا اپنے مقدمے کے کاغذات ان کے پاس بھیجے اور ان سے التجا کی کہ مجھے مشورہ دیں۔ انہوں نے کہا۔ اگاندھی سے کہہ دو کہ یہ باتیں وکیلوں اور بیرسٹروں کو روز مرہ پیش آتی ہیں۔ انہیں انگریز حکام کا تجربہ نہیں ہے۔ اگر وہ کچھ کہنا چاہتے ہیں اور چین سے رہنا چاہتے ہیں تو رقعے کو پھاڑ ڈالیں اور بات کو پنی جائیں۔ صاحب پر مقدمہ چلانے سے انہیں کچھ حاصل نہیں ہوگا بلکہ خود ہی تباہ ہو جائیں تو مجب نہیں

- ان سے کہو کہ ابھی کچھ دن سیکھیں کہ زندگی کیا چیز ہے۔

یہ نصیحت مجھے زہر کی طرح کڑوی معلوم ہوئی مگر میری داروئے تلخ پینا پڑی میں اس توہین کو چپ چاپ پی گیا اور میں نے اس سے آئندہ کے لیے سبق بھی حاصل کیا۔ میں نے اپنے دل میں عہد کر لیا کہ اب میں کسی ایسے پھیر میں نہ آؤں گا کہ مجھے اپنے اصولوں کے خلاف عمل کرنا پڑے اور کسی دوستی سے یوں بجانامدہ نہ اٹھوں گا۔ اس وقت سے آج تک میں نے کسی اس عہد کو نہیں توڑا۔ اس دھچکے نے میری زندگی کا رخ ہی بدل دیا۔

جنوبی افریقہ جانے کی تیاریاں

بے شک یہ میری غلطی تھی کہ میں پولیٹیکل ایجنٹ کے پاس گیا۔ لیکن ان کا یہ طیش اور قہر میری غلطی کے تناسب سے کہیں زیادہ تھا۔ میں نے ایسا قصور نہیں کیا تھا کہ نکال دیا جاتا۔ میں نے ان کا پانچ منٹ سے زیادہ وقت نہ لیا ہو گا لیکن انہیں تو میرا بت کرنا ہی ناگوار تھا۔ وہ چاہتے تو مجھ سے آدمیت سے کہہ دیتے کہ چلے جاؤ مگر وہ تو حکومت کے نشے میں چور تھے آگے چل کر مجھے معلوم ہوا کہ ان صاحب کے صفات حسنہ میں تحمل داخل نہ تھا ان کی عادت تھی کہ جو ملاقات کے لئے آتا اس کی توہین کرتے کوئی بات ذرا بھی عطف مزاج ہوئی اور صاحب بگڑے۔

اب وقت یہ تھی کہ میرے مقدمے زیادہ تر انہیں کی عدالت میں ہوتے تھے ان کے غصے کو دور کرنا میرے بس کی بات نہ تھی۔ مجھے ان کی چالوسی کرنے کی بائبل خواہش نہ تھی۔ بلکہ سچ پوچھیے تو ایک بار نالاش کی دھمکی دے کر چپ چاپ رہنا مجھے اچھا نہیں معلوم ہوتا تھا۔

اس عرصے میں مجھے اپنے ملک کی ادنیٰ درجے کی سیاسی چالوں کا حال معلوم ہوا۔ کالٹھیاداز بہت سی چھوٹی چھوٹی ریاستوں کا مجموعہ ہے اس لئے قدرتی طور پر یہاں جوڑ توڑ لگانے والوں کی کمی نہ تھی۔ ریاستوں کا باہمی ساز باز کرنا اور عہدہ داروں کا اپنی قوت بڑھانے کے لئے سازشیں کرنا معمولی بات تھی۔ رئیس ہر دولت اپنے رازداروں سے دبے رہتے تھے اور خوشامدیوں کی باتوں پر فوراً اعتبار کر لیتے تھے۔ صاحب کے چہرہ اسی تک کی خوشامدی کرنا پڑتی تھی اور سررشتہ دار تو گویا صاحب کے بھی آقا تھے کیونکہ وہی ان کے آنکھ کان تھے انہیں ہر چیز ترجمہ کر کے سمجھاتے تھے سررشتہ دار کی مرضی قانون تھی اور کہا جاتا ہے کہ ان کی آمدنی صاحب سے زیادہ تھی۔ ممکن ہے کہ یہ مبالغہ ہو لیکن اس میں شک نہیں کہ ان کا خرچ بہت تھا اور تنخواہ اسکے لئے کافی نہیں ہو سکتی تھی۔

یہ فضا مجھے زہریلی معلوم ہوتی تھی۔ اور میں ہمیشہ اس فکر میں رہتا تھا کہ اس کے اثر سے کیونکر محفوظ رہوں۔

میں بہت پڑمردہ رہتا تھا اور میرے بھائی اس بات کو اچھی طرح جانتے تھے ہم دونوں کا خیال تھا کہ اگر مجھے کوئی مستقل کام مل جائے تو اس سازش کی فضا سے چھٹکارا ہو جائے لیکن بغیر سازش کے دیوانی یا ججی ملنا ناممکن تھا اور دکالت میں یہ دقت تھی کہ صاحب سے جھگڑا ہو گیا تھا۔

پوربندر میں اس زمانے میں راجہ صاحب بااختیار نہ تھے۔ انگریزی حکومت کی طرف سے ایک منظم مقرر تھے مجھے ان سے اس لئے ملنا تھا کہ راجہ صاحب کو کچھ اختیارات دلاؤں اور امیروں پر جو بھاری ادگھوتی (مالگزار) باندھ دی گئی ہے اسے کم کراؤں۔ یہ منظم تھے تو ہندوستانی مگر میں نے انہیں صاحب سے بھی مغرور پایا۔ یہ قابل آدمی تھے مگر ان کی قابلیت کی بدولت رعایا کچھ خوش حال نہیں معلوم ہوتی تھی۔ میں راجہ صاحب کو تھوڑے بہت اختیارات دلوانے میں تو کامیاب ہوا لیکن امیروں کو کوئی دادرسی نہ ہو سکی مجھے یہ محسوس ہوا کہ ان کے معاملے پر اچھی طرح غور تک نہیں کیا گیا۔

غرض یہاں بھی مجھے اپنی کوشش میں ایک لحاظ سے مایوسی ہوئی۔ میرا خیال تھا کہ میرے موکلوں کے ساتھ انصاف نہیں کیا گیا لیکن کوئی چارہ کار نظر نہیں آتا تھا زیادہ سے زیادہ میں پولیٹیکل ایجنٹ یا گورنر کے یہاں اپیل کر سکتا تھا۔ مگر وہ یقیناً میری اپیل کو خارج کر دیتے اور مداخلت کرنے سے انکار کرتے۔ اگر ان فیصلوں کی نگرانی کے لئے کوئی قاعدہ یا ضابطہ ہوتا تو ایک بات بھی تھی مگر وہاں تو صاحب کی مرضی قانون تھی۔

میں یہاں کی زندگی سے اور بھی بیزار ہو گیا۔

اس عرصے میں ایک مہینے نے جن کی دوکان پوربندر میں تھی میرے بھائی کو یہ پیغام بھیجا ہم جنوبی افریقہ میں تجارت کرتے ہیں۔ ہمارا کاروبار بڑا ہے اور وہاں عدالت میں ہمارا ایک بڑا مقدمہ ہے جس میں ہماری طرف سے چالیس ہزار پونڈ کا دعویٰ کیا گیا ہے۔ یہ مقدمہ بہت دن سے چل رہا ہے ہم نے بہترین وکیلوں اور بیرسٹروں کی خدمات حاصل کی ہیں۔ اگر آپ اپنے بھائی کو وہاں بھیج دیں تو ان کے لئے بھی اچھا ہے اور ہمارے لئے بھی۔ وہ ہمارے وکیلوں کو ہم سے بہتر ہدایات دے سکیں گے۔ انھیں یہ فائدہ ہے کہ ایک نئے ملک کی سیر کر لیں گے اور نئے نئے لوگوں سے ملاقات ہو جائے گی۔

بھائی صاحب نے مجھ سے اس معاملے میں گفتگو کی۔ میں یہ صاف طور پر نہیں سمجھ سکا کہ مجھے صرف وکیلوں کی ہدایتیں دینا ہوگی یا عدالت میں بھی جانا پڑے گا مگر بات ایسی تھی کہ میرا جی لپٹا گیا۔

بھائی صاحب نے مجھے سیٹھ عبدالکریم جھاویری سے ملوایا۔ یہ اسی عبداللہ کمپنی میں جس کا یہ معاملہ تھا حصہ دار تھے۔ سیٹھ صاحب نے مجھے یقین دلایا کہ کام کچھ ایسا مشکل نہیں۔ انہیں نے کہا وہاں ہم سے بڑے بڑے یورپنیوں سے دوستی ہے آپ کی بھی ان سے ملاقات ہو جائے گی۔ آپ سے دوکان کے کام میں بھی مدد ملے گی۔ ہماری خط و کتابت زیادہ تر انگریزی میں ہوتی ہے اس میں آپ ہاتھ بنا لیں گے ظاہر ہے کہ آپ وہاں ہمارے مہمان ہوں گے اور آپ کو کچھ خرچ کرنا نہیں پڑے گا۔

میں نے پوچھا آپ میری خدمات کتنے دن کے لیے چاہتے ہیں اور معاوضہ کیا ہو گا؟

”آپ کو ایک سال سے زیادہ نہیں لگے گا ہم آپ کو آنے جانے کا ادل درجے کا کرایہ دیں گے اور کل اخراجات کے علاوہ ایک سو پانچ پاؤنڈ اور۔“

یہ بیرسٹر کی حیثیت سے جانا تو کہا نہیں جاسکتا۔ یوں کہنا چاہئے کہ میں دوکان کے ایک ملازم کی حیثیت سے جا رہا تھا لیکن مجھے تو یہ فکر تھی کسی طرح ہندوستان سے نکلوں۔ پھر یہ لالچ تھا کہ نیا ملک دیکھنے میں آئے گا اور نیا تجربہ حاصل ہو گا۔ میں نے یہ بھی سوچا کہ ایک سو پانچ پاؤنڈ بھائی صاحب کو بھیج سکوں گا۔ جس سے گھر کے خرچ میں مدد ملے گی۔ غرض میں نے بغیر رد و بدل کئے ان شرطوں کو منظور کر لیا اور جنوبی افریقہ جانے کی تیاری میں مصروف ہو گیا۔

مثال چہینا

جنوبی افریقہ جانے وقت مجھے وہ جدائی کا درد محسوس نہیں ہوا جو انگلستان جاتے وقت ہوا تھا۔ اب میری والدہ کا انتقال ہو چکا تھا میں دنیا دیکھ چکا تھا اور غیر ملکوں کے سفر کا تجربہ حاصل کر چکا تھا۔ اب وہ زمانہ نہیں رہا تھا کہ راجکوٹ سے بمبئی جانا غیر معمولی بات ہو۔

اس بار صرف مجھے اپنی بیوی کی جدائی حق گزری۔ میرے انگلستان سے واپس آنے کے بعد ایک اور بچہ پیدا ہو چکا تھا ہم دونوں کی محبت ابھی شہوانی خواہش سے غلبہ نہ تھی مگر روز بروز پاک ہوتی جاتی تھی۔ جب سے میں یورپ سے واپس آیا مجھے بہت کم ان کے ساتھ رہنے کا موقع ملا تھا۔ اب میں جیسا کچھ برا بھلا مجھ سے ممکن تھا انہیں پڑھاتا تھا اور بعض اصلاحوں میں ان کی مدد کرتا تھا اس لئے ہم دونوں کو اس کی ضرورت محسوس ہوتی تھی کہ ہم زیادہ دن یکجا رہیں تاکہ یہ اصلاحیں جاری رہ سکیں لیکن جنوبی افریقہ کے شوق میں فریق کا صدمہ برداشت کرنے کو تیار ہو گیا۔ میں نے انہیں یہ کہہ کر تسکین دی ہم دونوں ایک سال میں ضرور ملیں گے اور راجکوٹ سے بمبئی روانہ ہو گیا۔

یہاں مجھے دادا عبداللہ کمپنی کے ایجنٹ کے ذریعہ سے جہاز کا ٹکٹ لینا تھا۔ مگر جو جہاز جانے والا تھا اس میں بالکل جگہ نہ تھی اور مجھے یہ مشکل کہ اگر اس جہاز سے نہ جاؤں تو بمبئی میں بیکار پڑا رہنا پڑے۔ ایجنٹ نے کہا اہم نے اول درجے کا ٹکٹ لینے کی اجازت کو شش کی لیکن کوئی نتیجہ نہ ہوا۔ ہاں آپ ڈیک پر جانا چاہیں تو جاسکتے ہیں۔ اس کا انتظام کر دیا جائے گا کہ کھانا آپ دوسرے مسافروں کے ساتھ کمرے میں کھا سکیں۔ ”یہ وہ زمانہ تھا کہ جب میں اول درجے سے کم میں سفر ہی نہیں کرتا تھا اور یوں بھی بھلا بیرسٹر صاحب ڈیک پر کیے جاسکتے ہیں اس لئے میں نے اس دعوت سے انکار کر دیا۔ مجھے ایجنٹ

کی سچائی میں شبہ تھا کیونکہ یہ یقین نہیں آتا تھا کہ اول درجے میں کوئی جگہ غلطی نہیں۔ آخر اس کی رضامندی سے میں خود کوشش کرنے نکلا۔ میں جہاز پر گیا اور کپتان سے ملا اس نے صاف صاف کہہ دیا۔ اہمارے یہاں عام طور پر مسافروں کی اتنی کثرت نہیں ہوتی لیکن چونکہ مزنیق کے گورنر جنرل اس جہاز پر جا رہے ہیں اس لئے سب جگہیں بھر گئیں ہیں۔"

میں نے پوچھا کیا یہ ممکن نہیں کہ آپ میرے لئے کسی طرح گنجائش نکال دیں؟ اس نے سر سے پیر تک مجھے دیکھا اور مسکرا کر کہا صرف ایک صورت سے امیرے کہیں میں ایک زائد جگہ ہے جو عموماً مسافروں کو نہیں دے جاتی۔ مگر میں آپ کو دے دوں گا میں نے شکریہ ادا کیا اور ایجنٹ کو بھیج کر ٹکٹ منگوا لیا۔ اپریل 1893ء میں میرے دل میں بڑے دلولے سے ہوئے قسمت آزمائی کرنے جنوبی افریقہ روانہ ہو گیا۔

پہلی بندرگاہ جہاں جہاز ٹھہرا لاہور تھی۔ ہم یہاں تیرہ دن میں پہنچے، اس عرصے میں مجھ میں اور کپتان میں بڑی دوستی ہو گئی۔ اسے شطرنج کھیلنے کا شوق تھا مگر وہ ناہموز تھا اور چاہتا تھا کہ کوئی ایسا شخص ساتھ کھیلنے کو ملے جو اس سے بھی زیادہ کھیلتا ہو اس لئے اس نے مجھ سے کھیلنے کی فرمائش کی میں نے اس کھیل کی بہت تعریف سنی تھی مگر کھیلا نہ تھا۔ کھیلنے والے کہا کرتے تھے کہ اس میں فراہت سے کام لینے کا بہت موقع ہے کپتان نے کہا تمہیں کھیلا سکا دوں گا اور چونکہ مجھ میں صبر بے حد تھا اس لئے وہ مجھے بڑا مستعد شاگرد سمجھتا تھا۔ ہر بار میں ہی ہارتا تھا اس لئے وہ مجھے اور بھی شوق سے سکھاتا تھا کھیل مجھے پسند آیا مگر میری رخصت بس جہاز ہی تک رہی اور میری معلومات سیدھی سادھی چالوں سے آگے نہیں بڑھی۔

لاہور میں جہاز تین چار گھنٹے لنگر انداز رہا اور میں نیچے اتر کر بندرگاہ دیکھنے گیا۔ کپتان بھی کنارے پر گیا مگر اس نے مجھے آگاہ کر دیا تھا کہ یہاں سمندر کی حالت اعتبار کے قابل نہیں اور تاکید کر دی کہ ذرا پہلے سے لوٹ آؤں۔

یہ چھوٹی سی جگہ تھی۔ میں ڈاک خانے پہنچا۔ وہاں میں ہندوستانی کلرکوں کو دیکھ کر بہت خوش ہوا۔ اور ان سے باتیں کرنے لگا۔ مجھے افریقی بھی نظر آئے اور میں نے ان کے طرز زندگی سے جس سے مجھے بہت دلچسپی تھی واقف ہونے کی کوشش کی اس میں کچھ دیر لگ گئی۔

چند ڈیک کے مسافر بھی جن سے مجھے بہت واقفیت ہو گئی تھی، ساحل پر آئے تھے کہ ذرا اطمینان سے کھانا پکا کر کھائیں۔ میں نے دیکھا کہ وہ واپسی کی تیاری کر رہے ہیں اور ہم سب کے سب

ایک ہی کشتی میں بیٹھ گئے۔ سمندر باڈھ پر تھا اور ہماری کشتی مناسب مقدار سے زیادہ لدی ہوئی تھی۔ پانی کا دھارا اتنا تیز تھا کہ کشتی جہاز کی سیڑھی کے برابر کسی طرح نہیں ٹھہرتی تھی۔ روانگی کی پہلی سیٹی بج چکی تھی میرے ہاتھ پیر پھول گئے۔ کپتان اوپر کھڑا ہماری پریشانی دیکھ رہا تھا۔ اس نے جہاز کو اور پانچ منٹ ٹھہرانے کا حکم دیا۔ جہاز کے قریب ایک اور کشتی تھی جسے ایک دوست دس روپے میں میرے لئے کرایہ پر لے لیا۔ اس کشتی نے مجھے جہاز کے قریب پہنچایا۔ سیڑھی اٹھالی گئی تھی اس لئے میں ایک رسی کے ذریعہ سے اوپر کھینچا گیا اور جہاز فوراً روانہ ہو گیا۔ دوسرے مسافر رہ گئے اب مجھے کپتان کی نصیحت کی قدر ہوئی۔

لامو کے آگے دلا سری بندر گاہ ممبایا تھی اور تیسری زنجبار۔ یہاں کوئی آٹھ دس دن ٹھہرنا پڑا اور یہاں سے ہم دوسرے جہاز میں سوار ہوئے۔

کپتان کو مجھ سے انس ہو گیا تھا مگر اس انس کی بدولت ایک ناگوار واقعہ پیش آیا اس نے مجھے اور انگریز دوست کو اپنے ساتھ سیر کرنے کی دعوت دی ہم تینوں ایک کشتی میں بیٹھ کر سارے پر گئے۔ میرے فرشتوں کو بھی خبر نہ تھی کہ اس سیر کے کیا معنی ہیں اور کپتان بے چارہ کیا جانے کہ میں ان معاملات میں کتنا سادہ لوح ہوں۔ ایک دلال ہم لوگوں کو حبشی عورتوں کے یہاں لے گیا اور اس نے ہم تینوں کو علیحدہ علیحدہ کمروں میں پہنچا دیا۔ میں دم بخود کھڑا تھا اور شرم سے گڑا جاتا تھا۔ خدا جانے وہ بے چاری عورت مجھے کیا سمجھتی ہوگی۔ جب کپتان نے مجھے پکارا تو جیسا گیا تھا ویسا ہی آگیا۔ اس نے میرے چہرے سے میری پاکدامنی معلوم کر لی۔ پہلے تو مجھے بہت شرم آئی لیکن چونکہ اس فعل کے خیال ہی سے میرے رونگٹے کھڑے ہوئے تھے اس لئے شرم کا احساس رفتہ رفتہ جاتا رہا اور میں نے خدا کا شکر ادا کیا کہ اس عورت کو دیکھ کر میرے دل میں ذرا بھی بدی نہیں آئی۔ مجھے اپنے آپ سے نفرت آتی تھی کہ میں نے جرات سے کام لے کر کمرے میں جانے سے انکار کیوں نہ کر دیا۔

میری زندگی میں یہ اس قسم کی تیسری آزمائش تھی۔ خدا جانے کتنے نوجوان جو ابتدا میں پاکدامن ہوں گے جھوٹی شرم کی بدولت گناہ میں آلودہ ہو گئے ہونگے میری اسی میں کوئی تعریف نہیں کہ میں بے داغ بچ کر چلا آیا۔ تعریف تو جب ہوتی کہ میں کمرے میں جانے ہی سے انکار کر دیتا۔ مجھے اس رحمن و رحیم کا شکر کرنا چاہئے کہ اس نے مجھے بچا لیا۔ اس واقعے سے مجھے ذات الہی پر اور بھی عقیدہ ہو گیا اور ایک حد تک جھوٹی شرم سے نجات ملی۔

چونکہ اس بندر گاہ میں ایک ہفتہ ٹھہرنا تھا اس لئے میں سے شہر میں کمرے کرائے پر لے لئے اور

آس پاس پھر کر خوب سیر کی۔ زنجبار میں درختوں اور سبزہ زار و نکلی کثرت تھی اسکا اندازہ کرہوسکتا ہے
تولابار کودیکھ کر مجھے وہاں کے اونچے درختوں اور بڑے بڑے پھلوں کودیکھ کر حیرت ہوتی تھی۔ اس
کے بعد مزنبیق میں قیام ہوا اور وہاں سے چل کر ہم مئی کے آخر میں مثال پہنچ گئے۔

چند تجربے

نشال کی بندرگاہ ڈربن ہے۔ اسے پورٹ نشال بھی کہتے ہیں۔ وہاں عبداللہ سیٹھ مجھے لینے کے لئے آئے۔ جب جہاز بندرگاہ کے قریب پہنچا تو میں ان لوگوں کو دیکھ رہا تھا جو اپنے دوستوں سے ملنے کے لئے جہاز پر آئے تھے مجھے یہ اندازہ ہوا کہ ہندوستانی کچھ عزت کی نگاہ سے نہیں دیکھے جاتے۔ عبداللہ سیٹھ کے جلتے دلوں کا جو برتاؤ ان کے ساتھ تھا اس سے ایک طرح کی رعوت ظاہر ہوئی تھا جس سے میرے دل پر چوٹ لگی۔ عبداللہ سیٹھ اس کے عادی ہو گئے تھے مجھے لوگ حیرت سے دیکھ رہے تھے میں اپنے لباس کے سبب سے اور ہندوستانیوں سے ممتاز نظر آتا تھا۔ میں فزاک کوٹ پہنے تھا اور میرے سر پر بھگلی دمنگ کی پگزی تھی۔

بہمیں دوکان کی عمارت میں پہنچایا گیا اور جس کمرے میں عبداللہ سیٹھ رہتے تھے۔ اس کے برابر والے کمرے میں ٹھہرایا گیا ہم دونوں کو ایک دوسرے کی طبیعت کا اندازہ کرنے میں دقت ہوئی۔ ان کاغزات کو پڑھ کر جو ان کے بھائی نے میرے ساتھ بھیجے تھے۔ وہ الجھن میں پڑ گئے۔ وہ سمجھے کہ ان کے بھائی نے ان کے گھر ایک سفید ہاتھی بھیج دیا ہے۔ جسے کھلاتے کھلاتے دیوالہ نکل جائے گا۔ میرے لباس اور طرز معاشرت میں انہیں فرنگیوں کا سا اسراف نظر آیا۔ انہوں نے سوچا کہ اس دقت کوئی خاص کام بھی نہیں جواں حضرت کو دیا جاسکے۔ مقدمہ ٹرانسوال میں ہے فوراً وہاں بھیجنا بالکل فضول ہے۔ پھر یہ بھی معلوم نہیں کہ ان کی قابلیت اور دیانت پر کہاں تک اعتبار کیا جاسکتا ہے؟ میں تو پریشان رہا اور کہا کہ ان کی نگرانی کر سکوں۔ مدعا علیہ سب وہیں ہیں ممکن ہے کہ وہ لوگ ان پر ناجائز اثر ڈالیں۔ اب اگر مقدمے کا کام نہیں دیا جاسکتا تو پھر اور کون سا کام دیا جائے۔ دوسرے کام تو میرے محرران سے کہیں اچھا کر لیتے ہیں اور محرر اگر غلطی کریں تو ان سے باز پرس ہو سکتی ہے لیکن اگر ان سے غلطی ہو تو کیا کیا

جائے۔ اس لئے اگر مقدمے کے متعلق کوئی کام انہیں نہ دیا جائے تو گویا مفت میں ان کا بار میرے سر پر گیا۔

عبداللہ سیٹھ قریب قریب ان پڑھ تھے مگر ان کا تجربہ بہت وسیع تھا۔ ان کی سوجھ بوجھ غضب کی تھی اور انہیں اس کا احساس بھی تھا۔ مشق سے انہوں نے بس اتنی انگریزی سیکھ لی تھی کہ بات چیت کر سکیں۔ مگر وہ اسی سے سارا کاروبار چلاتے تھے۔ چاہے بینک کے منجروں اور یورپی تاجروں سے معاملہ کرنا ہو یا وکیل کو مقدمہ سمجھانا ہو۔ ہندوستانی ان کی بڑی عزت کرتے تھے۔ ان سب خوبیوں کے ساتھ ان میں ایک عیب تھا وہ فطری طور پر شکی دماغ ہونے لگے تھے۔

انہیں اس بات پر فخر تھا کہ ان کا مذہب اسلام ہے اور اس مذہب کے فلسفے پر تقریر کرنے کا انہیں بڑا شوق تھا وہ عربی نہیں جانتے تھے مگر قرآن مجید کی تفسیر اور عام اسلامی امور میں خاصا دخل رکھتے تھے مثالیں انہیں بڑی کثرت سے یاد تھیں اور جب چاہتے تھے ان سے کام لیتے تھے۔ ان کی صحبت میں مجھے اسلام سے اچھی خاصی عملی واقفیت ہو گئی جب ہم دونوں میں بے تکلفی ہو گئی تو ہم اکثر مذہبی مسکوں پر بحث کیا کرتے تھے۔

میرے آنے کے دوسرے تیسرے دن وہ مجھے ڈربن کی عدالت دکھانے لے گئے وہاں انہوں نے مجھے کئی آدمیوں سے ملوایا۔ اور اپنے وکیل کے پاس بٹھایا۔ مجسٹریٹ مجھے دیر تک گھورتا رہا۔ آخر میں اس نے مجھ سے کہا "پگزی اتار ڈالو" میں نے انکار کیا اور عدالت سے اٹھ کر چلا آیا۔

اس سے ثابت ہوا کہ یہاں بھی میری تقریر میں لڑائی لڑنا لکھا ہے۔ عبداللہ سیٹھ نے مجھے سمجھایا کہ بعض ہندوستانیوں کو پگزی اتارنا پڑتا ہے۔ انہوں نے کہا جو لوگ اسلامی لباس پہنتے ہیں وہ پگزی باندھے رہتے ہیں لیکن اور ہندوستانیوں کو عموماً عدالت میں جاتے وقت پگزی اتارنے کا حکم ہے۔

اس بار یک فرق کو سمجھانے کے لئے مجھے کسی قدر تفصیل سے کام لینا چاہیے اور دو تین دن کے عرصے میں مجھے یہ معلوم ہوا کہ یہاں ہندوستانی چار طبقوں میں تقسیم کئے جاتے ہیں۔ پہلا طبقہ مسلمان تاجروں کا جو اپنے آپ کو عرب کہتے تھے۔ دوسرا طبقہ چند محروں اور تیسرا پارسی محروں کا تھا۔ ہندو محروں کسی شمار قطار میں نہ تھے۔ سوائے ان لوگوں کے جو عربوں میں مل جاتے تھے۔ پارسی محروں اپنے آپ کو ایرانی کہتے تھے۔ ان تینوں طبقوں میں آپس میں سماجی تعلقات تھے مگر سب سے بڑا طبقہ تامل تیلنگو اور شمالی مہجان کے پابند اور آزاد مزدوروں کا تھا۔ پابند مزدور وہ تھے جو پانچ سال کی ملازمت کا معاہدہ کر کے مثال گئے اور گرمی کہلاتے تھے گرمی "گرمٹ" سے نکلا ہے جو انگریزی کے لفظ

ایگریمنٹ (مصلحت) کی خرابی ہے۔ مزکورہ بلا تینوں طبقے اس چوتھے طبقہ سے محض کاروباری تعلقات رکھتے تھے۔ انگریز لوگ ان کو قلی کہتے تھے اور چونکہ اکثر ہندوستانی مزدور تھے اس لئے سبھی اقلی یا اسامی کہلاتے تھے ساسی کا اعلیٰ زبان کالاجہ ہے جو اکثر تامل تیلنگو کے آخر میں آتا ہے اور یہ اصل میں سنسکرت لفظ "سوامی" ہے جس کے معنی مالک کے ہیں۔ اس لئے جب کسی ہندوستانی کو جس کی طبیعت میں غرافت ہو کوئی شخص ساسی کہہ کر مخاطب کرتا تھا تو وہ یہ جواب دیتا تھا آپ مجھے اسامی کہتے ہیں مگر آپ کو معلوم نہیں کہ اسامی کے معنی مالک کے ہیں۔ میں آپ کا مالک تو نہیں ہوں" بعض انگریز یہ سن کر بھینپ جاتے تھے بعض اس ہندوستانی کو گالیاں دیتے تھے بلکہ موقع ملے تو مار بیٹھتے تھے۔

کیونکہ ان کے نزدیک اسامی "حقارت کا لفظ تھا۔ اس کے معنی مالک" بتانا گویا ان کی توہین کرنا تھا۔

اس لئے لوگ مجھے اقلی "بیرسز" کہتے تھے۔ ہندوستانی تاجر اقلی تاجر کہلاتے ہیں رفتہ رفتہ لوگ قلی کے معنی بھول گئے تھے اور یہ ہندوستانیوں کا عام لقب ہو گیا تھا۔ کسی مسلمان تاجر کو کوئی انگریز اقلی کہہ دے تو وہ بہت بگڑتا تھا اور کہتا تھا میں قلی نہیں ہوں بلکہ عرب ہوں یا میں تاجر ہوں" اور انگریز اگر مہذب ہو تو اس سے معافی مانگ لیتا تھا۔

ایسی صورت میں پگڑی کا مسئلہ بہت اہم تھا۔ پگڑی اتارنے کے معنی یہ تھے گویا چپ چاپ ذلت سہ لی۔ اس لئے میں نے یہ سوچا کہ اب ہندوستانی پگڑی کو خیر باد کہہ کر انگریزی ہیٹ استعمال کرنا چاہئے تاکہ میری ذلت نہ ہو اور ان ناگوار جھگڑے سے بچھا چھوٹے۔

مگر عبداللہ سیٹھ نے اس خیال کو ناپسند کیا۔ انہوں نے کہا اگر تم ایسا کرو گے تو بہت برا اثر پڑے گا۔ تمہارے سبب سے ان لوگوں کی بات بگڑ جائے گی جو پگڑی باندھنے پر اڑے ہوئے ہیں اور تمہارے سر پر ہندوستانی پگڑی بھلی بھی معلوم ہوتی ہے۔ اگر تم انگریزی ہیٹ لگاؤ تو ہوٹل کے بیرے معلوم ہونے لگو گے۔"

یہ نصیحت مصلحت اندیشی، حب وطن اور کسی قدر تنگ نظری پر مبنی تھی۔ مصلحت تو ظاہر ہے اور حب وطن نہ ہوتا تو وہ ہندوستانی پگڑی باندھنے پر استنا زور کیوں دیتے۔

مگر بیرے کی حقارت آمیز پھبتی سے ایک حرع کی تنگ نظری ظاہر ہوتی تھی۔ ہندوستانی پابند مزدوروں میں تین مذہب کے لوگ تھے۔ ہندو، مسلمان اور عیسائی۔ آخر الا ذکر پابند مزدوروں کی اولاد

تھے جنہوں نے عیسائی مذہب اختیار کر لیا تھا 1893ء میں ان کی تعداد خاصی بڑی ہو گئی تھی۔ وہ انگریزی لباس پہنتے تھے اور ان میں سے اکثر ہوٹلوں میں بیرے کا کام کر کے گزار کرتے تھے۔ عبداللہ سیٹھ نے بھی انگریزی ہیٹ پر اعتراض کیا تو ان کا اشارہ اسی گروہ کی طرف تھا۔ ہوٹل کا بیرا ہونا ذلت سمجھی جاتی تھی بہت سے لوگ اب تک اس خیال پر قائم ہیں۔

مجموعی حیثیت سے مجھے عبداللہ سیٹھ کی نصیحت پسند آئی۔ میں نے اخباروں میں اس واقعے کا حال لکھا اور اپنی پگڑی باندھ کر عدالت میں جانے کو جائز ثابت کیا اس مسئلہ پر اخباروں میں خوب بحث ہوئی اور انہوں نے میرا لقب ”ناپسندیدہ نووارد“ رکھ دیا بعض میری تائید کرتے تھے اور بعض میری بیباکی پر اعتراض کرتے تھے۔

مگر جب تک جنوبی افریقہ میں رہا قریب قریب ہمیشہ پگڑی باندھتا رہا۔ البتہ ایک زمانے میں پگڑی ٹوپی وغیرہ سب چھوڑ دی تھی اور ننگے سر رہتا تھا۔ یہ کب ہوا اور کیوں ہوا اس کا حال آگے چل کر معلوم ہوگا۔

پریٹوریا کا سفر

مجھے تھوڑے دن میں عیسائی ہندوستانیوں سے جو ڈربن میں رہتے تھے ملنے کا اتفاق ہوا۔ عدالت کے مترجم مسز پال رومن کیتھولک تھے۔ مجھ سے ان کی ملاقات ہو گئی اور مسز سبحان گاڈفرے آنجہانی سے بھی جو اس زمانے میں پرنسٹنٹ مشن میں مدرس تھے ان کے بیٹے مسز جیمس گاڈفرے پار سال جنوبی افریقہ کے وفد کے رکن ہو کر ہندوستان آئے تھے اسی زمانے میں میں پارسی رستم جی آنجہانی اور آدم جی میاں خاں آنجہانی سے بھی ملا ان سب دوستوں میں جو اس وقت تک ایک دوسرے سے صرف کاروبار کے سلسلے میں ملتے تھے بعد میں بہت گہرے تعلقات ہو گئے جیسا کہ آگے چل معلوم ہوگا۔

ادھر میں اپنے حلقہ ملاقات کو وسیع کر رہا تھا اور ادھر ہماری دوکان کے نام وکیل کا خط آیا جس میں اطلاع ملی کہ اب مقدمے کی تیاریاں کرنے کا وقت ہے اور عبداللہ سیٹھ کو چاہئے یا تو وہ خود پریٹوریا جائیں یا اپنے کسی نمائندے کو بھیجیں۔

عبداللہ سیٹھ نے مجھے یہ خط پڑھنے کو دیا اور مجھ سے پوچھا کہ تم پریٹوریا جاؤ گے میں نے کہا یہ میں اس وقت کہہ سکتا ہوں جب آپ سے مقدمہ سمجھ لوں۔ ابھی تو میں حیران ہوں کہ میرا وہاں کیا کام ہے۔ اس پر انہوں نے اپنے محرروں کو حکم دیا کہ مجھے مقدمہ سمجھائیں۔

جب میں مقدمے کا مطالعہ کرنے لگ تو یہ معلوم ہوا کہ مجھے ان معاملات میں الف بے سے شروع کرنا چاہئے۔ جب میں زنجبار میں کچھ روز ٹھہرا تھا تو میں نے عدالت میں جا کر وہاں کی کارروائی دیکھی تھی۔ ایک پارسی وکیل گوادے سے جرح کے سلسلے میں یہی کھاتے کے متعلق سوال کر رہا تھا میں ایک حرف نہیں سمجھ۔ سابق کانن میں نے نہ تو اسکول میں سیکھا تھا اور نہ انگلستان کے قیام کے زمانے میں

اس مقدمے کا جس کے لئے میں جنوبی افریقہ آیا تھا دار و مدار حسب کتاب پر تھا محرر لکھے جو کلمے کی باتیں کرتا چلا گیا اور میری الجھن بڑھتی گئی مجھے یہ نہیں معلوم تھا کہ پی نوٹ کے کہتے ہیں۔ لغت میں بھی یہ لفظ نہیں ملا میں نے محرر کے سامنے اپنی جہالت کا اظہار کیا اور اس سے معلوم ہوا کہ پی نوٹ سے پرائسری نوٹ مراد ہے میں نے سیاق پر ایک کتاب خریدی اور اس کا مطالعہ کیا۔ اس سے مجھے کسی قدر اطمینان ہوا مقدمہ میری سمجھ میں آ گیا میں نے دیکھا کہ عبداللہ سیٹھ جنہیں حسب لکھنا نہیں آتا تھا اتنی سوجھ بوجھ رکھتے تھے کہ سیاق کی پیچیدگیوں کو دم بھر میں سلجھا کے رکھ دیتے تھے میں نے ان سے کہا کہ میں پریٹوریا جانے کو تیار ہوں۔

انہوں نے پوچھا آپ ٹھہریں گے۔ کہاں ”میں نے کہا ”جہاں آپ فرمائیں“ اچھا تو میں وکیل صاحب کو لکھ دوں گا وہ آپ کے ٹھہرنے کا انتظام کر دیں گے۔ میں اپنے مہین دوستوں کو بھی اطلاع دے دوں گا لیکن میری رائے میں ان کے یہاں آپ کا ٹھہرنا مناسب نہیں۔ فریق ثانی کا پریٹوریا میں بڑا اثر ہے۔ اگر ان میں سے کوئی ہمارے خط پڑھ لے تو ہمیں بہت نقصان پہنچ جانے کا اندیشہ ہے۔ آپ ان لوگوں سے ربط ضبط بڑھانے سے جتنا پرہیز کریں اتنا ہی ہمارے لئے اچھا ہے۔“

”مجھے جہاں آپ کے وکیل ٹھہرائیں گے وہیں ٹھہروں گا یا اپنے طور کہیں علیحدہ مکان ڈونڈھ لوں گا۔ آپ خاطر جمع رکھیں۔ ہماری پوشیدہ باتوں کی کسی کو کانوں کان خبر نہ ہوگی۔ مگر یہ میں ضرور چاہتا ہوں کہ فریق ثانی سے ملاقات بلکہ دوستی پیدا کروں۔ اگر ہو سکا تو میں یہ کوشش کروں گا کہ عدالت کے باہر آپس میں سمجھوتہ ہو جائے آخر سیٹھ طیب آپ کے عزیز ہی تو ہیں“

سیٹھ طیب حاجی خان محمد عبداللہ سیٹھ کے قریبی رشتہ دار تھے
سیٹھ کے چہرے سے ظاہر ہو گیا کہ وہ سمجھوتے کا نام سن کر کھٹک گئے لیکن مجھے ڈر بن آئے چھ سات دن ہو چکے تھے اور ہم دونوں ایک دوسرے کی طبیعت سے واقف ہو گئے تھے۔ اب میں سفید ہاتھی نہیں رہا تھا۔ انہوں نے رک رک کر کہا:-

ہاں۔۔۔۔۔ ہے۔۔۔۔۔ تو۔۔۔۔۔ اچھا۔ عدالت کے باہر سمجھوتہ ہو جائے تو کیا بات ہے لیکن ہم سب عزیز ہیں اور ایک دوسرے کو خوب جانتے ہیں۔ طیب سیٹھ آسانی سے راضی ہونے والے آسانی نہیں۔ اگر ہم نے ذرا سی غفلت کی تو وہ ہم سے نہ جانے کیا کچھ ایٹھ لیں گے اور آخر میں ایسا چرکہ دیں گے کہ ہم بھی یاد کریں گی اس لئے آپ ذرا دیکھ بھال کر قدم اٹھائیے گا۔
میں نے کہا آپ کچھ اندیشہ نہ کیجئے مجھے طیب سیٹھ سے یا کسی شخص سے مقدمہ کا حال بتانے کی

کیا ضرورت ہے۔ میں تو انہیں صرف یہ صلاح دوں گا کہ آپس میں سمجھو تا کر لیں ورنہ مدتوں بیکار مقدمہ بازی ہوتی رہے گی۔"

ذربن آنے کے ساتویں آٹھویں دن میں وہاں سے روانہ ہو گیا میرے لئے اول درجے کا ٹکٹ لیا گیا۔ وہاں قاعدہ تھا کہ اگر بستر کی ضرورت ہو تو پانچ شلنگ اور دینا پڑتے تھے۔ عبداللہ سیٹھ کا اصرار تھا کہ میں اپنا بستر کرائے پر لے لوں لیکن میں نے کچھ تو ضد اور غرور میں اور کچھ پانچ شلنگ بچانے کے خیال سے انکار کر دیا۔ عبداللہ سیٹھ نے کہا ادیکھو یہ ہندوستان نہیں ہے ہمیں خدا نے بہت کچھ دے رکھا ہے تمہیں جس چیز کی ضرورت ہو بے تکلف لے لو۔"

میں نے ان کا شکریہ ادا کیا اور کہا کہ آپ میری طرف سے بالکل مطمئن رہیں نو بجے رات کو گاڑی شمال کے دارالحکومت میرنیز مرگ پہنچی بستر وغیرہ اسی اسٹیشن پر دئے جاتے تھے ایک ریل کا آدمی آیا اور اس نے پوچھا کہ آپ کو بستر تو نہیں چاہیے میں نے کہا نہیں میرے پاس موجود ہے۔ اس کے بعد ایک (سفید چمڑے کا) مسافر آیا اور اس نے مجھے سر سے پیر تک دیکھا۔ اسے معلوم ہو گیا کہ یہ کالا آدمی ہے۔ اس کی طبیعت منفض ہو گئی۔ وہ فوراً چلا گیا اور تھوڑی دیر میں دو ایک ریل کے ملازموں کو ساتھ لے آیا انہوں نے تو کچھ نہیں کہا مگر ایک اور افسر میرے پاس آکر کہنے لگا اادھر آؤ تمہیں گارڈ کے ڈبے میں بیٹھنا پڑے گا۔"

میں نے کہا مگر میرے پاس تو اول درجے کا ٹکٹ ہے۔"

اس نے جواب دیا اس سے کچھ نہیں ہوتا میں جو تم سے کہتا ہوں کہ تمہیں گارڈ کے ڈبے میں چلنا پڑے گا۔"

اور میں تم سے یہ کہتا ہوں کہ مجھے ذربن میں اس ڈبے میں بیٹھنے کی اجازت دی گئی تھی اور میں اسی میں جاؤں گا۔"

اہرگز نہیں تمہیں یہ ڈبہ خالی کرنا پڑے گا ورنہ میں پولیس کے سپاہی کو بلا کر تمہیں نکلوا دوں گا۔"

تمہیں اختیار ہے میں اپنی مرضی سے تو جانے کا نہیں"

سپاہی آیا اور اس نے میرا ہاتھ پکڑ کر مجھے باہر کھینچ لیا۔ میرا اسباب بھی اٹھایا گیا میں نے دوسرے ڈبے میں جانے سے انکار کیا اور گاڑی چل دی میں جا کر مسافر خانے میں بیٹھ گیا۔ میں نے اپنا ہینڈ بیگ لیا اور باقی سامان جہاں تھا وہیں پڑا رہنے دیا۔ ریل کے ملازموں نے اسے اپنی حفاظت میں لے لیا۔

جاڑے کے دن تھے اور جنوبی افریقہ کے بلند خطوں میں کڑا کے کا جاڑا پڑتا ہے میری بزرگ بہت

اوپنچی جگہ ہے۔۔۔ یہاں بڑی سخت سردی تھی۔ میرا کوٹ میری اسباب میں تھا لیکن مجھے مانگنے کی جرات نہ ہوتی تھی کہ کہیں پھر ذلیل نہ ہونا پڑے۔ اس لیے

بیٹھا کانپتا رہا۔ کمرے میں روشنی نہیں تھی۔ آدھی رات کے قریب ایک مسافر آیا اور اس نے چلا کہ مجھ سے باتیں کرے مگر میں ایسی حالت میں کیا خاک باتیں کرتا۔

میں یہ سوچ رہا تھا کہ اب میرا فرض کیا ہے۔ میں اپنے حقوق کے لئے لڑوں یا اسکی وقت ہندوستان لوٹ جاؤں یا چپ چاپ ذلت برداشت کر کے پریٹوریا پہنچوں اور مقدمہ ختم ہونے کے بعد ہندوستان کی واپسی کا قصد کروں جس کام کا میں نے ذمہ لیا ہے اسے پورا کئے بغیر ہندوستان واپس جانا بزدلی ہے مجھے تکلیف اٹھانا پڑی۔ یہ سٹگی چیز ہے۔ یہ محض ایک علامت ہے رنگ کے تعصب کی جو ایک جہلک مرض کی صورت میں سٹخ کے بیچے موجود ہے۔ اگر ہو سکے تو مجھے یہ کوشش کرنا چاہئے کہ اس مرض کا پورا ازالہ ہو جائے اور اس میں جتنی تکلیفیں پیش آئیں سب جھیلنا چاہئے میرے ساتھ بد سلوکی کی گئی ہے اس کی تلافی کی کوشش صرف اس حد تک جائز ہے جہاں تک نسلی تعصب کو دور کرنے میں مدد ملے۔

غرض میں نے یہ طے کیا کہ جو پہلی گاڑی ملے گی اس پے پریٹوریا چلا جاؤں گا۔ دوسرے دن صبح کو میں نے ریلوے کے جنرل منیجر کے نام بڑا لمبا تار دیا اور عبداللہ سیٹھ کو بھی اطلاع دے دی۔ وہ فوراً جا کر جنرل منیجر سے ملے۔ اس نے ریل کے کارکنوں کے طرز عمل کو جائز قرار دیا لیکن سیٹھ صاحب کو اطمینان دلایا کہ اسٹیشن ماسٹر کو ہدایت کر دی گئی ہے کہ وہ میرے حفاظت کے ساتھ منزل مقصود تک پہنچنے کا انتظام کر دے۔ عبداللہ سیٹھ نے میرٹیز برگ کے ہندوستانی تاجروں کو اور اپنے دوستوں کو جو دوسرے مقامات پر تھے تار دے دیئے کہ وہ مجھ سے ملیں اور میری مدد کریں۔ تاجر مجھ سے ملنے آئے اور انہوں نے مجھے تسکین دینے کے بعد ان وقتوں کا ذکر کیا۔ جو انہیں پیش آچکی تھیں اور کہا کہ یہ کوئی غیر معمولی بات نہیں۔ جو ہندوستانی اول درجے میں یا دوسرے درجے میں سفر کرتے ہیں انہیں ریلوے کے ملازموں اور فرنگی مسافروں کی بد سلوکی کے لئے تیار رہنا چاہئے۔ سارا دن انہیں المناک داستانوں کے سنتے میں گزر گیا۔ شام کی گاڑی آئی میرے لئے ایک جگہ محفوظ کر لی گئی۔ میرٹیز برگ میں نے بستر کا ٹکٹ جس کے لینے سے ڈر بن میں انکار کیا تھا خرید لیا۔

اس گاڑی نے مجھے چارلس ٹاؤن تک پہنچایا۔

مزید تکلیفیں

پارلس ٹاؤن میں گاڑی صبح کو پہنچی۔ اس زمانے میں پارلس ٹاؤن اور جوبہا سبرگ کے درمیان ریل نہ تھی بلکہ شکر م چلتی تھی جو رستے میں اسٹیشن کے مقام پر رات بھر ٹھہرتی تھی۔ میرے پاس شکر م کا ٹکٹ تھا جس کی معیاد میر نیز برگ میں ایک دن ٹھہر جانے کے بعد بھی ختم نہیں ہوئی تھی۔ اس کے علاوہ عبداللہ سیٹھ نے پارلس ٹاؤن کے ایجنٹ کو تار دے دیا تھا۔

مگر ایجنٹ مجھے ٹکنے کے لئے بہانا ڈھونڈتا تھا۔ اس لئے میں نے اسے وہی جواب دیا جو دینا چاہئے تھا۔ مگر جس خیال سے وہ نہانا چاہتا تھا وہ جگہ کی کمی نہ تھی بلکہ کچھ اور ہی بات تھی۔ مسافر شکر م کے اندر بٹھائے جاتے تھے۔ شکر م کا محاذ جو ایڈر "بھلاتا تھا ایک گورا تھا اس نے دیکھا کہ میں اقلی " ہوں اور اجنبی معلوم ہوتا ہوں اس لئے اس نے مجھے فرنگی مسافروں کے ساتھ بٹھانا مناسب نہ سمجھا۔ کوچ بکس کے دونوں طرف بھی بیٹھنے کی جگہیں تھیں۔ ایڈر عموماً ان میں سے کسی جگہ پر بیٹھا کرتا تھا مگر آج وہ خود اندر بیٹھا اور مجھے اپنی جگہ پر بٹھایا۔ میں جانتا تھا کہ یہ صریحی نا انصافی ہے اور اس میں میری توہین ہے مگر میں نے یہی مناسب سمجھا کہ اسے چپ چاپ برداشت کر لوں۔ زبردستی اندر گھس جانا میرے امکان میں نہ تھا اور اگر میں صدمائے احتجاج بلند کرتا تو شکر م مجھے چھوڑ کر چلی جاتی، میرا ایک دن اور ضائع ہوتا اور دوسرے دن خدا جانے کیا واقعہ پیش آتا اس لئے اگرچہ میں اپنے دل میں پچ تب کھا رہا تھا مگر مصلحت اندیشی سے کام لے کر کوچوان کے پاس بیٹھ گیا۔

میں بچے کے قریب شکر م پارڈیکو پ پہنچی۔ اب ایڈر کو یہ سو تھی کہ میری جگہ پر بیٹھے کیونکہ اسے تمباکو پینے اور شاید تازہ ہوا کی خواہش تھی۔ اس لئے اس نے کوچوان سے ایک میلا ساٹل لے کر

پیر رکھنے کے تختے پر بچھا دیا اور مجھ سے مخاطب ہو کر کہا "سامی تم اس پر بیٹھو میں کوچبان کے پاس بیٹھوں گا۔" یہ اتنی بڑی ذلت تھی جسے میں کسی طرح برداشت نہیں کر سکتا تھا۔ ڈرتے ڈرتے میں نے اس سے کہا "تمہیں نے مجھے یہاں بٹھایا تھا مگر میری جگہ اندر ہونا چاہئے تھی میں نے یہ ذلت برداشت کر لی اب تمہارا جی بلبر بیٹھ کر تمباکو پینے کو چاہتا ہے اس لئے تم مجھے اپنے پیروں کے پاس بٹھاتے ہو یہ تو میں نہیں کروں گا۔ البتہ اندر بیٹھنے کو تیار ہوں" جتنی دیر میں میں نے انک انک کر یہ الفاظ کہے وہ شخص میری طرف بڑھا اور اس نے میرے کانوں پر تان تان کر گھونے لگانا شروع کئے۔ اس نے میرا بازو پکڑ لیا اور مجھے کھینچ کر بیچے اتارنا چاہا میں نے پیٹل کا کٹہرا جو کوچ بکس پر لگا تھا مضبوط پکڑ لیا اور یہ ارادہ کر لیا کہ چاہے میری کہنی ٹوٹ جائے مگر اسے نہ چھوڑوں گا۔ مسافر یہ تماشہ دیکھ رہے تھے کہ وہ شخص مجھے گالیاں دے رہا ہو مجھے کھینچ رہا ہے اور میں خاموش ہوں۔ وہ طاقتور تھا اور میں کمزور تھا بعض مسافروں کو رحم آگیا اور انہوں نے چلا کر کہا "بھلے آدمی اس بیچارے کو چھوڑ دے اسے کیوں مار رہا ہے۔ یہ سچ تو کہتا ہے اگر وہاں نہیں بیٹھنا چاہتا تو اسے ہمارے پاس بیٹھ جانے دے۔" اس نے گرج کر جواب دیا ہرگز نہیں مگر وہ کچھ سہٹایا اور اس نے مجھے مارنے سے ہاتھ روک لیا۔ پھر اس نے میرا بازو چھوڑ دیا اور مجھے دو چار گالیاں دے کر ہائیٹل نوکر کو جو کوچ بکس کے دوسرے سرے پر بیٹھا تھا نیچے بٹھایا اور خود اس کی جگہ لے لی۔

سب مسافر اپنی اپنی جگہ پر بیٹھ گئے سیٹی بجی اور گاڑی روانہ ہو گئی میرا دل دھڑک رہا تھا اور میں دل میں کہتا تھا کہ دیکھئے منزل مقصود تک زندہ پہنچتا ہوں یا نہیں۔ وہ شخص مجھے کبھی کبھی قہر آلود نظر سے دیکھتا تھا اور انگلی سے میری طرف اشارہ کر کے کہتا تھا "خبردار مجھے اسٹینڈرین پہنچنے دو پھر میں تمہیں دکھا دوں گا کہ میں کیا کر سکتا ہوں"

جب ہم اسٹینڈرین پہنچے تو اندھیرا ہو چکا تھا۔ یہاں مجھے کچھ ہندوستانی صورتیں نظر آئیں اور میں نے اطمینان کی سانس لی۔ میرے اترتے ہی یہ دوست میرے پاس آئے اور انہوں نے کہا "ہم یہاں اس لئے آئے ہیں کہ آپ کا استقبال کریں اور آپ کو عیسیٰ سیٹھ کے یہاں لے جائیں۔ ہمارے دادا عبداللہ کا تار آیا تھا" میں بہت خوش ہوا اور ہم سب سیٹھ عیسیٰ حاجی عمر کے یہاں پہنچے اور ان کے محرر میرے ارد گرد جمع ہو گئے میں نے انہیں اپنی ساری پتلا سنائی۔ انہیں یہ سن کر بہت افسوس ہوا اور انہوں نے اپنے تلخ تجربت مجھ سے بیان کیے۔

میں چاہتا تھا شکر م کہنی کے ایجنٹ کو سارے واقعے کی اطلاع دوں۔ اس لئے میں نے ان کے

نام خط لکھا اور جو کچھ گزرا تفصیل سے بیان کر کے اسے محاذ کی دھمکی کی طرف توجہ دلائی میں نے اس سے بات کا بھی اطمینان چلا کہ جب شکر م دوسرے دن صبح کو روانہ ہوگی تو مجھے اندر دوسرے مسافروں کے ساتھ جگہ دی جائیگی الیجنٹ کا یہ جواب آیا اسٹینڈرٹن سے بہت بڑی شکر م چلتی ہے جس کے محاذ دوسرے ہیں اور آپ کو اور مسافروں کے ساتھ ہی جگہ ملے گی۔ "اس سے مجھے کسی قدر اطمینان ہوا۔ ظاہر ہے کہ میرا ارادہ اس شخص پر جس نے مجھ پر ہاتھ اٹھایا دعویٰ کرنے کا نہ تھا اس لیے یہ واقعہ۔ ہمیں ختم ہو گیا۔

صبح کو سیٹھ کے آدمی مجھے شکر م تک پہنچانے گئے مجھے اچھی جگہ مل گئی اور میں اسی روز رات کو خیریت سے جوہانسبرگ پہنچ گیا۔

اسٹینڈرٹن ایک چھوٹا سا گاؤں ہے اور جوہانسبرگ بڑا شہر ہے۔ عبداللہ سیٹھ نے جوہانسبرگ بھی تار دیدیا تھا اور مجھے محمد قاسم قرالدین کی دوکان کا پتہ بتادیا تھا ان کا آدمی مجھے لینے شکر م کے اڈے پر آیا تھا نہ میں نے اسے دیکھا اور نہ اس نے مجھے پہچانا۔ اس لئے میں نے کسی ہوٹل میں جانے کا قصد کیا۔ مجھے کئی ہوٹلوں کے نام معلوم تھے میں نے ایک کریہ کی گاڑی لی اور کہا کہ گرانڈ نیشنل ہوٹل لے چلوں میں نے منجر سے مل کر کمرہ مانگا۔ اس نے مجھے ایک نفر دیکھا اور تہذیب کے ساتھ یہ الفاظ کہہ کر افسوس ہے ہمارے یہاں بائبل جگہ نہیں "رضخت کر دیا اس لئے میں نے گاڑی والے سے محمد قاسم قرالدین کی دوکان پر چلنے کو کہا وہ عبدالغنی سیٹھ میرا انتظار کر رہا تھا۔ اور انہوں نے بڑی گرمجوشی سے میرا خیر مقدم کیا ہوٹل کا واقعہ سن کر وہ خوب ہنسے اور کہنے لگے ا بھلا آپ کو ہوٹل میں جگہ کیسے مل سکتی تھی۔"

میں نے پوچھا آخر کیوں نہیں؟

انہوں نے کہا جب چند روز یہاں رہیں گے تو آپ کو معلوم ہو جائے گا۔ یہاں تو ہم ہی لوگ رہ سکتے ہیں جو روپیہ کمانے کے لالچ میں دہمیں بہتے ہیں پھر ہماری جو حالت ہے وہ آپ دیکھتے ہی ہیں " اس کے بعد انہوں نے مجھ سے ان سختیوں کے واقعات بیان کئے جو ہندوستانیوں پر جنوبی افریقہ میں ہوئی تھیں۔ ان سیٹھ صاحب کا آگے چل کر مفصل ذکر آئے گا۔

انہوں نے کہا یہ ملک آپ جیسے لوگوں کے لئے نہیں ہے دیکھیے اب آپ کو پریٹوریا جانا ہے۔ آپ کو تیسرے درجے میں سفر کرنا پڑے گا ان سوال کی حالت سٹال سے بھی بدتر ہے پہلے اور دوسرے درجے کے ٹکٹ ہندوستانیوں کو کبھی نہیں دئے جاتے۔"

”معلوم ہوتا ہے آپ لوگوں نے اس لیے ہم کو شمش نہیں کی“
 ہم نے عرضداشتیں بھیجیں لیکن سچ پوچھیے تو ہم لوگ خود عام طور پر پہلے اور دوسرے درجے میں
 سفر نہیں چاہتے۔“

میں نے ریلوے کے ضوابط منگائے اور انہیں پڑھا ایک جگہ کچھ گنجائش نظر آئی۔ ٹرانسوال کے
 پرانے قوانین کی زبان ابہام اور گجگک سے غلطی نہ تھی، اور ریلوے کے ضوابط کی زبان تو اور بھی ناقص
 تھی۔

میں نے سیٹھ صاحب سے کہا میں تو اول درجے میں جانا چاہتا ہوں اور اگر یہ ممکن نہیں تو میں
 کرایہ کی گاڑی میں جانا زیادہ پسند کروں گا۔ یہاں سے پریٹوریا کل سیلٹس ہی میل تو ہے۔“

سیٹھ عبدالغنی نے مجھے سمجھایا کہ اس میں بہت دیر لگے گی اور بڑا خرچ ہو گا البتہ وہ اس پر راضی
 ہو گئے کہ میں اول درجے میں سفر کروں۔ چنانچہ میں نے اسٹیشن ماسٹر کے نام ایک رقعہ بھیجا میں نے
 لکھا کہ میں بیرسٹر ہوں اور ہمیشہ اول درجے میں سفر کرتا ہوں مجھے جلد سے جلد پریٹوریا پہنچنا ہے اس
 لئے اسناد ملت نہیں کہ جواب کا انتظار کیا جائے میں خود اسٹیشن آکر جواب لوں گا اور امید ہے کہ مجھے اول
 درجے کا ٹکٹ مل جائے گا۔ ظاہر ہے کہ خود جا کر جواب لینے میں خاص مقصد نظر تھا۔ میرا خیال تھا کہ اگر
 اسٹیشن ماسٹر نے تحریری جواب بھیجا تو وہ یقیناً انکار کرے گا خصوصاً اس کے ذہن میں ”قلی بیرسٹر“ کا
 تصور کچھ اور ہی ہو گا اس لئے میں نے سوچا کہ میں مکمل انگریزی وضع میں جا کر اس سے باتیں کروں تو
 ممکن ہے وہ ٹکٹ دے دے۔ اس لئے میں نے فزاک کوٹ پہن کر اور نکلتی ٹاکرا اسٹیشن گیا اور ٹکٹ
 گھر کے تختے پر کرایہ کی ایک گنی رک کر میں نے اول درجے کا ٹکٹ مانگا۔
 اس نے پوچھا تمہیں نے مجھے رقعہ بھیجا تھا۔“

اجی ہاں آپ ٹکٹ دیدیں تو بڑی مہربانی ہو۔ مجھے آج پریٹوریا پہنچنا ضروری ہے وہ مسکریا اور
 ہمدردی سے کہنے لگا میں ٹرانسوال کا رہنے والا ہوں بلکہ پانستلی (1) ہوں میں آپ کے جذبات کی قدر
 کرتا ہوں اور آپ سے ہمدردی رکھتا ہوں۔ میں آپ کو ٹکٹ ضرور دوں گا۔ مگر ایک شرط پر کہ اگر کارڈ
 آپ کو اتار کر تھرے درجے میں بٹھادے تو آپ مجھے اس جھنگڑے میں نہ کھینچیں۔ یعنی ریلوے کمپنی پر
 دعویٰ نہ کریں۔ اچھا خدا حافظ۔ آپ کی صورت سے ظاہر ہے کہ آپ شریف آدمی ہیں۔“

یہ کہہ کر اس نے ٹکٹ دے دیا میں نے اس کا شکریہ ادا کیا اور جوابت وہ چاہتا تھا اس کی طرف
 سے اطمینان دلایا۔“

سیٹھ عبدالغنی مجھے پہنچانے اسٹیشن آئے تھے۔ انہیں یہ دیکھ کر کہ مجھے اول درجے کا ٹکٹ مل گیا بہت تعجب ہوا مگر انہوں نے مجھے متنبہ کرنے کے لئے کہا خدا ہی جانتا ہے جو تم خیریت سے پریٹوریا پہنچ جاؤ۔ مجھے اندیشہ ہے کہ گارڈ تمہیں چین سے نہ بیٹھنے دے گا اور اگر اس نے نہ بھی چھیڑا تو مسافر دق کریں گے۔

میں اول درجے کے ڈبے میں بیٹھا اور گاڑی روانہ ہوئی۔ جرمسٹن میں گارڈ ٹکٹ دیکھنے آیا۔ وہ مجھے وہاں دیکھ کر جھنجھلایا اور انگلی سے اشارہ کرنے لگا کہ تیسرے درجے میں جا کر بیٹھو۔ میں نے اسے اپنا اول درجہ کا ٹکٹ دکھایا۔ اس نے کہا اس سے کچھ نہیں ہوتا۔ جاؤ تیسرے درجے میں بیٹھو۔

ڈبے میں صرف ایک انگریز مسافر تھا۔ اس نے گارڈ کی خبر لی "تم کیوں ایک شریف آدمی کو دق کر رہے ہو دیکھتے نہیں کہ ان کے پاس اول درجے کا ٹکٹ ہے مجھے ان کے ساتھ سفر کرنے میں مطلق اعتراض نہیں" مجھ سے مخاطب ہو کر کہنے لگا۔

آپ اطمینان سے۔۔۔ ہمیں بیٹھئے۔

گارڈ بڑبڑاتا ہوا چلا گیا "اگر تم قلی کے ساتھ سفر کرنا چاہتے ہو تو کرومیرا کرنا ساہرج ہے" شام کو آٹھ بجے گاڑی پریٹوریا پہنچی۔

حوالہ

1 - ہالینڈ کاربے نے والا۔ ڈچ۔

پریٹوریا میں پہلا دن

مجھے امید تھی کہ پریٹوریا کے اسٹیشن پر دادا عبداللہ کے وکیل کی طرف سے کوئی شخص لینے آئے گا۔ میں جانتا تھا کہ کوئی ہندوستانی میرے استقبال کے لئے موجود نہ ہو گا کیونکہ میں نے پکا وعدہ کر لیا تھا کہ کسی ہندوستانی کے یہاں نہیں ٹھہروں گا لیکن وکیل نے کسی کو نہیں بھیجا۔ مجھے بعد میں معلوم ہوا کہ اتوار کے سبب سے کسی شخص کے آنے میں بڑی زحمت ہوتی۔ میں بہت پریشان تھا اور میری سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ کہاں جاؤں کیونکہ یہ اندیشہ تھا کہ کوئی ہوٹل مجھے نہیں لے گا۔

1893ء میں پریٹوریا کے اسٹیشن کی وہ حالت نہیں تھی جو 1914ء میں تھی ایک آدھ لیمپ ٹمٹارہا تھا اور اکاد کا مسافر نظر آتے تھے۔ میں نے سوچا کہ اور سب مسافر چلے جائیں اور ٹکٹ کلکٹر خالی ہو تو میں اپنا ٹکٹ دوں اور اس سے پوچھوں کہ اسے کوئی چھوٹا سا ہوٹل یا کوئی اور جگہ معلوم ہے جہاں میں رات کو ٹھہر سکوں۔ اگر وہ بتا دے تو اچھا ہے ورنہ پھر اسٹیشن ہی پر رات گزاروں۔ مگر سچ پوچھے تو مجھے اس سے اتنی ہی بات دریافت کرنے میں بھی جھجک تھی کیونکہ مجھے اندیشہ تھا کہ کہیں ذلیل نہ ہونا پڑے۔

اسٹیشن مسافروں سے خالی ہو گیا۔ میں نے ٹکٹ کلکٹر کو ٹکٹ دیا اور اس سے جو سوالات کرنا تھے کئے۔ اس نے تہذیب سے جواب دیا مگر معلوم ہوا کہ اس سے کچھ زیادہ مدد نہیں مل سکتی۔ البتہ ایک امریکی عیاشی جو پاس کھڑا تھا مجھ سے کہنے لگا۔

”میں دیکھتا ہوں کہ آپ یہاں بالکل اجنبی ہیں آپ کے کوئی ملاقاتی نہیں آپ میرے ساتھ آئے تو آپ کو ایک چھوٹے سے ہوٹل میں لے چلوں اس کا مالک امریکی ہے اور میں اسے اچھی طرح جانتا

ہوں۔ میرے خیال میں وہ آپ کو ٹھہرا لے گا۔

مجھے اس میں شبہہ تھا لیکن میں نے اس کا شکریہ ادا کیا اور اس کی رائے مان لی۔ وہ مجھے جانشین کے فیملی ہوٹل میں لے گیا۔ اس نے مسٹر جانشین کو الگ لے جا کر باتیں کیں وہ مجھے اس شرط پر رات بھر ٹھہرانے کے لئے تیار ہو گیا کہ میں کھانا اپنے کمرے میں کھاؤں۔

انہوں نے کہا میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ میرا دل رنگ کے تعصب سے خالی ہے لیکن میرے گاہک سب فرنگی ہیں اور اگر میں آپ کو کھانے کے کمرے میں بیٹھنے دوں تو ممکن ہے کہ وہ خفا ہو جائیں بلکہ اٹھ کر چلے جائیں۔

میں نے کہا میں تو آپ کی اسی عنایت کا شکر گزار ہوں کہ آپ نے مجھے رات بھر ٹھہرایا۔ اب مجھے یہاں کے حالات سے کم و بیش واقفیت ہو گئی ہے اور میں آپ کی مشکلوں کو سمجھتا ہوں آپ مجھے کمرے ہی پر کھانا بھیج دیجئے کیا مضائقہ ہے۔ امید ہے کہ کل میں کوئی اور انتظام کر لوں گا۔

میں اپنے کمرے میں پہنچا دیا گیا اور وہاں بیٹھ کر کھانے کا انتظار کرنے لگا میں بالکل تنہا تھا اور اپنے خیالات میں ڈوبا ہوا تھا۔ ہوٹل میں زیادہ مہمان نہیں تھے اور مجھے امید تھی کہ بھرا تھوڑی دیر میں کھانا لے آئے گا۔ مگر دیکھتا ہوں کہ اس کے بجائے خود مسٹر جانشین چلے آ رہے ہیں۔ انہوں نے کہا کہ مجھے شرم آئی کہ میں نے آپ سے یہاں کھانا کھانے کو کہا۔ اس لئے میں نے جا کر اور مہمانوں سے پوچھا کہ اگر ہندوستانی مہمان کھانے کے کمرے بیٹھ کر کھائیں تو آپ کو اعتراض تو نہ ہو گا۔ انہوں نے کہا ہمیں کوئی اعتراض نہیں۔ ہماری طرف سے وہ شوق سے جب تک جی چاہے اس ہوٹل میں رہیں۔ اس لئے اگر آپ مناسب سمجھتے تو کھانے کے کمرے میں تشریف لے چلئے اور جب تک مرضی ہو یہاں قیام کیجئے۔

میں نے پھر ان کا شکریہ ادا کیا اور کھانے کے کمرے میں جا کر خوب اطمینان سے کھانا کھایا۔ دوسرے دن صبح کو میں عبداللہ سیٹھ کے وکیل بھیکر سے ملا۔ سیٹھ صاحب کو گفتگو سے مجھے ان کی طبیعت کا تھوڑا بہت اندازہ ہو گیا تھا۔ اس لئے ان کی گرجوشی سے ملنے پر مجھے تعجب نہیں ہوا۔ انہوں نے مجھے ہاتھوں ہاتھ لیا اور دوستانہ مزاج پر سی کی۔ میں نے انہیں سمجھایا کہ میں کس غرض سے آیا ہوں۔ انہوں نے کہا "بیرسٹر کی حیثیت سے آپ کے لیے کوئی کام نہیں کیونکہ ہم نے بہترین بیرسٹر کو کر لیا ہے۔ مگر مقدمہ عرصے سے چل رہا ہے اور اس میں بڑی پیچیدگیاں ہیں اس لئے بہت سے واقعات معلوم کرنے کی ضرورت پڑتی ہے اس میں میں آپ سے مدد لوں گا۔ اور پھر ظاہر ہے کہ آپ کے سبب سے مجھے اپنے موکل سے خط و کتابت کرنے میں آسانی ہوگی کیونکہ مجھے ان سے جو کچھ پوچھنا ہو گا آپ ہی کے

توسط سے پوچھوں گا آپ کے آنے سے یہ بڑا فائدہ ہوا۔ میں نے ابھی تک آپ کے لئے کمرے نہیں لئے میں نے مناسب یہ سمجھا کہ پہلے آپ سے ملاقات ہو جائے۔ اس کے بعد اس کا انتظام کر لوں گا۔ یہاں رنگ کے تعصب کی بڑی شدت ہے۔ اس سبب سے آپ جیسے آدمی کے لئے مکان ملنا بہت مشکل ہے۔ مگر میری نظر میں ایک غریب عورت کا مکان ہے اس کا شوہر ڈبل روٹی بیچتا ہے مجھے امید ہے کہ وہ آپ کو اپنے یہاں ٹھہرائیگی۔ اس سے اس کی آمدنی میں تھوڑا بہت اضافہ ہو جائے گا۔ آئیے اس کے یہاں چلیں۔"

وہ مجھے لے کر اس عورت کے یہاں گئے۔ انہوں نے اس سے علیحدہ گفتگو کی اور وہ مجھے پلنتیں شلنگ ہفتہ وار پر اپنے یہاں رکھنے پر راضی ہو گئی۔

مسٹر بیکر اپنے پیسے کے کام کے علاوہ بڑے جوش اور انہماک سے وعظ بھی کہا کرتے تھے۔ وہ ابھی زندہ ہیں اور اب دکالت چھوڑ کر محض تبلیغ کا کام کرتے ہیں۔

ان کی مالی حالت ابھی ہے میرے ان کے درمیان اب تک خط و کتابت جاری ہے ان کے خطوط کا ہمیشہ ایک ہی موضوع ہوتا ہے۔ وہ مختلف پہلوؤں سے مذہب عیسوی کی فضیلت ثابت کرتے ہیں اور ان کا دعویٰ ہے کہ جب تک انسان مسیح کو خدا کا اکلوتا بیٹا اور نوع انسانی کا نجات دہندہ نہ مانے اسے ابدی تسکین نصیب ہونا ناممکن ہے

پہلی ہی ملاقات میں مسٹر بیکر نے مجھ سے پوچھا کہ تمہارا مذہب ہی عقیدہ کیا ہے میں نے کہا میں ہندو دھرم میں پیدا ہوا لیکن مجھے اس مذہب سے بہت کم واقفیت ہے اور دوسرے مذہبوں میں اتنی بھی نہیں سچ پوچھے تو مجھے خود اپنے حال کی خبر نہیں۔ مجھے نہیں معلوم کہ میرا عقیدہ کیا ہے اور کیا ہونا چاہئے۔ میرا ارادہ ہے کہ اپنے مذہب کا گہرا مطالعہ کروں اور جہاں تک ہو سکے دوسرے مذہبوں کا بھی۔

مسٹر بیکر یہ بات سن کر بہت خوش ہوئے اور کہنے لگے میں جنوبی افریقہ کے جنرل مشن کے ڈائرکٹروں میں سے ہوں۔ میں نے اپنے خرچ سے ایک گرجا بنوایا ہے اور اس میں پابندی سے وعظ کہا کرتا ہوں۔ میرا دل رنگ کے تعصب سے پاک ہے میرے چند رفیق ہیں ادہم سب روز ایک بچے چند منٹ کے لئے جمع ہوتے ہیں اور دعا مانگتے ہیں کہ ہمیں تسکین اور ہدایت نصیب ہو۔ اگر آپ بھی ہمارے ساتھ شریک ہوا کریں تو مجھے بڑی خوشی ہوگی۔ میں آپ کو اپنے رفیقوں سے ملواؤں گا۔ وہ آپ کو دیکھ کر بہت خوش ہوں گے اور امید ہے کہ آپ کو بھی ان کی صحبت پسند آئے گی۔ اس کے علاوہ میں آپ کو چند مذہبی کتابیں پڑھنے کے لئے دوں گا اور سب کتابوں کی سر تاج تو مقدس بائبل ہے جس

کی تلاوت کی میں آپ کو خاص طور پر تاکید کرتا ہوں
میں نے مسٹر بیکر کا شکریہ ادا کیا اور وعدہ کیا کہ ایک سبجے کی عبادت میں جہاں تک ہو سکے گا
پابندی سے شریک ہوا کروں گا۔

مسٹر بیکر نے کہا "تو میں کل ایک سبجے اسی جگہ آپ کا انتظار کروں گا اور ہم دونوں مل کر عبادت
میں جائیں گے" اور ہم ایک دوسرے سے رخصت ہو گئے۔
ابھی میرے پاس ان باتوں پر غور کرنے کا وقت نہ تھا۔

میں مسٹر جانسن کے یہاں پہنچاں کا بل ادا کیا اور اپنے نئے مکان میں جا کر دوپہر کا کھانا کھایا۔
مالکہ مکان بڑی نیک عورت تھی۔ اس نے میرے لئے نباتاتی کھانا پکایا تھا۔ مجھے اس خاندان کے لوگوں
سے بے تکلف ہونے میں دیر نہیں لگی۔

اس کے بعد میں ان دوست سے ملنے گیا جن کے نام دادا عبداللہ نے رقمہ دیا تھا ان سے معلوم ہوا
کہ جنوبی افریقہ میں ہندوستانیوں کو کیا کیا سختیاں برداشت کرنا پڑتی ہیں۔ ان کا اصرار تھا کہ میرے ساتھ
ٹھہرو۔ میں نے ان کا شکریہ ادا کیا اور کہا کہ میں پہلے ہی انتظام کر چکا ہوں۔ انہوں نے بہت اصرار سے کہا
کہ جس چیز کی ضرورت ہو بے تکلف مجھ سے مانگ لینا۔

اب شام ہو گئی تھی۔ میں نے گھر آ کر کھانا کھایا اور خیالات میں ڈوبا ہوا اپنے کمرے میں جا کر لیٹ گیا
۔ ابھی کچھ میرے لئے کوئی کام نہ تھا میں نے عبداللہ میٹھ کو اس کی اطلاع دے دی میں اپنے دل میں
سوچ رہا تھا کہ مسٹر بیکر کو مجھ سے اتنی دلچسپی کیوں ہے۔ مجھے ان کے دیندار رفیقوں سے مل کر کیا
فائدہ ہو گا میرے لئے عیسائی مذہب کا مطالعہ کرنا کہاں تک اچھا ہے؟ ہندو دھرم کے متعلق کتابیں کہاں
سے ملیں؟ اور جب تک میں خود اپنے مذہب سے اچھی طرح واقف نہ ہو جاؤں عیسائیت کا صحیح اندازہ کیسے
کر سکتا ہوں؟ میں اسی نتیجہ پر پہنچا کہ مجھے ہر چیز پر جو میرے سامنے آئے ٹھنڈے دل سے غور کرنا چاہئے
اور مسٹر بیکر کے حلقے کے لوگ جو سوالات کریں ان کا جواب دینے کے لئے خدا کی ہدایت کا منتظر رہنا
چاہئے جب تک میں اپنے مذہب کو اچھی طرح سمجھ لوں کسی دوسرے مذہب کے اختیار کرنے کا خیال
دل میں لانا مناسب نہیں ہے۔

یہ سوچتے سوچتے میں سو گیا۔

عیسائیوں کی صحبت

دوسرے دن ایک بچے مسٹر بیکر کی عبادت کی صحبت میں گیا۔ وہاں مجھ سے مس، میرس، مس گیپ اور مسٹر کولس وغیرہ سے ملاقات ہوئی۔ ہر شخص دعا مانگنے کے لئے دو زانو ہو گیا۔ میں نے بھی اوروں کی دیکھا دیکھی یہی کیا۔ دعا میں ہر شخص اپنی اپنی خواہش کے مطابق خدا سے مختلف چیزوں کی التجا کرتا تھا۔ مسئلہ عام طور پر لوگ اس طرح کی دعائیں مانگتے تھے کہ دن امن و عافیت سے گزر جائے یا خدا ہمارے دل کے دروازے کھول دے۔

اب ایک نئی دعا میری نلاح کے لئے مانگی جانے لگی اے مالک ہمارے نئے بھائی کو جو ہمارے درمیان آیا ہے اپنی راہ دکھا دے۔ اے بھی اے مالک وہ تسکین عطا کر جو تو نے ہمیں بخشی ہے۔ یسوع مسیح جس نے ہمیں نجات دی ہے اے بھی نجات دے۔ اے خدا تجھے واسطہ یسوع کا۔ ”ان صحبتوں میں مناجاتیں نہیں کائی جاتی تھیں بلکہ کسی قسم کا گانا بجانا نہیں ہوتا تھا۔ روز کسی خاص چیز کی دعا مانگنے کے بعد ہم سب منتشر ہو جاتے تھے اور اپنے اپنے گھر جا کر دوپہر کا کھانا کھاتے تھے۔ دعائیں پانچ منٹ سے زیادہ صرف نہیں ہوتے تھے۔

مس، میرس اور مس گیپ دونوں کنواری خاتونیں تھیں۔ مسٹر کولس کو ٹیکر (1) تھے۔ یہ دونوں خاتونیں ساتھ رہتی تھیں اور انہوں نے مجھے مستقل دعوت دی کہ ہر اتوار کو ان کے یہاں چائے پیا کروں۔

جب ہم سب لوگ اتوار کے دن جمع ہوتے تھے تو میں مسٹر کولس کو اپنا ہفتہ بھر کا مذہبی روزنامہ دے دیتا تھا اور میں نے اس عرصہ میں جو مذہبی کتابیں پڑھی تھیں اور ان کے جو اثرات مجھ پر ہوئے تھے ان کے متعلق گفتگو کیا کرتا تھا۔ دونوں خاتونیں اپنے پاک تجربے بیان کیا کرتی تھیں اور جو تسکین قلب

انہیں حاصل ہوئی تھی اس کا ذکر کرتی تھیں۔

مسٹر کولس ایک صاف دل راسخ العقیدہ نوجوان تھے۔ ہم دونوں ساتھ ٹہلنے جایا کرتے تھے اور وہ مجھے دوسرے عیسائی دوستوں کے یہاں بھی لے جاتے تھے۔

جب مجھ میں اور ان میں زیادہ گہری دوستی ہو گئی تو وہ مجھے اپنی پسند کی کتابیں پڑھنے کے لئے دینے لگے۔ یہاں تک کہ میری الماری ان کتابوں سے بھر گئی میں بڑے ذوق شوق سے ان کا مطالعہ کرتا تھا اور جو کچھ میں پڑھتا تھا اس پر ہم دونوں میں بحث ہوا کرتی تھی۔

1893 میں میں نے اس قسم کی بہت سی کتابیں پڑھیں۔ مجھے ان سب کے نام یاد نہیں مگر ان میں سٹی ٹیمپل کے ڈاکٹر پارکر کی "تفسیر" پیرسن کی بہت سے قطعی ثبوت (2) اور ہٹلر کی "قیاسات" (3) بھی تھیں۔ ان کے بعض حصے میری سمجھ میں نہیں آتے تھے۔ بعض باہیں مجھے پسند آئیں اور بعض ناپسند ہوئیں۔ بہت سے قطعی ثبوت "میں انجیل کے مذہب کی حیثیت سے کہ مصنف نے اسے سمجھا ہے حمایت کی گئی ہے۔ اس کتاب نے مجھ پر کوئی اثر نہیں ڈالا۔ پارکر کی "تفسیر" اخلاقی احساس کو ابھارنے والی کتاب ہے لیکن ایک ایسے شخص کو جو عیسائی مذہب کے رسمی عقائد کا قائل نہیں اس سے کوئی مدد نہیں مل سکتی، ہٹلر کی "قیاسات" میں مجھے بہت دقتیں اور مشکل کتاب معلوم ہوئی جس کو اچھی طرح سمجھنے کے لئے چار پانچ بار پڑھنا ضروری ہے۔ میرے خیال میں یہ دہریوں کو خدا پرست بنانے کے لئے لکھی گئی ہے۔ اس میں خدا کے وجود کی دلیلیں جو دی گئی ہیں وہ میرے لئے غیر ضروری تھیں کیونکہ میں الحاد کی منزل سے گر چکا تھا۔ لیکن جن دلیلوں سے یہ ثابت کیا گیا ہے کہ خدا نے صرف عیسائی ہی کے جسم میں حلول کیا تھا اور وہ خدا کے دربار میں بندوں کے شفیع ہیں۔ ان کا مجھ پر کوئی اثر نہیں ہوا۔

لیکن مسٹر کولس آسانی سے ہار مانے والے آدمی نہ تھے۔ انہیں مجھ سے بہت محبت تھی۔ انہوں نے میرے گلے میں تلمسی کے دانوں کا کنٹھا دیکھا جو ویشنو مذہب کی علامت ہے وہ اسے ضعیف الاعتقادی سمجھے۔ جس سے انہیں بہت دکھ ہوا "یہ ضعیف الاعتقادی تمہیں زیب نہیں دیتی ادھر آؤ میں اسے توڑ ڈالوں۔"

ایہ نہیں ہو سکتا یہ میری ماں کا دیا ہو تبرک ہے۔"

اگر کیا تم اس پر عقیدہ رکھتے ہو؟"

میں اس کے ہمید کو نہیں جانتا۔ میرا خیال نہیں ہے کہ اس کو نہ پہنتے سے مجھے کوئی نقصان پہنچے گا۔

لیکن جو کنٹھا میری ماں نے مجھے بڑی محبت سے یہ سمجھ کر دیا ہے کہ میرے لئے باعث برکت ہو گا اسے میں بلاوجہ نہیں اتار سکتا۔ جب یہ دن گزرنے سے گھسٹے گھسٹے خود بخود ٹوٹ جائے گا تو میں دوسرا نہیں بہنوں کا مگر اسے تو ہرگز نہیں توڑوں گا۔

مسٹر کونٹس میری دلیل کو نہیں سمجھے کیونکہ ان کی نظر میں میرے مذہب کی کوئی وقعت نہیں تھی۔ انہیں آرزو تھی کہ خداوہ دن دکھائے کہ جب وہ مجھے جہالت کے گڑھے سے نکالیں۔ ہ مجھے یقین دلانا چاہتے تھے کہ چاہے دوسرے مذہبوں میں بھی حق کی جھلک ہو لیکن کامل حق صرف مذہب عیسوی میں ہے۔ اسے قبول کیے بغیر میری نجات ناممکن ہے جب تک مسیح کی شفاعت نہ ہو میرے گناہ نہیں بخشنے جائیں گے اور میرے نیک اعمال کسی کام نہ آئیں گے۔

جس طرح انہوں نے مجھے متعدد نئی کتابوں کی طرف توجہ دلائی اسی طرح متعدد دوستوں سے بھی جو ان کے نزدیک پکے عیسائی تھے۔ ملوایا۔ ان میں سے ایک خاندان اس عیسائی فرقے سے تعلق رکھتا تھا جسے پلیمتھ برادری کہتے ہیں۔

جن عیسائیوں سے میں مسٹر کونٹس کی معرفت ملا ان میں سے بہت سے نیک لوگ تھے اکثر کو میں نے پر میزگار پایا لیکن اس خاندان کے ایک پلیمتھ برادر نے ایک بار ایسی دلیل پیش کی جسے سن کر میں حیران رہ گیا۔

”آپ ہمارے مذہب کی خوبی کو نہیں سمجھ سکتے۔ آپ کے بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ عمر بھر اپنی لغزشوں کی فکر میں الجھے رہتے ہیں، ہر وقت ان کی اصلاح اور تلافی کی کوشش کرتے رہتے ہیں۔ بھلا عمل کے ابدی اور ”میں پڑ کر آپ کی نجات کیونکر ہو سکتی ہے“ اس طرح تو آپ کو کبھی سکون قلب حاصل نہیں ہو سکتا۔ آپ کو اعتراف ہے کہ ہم سب گنہگار ہیں۔ اب دیکھئے ہمارا عقیدہ کتنا مکمل ہے۔ ہم جانتے ہیں کہ برائیوں کی اصلاح اور تلافی کی سعی لامحالہ ہے اور گناہوں کا کفارہ ضروری ہے۔ ہم میں یہ طاقت کہاں کہ اپنے گناہوں کی بوجھ اٹھائیں؟ بس ایک ہی صورت ممکن ہے کہ ہم یہ بوجھ مسیح کے سر ڈال دیں وہ خدا کا معصوم اکلانا پینا ہے اس نے کہا ہے کہ جو مجھ پر عقیدہ رکھتا ہے اسے ابدی زندگی نصیب ہوگی۔ یہ خدا کا رحم و کرم ہے کہ جس کی کوئی انتہا نہیں۔ ہمارا عقیدہ ہے کہ مسیح نے ہماری طرف سے کفارہ دے دیا اس لئے ہمارے گناہ ہماری نجات کو نہیں روک سکتے۔ گناہ تو ہماری سرشت میں ہے۔ کون ہے جو اس دنیا میں گناہ سے پاک رہ سکے اسی لئے مسیح نے ایزائیس اٹھائیں اور سارے انسانوں کے گناہوں کی تلافی کر دی۔ صرف اسی شخص کو جو اس کفارہ عظیم پر ایمان لائے ابدی سکون نصیب

ہو سکتا ہے ذرا سوچئے تو کہ آپ کی زندگی کیسی بے پیمانی کی ہے اور ہمیں کیسی امن و عافیت و بشارت دی گئی۔"

اس دلیل سے مجھے مطلق تشفی نہیں ہوئی اور میں نے عاجزی سے کہا۔

"اگر یہی عیسائیت ہے جسے سب عیسائی مانتے ہیں تو میں اسے قبول کرنے سے معذور ہوں۔ میں گناہ کے عذاب سے نجات نہیں چاہتا۔ مجھے تو خود گناہ سے بلکہ اس کے خیال سے نجات کی جستجو ہے۔ جب تک میں یہ مقصد نہ حاصل کر لوں اس وقت تک یہیچون رہنا مجھے قبول ہے۔"

پلیمتھ برادر نے جواب دیا میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ آپ کی کوشش کا کوئی نتیجہ نہ ہوگا۔ میں نے جو کہا ہے اس پر غور کیجئے۔"

اور اس بزرگ نے جو کہا تھا وہ کر کے بھی دکھایا۔ وہ خاص کر کے برے کام کرتے تھے اور مجھ سے کہتے تھے کہ میرے سکون قلب میں غل نہیں پڑا۔

پھر مجھے ان دوستوں سے ملنے سے پہلے ہی معلوم ہو گیا تھا کہ سب عیسائی کفارے کے نعرے کے قائل نہیں ہیں۔ خود مسٹر کولس کی زندگی متقیانہ تھی۔ ان کا دل پاک تھا اور وہ تزکیہ نفس کے امکان کو مانتے تھے۔ دونوں خاتونیں بھی یہی عقیدہ رکھتی ہیں۔ عیسائی مذہب کی جو کتابیں میرے ہاتھ آئیں ان میں سے بعض محبت اور معرفت الہی سے مالا مال تھیں۔ اس لئے اگرچہ کولس کو میرے اس نئے تجربے سے بہت تشویش ہوئی مگر میں نے انہیں یقین دلایا کہ کسی پلیمتھ برادر کے بگڑے ہوئے عقیدے کی وجہ سے میں عیسائیت سے بدعن نہیں ہو سکتا۔

میری مشکلیں اور تھیں یہ بائبل سے اور اس کی مروجہ تفسیر سے متعلق تھیں

حوالہ جات

- 1 - عیسائیوں کا ایک فرقہ جو زیادہ تر امریکہ میں پایا جاتا ہے۔
- 2 - Many Infallible
- 3 - Analogy
- 4 - پرتھ انگلستان کے جنوب مغرب میں ایک بندرگاہ ہے یہ فرقہ اسی مقام سے منسوب ہے۔

ہندوستانیوں سے ملاقات کی کوشش

قبل اس کے کہ میں عیسائیوں کی صحبت کے مزید حالات بیان کروں مجھے اس زمانے کے اور تجربے بھی بیان کر دینا چاہئے۔

سیٹھ طیب حاجی خان محمد کی پریٹوریا میں وہی حیثیت تھی جو نٹال میں دادا عبداللہ کی تھی۔ کوئی عام تحریک بغیر ان کے نہیں چل سکتی تھی۔ میں نے پہلے ہی ہفتے ان سے واقفیت پیدا کر لی اور ان سے اپنے اس ارادہ کا ذکر کیا کہ پریٹوریا میں جتنے ہندوستانی ہیں ان سب سے ملوں گا۔ میں نے یہ خواہش ظہر کی کہ وہاں کے ہندوستانی باشندوں کے حالات تحقیق کروں اور ان سے اس بارے میں مدد چاہی۔ انہوں نے بڑی خوشی سے مدد کرنے کا وعدہ کیا۔

میں نے سوچا کہ پہلا قدم یوں اٹھاؤں کہ پریٹوریا کے سارے ہندوستانیوں کا جلسہ کر کے ایک تقریر کروں جس سے انہیں یہ اندازہ ہو کہ ٹرانسوال میں ان کا کیا حال ہے۔ یہ جلسہ سیٹھ حاجی محمد جو ب (1) کے یہاں ہوا۔ جن کے نام میں تعارف کا خط لایا تھا۔ اس میں زیادہ تر مہین تاجر تھے مگر اکاد کا ہندو بھی نظر آتے تھے۔ اصل میں پریٹوریا میں ہندوؤں کی آبادی بہت کم تھی۔

میں نے اس جلسے میں جو تقریر کی وہ ہماری عمر میں میری پہلی تقریر کہی جاسکتی ہے۔ اس کا عنوان تھا ”کاروبار میں سچائی سے کام لینا“ میں اچھی طرح تیار ہو کر گیا تھا میں نے ہمیشہ تاجروں کو یہ کہتے سنا تھا کہ کاروبار میں سچائی سے کام نہیں چلتا۔ میں اس بات کو نہ اس زمانے میں مانتا تھا نہ اب مانتا ہوں۔ اب بھی بعض تاجر دوستوں کا خیال ہے کہ سچائی اور کاروبار یہ دونوں چیزیں ایک جگہ جمع نہیں ہو سکتیں۔ وہ کہتے ہیں کہ کاروبار عملی چیز ہے اور سچائی مذہب سے تعلق رکھتی ہے اور عملی امور کو مذہب سے کوئی واسطہ نہیں۔ ان کے نزدیک خالص حق کا کاروبار میں نام بھی نہ لینا چاہیے البتہ ایک

مناسب حد تک سچائی شاید برتی جاسکے۔ میں نے اپنی تقریر میں اس خیال کی سختی سے مخالفت کی اور تاجروں کے دل میں ان کے دہرے فرض کے احساس کو ابھارا۔ میں نے کہا۔ غیر ملک میں رہ کر ہم پر سچائی کی ذمہ داری اور بڑھ جاتی ہے کیونکہ یہاں کے لوگ ہم چند ہندوستانیوں کے طرز عمل کو دیکھ کر ہمارے کرداروں ہم وطنوں کی سیرت کا اندازہ کریں گے۔

میں نے دیکھا کہ ہماری قوم کے لوگ انگریزوں کے مقابلے میں جن کے درمیان وہ رہتے ہیں میلے اور حفظان صحت کے اصولوں سے بے پروا ہیں۔ میں نے انہیں اس بات کی طرف توجہ دلائی اس کے علاوہ اس بات پر زور دیا کہ ہندو مسلمان پارسی، عیسائی، گجراتی، مدراسی، پنجابی، سندھی، کچھی، ہورتی وغیرہ کا امتیاز مٹا دینا چاہئے۔

آخر میں میں نے یہ تجویز پیش کی کہ ایک انجمن قائم کی جائے جس کے ذریعہ سے ہندوستانی باشندے اپنی تکلیفوں کی شکایت حکام تک پہنچا سکیں اور یہ وعدہ کیا کہ جہاں تک ممکن ہے میں اپنا وقت اس انجمن کی خدمت میں صرف کیا کروں گا۔

مجھے یہ اندازہ ہوا کہ میری تقریر کا حاضرین پر گہرا اثر ہوا۔

اس تقریر کے بعد بحث شروع ہوئی، بعض لوگوں نے وعدہ کیا کہ مجھے معلومات مہیا کرنے میں مدد دیں گے۔ میں نے دیکھا کہ حاضرین میں سے بہت کم لوگ انگریزی جانتے ہیں۔ چونکہ میرا خیال تھا کہ انگریزی جاننا اس ملک میں بہت مفید ثابت ہوگا۔ اس لئے میں نے لوگوں کو مشورہ دیا کہ جسے فرصت ہو وہ انگریزی ضرور سیکھے میں نے ان سے کہا کہ بڑی عمر میں بھی آدمی نئی زبان سیکھ سکتا ہے اور اس کی بہت سی مثالیں پیش کیں اس کے علاوہ میں نے اس کا ذمہ لیا کہ اگر کوئی کلاس کھولا جائے تو میں اس میں پڑھاؤں گا یا جن لوگوں کو پڑھنے کا شوق ہے انہیں الگ الگ تعلیم دوں گا۔

کلاس تو نہیں کھلا مگر نوجوان اس پر راضی ہوئے کہ فرصت کے وقت پڑھا کریں گے بشرطیکہ میں ان کے گھر جا کر پڑھاؤں۔ ان میں سے دو مسلمان تھے ایک حجام اور ایک محرر اور تیسرا ہندو تھا جس کی چھوٹی سی دوکان تھی میں نے منظور کر لیا کہ جو وقت ان کے لئے مناسب ہوگا اس میں انہیں جا کر پڑھنا یا کروں گا مجھے اپنی پڑھانے کی قابلیت میں ذرا شبہ نہ تھا میرے شاگرد چاہے تھک جائیں مگر میں کبھی نہ تھکتا تھا بعض وقت ایسا ہوتا تھا کہ میں ان کے گھر پہنچ کر انہیں کاروبار میں مصروف پاتا تھا مگر میں صبر کو ہاتھ سے نہ دیتا۔ تینوں میں سے کسی کو انگریزی سے زیادہ گہری واقفیت حاصل کرنے کی خواہش نہ تھی مگر دو نے آٹھ مہینے میں اچھی خاصی ترقی کر لی۔ ان دونوں نے حسب کتاب رکھنا اور معمولی

کاروباری خط لکھنا سکھ لیا۔ حجام کا حوصلہ بس اس حد تک تھا کہ گاہکوں سے بات چیت کرنے بھر کی انگریزی آجائے میرے شاگردوں میں سے دو کو پڑھنے سے یہ فائدہ ہوا کہ ان کی آمدنی میں معقول اضافہ ہو گیا۔

میں جلے کے نتیجے سے مطمئن تھا۔ جہاں تک مجھے یاد ہے یہ طے ہوا کہ اس قسم کے جلے مہینے میں ایک بار ہوا کریں۔ یہ جلے کم و بیش پابندی سے ہوتے تھے اور میں آزادی سے تبادلہ خیالات کیا کرتا تھا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ پریٹوریا میں کوئی ہندوستانی ایسا نہ تھا جس کی مجھ سے ملاقات نہ ہو اور جس کے حالات مجھے نہ معلوم ہوں۔ اب میں نے مناسب سمجھا کہ مسٹر جیکوئس ڈی ویٹ سے جو پریٹوریا میں برطانوی ایجنٹ تھے۔ ملوں انھیں ہندوستانیوں سے بھدروی تھی مگر ان کا اثر بہت کم تھا۔ بہر حال وہ اس پر راضی ہو گئے کہ جہاں تک ہو سکے گا ہماری مدد کریں گے اور مجھے دعوت دی کہ جب ضرورت ہو مجھ سے مل لیا کرو۔

اب میں نے ریلوے حکام سے خط و کتابت کی اور انہیں یہ بتایا کہ جو پابندیاں ہندوستانیوں پر عائد کی جاتی ہیں وہ خود ان کے قواعد کی رو سے جائز قرار نہیں پاسکتیں۔ مجھے یہ جواب ملا کہ جو ہندوستانی معقول لباس پہنے ہوں انہیں پہلے اور دوسرے درجے کے ٹکٹ ملا کریں گے۔ اس سے ہماری دقت رفع نہیں ہوئی کیونکہ معقول لباس کا فیصلہ کرنا تو سٹیشن ماسٹر کے اختیار میں تھا۔ برطانوی ایجنٹ نے مجھے ہندوستانیوں کے متعلق کچھ کاغذات دکھائے۔ طیب سیٹھ نے بھی مجھے اس قسم کے کاغذات دیئے تھے ان سے مجھے معلوم ہوا کہ ہندوستانی کس بے رحمی سے اریجن فری اسٹیٹ سے نکالے جا رہے ہیں۔

پریٹوریا کے قیام سے مجھے یہ موقع ملا کہ ٹرانسوال اور اریجن فری اسٹیٹ کے ہندوستانیوں کی سماجی، معاشی اور سیاسی حالت کا گہرا مطالعہ کروں۔ مجھے سان گمان بھی نہ تھا کہ یہ مطالعہ میرے لئے آگے چل کر اس قدر مفید ثابت ہو گا کیونکہ میرا خیال تھا کہ سال کے آخر تک بلکہ اگر مقدمہ جلد ختم ہو گیا تو اس سے بھی پہلے ہندوستان واپس جاؤں گا۔

مگر خدا کی مرضی کچھ اور تھی۔

حوالہ

1 - غالباً یوسف کی خرابی ہے۔

قلیوں کی درگت

یہاں ٹرانسوال اور آرنج فری اسٹیٹ کے ہندوستانیوں کی حالت تفصیل سے بیان کرنے کا موقع نہیں جو لوگ اس سے پوری طرح واقف ہونا چاہتے ہیں وہ میری کتاب ”جنوبی افریقہ کے ستیاگرہ کی تاریخ“ پڑھیں۔ البتہ اس کا کچھ مختصر سا ذکر کر دینا ضروری ہے۔

آرنج فری اسٹیٹ میں ہندوستانی ایک خاص قانون کے ذریعے سے جو 1888ء میں بلکہ اس سے بھی پہلے پاس ہوا تھا، کل حقوق سے محروم کئے جا چکے تھے۔ اب ان کے وہاں رہنے کی صرف یہی صورت تھی کہ ہونٹوں میں بیرے بن کر رہیں، یا اور اسی قسم کے ادنیٰ پیٹھے اختیار کریں۔ تاجر برائے نام ہر جانہ دے کر نکال دیئے گئے۔ انہوں نے عرضیاں دیں، وفد بھیجے مگر کوئی نتیجہ نہیں ہوا۔

ٹرانسوال میں 1885ء میں ایک بڑا سخت قانون پاس ہوا۔ 1886ء میں اس میں کچھ خفیف سی ترمیم ہوئی جس کی رو سے ہندوستانیوں کو مثال میں داخل ہونے کے لئے تین پونڈ محصول دینا پڑتا تھا۔ انہیں سوائے بعض علاقوں کے جو ان کیلئے مخصوص کر دیئے گئے تھے کہیں زمین خریدنے کی اجازت نہیں تھی اور ان علاقوں میں بھی آراضی عملاً انکی ملکیت نہیں ہوتی تھی۔ انہیں ووٹ دینے کا حق نہ تھا۔ وہ قانون جس میں یہ سب قیدیں لگائی گئی تھیں خاص ایشیا کے باشندوں کے لئے تھا۔ اس کے علاوہ ان لوگوں پر وہ قوانین بھی عائد ہوتے تھے جو غیر سفید اقوام کے خلاف وضع کئے گئے تھے ان کی رو سے ہندوستانیوں کو سڑک کے کنارے کی پٹری پر چلنے کی ممانعت تھی اور رات کو نونہج کے بعد بغیر پاس کے گھر سے نہیں نکلنے پاتے تھے۔ اس ضابطہ کی عملدرآمد میں ہندوستانیوں کے ساتھ نرمی اور سختی دونوں کی گنجائش تھی۔ جو لوگ ”عرب“ سمجھے جاتے تھے وہ رعایتاً اس سے

مستثنیٰ کر دیئے۔

مجھے خود ان دونوں ضابطوں سے سابقہ پڑا۔ میں رات کو اکثر مسز کونس کے ساتھ ٹہلنے جایا کرتا تھا اور ہم دونوں عموماً دس بجے کے قریب واپس آیا کرتے تھے۔ اس میں یہ اندیشہ تھا کہ کہیں پولیس مجھے گرفتار نہ کر لے۔ مسز کونس کو اس معاملے میں مجھ سے زیادہ تشویش تھی۔ وہ اپنے حبشی نوکروں کو پاس دیا کرتے تھے لیکن مجھے کیسے دیتے؟ وہ تو صرف آقا اپنے نوکروں کو دے سکتا تھا اگر میں ان سے پاس مانگتا اور وہ دینے پر تیار بھی ہو جاتے تب بھی اصولاً نہیں دے سکتے تھے کیونکہ یہ دفاع بازی میں داخل تھا۔

اس لئے مسز کونس یا ان کے کوئی دوست مجھے ڈاکٹر کراوز کے پاس لے گئے جو حکومت کے مشیر قانونی تھے وہ اسی ان آف کورٹ کے بیرسٹر تھے جہاں کامیں تھا۔ انہیں اس پر بہت غصہ آیا کہ میری حیثیت کا آدمی رات کو نو بجے کے بعد بغیر پاس کے گھر سے نہیں نکل سکتا تھا۔ انہوں نے مجھ سے ہمدردی کا اظہار کیا اور بجائے پاس کے مجھے ایک خط لکھ کر دے دیا جس کی رو سے مجھے اختیار تھا کہ ہر وقت بے روک ٹوک باہر نکل سکوں۔ میں جب کبھی باہر جاتا تھا تو یہ خط اپنے پاس رکھتا تھا۔ محض اتفاق کی بات تھی کہ مجھے کبھی اس سے کام لینے کی ضرورت نہیں ہوئی۔

ڈاکٹر کراوز نے مجھے اپنے گھر آنے کی دعوت دی اور ہم دونوں میں خاصی دوستی ہو گئی میں کبھی کبھی ان کے یہاں جایا کرتا تھا اور انہیں کے توسط سے میری ملاقات ان کے بھائی سے ہوئی جو ان سے زیادہ مشہور تھے۔ یہ جوہانسبرگ میں وکیل سرکار تھے جنگ بوئر کے زمانے میں انہیں فوجی عدالت کے ایک انگریز افسر کے قتل کے الزام میں سات برس کی سزا ہوئی۔ اس آف کورٹ کے منتظموں نے ان کا نام بیرسٹروں کے زمرے سے خارج کر دیا۔ لڑائی کے ختم ہونے کے بعد رہا ہو کر اعزاز کے ساتھ ٹرانسوال کی مجلس وکلاء میں دوبارہ داخل کئے گئے اور بدستور وکالت کرنے لگے۔

ان لوگوں کی ملاقات آگے چل کر قومی خدمت کی زندگی میں میرے لئے مفید ثابت ہوئی اور اس کی بدولت میرے کام میں بڑی آسانی ہو گئی۔

پٹری پر چلنے کے متعلق جو ضابطہ تھا اس سے مجھے زیادہ نقصان پہنچا میں ہمیشہ ٹہلنے کے لئے پریسیڈنٹ اسٹریٹ سے ہوتا ہوا کھلے میدان میں نکل جایا کرتا تھا۔ پریسیڈنٹ کروگر کا مکان اسی سڑک پر تھا۔ یہ ایک معمولی سی عمارت تھی جس میں باغ ٹھک نہ تھا اور اس میں اور آس پاس کے

مکانوں میں مشکل سے تمیز کی جاسکتی تھی۔ پریٹوریا کے بہت سے لکھ پتیوں کے مکان کہیں زیادہ شاندار تھے۔ جن کے احاطوں میں باغ لگے ہوئے تھے۔ پریسیڈنٹ کرور کی سادگی ضرب المثل تھی۔ صرف مکان کے سامنے پولیس کا پہرا دیکھ کر پتہ چل سکتا تھا کہ یہ کسی سرکاری عہدے دار کا مکان ہے۔ میں تقریباً ہمیشہ پٹری پر پہرے والوں کے قریب سے جایا کرتا تھا اور کبھی روک ٹوک نہیں ہوتی۔

مگر پہرے والے بدلتے رہتے تھے۔ ایک بار ان میں سے ایک شخص نے بغیر اس کے کہ مجھے آگاہ کر تاپا پٹری سے اترنے کے لئے کہتا مجھے دھکا دے کر اور لات مار کر سڑک پر ڈھکیں دیا۔ مجھے بڑا رنج ہوا۔ مگر اس سے پہلے کہ میں اس شخص سے اس برتاؤ کا سبب پوچھوں مسٹر کولس نے جو اتفاق سے اسی وقت گھوڑے پر سوار وہاں سے گزر رہے تھے مجھے آواز دی اور کہا۔ ”گاندھی میں نے سارا واقعہ دیکھا ہے اگر تم اس شخص پر مقدمہ چلاؤ تو میں خوشی سے گواہی دوں گا۔ مجھے نہایت افسوس ہے کہ تم پر اس بد تمیزی سے حملہ کیا گیا۔“

میں نے کہا ”اس میں افسوس کی کیا بات ہے، اس غریب کو کیا معلوم کہ یہ کون شخص ہے، اس کے نزدیک سب کالے آدمی برابر ہیں۔ غالباً وہ جیشیوں کے ساتھ بھی وہی برتاؤ کرتا ہے جو اس نے میرے ساتھ کیا۔ میں نے یہ اصول قرار دے لیا۔ میں اپنے ذاتی معاملے میں کبھی عدالت میں چارہ جوئی نہیں کروں گا۔ اس لئے ارادہ اس پر مقدمہ چلانے کا نہیں۔“

مسٹر کولس نے کہا ”تم سے یہی توقع تھی مگر پھر سے سوچ لو۔ ہمیں ان لوگوں کو سبق ضرور دینا چاہئے۔“ پھر انہوں نے پولیس والے سے مخاطب ہو کر اس کو ملامت کی۔ میں ان کی باتیں نہیں سمجھ سکا کیونکہ پولیس والا بوڑھا اور یہ دونوں دندیری (1) زبان میں گفتگو کر رہے تھے۔ مگر آخر میں اس سپاہی نے مجھ سے معافی مانگی جس کی کوئی ضرورت نہ تھی۔ میں پہلے ہی معاف کر چکا تھا۔ مگر میں پھر کبھی اس سڑک پر نہیں گیا۔ میں نے سوچا کہ اس شخص کی جگہ دوسرے لوگ آئیں گے۔ انہیں یہ واقعہ تو معلوم نہیں ہو گا۔ اس لئے وہ بھی مجھ سے اسی قسم کا برتاؤ کریں گے۔ میں کیوں بے ضرورت ایسا کام کروں جس میں لاتیں کھانے کا اندیشہ ہو۔ اس لئے میں نے ٹہلنے کے لئے دوسرا راستہ اختیار کیا۔

اس واقعے سے میرے دل میں نوآباد ہندوستانوں کا درد اور بڑھ گیا۔ میں نے ان سے مشورہ کیا کہ اگر ان ضابطوں کی منوخی کے لئے برطانیہ ایجنٹ سے ملنے کے بعد آزمائشی مقدمہ لڑنے کی

ضرورت پڑے تو لڑنا چاہئے یا نہیں۔

اس طرح مجھے نو آباد ہندوستانیوں کی مشکلات کا اندازہ کرنے کا موقع ملا اور وہ بھی سن سنا کر یا کتابوں میں پڑھ کر نہیں بلکہ ذاتی تجربے کی بنا پر مجھے معلوم ہو گیا کہ جنوبی افریقہ کسی خوددار ہندوستانی کے رہنے کی جگہ نہیں اور میں دن رات اس فکر میں غلطاں اور بیچاں رہنے لگا کہ اس حالت میں اصلاح کرنے کی کیا صورت ہے۔

لیکن اس وقت تو میرا سب سے بڑا فرض یہ تھا کہ دادا عبداللہ کے مقدمے کی پیروی کروں۔

حوالہ

1 - ڈچ - ہالینڈ کی۔



مقدمے کی تیاری

پریٹوریا میں ایک سال کا قیام میری زندگی میں سب سے زیادہ قابل قدر تجربہ تھا۔ بہیں مجھے قومی خدمت کے طریقے سیکھنے کا موقع ملا اور اسے انجام دینے کی تھوڑی بہت قابلیت پیدا ہوئی۔ بہیں وہ مذہبی روح جو میرے دل میں تھی قوت سے فعل میں آئی۔ بہیں مجھے وکالت کے متعلق صحیح واقفیت حاصل ہوئی اور میں نے وہ چیزیں سیکھیں جو ایک نیا بیرسٹر ایک پرانے بیرسٹر کے دفتر میں سیکھتا ہے۔ بہیں مجھے یہ اعتماد پیدا ہوا کہ میں وکالت میں کچھ ایسا برانہ رہوں گا اور بہیں کامیابی کی کنجی میرے ہاتھ لگی۔

دادا عبداللہ کا مقدمہ کوئی چھوٹا مقدمہ نہ تھا۔ چالیس ہزار پونڈ کا دعویٰ تھا۔ اس کا تعلق تجارتی معاملات سے تھا۔ اس لئے اس میں سیاق کی بڑی بڑی پیچیدگیاں تھیں۔ دعویٰ کا ایک جزو پر امیری نوٹوں پر مبنی تھا اور ایک پر امیری نوٹ لکھنے کے صریحی دعوے پر (جواب دعویٰ یہ تھا کہ یہ نوٹ دھوکہ دے کر حاصل کئے گئے) ان کے لکھنے کی کوئی معقول وجہ ثابت نہیں ہوتی۔ اس پیچیدہ مقدمے میں بہت سے نفس الامری اور قانونی نکتے تھے۔

فریقین کی طرف سے چوٹی کے وکیل اور بیرسٹر تھے۔ اس طرح مجھے ان کام کے مطالعے کا بہت عمدہ موقع ملا۔ مدعی کی طرف سے مقدمے کے کاغذات ترتیب دے کر وکیل کے حوالے کرنا اور واقعات کی چھان بین کر کے مدعی کے مفید مطلب باتیں نکالنا میرے سپرد کیا گیا تھا۔ میں دیکھا کرتا تھا کہ وکیل میرے ترتیب دیئے ہوئے واقعات کا کتنا حصہ قبول کرتا ہے اور کتنا رد کرتا ہے اور بیرسٹر وکیل کی تیاری کی ہوئی کیفیت کو کس حد تک کام میں لاتا ہے اور یہ میرے لئے ایک مفید تعلیم تھی، اس لئے مجھے اچھا خاصا اندازہ ہو گیا کہ معاملے کو سمجھنے اور شہادت کو ترتیب دینے کی کس

حد تک قابلیت رکھتا ہوں۔

میں اس کام میں بڑی سرگرمی سے مصروف تھا بلکہ یوں کہنا چاہئے کہ دل و جان سے محو تھا۔ میں نے معاملات کے متعلق کل کاغذات پڑھے۔ میرے موکل قابل آدمی تھے اور مجھ پر پورا اعتبار کرتے تھے جس سے میرے کام میں بڑی آسانی ہو گئی۔ میں نے سیاق پر خاصا عبور حاصل کر لیا اور چونکہ خط و کتابت زیادہ تر گجراتی میں ہوتی تھی اور مجھے اس کا ترجمہ انگریزی میں کرنا پڑتا تھا اس لئے میری ترجمے کی مشق بھی بڑھ گئی۔

اگرچہ مجھے مذہبی مشاغل اور قومی خدمت سے بڑی دلچسپی تھی اور میں اپنے وقت کا کچھ حصہ ان میں صرف کرتا تھا۔ لیکن یہ چیزیں میری توجہ کامرکزنہ تھیں سب سے زیادہ شغف مجھے مقدمہ کی تیاری میں تھا۔ قانونی کتابوں کا مطالعہ اور حسب ضرورت نظریں تلاش کرنا میرے نزدیک سب سے مقدم تھا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ مجھے مقدمے کے واقعات پر اتنا عبور ہو گیا جتنا خود مدعی اور مدعا علیہ کو بھی نہ ہو گا کیونکہ میرے پاس دونوں کے کاغذات موجود تھے۔

مجھے مسٹر پنکٹ آنجہانی کی یہ نصیحت یاد تھی کہ مقدمے کا تین چوتھائی واقعات کو سمجھنا چاہئے۔ آگے چل کر جنوبی افریقہ کے مشہور بیر مسٹر کیونارڈ نے بھی اس کی تصدیق کی۔ میں نے اپنے مقدمے میں یہ دیکھا کہ اگرچہ میرا موکل حق پر ہے لیکن قانون بقاہر اس کے خلاف ہے۔ میں نے مایوسی کی حالت میں مسٹر کیونارڈ سے مدد چاہی انہیں بھی یہ محسوس ہوا کہ واقعات کی شہادت بہت قوی ہے۔ انہوں نے جوش میں آکر کہا گاندھی میں نے اتنے دن میں ایک بات سیکھی ہے اور وہ یہ ہے کہ اگر ہم مقدمے میں واقعات کا پہلو سنبھال لیں تو قانونی پہلو خود بخود ٹھیک ہو جائے گا۔ ہمیں اس مقدمے کے واقعات کا زیادہ گہرا مطالعہ کرنا چاہئے۔ ”اس کے بعد انہوں نے مجھ سے کہا کہ تم اس مقدمے پر اور غور کرو اور پھر میرے پاس آؤ میں نے واقعات پر دوبارہ نظر ڈالی تو مقدمے کی صورت کچھ اور ہی ہو گئی اور مجھے اس کے متعلق جنوبی افریقہ کی ایک نظیر بھی مل گئی۔ میں خوش خوش مسٹر کیونارڈ کے پاس گیا اور ان سے سب حالات بیان کئے۔ انہوں نے کہا بس اب ہم جیت جائیں گے۔ البتہ اس کا سوال رکنا ہو گا کہ مقدمہ کس جج کے سامنے پیش ہوتا ہے۔“

دادا عبداللہ کے مقدمے کا ترتیب کے زمانے میں مجھے واقعات کی اہمیت کا افسوس تھا مگر اس حد تک نہیں تھا۔ اصل یہ واقعات حق کا نام ہے اور اگر ہم حق کا دامن مضبوطی سے تھام لیں تو قانون خود بخود ہماری مدد کرتا ہے میں نے دیکھا کہ دادا عبداللہ کا مقدمہ واقعات کے اعتبار سے بہت

زور دار ہے اور قانون یقیناً ان کی مدد کرے گا۔ لیکن اسی کے ساتھ یہ خیال ہوا کہ اگر مقدمہ بازی کا سلسلہ یوں ہی چلتا رہا تو مدعی اور مدعا علیہ جو ایک ہی شہر کے رہنے والے اور آپس میں رشتہ دار ہیں تباہ ہو جائیں گے۔ کسی کو خبر نہ تھی کہ مقدمہ کب تک چلے گا۔ اندیشہ تھا کہ عدالت ہی کے ذریعہ سے فیصلہ ہوا تو مدتوں میں ہو گا اور دونوں فریقوں میں سے کسی کو کوئی فائدہ نہ ہو گا۔ اس لئے دونوں کی خواہش تھی کہ اگر ممکن ہا تو فوراً تصفیہ ہو جائے۔

میں نے طیب سیٹھ سے مل کر انہیں مشورہ دیا اور اپنی طرف سے درخواست کی کہ پختہ سے فیصلہ کر لیجئے۔ میں نے کہا آپ اپنے بیرسٹر سے گفتگو کیجئے۔ اگر کوئی ایسا شخص بیخ بنا دیا جائے جس پر فریقین کو اعتبار ہو تو بہت جلد تصفیہ ہو جائے گا۔ میں دیکھ رہا تھا کہ وکیلوں کی فیس میں روپیہ اتنی تیزی سے گھل رہا ہے کہ اگرچہ موکل دولت مند تاجر ہیں لیکن ان کا سارا سرمایہ اسی میں کھپ جائے گا اور پھر انہیں مقدمے کی اتنی فکر رہتی ہے کہ کسی اور کام کی فرصت نہیں ملتی۔ ادھر آپس میں مخالفت بڑھتی جاتی ہے۔ مجھے اس پیشہ سے نفرت ہو گئی۔ دونوں طرف کے بیرسٹر اپنا فرض سمجھتے تھے کہ ڈھونڈ ڈھونڈ کر ایسے قانونی پہلو نکالیں جو ان کے موکل کے حق میں مفید ہوں اس کے علاوہ مجھے پہلی بار یہ معلوم ہوا کہ جو فریق جیتتا ہے اسے پورا خرچہ نہیں ملتا۔ کورٹ فیس کے ضابطے کی رو سے خرچے کی جو ایک فریق سے دوسرے کو دلایا جاتا تھا۔ ایک خاص رقم متعین کر دی گئی تھی لیکن اصل میں وکیل اپنے موکل سے اس سے کہیں زیادہ وصول کرتے تھے مجھ سے یہ برداشت نہیں ہوتا تھا۔ میں اپنا فرض سمجھتا تھا کہ دونوں فریقوں کا خیر خواہ رہوں اور ان میں میل کرا دوں۔ میں نے مصالحت کی انتہائی کوشش کی خدا خدا کر کے طیب سیٹھ راضی ہو گئے۔ ایک بیخ مقرر کئے گئے ان کے سامنے مقدمے کی بحث ہوئی اور فیصلہ دادا عبداللہ کے موافق ہوا۔

لیکن مجھے اس سے اطمینان نہیں ہوا۔ میں نے سوچا کہ اگر میرے موکل نے فوراً ڈگری اجرا کرائی تو سیٹھ طیب پورا روپیہ ادا نہیں کر پائیں گے۔ اور جنوبی افریقہ میں جو پور بندر کے مہین رہتے تھے ان میں بن لکھا قانون تھا کہ دیوالے پر موت کو ترجیح دینا چاہئے۔ سیٹھ طیب کے لئے سیلنتیں ہزار پاؤنڈ اور خرچ یکمشت ادا کرنا ناممکن تھا۔ وہ چاہتے تھے کہ پیسہ چکا دیں اور دو لائے نہ قرار دیئے جائیں۔ اس کی صرف ایک ہی صورت تھی کہ دادا عبداللہ ان سے تھوڑا تھوڑا کر کے روپیہ لیں۔ انہوں نے وہ فراخ دلی دکھائی جس کی اس موقع پر ضرورت تھی اور سیٹھ طیب کو بہت سی قسطوں میں رقم ادا کرنے کی اجازت دے دی مجھے قسط دار ادائیگی کی رعایت حاصل کرنے میں اتنی

دقت ہوئی جتنی فریقین کو پختیت پر راضی کرنے میں بھی نہیں ہوئی تھی۔ لیکن جب تصفیہ ہو گیا تو دونوں کو خوشی ہوئی اور دونوں کی عزت لوگوں کی نظروں میں بڑھ گئی۔ میری مسرت کی کوئی انتہا نہ تھی۔ میں سمجھا کہ میں نے وہ بات سیکھ لی جو دکالت کا حقیقی مقصد ہے مجھے فطرت السانی کے اعلیٰ عنصر کا ڈھونڈھ نکالنا اور لوگوں کے دل کی بات سمجھنا آ گیا۔ مجھ پر راز کھل گیا کہ وکیل کا اصل کام یہ ہے کہ جن دلوں میں آپس میں پھوٹ پڑ گئی ہو انہیں ملا دے۔ یہ سبق مرے دل پر ایسا نقش ہو گیا کہ بیس سال کی دکالت کے زمانے میں میرا وقت زیادہ تر سینکڑوں مقدموں میں آپس میں راضی نامہ کرانے میں صرف ہوا۔ اس میں میرا نقصان نہیں ہوا۔ یہاں تک کہ میری آمدنی میں بھی کمی نہیں ہوئی اور میری روح تو بے شہرہ ہلاکت سے محفوظ رہی۔

حوالہ

1 - چار لاکھ اور چھ لاکھ روپے کے درمیان

مذہبی جوش

اب میں پھر ان معاملات کی طرف رجوع کرتا ہوں جو عیسائی دوستوں کے سابقے میں پیش آئے۔ مسٹر بیکر کو میری آئندہ زندگی کی بڑی فکر تھی۔ وہ مجھے ویلنگٹن کانفرنس میں لے گئے۔ پروٹسٹنٹ عیسائی چند سال کے وقفے سے اس طرح کے جلسے ”روحانی روشنی“ یعنی تزکیہ نفس کی خاطر کیا کرتے تھے۔ اسے ہم مذہبی تجدید یا ایمان تازہ کرنا کہہ سکتے ہیں۔ ویلنگٹن کانفرنس اسی قسم کی چیز تھی۔ اس کے صدر وہاں کے مشہور پادری اینڈریو مرے صاحب تھے۔ مسٹر بیکر صاحب کو امید تھی کہ کانفرنس کی مذہبی ذوق و شوق کی فضا اور حاضرین کے جوش اور خلوص کا لازمی نتیجہ یہ ہو گا کہ میں عیسائیت قبول کر لوں گا۔

مگر ان کا آخری سہارا دعا کی تاثیر تھی۔ دعا کے وہ بہت قائل تھے۔ انہیں یقین کامل تھا کہ اگر دل سے دعا مانگی جائے تو خدا ضرور سنتا ہے۔ وہ ایسے لوگوں کی مثال دیا کرتے تھے جیسے برسل کا جارج ملر جو دنیاوی امور میں بھی ہمیشہ دعا ہی سے کام لیتا تھا۔ میں دعا کی تاثیر کے متعلق ان کی تقریر بغیر کسی تعصب کے توجہ سے سنا کرتا تھا اور میں نے انہیں یقین دلا دیا تھا کہ اگر عیسائیت کے اصول میرے دل میں اتر گئے تو کوئی چیز مجھے عیسائی ہونے سے نہیں روک سکتی مجھے ان سے یہ وعدہ کرنے میں کوئی تامل نہ تھا اس لئے میں نے مدت سے اپنے نفس کو ضمیر کی پیروی کا عادی بنا لیا تھا مجھے اس کی اطاعت میں لطف آتا تھا۔ اس کے احکام کی خلاف ورزی کرنا میرے لئے مشکل اور تکلیف دہ ہوتا تھا۔

غرض ہم ویلنگٹن گئے۔ مسٹر بیکر میرے جیسے کالے آدمی کو ساتھ لے جانے سے بڑی مشکل میں پڑ گئے۔ انہیں بارہا محض میرے سبب سے تکلیفیں جھیلنا پڑیں۔ ہمیں ایک روز رستے میں ٹھہرنا پڑا

کیونکہ اتوار کا دن آگیا اور مسٹر بیکر اور ان کے ساتھی یوم السبت کو سفر نہیں کر سکتے تھے۔ اسٹیشن کے ہوٹل میں میجر بڑی تکرار کے بعد مجھے ٹھہرانے پر تورا ضعی ہو گیا مگر کھانے کے کمرے میں جانے کی کسی طرح اجازت نہیں دی۔ مسٹر بیکر آسانی سے مانتے والے آدمی نہ تھے۔ وہ اس پرواز گئے تھے کہ ہوٹل کے مسافروں کے جو حقوق ہیں وہ اسے بھی دیئے جائیں۔ مگر مجھے اس شخص کی مشکلوں کا اندازہ تھا۔ ویلنگٹن میں بھی میں مسٹر بیکر کے ساتھ ٹھہرا۔ انہیں چھوٹی چھوٹی باتوں میں ناگوار صورتیں پیش آتی تھیں۔ وہ انہیں مجھ سے چھپانا چاہتے تھے مگر مجھے سب معلوم تھا۔

یہ کانفرنس دیندار عیسائیوں کی مجلس تھی۔ مجھے ان کی خوش اعتقادی دیکھ کر بہت مسرت ہوئی۔ میں پادری مرے صاحب سے ملا۔ میں نے دیکھا کہ بہت سے لوگ میرے لئے دعا کر رہے ہیں۔ مجھے ان کی بہت سی مناجاتیں پسند آئیں۔ ان میں بڑی شیرینی تھی۔

کانفرنس تین دن رہی جو لوگ اس میں شریک تھے ان کی دینداری کی میرے دل میں بڑی قدر تھی۔ مگر مجھے اپنا عقیدہ بدلنے کی کوئی وجہ نظر نہ آئی یہ یقین کرنا میرے لئے ناممکن تھا کہ جب تک عیسائی نہ ہو جاؤں گا میری نجات نہ ہوگی۔ میں نے یہ بات اپنے چند نیک عیسائی دوستوں سے کہی تو ان کے دل کو بڑا دھچکا لگا مگر میں کیا کرتا مجبور تھا۔

میری مشکلات بہت گہری تھیں یہ بات کسی طرح میری سمجھ میں نہیں آتی تھی کہ مسیح خدا کے مجسم اکلوتے بیٹے ہیں اور صرف وہی شخص جو انہیں مانتا ہے ابدی نجات حاصل کر سکتا ہے۔ میں اپنے دل میں کہتا تھا کہ اگر کوئی خدا کا بیٹا ہو سکتا ہے تو ہم سب اس کے بیٹے ہیں۔ اگر مسیح خدا سے مشابہ ہیں یا خدا ہیں تو سبھی انسان خدا سے مشابہ ہیں۔ اور خدا ہو سکتے ہیں۔ میری عقل قبول نہیں کرتی تھی کہ مسیح کی شہادت اور ان کے خون سے دنیا کے گناہوں کا کفارہ ہونا حقیقی معنی میں صحیح ہے۔ استعارے کے طور پر ممکن ہے اس میں کچھ اصلیت ہو۔ پھر مذہب عیسوی کہتا تھا کہ جانوروں میں روح نہیں ہوتی ان کے لئے موت کامل فنا ہے اور میرا عقیدہ اس کے خلاف تھا۔ میں مسیح کو شہید، ایثار مجسم، خدا کا رسیدہ گرد مان سکتا تھا مگر سب سے مکمل انسان تسلیم کرنے کے لئے تیار نہ تھا۔ ان کا صلیب پانا دنیا کے لئے ایک شاندار مثال تھی۔ مگر یہ بات میرے دل کو نہیں لگتی تھی کہ اس میں کوئی پراسرار دیا معجزنا تاثیر تھی۔ فلسفیانہ حیثیت سے عیسائیت کے اصولوں میں کوئی غیر معمولی بات نہ تھی۔ ایثار کے نقطہ سے میرے خیال میں ہندو عیسائیوں سے بہت آگے تھے۔ میرے لئے عیسائیت کو مکمل یا سب مذہبوں سے بڑھ کر سمجھنا ناممکن تھا۔

جب موقع ملتا تھا میں اپنے خدشوں کا ذکر اپنے عیسائی دوستوں سے کرتا تھا۔ مگر ان کے جوابوں سے مجھے تسکین نہیں ہوتی تھی۔ اس زمانے میں جس طرح میں عیسائیت کو مکمل یا بہترین مذہب تسلیم نہیں کرتا تھا۔ اسی طرح ہندو دھرم کو بھی نہیں مانتا تھا۔ ہندوؤں کے عیب میری نظروں میں کھٹکتے تھے۔ میں جانتا تھا کہ چھوت چھت ہندو دھرم کا جزو ہے تو اسی طرح ہے جیسے بد گوشت جسم کا جزو ہوتا ہے۔ میری سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ اتنے فرقوں اور ذاتوں کے ہونے میں کیا مصلحت ہے۔ اس کے کیا معنی ہیں کہ دید خدا کا منزل کلام ہے۔ اگر اسے منزل مانا جائے تو بائبل اور قرآن کو بھی ماننا چاہئے۔

جس طرح عیسائی دوست مجھے اپنے مذہب میں لانے کی کوشش کر رہے تھے اسی طرح مسلمان دوست بھی کر رہے تھے۔ عبد اللہ سیٹھ برابر مجھے اسلام کے مطالعے کی ترغیب دیتے رہتے تھے اور ہمیشہ اس کی کوئی نہ کوئی خوبی بیان کرتے تھے۔

میں نے رائے چند بھائی کو خط لکھا جس میں اپنے شبیہ ظاہر کئے۔ ہندوستان کے اور دھرم شاستریوں سے بھی میں نے خط و کتابت کی رائے چند بھائی کے خط سے مجھے کسی قدر تسکین ہوئی۔ انہوں نے لکھا کہ تم صبر سے کام لو اور ہندو مذہب کا اور گہرا مطالعہ کرو ان کا ایک جملہ یہ تھا "اس مسئلے پر ٹھنڈے دل سے غور کرنے کے بعد مجھے یقین ہو گیا کہ ہندو دھرم میں جتنی دقت نظر، نزاکت خیال، روحانی بلند پروازی اور کشادہ دلی ہے کسی مذہب میں نہیں۔"

میں نے سیل کا ترجمہ قرآن خرید کر اس کا مطالعہ شروع کیا اور اسلام کے متعلق اور کتابیں بھی مہیا کیں میں نے انگلستان کے عیسائی دوستوں کو خطوط لکھے ان میں سے ایک نے میرا تعارف ایڈورڈ میٹلینڈ سے کرایا۔ جس سے میری خط و کتابت ہونے لگی۔ انہوں نے مجھے "طریق احسن" بھیجی جو انہوں نے اور انیا کنگس فورڈ نے مل کر لکھی تھی۔ اس کتاب میں عیسائیوں کے مردوہ عقائد کی تردید تھی۔ انہوں نے مجھے ایک اور کتاب بائبل کی "تفسیر" "جدید" بھی بھیجی مجھے یہ دونوں پسند آئیں۔ ان سے بظاہر ہندو دھرم کی تائید ہوتی تھی "ناسائی کی" خدا کی سلطنت تمہارے سینے میں ہے" نے مجھے حیرت میں ڈال دیا۔ اس کا اثر میرے دل پر ہمیشہ باقی رہا۔ اس میں اتنی آزادی خیال اطلاق گہرائی اور سچائی تھی کہ وہ سب کتابیں جو مسٹر کولس نے مجھے دی تھیں اس کے آگے ماند پڑ گئیں۔

غرض مجھے کتابوں کے مطالعے نے ایسے رستے پر ڈال دیا جس کا میرے عیسائی دوستوں کو خیال تک نہ آیا ایڈورڈ میٹلینڈ سے میری خط و کتابت بہت دن تک ہوتی رہی اور رائے چند بھائی سے

تو جب تک وہ زندہ رہے نامہ و پیام جاری رہا۔ انہوں نے جو کتابی مجھے بھیجی تھیں ان میں سے بعض میں نے پڑھیں۔ مثلاً بیچ کرن رت نملا، یوگ و سہتا کی موکشا پراکرن اور ہری بھدر سوری کی مدرشن سمچیا وغیرہ۔

اگرچہ میں اس رسے پر چلنے لگا جس پر میرے عیسائی دوست مجھے نہیں چلانا چاہتے تھے تاہم میں ان کا ہمیشہ احسان مند رہوں گا کہ انہوں نے میرے دل میں مذہبی تحقیق کے شوق کو ابھارا مجھے ان کی صحبت کی یاد ہمیشہ عزیز رہے گی۔ اس کے بعد آنے والے زمانے میں ایسی اور بہت سی صحبتیں میرے نصیب میں تھیں۔

آدمی کیا سوچتا ہے اور خدا کیا کرتا ہے

مقدمہ طے ہو چکا تھا اور اب مجھے پریسٹوریا میں ٹھہرنے کی کوئی وجہ نہ تھی۔ اس لئے میں ڈربن واپس آیا اور وطن جانے کی تیاریاں کرنے لگا۔ مگر بھلا عبداللہ سیٹھ مجھے بغیر رخصتی جلسے کے کب جانے دیتے تھے۔ انہوں نے مجھے رخصت کرنے کے لئے سڈنہم میں جلسہ منعقد کیا۔

ہم لوگ وہاں دن بھر رہنے کے ارادے سے گئے۔ میں بیٹھا کچھ اخباروں کی ورق گردانی کر رہا تھا کہ اتفاق سے اخبار کے ایک کونے میں میری نظر ایک پیراگراف پر پڑی جس کا عنوان تھا ”ہندوستانیوں کو ووٹ کا حق“ یہ اس مسودہ قانون کے متعلق تھا جو ان دنوں مجلس وضع قوانین میں پیش تھا اور جس میں یہ تجویز تھی کہ ہندوستانی نٹال کی مجلس وضع قوانین کے رکن منتخب کرنے کے حق سے محروم کر دیئے جائیں۔ مجھے اور دوسرے مہمانوں کی جو وہاں جمع تھے اب تک اس مسودے کا علم نہ تھا۔

میں نے عبداللہ سیٹھ سے اس کے متعلق پوچھا۔ انہوں نے کہا بھلا ہم لوگ ان معاملات کو کیا جانیں۔ ہم تو صرف ان باتوں کو سمجھتے ہیں جن کا اثر ہماری تجارت پر پڑتا ہے۔ آپ کو معلوم ہے کہ اریخ فری اسٹیٹ میں ہماری جتنی تجارت تھی سب برباد کر دی گئی۔ ہم نے بہت فریاد کی مگر کچھ نتیجہ نہیں ہوا۔ ان پڑھ ہونے کے سبب ہم بالکل بے دست و پا ہیں۔ ہم اخبار عموماً محض اس لئے پڑھتے ہیں کہ بازار کے روزانہ نرخ وغیرہ معلوم کرتے رہیں ہمیں کیا خبر کہ وضع قوانین کسے کہتے ہیں۔ ہماری آنکھ کان تو یہاں کے یورپی وکیل ہیں۔

میں نے کہا ”یہاں بہت سے نوجوان ہندوستانی ہیں جن کی پیدائش اور تعلیم یہیں کی ہے وہ آپ کی مدد نہیں کرتے؟“

عبداللہ سیٹھ نے جھلا کر کہا ”جی ہاں! وہی تو ہماری مدد کریں گے۔ وہ تو ہمارے پاس تک نہیں پھٹکتے اور سچ پوچھئے تو ہم بھی انہیں اپنا نہیں سمجھتے۔ عیسائی ہونے کے سبب سے وہ لوگ یورپی پادریوں کی منشی میں ہیں اور پادری ٹھہرے گورنمنٹ کے نیاز مند۔“

یہ سن کر میری آنکھیں کھل گئیں۔ میں نے دل میں سوچا کہ ان لوگوں کو اپنا بنانا چاہئے کیا عیسائیت کے یہی معنی ہیں؟ کیا عیسائی ہو جانے سے آدمی ہندوستانی نہیں رہتا؟

لیکن میں وطن کی داپسی کے لئے پابریکاب تھا اس لئے میں اس مسئلے کے متعلق جو خیالات میرے دل میں تھے انہیں ظاہر کرتے ہچکچاتا تھا۔ میں نے عبداللہ سیٹھ سے صرف اتنی بات کہی۔ ”اگر یہ مسودہ پاس ہو کر قانون بن گیا تو ہماری زندگی دشوار ہو جائے گی۔ یہ ہمارے لئے موت کا پیغام ہے۔ یہ ہماری خودداری کو مٹا کر چھوڑے گا۔“

سیٹھ عبداللہ نے کہا ”بہت ممکن ہے۔ مگر یہ تو سنئے کہ ووٹ کا مسئلہ کیوں شروع ہوا ہمیں اس کی کچھ خبر نہ تھی۔ مسٹر ایسکومپ نے جو یہاں چوٹی کے وکیل ہیں۔ جنہیں آپ بھی جانتے ہیں۔ ہمیں یہ بات سمجھائی اس کا قصہ یہ ہے کہ مسٹر ایسکومپ بڑے زبردست لڑنے والے ہیں۔ ان میں اور بندرگاہ کے انجینئر میں ان بن تھی۔ ان کا خیال تھا انجینئر ان کے ووٹ چھین لے گا اور انہیں انتخاب میں شکست دے دیگا۔ اس لئے انہوں نے ہمارے حقوق سمجھائے اور ان کے کہنے سے ہم لوگوں نے اپنے نام ووٹ ڈالنے والوں کے رجسٹر میں لکھوائے اور ان کے حق میں ووٹ دیا۔ اب آپ ہی دیکھئے کہ ووٹ کے حق کی اہمیت آپ کی نظر میں ہے ہماری نظر میں کیسے ہو سکتی ہے۔ مگر ہم آپ کا مطلب سمجھتے ہیں۔ آپ یہ بتائیے کہ ہمیں کیا کرنا چاہئے۔“

اور مہمان اس گفتگو کو غور سے سن رہے تھے۔ ان میں سے ایک نے کہا مجھ سے پوچھئے کہ کیا کرنا چاہئے۔ آپ اپنا جہاز کا ٹکٹ منسوخ کرا لیجئے اور یہاں ایک مہینہ اور ٹھہریئے۔ ہم آپ کی ہدایت کے مطابق لڑیں گے۔“

سب کے سب بول اٹھے ”بالکل ٹھیک ہے! بالکل ٹھیک ہے! عبداللہ سیٹھ آپ کا مددگار ہیں۔“

سیٹھ بڑے سیانے آدمی تھے انہوں نے کہا ”مجھے اب کیا حق ہے کہ انہیں روکوں؟ بلکہ یوں کہنا چاہئے کہ جتنا حق مجھے ہے اتنا ہی آپ کو بھی ہے۔ مگر آپ کہتے ٹھیک ہیں۔ آئیے ہم سب مل کر انہیں روکیں۔ البتہ یہ یاد رکھئے کہ یہ بیرسٹر ہیں۔ ان کی نفیس کا کیا بندوبست ہوگا؟“

فیس کے ذکر سے مجھے بڑی تکلیف ہوئی اور میں نے قطع کلام کر کے کہا۔ سیٹھ صاحب فیس کا نام بھی نہ لیجئے۔ قومی خدمت کی کوئی فیس نہیں ہوتی۔ میں یہاں ٹھہرا بھی تو غلام کی حیثیت سے ٹھہروں گا اور آپ کو معلوم ہے کہ میں ان سب دوستوں سے واقف نہیں ہوں۔ اگر آپ کو یقین ہو کہ یہ میرا ساتھ دینے کے تو میں ایک مہینہ ٹھہرنے کو تیار ہوں۔ لیکن ایک بات ہے مجھے تو کوئی معاوضہ دینے کی ضرورت نہیں مگر جس قسم کا کام ہم کرنا چاہتے ہیں اس لئے ابتدا میں تھوڑا بہت روپیہ ضرور چاہئے مثلاً ممکن ہے ہمیں تار بھیجنا پڑیں۔ کاغذات چھپوانا پڑیں۔ دورہ کرنا مقامی دیکھوں سے مشورہ لینا ہو اور چونکہ میں آپ کے یہاں کے قوانین سے ناواقف ہوں اس لئے شاید مجھے معلومات حاصل کرنے کے لئے کچھ کتابوں کی ضرورت پیش آئے۔ یہ سب کام بغیر روپیہ کے نہیں ہو سکتا۔ اور یہ بھی ظاہر ہے کہ یہ ایک شخص کے بس کی بات نہیں بہت سے لوگوں کو میرا ہاتھ بٹانا چاہئے۔“

سب نے ایک زبان ہو کر کہا ”انشاء اللہ تعالیٰ، روپے کی کوئی کمی نہیں۔ آدمی جتنے آپ چاہیں موجود ہیں۔ آپ مہربانی کر کے ٹھہرنے کی ہامی تو بھریں۔ پھر سب ٹھیک ہو جائے گا۔“

اس طرح رخصتی پارٹی مجلس انتظامی بن گئی۔ میں نے یہ رائے دی کہ کھانا وغیرہ جلدی ختم کر کے گھر واپس چلنا چاہئے۔ میں نے اپنے دل میں اس مہم کا نقشہ سوچ لیا۔ میں نے ان لوگوں کے نام معلوم کئے جن کا نام ووٹ دینے والوں کی فہرست میں تھا اور ایک مہینہ ٹھہرنے کا ارادہ کر لیا۔

اس طرح خدا نے میری جنوبی افریقہ کی زندگی کی بنیاد ڈالی اور اس لڑائی کا بیج بویا جو قومی خود داری کی حفاظت کے لئے لڑی گئی۔

نٹال میں مستقل سکونت

سیٹھ حاجی محمد حاجی دادا 1893ء میں نٹال کے ہندوستانیوں کے ممتاز رہنما سمجھے جاتے تھے۔ دولت کے اعتبار سے سیٹھ عبداللہ حاجی آدم سب سے بڑے ہوئے تھے۔ لیکن پبلک معاملات میں وہ اور دوسرے لوگ سیٹھ حاجی محمد ہی کو اپنا سردار مانتے تھے اس لئے ان کی صدارت میں ایک جلسہ سیٹھ عبداللہ کے گھر پر ہوا جس میں یہ طے کیا گیا کہ مسودہ قانون حق رائے دہندگی کی مخالفت کی جائے۔

رضاکار بھرتی کئے گئے جلسے میں وہ ہندوستانی بھی بلائے گئے جو نٹال میں پیدا ہوئے تھے۔ جن میں سے اکثر نوجوان عیسائی تھے۔ ڈربن کے مترجم عدالت مسٹریال اور مشن اسکول کے ہیڈ ماسٹر مسٹر سبحان گاڈفرے بھی موجود تھے اور انہیں کی کوشش سے عیسائی نوجوان اچھی تعداد میں جمع ہو گئے تھے۔ یہ سب لوگ رضاکاروں میں بھرتی ہو گئے۔

بہت سے مقامی تاجر بھی رضاکار بنے جن میں سے سیٹھ دادو محمد، محمد قاسم، قمر الدین، آدم جی میاں خان، اے کولاند آویلو پلے، سی پٹھن رام، رتکاسامی پدیاچی اور امودی جیو خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ پارسی رستم جی بھی موجود تھے۔ محروں میں سے مانک جی، جوشی، نرسنگہ رام اور دادا عبداللہ کمپنی اور دوسری بڑی دوکانوں کے ملازم تھے۔ ان سب نے اپنے آپ کو قومی کام میں شرکت کرتے دیکھا تو انہیں تعجب بھی ہوا اور خوشی بھی ہوئی۔ ان کی زندگی میں یہ ایک نیا تجربہ تھا کہ انہیں اس کام میں حصہ لینے کی دعوت دی گئی۔ قومی مصیبت کے وقت ادنیٰ نیچے، چھوٹے بڑے، نوکر آقا ہندو، مسلمان، پارسی، عیسائی، گجراتی، مدراسی، سندھی وغیرہ کافرق بھلا دیا گیا سب کے سب یکساں اور وطن کے خادم تھے۔

مسودے کی دوسری خواندگی منظور ہو چکی تھی یا ہونے والی تھی۔ اس موقع پر جو تقریریں ہوئیں ان میں کہا گیا تھا کہ ہندوستانیوں کا اس سخت تجویز کی مخالفت نہ کرنا اس بات کا ثبوت ہے کہ وہ ووٹ کا حق پانے کی قابلیت نہیں رکھتے۔

میں نے حاضرین جلسہ کو صورت حال سمجھائی۔ سب سے پہلا کام میں نے یہ کیا کہ مجلس وضع قوانین کے صدر کے نام تار بھیجا کہ مہربانی کر کے اس مسودے پر مزید بحث ملتوی کر دیجئے۔ اسی مضمون کا تار وزیراعظم سرجان رائس کو دیا گیا اور مسٹر الیکومب کو بھی جو دادا عبداللہ کے دوست تھے۔ صدر نے فوراً جواب دیا کہ بحث دو دن کے لئے ملتوی کر دی گئی اس لئے ہم لوگوں کو بڑی خوشی ہوئی۔

ایک عرضداشت مجلس وضع قوانین میں پیش کرنے کی غرض سے تیار کی گئی۔ اس کی تین نقلیں مجلس کے لئے کرنا تھیں اور ایک زائد نقل اخباروں کے لئے۔ یہ بھی تجویز تھی کہ ان حتی الامکان بہت سے دستخط حاصل کئے جائیں اور یہ سب کام ایک رات میں ختم کرنا تھا۔ انگریزی دان رضا کار اور بعض اور لوگ رات بھر جاگتے رہے۔ ایک ضعیف العمر بزرگ مسٹر ارٹھر نے جن کی خوشنویسی مشہور تھی پہلا بیضہ لکھا اور نقلیں دوسرے لوگوں نے اس طرح کیں کہ ایک شخص بوتا جاتا تھا اور کئی آدمی لکھتے جاتے تھے۔ یوں ایک وقت میں پانچ نقلیں تیار ہو گئیں۔ تاجروں میں سے جو لوگ رضا کار تھے انہوں نے اپنی گاڑیوں میں اور کرائے کی گاڑیوں میں گشت لگا کر لوگوں سے عرضداشت پر دستخط کرائے۔ یہ کام بہت جلد ہو گیا اور عرضداشت صحیح دی گئی۔ اخباروں نے اسے شائع کیا اور موافق رائیں لکھیں۔ مجلس وضع قوانین میں بھی لوگ اس سے متاثر ہوئے اور اس پر بحث کی گئی۔ مسودہ قانون کے حامیوں نے ان دلیلوں کا جو اس میں پیش کی گئی تھیں جواب دیا، جو مسلمہ طور پر کمزور تھا۔ مگر قانون پاس ہو ہی گیا۔

سب جانتے تھے کہ یہی ہونا ہے۔ لیکن اس تحریک کے جوش و خروش نے مثال کے ہندوستانیوں میں ایک نئی روح پھونک دی اور انہیں یقین دلا دیا کہ ان کی جماعت ایک متحدہ جماعت ہے جس میں کوئی تفریق نہیں اور ان کا فرض ہے کہ جس طرح اس کے تجارتی حقوق کی حفاظت کرتے ہیں اسی طرح سیاسی حقوق کی بھی کریں۔

اسی زمانے میں لارڈ رین برطانیہ کے وزیر نوآبادیات تھے۔ ہم لوگوں نے فیصلہ کیا کہ ان کو ایک عرضداشت بھیجی جائے جس پر ہزاروں آدمیوں کے دستخط ہوں۔ کوئی چھوٹا کام نہیں تھا جو

ایک دن میں ہو جاتا۔ رضا کار بھرتی کئے گئے اور ان سب نے اپنا اپنا کام مستعدی سے انجام دیا۔ میں نے اس عرضداشت کے تیار کرنے میں بڑی محنت کی۔ اس موضوع پر جتنا مواد مل سکتا تھا سب کا مطالعہ کیا میرے استدلال کی بنیاد دو چیزیں تھیں ایک اصولی بات اور دوسرا مصلحت کا پہلو۔ میں نے لکھا کہ چونکہ ہمیں ہندوستان میں ایک حد تک ووٹ کا حق حاصل ہے۔ اس لئے اصولاً مثال میں بھی ہونا چاہیے اور مصلحت بھی یہی ہے کہ یہ حق باقی رہنے دیا جائے کیونکہ ہندوستانیوں کی تعداد جو اسے استعمال کر سکتے ہیں بہت کم ہے۔

دو ہفتے کے اندر دس ہزار دستخط کئے گئے۔ سارے صوبے سے اس تعداد میں دستخط حاصل کرنا کوئی آسان کام نہ تھا۔ خصوصاً اس لحاظ سے کہ کام کرنے والے بالکل نا تجربہ کار تھے اس لئے کہ خاص طور پر قابل رضا کاروں کا انتخاب کرنا پڑا کیونکہ طے کر لیا گیا تھا کہ کسی شخص سے اس وقت تک دستخط نہ کرائے جائیں گے۔ جب تک اسے عرضداشت کا مطلب پوری طرح نہ سمجھا دیا جائے۔ گاؤں دور دور پھیلے ہوئے تھے۔ کام جلدی ہونا جیسی ممکن تھا کہ کچھ رضا کار دل و جان سے اس میں لگ جائیں سب نے اپنے اپنے حصے کا کام سرگرمی اور جوش سے انجام دیا لیکن ان سطروں کو لکھتے وقت سیٹھ داؤد محمد، رستم جی، آدم جی میاں خاں اور آمود جیو کی شکلیں آنکھوں میں پھر رہی ہیں۔ یہ سب سے زیادہ دستخط جمع کر کے لائے۔ داؤد سیٹھ دن بھر اپنی گاڑی میں پھرتے رہے اور یہ سارا کام بلا معاوضہ کیا گیا۔ بلکہ لوگوں نے جو اپنے پاس سے خرچ کیا تھا وہ بھی نہیں لیا۔ دادا عبداللہ کا گھر سرائے اور عام دفتر بن گیا۔ متعدد تعلیم یافتہ دوست جو میرا ہاتھ بٹاتے تھے اور بہت سے لوگ وہیں کھانا کھاتے تھے۔ اس طرح ہر شخص کو جو ہماری مدد کرتا تھا زیر بار ہونا پڑا۔

خدا خدا کر کے درخواست بھیجی گئی۔ گشت کرانے اور تقسیم کرانے کے لئے اس کی ایک ہزار کاپیاں چھپوائی گئی تھیں۔ اس کے ذریعہ سے ہندوستان کے لوگوں کو پہلی بار مثال کے حالات معلوم ہوئے۔ میں نے اس کی کاپیاں ہندوستان کے سب اخباروں اور سیاسی مضمون نگاروں کو، جن سے میں واقف تھا بھیجیں۔

ٹائمز آف انڈیا نے اس عرضداشت پر ایک مقالہ افتتاحیہ لکھا۔ جس میں ہندوستانیوں کے مطالبات کی زور دار تائید کی ہم نے انگلستان کی مختلف پارٹیوں کے اخباروں اور سیاسی مضمون نگاروں کو بھی اس کی کاپیاں بھیجیں۔ لندن ٹائمز نے بھی ہماری تائید کی اور ہمارے دل میں یہ امید بندھنے لگی کہ یہ قانون منسوخ کر دیا جائے گا۔

اب میرے لئے مثال سے جانا ممکن نہ تھا۔ ہندوستانی دوستوں نے مجھے گھیر لیا اور میرے پیچھے پڑ گئے کہ وہاں مستقل طور پر قیام کر لوں۔ میں نے اپنی مشکلوں کا ذکر کیا۔ میں نے یہ فیصلہ کر لیا تھا کہ یہاں رہوں گا تو اس شرط پر کہ اپنا خرچ پبلک پر نہ ڈالوں گا۔ اب یہ ضرورت محسوس ہو رہی تھی کہ میں الگ گھر لے کر رہوں۔ میں سوچتا تھا کہ مکان معقول ہو اور موقع بھی اچھا ہو۔ یہ بھی خیال تھا اگر میں اس شان سے نہ رہوں جیسے بیرسٹر عموماً رہتے ہیں تو اس میں میری جماعت کی بدنامی ہے اور اس طرح رہنے میں بظاہر تین سو پونڈ سالانہ سے کم خرچ نہ تھا۔ اس لئے میں نے اپنے دل میں فیصلہ کر کے لوگوں سے کہہ دیا ”میں صرف ایک شرط پر ٹھہر سکتا ہوں اور وہ یہ ہے کہ جماعت کے لوگ میرے لئے کم سے کم تین سو پونڈ سالانہ کا قانونی کام فراہم کرنے کا ذمہ لیں۔“

انہوں نے کہا ”مگر ہم تو یہ چاہتے ہیں کہ اتنی رقم آپ کو پبلک خدمت کے معاوضے میں دی جائے اور ہم اسے آسانی سے جمع کر سکتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ یہ اس نفس کے علاوہ ہے جو آپ کو لوگوں کے ذاتی مقدمے میں ملے گی۔“

میں نے کہا ”نہیں میں پبلک خدمت کا معاوضہ آپ سے نہیں لے سکتا۔ اس میں مجھے بیرسٹری کی قابلیت صرف کرنے کی بہت کم ضرورت پڑے گی۔ میرا کام تو یہ ہو گا کہ آپ سب لوگوں سے کام لوں۔ بھلا اس کا معاوضہ میں آپ سے کیسے لے سکتا ہوں؟ اس کے علاوہ مجھے اس کام کے سلسلے میں اکثر لوگوں سے چندہ مانگنے کی ضرورت ہو گی اور اگر میں آپ سے تنخواہ لوں تو پھر بڑی رقموں کا مطالبہ کرنے میں دقت ہو گی اور آگے چل کر کام رک جائے گا۔“

”مگر ہم آپ کو اتنے دن سے جانتے ہیں اور ہمیں یقین ہے کہ آپ ضرورت سے زیادہ روپیہ ہرگز نہ لیں گے۔ جب ہم آپ کو ٹھہرا رہے ہیں تو آپ کا خرچ بھی ہمارے ذمے ہونا چاہئے۔“

”آپ محبت کے سبب سے اور موجودہ جوش میں ہی باتیں کہہ رہے ہیں۔ یہ کیسے یقین ہو کہ یہ محبت اور جوش ہمیشہ رہے گا؟ آپ کے دوست اور خادم کی حیثیت سے مجھے کبھی کبھی آپ سے سخت باتیں کہنا پڑیں گی۔ خدا جانے اس وقت آپ کو مجھ سے محبت رہے یا نہ رہے۔ لیکن اصل بات یہ ہے کہ میں پبلک کا معاوضہ لینا جائز نہیں سمجھتا۔ میرے لئے یہی کافی ہے کہ آپ لوگ اپنے قانونی معاملات میرے سپرد کر دیا کریں۔ ممکن ہے کہ اس میں بھی آپ کو دقت ہو۔ کیونکہ اول تو میں گورا بیرسٹر نہیں ہوں۔ معلوم نہیں عدالت پر میرا کیا اثر پڑے۔ دوسرے یہ بھی یقینی طور پر نہیں کہہ سکتا کہ وکیل کی حیثیت سے کیا رہوں گا۔ اس لئے مجھے پہلے سے وکیل کرنا بھی آپ کے لئے جو کم

سے خالی نہیں۔ اگر میرے ساتھ اتنا احسان کریں گے تو میں اسی کو اپنے لیے کافی معاوضہ سمجھوں گا۔“
 اس بحث کا یہ نتیجہ ہوا کہ تقریباً بیس تاجروں نے مجھے ایک سال کے لئے اپنے تمام قانونی معاملات میں وکیل کر لیا۔ اس کے علاوہ دادا عبدالملک نے بجائے اس رقم کے جو وہ مجھے رخصت کرتے وقت دینا چاہتے تھے مجھے فرنیچر خرید دیا۔ یوں میں نے مثال میں سکونت اختیار کر لی۔

رنگ کی قید

عدالت کی تمثیل ایک ترازو قرار دی گئی ہے جسے ایک اندھی منصف مزاج تیز رفتار ہاتھ میں اس طرح لئے بیٹھی ہے کہ اس کے دونوں پہلے برابر ہیں تقدیر نے اسے خاص کر کے اندھا کر دیا ہے تاکہ وہ کسی شخص کے متعلق اس کی ظاہری صورت کی بنا پر رائے قائم نہ کر سکے بلکہ اس کے باطنی جوہر کو تولے۔ مگر مثال کی انجمن وکلاء نے عدالت عالیہ کو ترغیب دی کہ وہ اس اصول کے خلاف عمل کرے اور اپنی تمثیل کو غلط کر دے۔

میں نے عدالت عالیہ میں بیرسٹر کی حیثیت سے داخلے کی اجازت چاہی۔ میرے پاس بمبئی ہائیکورٹ کے داخلے کی سند تھی۔ انگلستان کی سند میں نے بمبئی ہائیکورٹ کے حوالے کر دی تھی۔ داخلے کی درخواست کے ساتھ چال چلن کے دو تصدیق نامے داخل کرنا ضروری تھا۔ میں نے یہ سمجھ کر کہ یورپینوں کی تصدیق کی زیادہ وقت ہوگی دو یورپی تاجروں سے جنہیں میں دادا عبداللہ کی معرفت جانتا تھا یہ تصدیق نامے لکھوائے عرضی کے لئے یہ شرط تھی کہ کسی وکیل کی معرفت داخل کی جائے اور عموماً صدر مشیر قانونی ایسی درخواستیں بغیر کسی مجلس کے داخل کر دیتا تھا۔ صدر مشیر قانونی مسٹر ایسکومپ تھے جن کے متعلق ہم پہلے کہہ چکے ہیں کہ دادا عبداللہ کہنی ان سے اپنے معاملات میں قانون مشورہ لیا کرتی تھی۔ میں ان کے پاس گیا اور وہ میری درخواست داخل کرنے پر خوشی سے راضی ہو گئے۔

مگر انجمن وکلاء نے مجھے اچانک یہ نوٹس دیا کہ وہ میرے داخلے کی مخالفت کرے گی۔ اس کا اعتراض یہ بھی تھا کہ میری درخواست کے ساتھ انگلستان کی اصل سند نہیں ہے لیکن جس بات پر اس نے سب سے زیادہ زور دیا وہ یہ تھی کہ جب بیرسٹروں کے داخلے کے قواعد بنائے گئے تو یہ امکان

ہرگز بنانے والوں کے ذہن میں نہ ہو گا کہ کوئی کالا آدمی بھی داخلے کی درخواست کرے گا اگر کالے آدمی داخل کئے گئے تو ان کی تعداد یورپیوں سے بڑھ جائے گی اور یورپیوں کے لئے اپنے حقوق کی حفاظت کا کوئی ذریعہ نہیں رہے گا۔

انجمن دکلا کی طرف سے ایک نامی وکیل پیرد کار تھے۔ چونکہ ان کا تعلق بھی دادا عبداللہ کمپنی سے تھا۔ اس لئے انہوں نے سیٹھ عبداللہ کی زبانی کہلا بھیجا کہ تم آکر مجھ سے مل جاؤ انہوں نے مجھ سے کھل کر گفتگو کی اور میرے پچھلے حالات پوچھے جو میں نے بیان کر دیئے۔ اس پر انہوں نے کہا ”مجھے آپ کے داخلے پر کوئی اعتراض نہیں مجھے تو صرف یہ خوف تھا کہ کہیں آپ ان لوگوں میں تو نہیں جن کی پیدائش یہیں کی ہے اور جو گھس پیٹھ کر کسی نہ کسی طرح آگے بڑھنا چاہتے ہیں۔ اور آپ کی درخواست کے ساتھ اصل سند نہ ہونے سے میرے شیپے کی تائید ہوئی۔ ایسے واقعات ہو چکے ہیں کہ لوگوں نے دوسروں کی اسناد اپنے نام سے پیش کر دیں۔ آپ نے چال چلن کے جو تصدیق نامے یورپی تاجروں کی طرف سے پیش کئے ہیں وہ میری نظر میں کوئی وقعت نہیں رکھتے۔ یہ لوگ آپ کے حالات کیا جانیں؟ انہیں آپ سے واقفیت ہوگی بھی تو برائے نام ہوگی؟“

میں نے کہا ”یوں تو پھر یہاں ہر شخص مجھ سے ناواقف ہے۔ عبداللہ سیٹھ کی بھی مجھ سے یہیں کی ملاقات ہے۔“

”مگر آپ تو یہ کہتے ہیں نہ کہ وہ آپ کے ہموطن ہیں؟ اگر آپ کے والد وہاں وزیر تھے تو عبداللہ سیٹھ آپ کے خاندان کو ضرور جانتے ہوں گے۔ آپ ان کی حلفی تصدیق پیش کر دیں تو مجھے آپ کے معاملے میں مطلق اعتراض نہ ہو گا۔ تب میں انجمن دکلا سے کہہ دوں گا کہ میں آپ کی درخواست کی مخالفت نہیں کر سکتا۔“

یہ گفتگو سن کر مجھے غصہ آگیا مگر میں نے ضبط سے کام لیا۔ میں نے اپنے دل میں کہا ”اگر میں دادا عبداللہ کا تصدیق نامہ بھیجتا تو یہ لوگ اسے رد کر دیتے اور یورپیوں کے تصدیق نامے مانگتے۔ بھلا بیرسٹری کے داخلے سے میرے حسب نسب کو کیا تعلق؟ اگر میں غریب یا برے خاندان کا بھی ہوتا تو میرے داخلے پر کیا اعتراض ہو سکتا تھا، مگر میں نے ان سے صرف اتنا کہا ”اگرچہ میں تسلیم نہیں کرتا کہ انجمن دکلا کو ان تفصیلات کا مطالبہ کرنے کا حق ہے پھر بھی میں وہ تصدیق نامہ جو آپ مانگتے ہیں پیش کرنے کے لئے تیار ہوں۔“

سیٹھ عبداللہ کی طرف سے حلفی تصدیق نامہ لکھ کر باضابطہ انجمن دکلا کے پیرد کار کو بھیج دیا گیا

انہوں نے اپنا طمینان ظاہر کیا مگر انجمن دکلار مطمئن نہیں ہوئی۔ اس نے عدالت عالیہ میں میرے داخلے کی مخالفت کی۔ مگر عدالت نے اس کی عذر داری کو خارج کر دیا۔ ہمارے کبیل مسٹر ایسکو مپ کو جو اب تک دینے کی ضرورت نہیں ہوئی۔ چیف جسٹس کے الفاظ قریب قریب یہ تھے۔ ”یہ اعتراض کہ عرضی گزار نے میں اصل سند منسلک نہیں کی، بے بنیاد ہے۔ اگر وہ دروغ حلفی کام تکب ہوا ہے تو اس پر مقدمہ چلایا جاسکتا ہے اور اگر وہ مجرم ثابت ہو تو اس کا نام دکلار کی فہرست سے خارج کیا جاسکتا ہے۔ قانون کالے گورے میں کوئی فرق نہیں کرتا۔ اس لئے عدالت کو ہرگز یہ حق حاصل نہیں کہ مسٹر گاندھی کو بیرسٹروں کے زمرے میں داخل ہونے سے روکے۔ ہم درخواست منظور کرتے ہیں۔ مسٹر گاندھی آپ داخلے کا حلف اٹھائیے۔“

میں نے کھڑے ہو کر جسٹس کے سامنے حلف اٹھایا۔ اس کے بعد ہی چیف جسٹس نے مجھ سے کہا مسٹر گاندھی اب آپ کو اپنی پگڑی اتارنا پڑے گی۔ عدالت نے اپنے بیرسٹر کے لباس کے متعلق جو قاعدے مقرر کئے ہیں ان کی پابندی آپ پر لازم ہے“

اب مجھے محسوس ہوا کہ میری آزادی محدود ہو گئی۔ وہی پگڑی جس کے اتارنے سے میں نے مجسٹریٹ ضلع کی عدالت میں انکار کر دیا تھا اب مجھے عدالت عالیہ کے حکم سے اتارنا پڑی۔ میں یہ نہیں کہتا کہ اگر میں اس حکم کی تعمیل سے انکار کرتا تو یہ انکار جائز نہ ہوتا لیکن میں چاہتا تھا کہ اپنی قوت کو بڑے معرکوں کے لئے محفوظ رکھوں، مجھے لڑنے میں جو سلیقہ حاصل تھا اسے پگڑی باندھنے کی حمایت میں صرف کرنا مجھے منظور نہ تھا۔ یہ چیز اس قابل تھی کہ اس سے بہتر مقصد کے لئے استعمال کیا جائے۔

سیٹھ عبداللہ اور دوسرے دوستوں کو میری یہ خوائے تسلیم (یا کمزوری؟) پسند نہیں آئی۔ ان کے نزدیک مجھے اپنے اس حق پر اصرار کرنا چاہئے تھا کہ عدالت میں پگڑی باندھ کر جایا کروں۔ میں نے انہیں سمجھایا بھجایا اور یہ مثل یاد دلائی ”جیسا دیس ویسا بھیس“ میں نے کہا ”اگر ہندوستان میں کوئی انگریز افسر پگڑی اتارنے کا حکم دیتا تو انکار کرنا جائز تھا لیکن مثال کی عدالت میں جو دستور ہے اس کی پابندی سے انکار مجھے بحیثیت ایک رکن عدالت کے مناسب نہیں۔“

میں نے اس قسم کی دلیلوں سے اپنے دوستوں کو کسی قدر دھیمایا لیکن انہیں اس معاملے میں اس اصول کا پوری طرح قائل نہ کر سکا کہ ایک ہی چیز مختلف صورتوں میں مختلف نقطہ نظر سے دیکھی جاسکتی ہے حالانکہ مجھے زندگی بھر خود حق پرستی نے یہ سبق دیا ہے کہ صلح کی خاطر کسی قدر

دب جانا بہت اچھی چیز ہے۔ آگے چل کر مجھے معلوم ہوا کہ یہ روش ستیاگرہ کا لازمی جزو ہے۔ اس کے سبب سے مجھے اکثر اپنی جان خطرے میں ڈالنا اور دوستوں کی خفگی اٹھانا پڑی مگر حق میرے کی طرح سخت ہے اور شگوفے کی طرح نازک۔

انجمن وکلاء کی مخالفت سے جنوبی افریقہ میں میری اور بھی شہرت ہو گئی۔ بہت سے اخباروں نے انجمن کو اس مخالفت پر ملامت کی اور اسے حاسد قرار دیا۔ اس شہرت سے ایک حد تک میرے کام میں آسانی پیدا ہو گئی۔

نٹال انڈین کانگریس

دکالت میرے لئے اول سے آخر تک ایک ضمنی مشغلے کی حیثیت رکھتی تھی نٹال کے قیام میں میرا جو مقصد تھا اسے پورا کرنے کے لئے یہ لازم تھا کہ میں پبلک کام پر پوری توجہ صرف کروں۔ ہندوستانیوں کو ووٹ کے حق سے محروم کرنے والے قانون کے خلاف محض عرضداشت بھیج دینا کافی نہ تھا۔ وزیر نوآبادیات کو متاثر کرنے کے لئے اس کی ضرورت تھی کہ لوگوں میں جوش پھیلانے کی کوشش کی جائے۔ یہ قرار پایا کہ اس مقصد کے لئے ایک مستقل ادارہ ہونا چاہئے میں نے سیٹھ عبداللہ اور دوسرے دوستوں کے مشورے سے ایک مستقل انجمن قائم کرنے کا فیصلہ کر لیا۔

میں بڑے شش و پنج میں تھا کہ نئی انجمن کا نام کیا رکھا جائے ایسے نام کی ضرورت تھی جس کا تعلق کسی خاص پارٹی سے نہیں بلکہ سارے ہندوستانیوں کو ظاہر کرتا ہو۔ مجھے معلوم تھا کہ ”کانگریس“ کا نام انگلستان کے قدامت پسندوں میں بھی بدنام ہے مگر ہندوستان کی جان کانگریس ہی ہے۔ پس چاہتا تھا کہ اسے نٹال میں ہر دل عزیز بناؤں۔ اس نام کے اختیار کرنے میں ہچکچانا بزدلی سی معلوم ہوتی تھی۔ اس لئے میں نے مفصل دلائل کے ساتھ یہ تجویز پیش کی کہ اس انجمن کا نام نٹال انڈین کانگریس رکھا جائے اس طرح 24 مئی کو نٹال انڈین کانگریس معرض وجود میں آئی۔

اس روز دادا عبداللہ کا وسیع کمرہ کچا کچھ بھرا ہوا تھا۔ سب حاضرین نے بڑے جوش کے ساتھ کانگریس کے قیام پر پسندیدگی کا ظہار کیا۔ اس کا دستور اساسی بالکل سیدھا سادہ تھا اور چندہ زیادہ رکھا گیا تھا۔ اس کا ممبر وہی شخص ہو سکتا تھا جو پانچ شلنگ ماہوار دے۔ مرفہ الحال طبقے کے لوگ اس پر آمادہ کئے گئے کہ جتنا زیادہ سے زیادہ چندہ دے سکیں دیا کریں۔ عبداللہ سیٹھ نے سب سے

زیادہ یعنی دو پونڈ ماہوار چندہ لکھوایا۔ دو اور دوستوں نے ان کی تقلید کی۔ میں نے سوچا کہ مجھے اپنے چندے میں کمی نہیں کرنا چاہیے اس لئے ایک پاؤنڈ ماہوار میں نے بھی لکھ دیا۔ یہ میرے لئے کوئی چھوٹی رقم نہ تھی۔ لیکن میں نے خیال کیا کہ اگر میرا کام ذرا بھی چل گیا تو اتنا دینا میری مقدرت سے باہر نہ ہو گا اور خدا کے فضل سے ایسا ہی ہوا۔ ممبروں کی ایک معقول تعداد نے ایک پونڈ چندہ لکھوایا۔ دس شلنگ دینے والوں کی تعداد اس سے بھی زیادہ تھی۔ اس کے علاوہ کچھ لوگوں نے یکمشت عطیے دیئے جو خوشی کے ساتھ قبول کئے گئے۔

تجربے سے معلوم ہوا کہ ایک بار مانگنے سے کوئی شخص چندہ نہیں دیتا اور جو ممبر ڈربن سے باہر رہتے تھے ان کے یہاں بار بار جانا ناممکن تھا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ یہ سارا جوش ہانڈی کا سا بال تھا جو چشم زدن میں غائب ہو گیا۔ خود ڈربن کے ممبر بھی بغیر بار بار کے تقاضے کے چندہ نہیں دیتے تھے۔

چندہ جمع کرنے کا کام میرے متعلق تھا کیونکہ سیکرٹری میں ہی تھا۔ کچھ دنوں میں یہاں تک نوبت پہنچی کہ میرا محرر دن بھر چندہ مانگتا پھرتا تھا۔ وہ بیچارہ اس کام سے عاجز آ گیا اور میں نے یہ محسوس کیا کہ اگر اس صورت حال میں اصلاح کرنا ہے تو چندے کی وصولی ماہوار نہیں بلکہ سالانہ ہونا چاہئے اور وہ بھی ہمیشہ پیشگی اس لئے میں نے کانگریس کا جلسہ کیا۔ ہر شخص نے خوشی سے یہ تجویز منظور کی کہ چندہ بجائے ماہوار کے سالانہ کر دیا جائے۔ اور کم سے کم تین پاؤنڈ رکھا جائے۔ اس سے وصولی کے کام میں بڑی آسانی ہوگی۔

میں نے پہلے ہی سبق سیکھ لیا تھا کہ پبلک کام قرض کے روپے سے کبھی نہیں کرنا چاہئے۔ لوگوں کا اعتبار اور بہت سی باتوں میں کیا جاسکتا ہے مگر روپے کے معاملے میں جائز نہیں۔ میں نے لوگوں کو کبھی موعودہ چندہ ادا کرنے میں مستعد نہیں پایا اور مثال کے ہندوستانی بھی اس سے مستثنیٰ نہیں تھے۔ اس لئے میں نے بغیر روپے کے کبھی کوئی کام شروع نہیں کیا اور مثال انڈین کانگریس کبھی مقروض نہیں رہی۔

میرے رفیقوں نے ممبر بنانے میں غیر معمولی سرگرمی دکھائی۔ یہ ایسا کام تھا جس سے انہیں دلچسپی بھی تھی اور بہت قیمتی تجربہ حاصل ہوتا تھا۔ لوگ بہت بڑی تعداد میں نقد چندہ ادا کر کے ممبر بننے لگے۔ اندرون ملک کے دور افتادہ دیہات میں کام کرنا وقت سے خالی نہ تھا۔ لوگ پبلک کام کی ماہیت سے واقف نہ تھے۔ پھر کبھی ہم دور دراز مقامات پر بلائے جاتے تھے اور ہر جگہ کے

بڑے تاجر ہمیں اپنے یہاں مہمان رکھتے تھے۔

ایک بار دورے میں ذرا مشکل پڑ گئی ہمیں توقع تھی کہ ہمارے میزبان چھ پاؤنڈ چندہ دیں گے لیکن انہوں نے تین پاؤنڈ سے زیادہ دینے سے انکار کر دیا۔ اگر ہم ان سے یہ رقم قبول کر لیتے تو دوسرے بھی ان کی تقلید کرتے اور ہمارا مجموعی چندہ بہت کم ہو جاتا۔ رات زیادہ ہو گئی تھی اور ہم بہت بھوکے تھے۔ لیکن ہم جتنی رقم لینے پر اڑے ہوئے تھے۔ اسے وصول کئے بغیر کھانا کیونکر کھاتے؟ ہم نے لاکھ سرمارا مگر کوئی اثر نہ ہوا۔ ہمارے میزبان کسی طرح نہیں مانتے تھے۔ اس مقام کے دوسرے تاجر انہیں سمجھاتے رہے اور ساری رات جاگتے گذر گئی مگر نہ وہ اپنی بات سے ذرہ برابر بٹنے اور نہ ہم۔ میرے بہت سے رفیق غصے سے کھول رہے تھے مگر انہوں نے ضبط سے کام لیا۔ خدا خدا کر کے صبح سویرے ہمارے میزبان پیسے۔ انہوں نے چھ پاؤنڈ دیئے اور ہم نے خوب پیٹ بھر کے کھانا کھایا۔ یہ ٹون گاٹ کا واقعہ ہے۔ مگر اس کا اثر اسٹیننگر سے لے کر جو شمالی ساحل پر واقع ہے اندرون ملک میں چارلس ٹاؤن تک پڑا اور اس کی بددلت وصولی کا کام تیزی سے ہونے لگا۔ مگر ہمارا کام صرف یہی نہ تھا کہ چندہ جمع کرتے رہتے بلکہ میں نے تو عرصے سے یہ سبق سیکھ لیا تھا کہ جتنے روپے کی ضرورت ہو اس سے زیادہ اپنے پاس نہیں رکھنا چاہئے۔

جلسہ مہینے میں ایک بار یا اگر ضرورت ہو تو ہفتے میں ایک بار ہوتا تھا۔ چھلے جلسے کی روداد پڑھی جاتی تھی اور ہر قسم کے سوالات پر بحث ہوتی تھی۔ لوگوں کو پبلک مباحثوں میں شرکت کا اور مختصر اور بر محل تقریر کرنے کا تجربہ نہ تھا۔ ہر شخص تقریر کرنے سے ہچکچاتا تھا۔ میں نے انہیں پبلک جلسوں کے ضوابط سمجھائے اور یہ لوگ ان کی پابندی کرنے لگے۔ انہیں محسوس ہو گیا کہ یہ ان کے لئے ایک تعلیم ہے اور بہت سے لوگ جنہیں کبھی مجمع کے سامنے تقریر کرنے کا اتفاق نہیں ہوا تھا اس کے عادی ہو گئے کہ پبلک مسئلوں کے متعلق اپنے خیالات عام جلسوں میں بیان کر سکیں۔

مجھے معلوم تھا کہ پبلک کام میں کبھی کبھی چھوٹے چھوٹے اخراجات میں بہت روپیہ صرف ہو جاتا ہے۔ اس لئے میں نے یہ طے کیا تھا کہ ابتداء میں رسید یہاں تک نہیں چھپوانا چاہئیں۔ میرے دفتر میں ایک نقل کی مشین تھی اسی پر میں رسیدوں اور رپورٹوں کی نقلیں لے لیا کرتا۔ ان چیزوں کو چھپوانا میں نے اس دقت شروع کیا جب کانگریس کے پاس روپے کی افراط ہو گئی اور ممبروں کی تعداد اور کام کی مقدار بہت بڑھ گئی۔ اس طرح کی کفایت شعاری ہر انجمن کے لئے ضروری

ہے۔ مگر مجھے معلوم ہے کہ یہ بہت کم برتی جاتی ہے۔ اسی لئے میں نے یہ مناسب سمجھا کہ ایک ہندی مگر ترقی پذیر انجمن کی ابتدائی حالت کا ذکر کرتے ہوئے یہ تفصیلات بیان کر دوں۔

لوگوں کو روپیہ دے کر رسید لینے کی پروانہ تھی لیکن ہم ہمیشہ بڑے اصرار سے رسید دیا کرتے تھے۔ اس طرح پائی پائی کا حساب رہتا تھا اور میرے خیال میں 1894ء کے حسابت مثال انڈین کانگریس کے دفتر میں اب تک محفوظ ہوں گے۔ حساب کے معاملے میں احتیاط ہر انجمن کے لئے ضروری ہے بغیر اس کے وہ بدنام ہو جاتی ہے۔ جب تک حساب باقاعدہ نہ ہو حق کی اصل پاکیزگی قائم رہنا ناممکن ہے۔

کانگریس کی ایک اور خصوصیت یہ تھی کہ اس میں وہ تعلیم یافتہ ہندوستانی بھی شریک تھے جو افریقہ میں پیدا ہوئے تھے۔ کانگریس کے ماتحت افریقی ہندیوں کے لئے ایک تعلیمی انجمن قائم کی گئی جس کے ارکان زیادہ تر یہی تعلیم یافتہ نوجوان تھے۔ انہیں کچھ برائے نام چندہ بھی دینا پڑتا تھا۔ اس انجمن میں وہ اپنی ضرورتوں اور شکایتوں کو ظاہر کر سکتے تھے۔ یہاں ان کی غور و فکر کی قوت ابھرتی تھی۔ انہیں ہندوستانی تاجروں سے ملنے جلنے کا اور اپنے بھائیوں کی خدمت کرنے کا موقع ملتا تھا۔ یہ ایک طرح کا دارالمباحثہ تھا۔ اس کے ارکان پابندی سے جمع ہوا کرتے تھے اور مختلف مضامین پر تقریریں کرتے تھے یا مضامین پڑھتے تھے۔ انجمن کے ساتھ ایک چھوٹا سا کتب خانہ بھی تھا۔

کانگریس کا تیسرا کام تھا تبلیغ اشاعت یعنی افریقہ اور انگلستان کے انگریزوں اور ہندوستان کے لوگوں کو مثال کے صحیح حالات سے آگاہ کرنا۔ اس مقصد کو پیش نظر رکھ کر دو پمفلٹ لکھے پہلے کا نام تھا "جنوبی افریقہ کے ہر برطانوی سے ایک درخواست" اس میں میں نے مثال کے ہندوستانیوں کی عام حالت مع اعداد و شمار بیان کی تھی اور ہر بات کا ثبوت دیا تھا دوسرے کا نام تھا "ہندوستانی اور ووٹ کا حق۔ ایک درخواست" اس میں مثال کے ہندوستانیوں کے مسلمہ ووٹ کی ایک مختصر سی تاریخ مع اعداد و شمار لکھی تھی۔ میں نے یہ رسالے بڑی محنت اور بڑے مطالعے کے بعد لکھے تھے میری محنت ٹھکانے لگی اور ان رسالوں کی خوب اشاعت ہوئی۔

اس ساری جدوجہد کا یہ نتیجہ ہوا کہ جنوبی افریقہ میں ہندوستانیوں کے بہت سے دوست پیدا ہو گئے اور ہندوستان کی سب پارٹیوں کو اس مسئلے سے ہمدردی اور دلچسپی ہو گئی۔ اس کے علاوہ خود افریقہ کے ہندوستانیوں کو ایک معینہ راہ عمل نظر آنے لگی۔

بالاسندرم

دل کی سچی اور پاک آرزو ہمیشہ پوری ہوتی ہے۔ میں نے خود اس اصول کی صحت کا بارہا تجربہ کیا ہے۔ غریبوں کی خدمت کرنے کی مجھے ہمیشہ آرزو رہی ہے۔ اس کی بدولت میں ان میں مل جل کر رہا اور انہیں کاہو رہا۔

نٹال انڈین کانگریس میں افریقی ہندی اور محروم وغیرہ شامل تھے لیکن بے سیکھے مزدور اور پابند مزدور ابھی شامل نہیں کئے گئے تھے۔ ابھی تک کانگریس ان کی نہ تھی۔ ان لوگوں میں اتنی مقدرت نہ تھی کہ چندہ دے کر اس کے کارکن بنیں۔ کانگریس انہیں صرف اس طرح اپنا کر سکتی تھی کہ ان کی خدمت کرے اس کا ایک موقع آیا لیکن سچ پوچھے تو ابھی تک نہ کانگریس اس موقع سے فائدہ اٹھانے کے لئے تیار تھی اور نہ میں تھا۔ ابھی مجھے وکالت شروع کئے دو ہی تین مہینے ہو رہے تھے اور کانگریس بالکل ابتدائی حالت میں تھی کہ ایک دن کیا دیکھتا ہوں ایک تاملی مجسٹریٹ لگائے اپنا پھیٹا ہاتھ میں لئے میرے سامنے کھڑا کانپ رہا ہے اور رو رہا ہے۔ اس کے سامنے کے دو دانت ٹوٹے ہوئے ہیں اور اس کے منہ سے خون بہہ رہا ہے۔ مجھے اس شخص کا سارا حال اپنے محروم سے معلوم ہوا جو خود تاملی تھا۔ آنے والے کا نام بالاسندرم تھا اور یہ نٹال کے ایک مشہور یورپی کے یہاں پابند مزدور تھا۔ اس کے آقا نے غصے کے مارے آپے سے باہر ہو کر اسے اتنا مارا کہ اس کے دو دانت ٹوٹ گئے۔

میں نے اسے ڈاکٹر کے پاس بھیجا۔ ان دنوں وہاں صرف یورپی ڈاکٹر تھے۔ میں ایک تصدیق نامہ چاہتا تھا جس سے معلوم ہو بالاسندرم کو کس قسم کی چوٹ آئی ہے۔ مجھے یہ تصدیق نامہ مل گیا اور میں نے فوراً بالاسندرم کو مجسٹریٹ کے یہاں لے جا کر بیان حلفی داخل کرادیا۔ مجسٹریٹ اسے پڑھ

کر آگ ہو گیا اور اس نے فوراً آقا کے نام سمن جاری کر دیا۔

میری ہرگز یہ خواہش نہ تھی کہ آقا کو سزا دلاؤں۔ میں تو صرف بلاسندرم کو اس کے بیچے سے چھڑانا چاہتا تھا۔ پابند مزدوروں کے متعلق جو قانون تھا وہ میں نے پڑھا۔ اگر معمولی نوکر بغیر پہلے سے اطلاع دیئے نوکری چھوڑ دے تو اس کا آقا اس پر دیوانی میں مقدمہ چلا سکتا تھا۔ مگر پابند مزدور کی حالت بالکل دوسری تھی۔ اس پر ایسی صورت میں فوجداری میں مقدمہ چلایا جاتا تھا اور اگر وہ مجرم قرار پائے تو اسے تید کی سزا ہوتی تھی۔ اسی لئے سرولیم منٹرنے کہا تھا کہ پابند مزدوری غلامی سے کم نہیں۔ پابند مزدور بھی غلام ہی کی طرح اپنے آقا کی ملکیت ہوا کرتا تھا۔

بلاسندرم کو چھڑانے کی صرف دو تدبیریں تھیں یا تو پابند مزدوروں کے محافظ (1) سے درخواست کی جاتی ہے کہ اس کے معاہدے کو منسوخ کر دے یا اسے کسی اور شخص کی ماتحتی میں دے دے یا خود بلاسندرم کے آقا سے کہا جاتا کہ وہ اسے سبکدوش کر دے۔ میں نے اس کے آقا کے پاس جا کر کہا ”میں یہ نہیں چاہتا تھا کہ آپ پر مقدمہ چلاؤں اور آپ کو سزا دلاؤں۔ میرے خیال میں آپ کو خود یہ احساس ہو گا کہ آپ نے اس شخص کو بہت بری طرح مارا ہے۔ میرے اطمینان کے لئے یہی کافی ہے کہ آپ اس کی خدمات کسی اور شخص کے ہاتھ فروخت کر دیں۔ اس پر وہ فوراً راضی ہو گیا۔ اس کے بعد میں محافظ سے ملا۔ اس نے بھی رضامندی ظاہر کی مگر اس شرط پر کہ میں خود بلاسندرم کے لئے کوئی نیا آقا ڈھونڈوں۔

اس لئے میں نے تلاش شروع کر دی یہ شرط تھی کہ کوئی فرنگی آقا ہو کیونکہ ہندوستانیوں کو پابند مزدور رکھنے کی اجازت نہیں تھی۔ ان دنوں مجھ سے بہت کم یورپیوں سے ملاقات تھی۔ ان میں سے ایک سے میں ملا اور ازراہ مہربانی بلاسندرم کو لینے پر راضی ہو گیا۔ میں نے اس مہربانی کا دل سے شکریہ ادا کیا۔ مجسٹریٹ نے بلاسندرم کے پہلے آقا کو مجرم قرار دیا اور ٹھیلے میں لکھ دیا کہ وہ (باہمی تصفیہ کی بنا پر) بلاسندرم کی خدمات کسی دوسرے کی طرف منتقل کرنے پر راضی ہو گیا۔

بلاسندرم کے معاملے کی خبر مہربان پابند مزدور کو ہو گئی اور میں ان مزدوروں کا دوست سمجھا جانے لگا مجھے اس رابطے کے پیدا ہونے سے بڑی خوشی ہوئی۔ میرے دفتر میں پابند مزدوروں کا تانا بندا گیا اور مجھے ان کے رنج و راحت سے واقف ہونے کا بہترین موقع ملا۔

اس معاملے کی صدائے بازگشت دور دراز مدد اس تک میں سنی گئی۔ اس صوبے کے مختلف حصے کے مزدور جو معاہدہ کر کے مثال جایا کرتے تھے اپنے بھائیوں کے ذریعے سے جو افریقہ میں مقیم

تھے اس سے واقف ہو گئے۔

خود اس معاملے میں کوئی غیر معمولی بات نہیں تھی۔ لیکن پابند مزدور کو یہ دیکھ کر کہ مثال میں ایک شخص ان کی مدد کے لئے اور کھلم کھلا ان کا ساتھ دینے کے لئے موجود ہے۔ بڑی خوشی ہوئی اور ان کا دل امید سے معمور ہو گیا۔

میں کہہ چکا ہوں کہ جب بلاسندرم میرے دفتر میں آیا تھا تو اپنا پھینٹا ہاتھ میں لئے تھا۔ اس بات کا ایک افسوس ناک پہلو تھا جس سے ہم لوگوں کی ذلت ظاہر ہوتی تھی۔ ناظرین کو یاد ہو گا کہ مجھے عدالت نے پگڑی اتارنے کا حکم دیا تھا۔ ہر پابند مجبوز اور ہر اجنبی ہندوستانی کے لئے زبردستی یہ قاعدہ بنا دیا گیا تھا کہ جب وہ کسی یورپی کے سامنے جائے تو اپنی پگڑی یا ٹوپی یا پھینٹا اتار کر جائے۔ صرف سلام چاہے دونوں ہاتھوں سے کیوں نہ کیا جائے۔ کافی نہ تھا۔ چارہ بلاسندرم یہ سمجھا کہ اسے میرے سامنے بھی اسی طرح آنا چاہئے میرے لئے یہ پہلا موقع تھا کہ کوئی اس طرح میری تعظیم کرے مجھے بڑی شرمندگی ہوئی اور میں نے اس سے کہا کہ پھینٹا ہاتھ کے۔ اس نے کچھ تامل کے بعد میری بات مانی مگر اس کے چہرے سے پتہ چلتا تھا کہ اسے بڑی خوشی ہوئی۔

یہ بات میرے لئے ہمیشہ ایک معرہ رہی کہ لوگ اپنے ہم جنسوں کی ذلت میں اپنی عزت کیونکر سمجھتے ہیں۔

حوالہ

1 - ایک سرکاری عہدہ دار جس کا کام یہ تھا کہ پابند مزدوروں کی نگرانی اور ان کے حفاظت کرے۔

تین پاؤنڈ کا محصول

بلاسندرم کے معاملے کی بدولت مجھے پابند مزدوروں سے تھوڑی بہت واقفیت ہو گئی مگر ان کی حال کا گہرا مطالعہ کرنے پر مجھے اس تحریک نے آمادہ کیا جو ان پر ایک بھاری محصول عائد کرنے کے لئے کی گئی تھی۔

اسی سال یعنی 1894ء میں حکومت نٹال نے ارادہ کیا کہ پابند مزدوروں پر چھبیس پاؤنڈ محصول لگائے۔ مجھے اس تجویز نے حیرت میں ڈال دیا۔ میں نے فوراً اس مسئلے کو کانگریس کے سامنے پیش کیا اور یہ تجویز منظور کرائی کہ اس محصول کی مخالفت کے لئے ضروری اقدام کیا جائے۔ مجھے پہلے اختصار کے ساتھ یہ بتا دینا چاہئے کہ اس محصول کی ابتدا کیوں ہوئی تھی۔

1860ء کے لگ بھگ نٹال کے یورپیوں کو معلوم ہوا کہ یہاں گنے کی کاشت بہت بڑے پیمانے پر ہو سکتی ہے اور انہیں مزدوروں کی ضرورت محسوس ہوئی۔ بغیر باہر کے مزدوروں کے گنے کی کاشت اور شکر سازی ناممکن تھی کیونکہ نٹال کے زولو اس قسم کے کام کے لئے موزوں نہ تھے۔ اس لئے نٹال کی حکومت نے حکومت ہند سے خط و کتابت کی اور ہندوستان سے مزدور بلانے کی اجازت لے لی یہ طے ہوا کہ ان مزدوروں سے پانچ سال نٹال میں کام کرنے کا معاہدہ لیا جائے اور اس کے بعد انہیں اختیار ہو کہ وہیں سکونت اختیار کر لیں اور زمین خرید لیں۔ اس طرح انہیں نٹال آنے کی ترغیب دلائی گئی کیونکہ اس وقت یورپیوں کا یہ خیال تھا کہ معاہدے کی میعاد کے اندر ہندوستانی مزدوروں کی محنت سے ان کی زراعت کافی ترقی کرے گی۔

لیکن ہندوستانیوں سے جتنی توقع تھی انہوں نے اس سے بھی زیادہ کام کیا انہوں نے ترکاریوں کی کاشت کو بھی بہت ترقی دی۔ بہت سی نئی ترکاریاں ہندوستان سے لا کر بونیں اور

دسی ترکاریوں کی کاشت اس طریقے پر کی کہ وہ پہلے سے کستی پڑیں۔ انہوں نے پہلے پہل آم کے درخت بھی لگائے۔ ان کا حوصلہ عمل زراعت ہی تک محدود نہیں رہا۔ انہوں نے تجارت شروع کی۔ زمین خرید کر مکان بنائے اور مزدور کی حیثیت سے ترقی کر کے زمیندار اور مکاندار بن گئے۔ ان کے بعد ہندوستان کے تاجر آئے اور تجارت کے لئے یہیں بس گئے۔ ان سب سے پہلے سینٹ ابو بکر آمود مرحوم آئے تھے انہوں نے تھوڑے ہی دن میں اپنے کاروبار کو بہت ترقی دے لی۔ یورپی تاجروں کو بڑا خطرہ پیدا ہو گیا۔ جب وہ ہندوستانی مزدوروں کو خوشی خوشی لائے تھے تو انہیں خبر نہ تھی کہ یہ تجارت میں اتنے ہوشیار ہیں۔ یہاں تک تو غنیمت تھا کہ یہ ہندوستانی آزاد کاشت کار یا زمیندار نہیں بلکہ یورپی تاجروں کو اس کی برداشت نہ تھی کہ یہ لوگ تجارت میں بھی مقابلہ کرنے لگیں۔

اس طرح ان کے دل میں ہندوستانیوں سے عداوت کی بنیاد پڑی۔ بہت سنی اور چیزیں تھیں جنہوں نے اسے ترقی دی۔ ہمارا طرز معاشرت جو ان کی زندگی سے بالکل مختلف تھہ ہماری سادگی ہمارا تھوڑے نفع پر قناعت کرنا۔ ہمارا حقائق صحت کے اصولوں سے بے پردا ہونا عام صفائی کا خیال نہ رکھنا۔ مکانوں کی مرمت میں کنجوسی کرنا پھر سب سے بڑھ کر اختلاف مذہب۔ ان سب چیزوں نے عداوت کی آگ کو خوب بھڑکایا۔ اس کا اظہار قانون سازی میں اس طرح ہوا کہ ہندوستانی وڈٹ کے حق سے محروم کر دیئے گئے اور پابند مزدوروں پر محصول تجویز کیا گیا۔ اس کے علاوہ دوسرے طریقوں سے بھی نیش زنی شروع کر دی گئی۔

پہلی تجویز یہ تھی کہ ہندوستانی مزدور زبردستی اپنے دیس کو بھیج دیئے جائیں تاکہ ان کے معاہدے کی میعاد ہندوستان میں ختم ہو لیکن حکومت ہند سے یہ توقع نہ تھی کہ وہ اسے منظور کرے گی۔ اس لئے دوسری تجویز یہ پیش کی گئی کہ:-

1۔ جب ہندوستانی مزدور کے معاہدے کی میعاد ختم ہو تو وہ ہندوستان چلا جائے۔

یا

2۔ ہر دو سال کے بعد اس سے کسی قدر زیادہ اجرت پر کام کرنے کا معاہدہ لیا جائے۔

اور اگر

3۔ وہ ان دونوں باتوں پر راضی نہ ہو تو چھپیں پاؤنڈ سالانہ محصول دیا کرے۔ ایک دھ جو سر ہنری ہنسن اور مسٹریس پر مشتمل تھا ہندوستان بھیجا گیا کہ یہ تجویز حکومت ہند سے منظور کرائے۔

دائسرائے اس زمانے میں لارڈ ایلگن تھے۔ انہوں نے پچیس پاؤنڈ کے محصول کو پسند نہیں کیا۔ مگر اس پر راضی ہو گئے کہ فی کس تین پاؤنڈ محصول لگایا جائے۔ میرا اس وقت یہ خیال تھا اور اب بھی ہے کہ دائسرائے نے اس معاملے میں بڑی غلطی کی۔ اس محصول کو منظور کرتے وقت انہوں نے ہندوستان کے فائدے کا بالکل خیال نہیں کیا۔ مثال کے فرنگیوں کی رضا جوئی ہرگز ان کے فرائض میں داخل نہ تھی۔ اس تجویز کی رو سے تین چار سال کے بعد ہر پابند مزدور کو، اس کی بیوی کو، اس کے لڑکے کو جس کی عمر سولہ سال سے زیادہ ہو اور لڑکی کو جس کی عمر تیرہ سال سے زیادہ ہو یہ محصول دینا پڑتا۔ چار آدمیوں کے ایک خاندان سے جس میں میاں بیوی اور دو بچے ہوں بارہ پاؤنڈ محصول لینا ایسی حالت میں کہ خاندان کے افسر کی اوسط آمدنی چودہ شلنگ ماہوار سے زیادہ نہ ہو اتنا بڑا ظلم تھا جس کی مثال دنیا میں کہیں نہ ملتی۔

ہم نے اس محصول کے خلاف بڑی سخت جدوجہد شروع کی۔ اگر مثال انڈین کانگریس اس معاملے میں خاموش رہتی تو ممکن تھا کہ دائسرائے پچیس پاؤنڈ تک کے محصول پر راضی ہو جاتے پچیس پاؤنڈ سے گھٹ کر تین پاؤنڈ محصول رہ جانا غالباً محض کانگریس کے احتجاج کا نتیجہ تھا۔ مگر ممکن ہے کہ میرا خیال غلط ہو۔ شاید حکومت ہند ابتدا ہی سے پچیس پاؤنڈ محصول کی مخالف ہو اور اس نے بغیر کانگریس کے احتجاج کا خیال کئے خود اپنی طرف سے تین پاؤنڈ محصول تجویز کیا ہو۔ بہر حال حکومت ہند نے اپنے فرض کے ادا کرنے میں غفلت کی۔ دائسرائے ہندوستان کی فلاح و بہبود کے ذمہ دار ہیں اس لئے انہیں کبھی اس وحشیانہ محصول پر راضی نہیں ہونا چاہئے تھا۔

کانگریس نے اگر محصول پچیس پاؤنڈ سے گھٹا کر تین پاؤنڈ کر دیا تو کوئی بڑا کام نہیں کیا۔ اس کے کارکنوں کو اب بھی یہ قلق تھا کہ وہ پابند مزدوروں کے حقوق کی پوری حفاظت نہیں کر سکے۔ وہ ہمیشہ اس ارادے پر مضبوطی سے قائم رہی کہ محصول کو معاف کرائے مگر اس کا یہ ارادہ بیس سال کے بعد پورا ہوا اور اس وقت بھی صرف مثال کو ہندوستانیوں کی کوشش سے نہیں بلکہ سارے جنوبی افریقہ کے ہندوستانیوں کی متحدہ جدوجہد سے۔ جب حکومت نے مسٹر گوکھلے سے بد عہدی کی تو آخری لڑائی شروع ہوئی جس میں پابند ہندوستانی مزدوروں نے پورا حصہ لیا۔ ان میں سے بعض نے گولی کھا کر جان دی اور دس ہزار قید ہو گئے۔

لیکن آخر میں حق کابل بالا ہوا۔ ہندوستانیوں نے جو تکلیفیں برداشت کیں وہ گویا حق کی آواز تھی۔ لیکن اگر اسی کے ساتھ استوار عقیدہ انتہائی صبر اور انتھک کوشش نہ ہوتی تو یہ آواز غالب نہ

آتی۔ اگر ہندوستانی ہمت ہار بیٹھتے اور کانگریس محصول کو اٹل سمجھ کر لڑائی سے ہاجم اٹھا لیتی تو یہ قابل نفرت محصول آج تک پابند مزدوروں پر مسلط ہوتا جس میں نہ صرف جنوبی افریقہ کی بلکہ سارے ہندوستان کی انتہائی ذلت تھی۔

مختلف مذاہب کا مطالعہ

میرے قومی خدمت میں محو ہو جانے کا اصلی سبب معرفت نفس کی آرزو تھی۔ میں نے اپنا دین و مذہب خدمت کو بنایا تھا۔ یہ سمجھ کر کہ معرفت الہی کا ذریعہ صرف خدمت ہی ہے اور خدمت کے معنی میں ہندوستان کی خدمت سمجھتا تھا کیونکہ اس کا موقع مجھے خود بخود بے تلاش کئے مل گیا اور میں اسی کے لئے موزوں بھی تھا۔ میں جنوبی افریقہ سیاحت کا لطف اٹھانے کا ٹھیادار کی سازشوں سے نجات پانے اور روزی کمانے کی نیت سے آیا تھا مگر جیسا کہ میں نے اوپر کہا ہے میں یہاں آکر خدا کی تلاش میں اور معرفت نفس کی کوشش میں مصروف ہو گیا۔

عیسائی دوستوں نے میرے دل میں ذوق معرفت کو ابھارا تھا اور یہ ذوق روز بروز بڑھتا جاتا تھا۔ میرے دوستوں کو اس معاملے میں اتنا انہماک تھا کہ اگر میں بے پردائی بھی کرتا تو بھی وہ میرا پیچھا نہ چھوڑتے۔ ڈربن میں جنوبی افریقہ کے مشن کے سردار مسٹر اسپینیئر والٹن کو میرے اس ذوق کا پتہ چل گیا اور انہوں نے مجھ سے راہ و رسم پیدا کی۔ یہاں تک کہ مجھے اپنے عزیزوں کی طرح سمجھنے لگے ظاہر ہے کہ اس ملاقات کی بنا میرے اور پریٹوریا کے عیسائیوں کے تعلقات تھے مسٹر والٹن کی طبیعت کا ایک خاص انداز تھا۔ جہاں تک مجھے یاد ہے انہوں نے مجھ سے عیسائی مذہب اختیار کرنے کے لئے نہیں کہا۔ لیکن انہوں نے اپنی زندگی کتاب کی طرح کھول کر میرے سامنے رکھ دی اور مجھے اپنے کردار کے مشاہدے کا پورا موقع دیا۔ ان کی بیوی بڑی نیک اور قابل تھیں۔ مجھے ان میاں بیوی کا طرز عمل دل سے پسند تھا۔ وہ بھی یہ بات جانتے تھے اور میں بھی جانتا تھا کہ ہم دونوں کے عقائد میں زمین آسمان کا فرق ہے اور کتنا ہی بحث و مباحثہ کیا جائے یہ فرق مٹے والا نہیں۔ لیکن اگر جانبین رواداری، لطف و مدارات اور سچائی سے کام لیں تو اختلاف عقائد بھی فائدہ ہی پہنچتا ہے مجھے مسٹر

والٹن کا انکسار، استقلال اور ذوق عمل بہت پسند آیا۔ اور ہم دونوں میں اکثر ملاقات ہونے لگی۔ یہ دوستی میرے دل میں مذہب کی چٹکاری دہکتی رہی۔ اب مجھے پریٹوریا کی سی فرصت نصیب نہ تھی کہ پورے انہماک سے مذہب کا مطالعہ کرتا۔ پھر بھی جو تھوڑا بہت وقت ملتا تھا اس سے میں اچھی طرح کام لیتا تھا۔ مذہبی مسائل پر میری خط و کتابت اب بھی جاری تھی۔ رائے چند بھائی برابر میری رہنمائی کر رہے تھے ایک دوست نے مجھے نزد شکر کی کتاب دھرم و چار بھیجی۔ اس کا دیباچہ میرے لئے بہت مفید ثابت ہوا۔ میں اس شاعر کی لابیلائی طرز زندگی کا حال سن چکا تھا۔ دیباچے میں یہ پڑھ کر کہ مذہبی کتابوں کے مطالعے سے اس کی زندگی میں کایا پلٹ ہو گئی۔ میرے دل پر بہت اثر ہوا مجھے یہ کتاب اتنی پسند آئی کہ میں نے اس کا ایک ایک حرف نہایت غور سے پڑھا۔ میں نے میکس طر کی کتاب ”ہندوستان میں کیا سکھاتا ہے“ اور اس کا ”پانشد“ کا ترجمہ جو انجمن تمھیا موئی کی طرف سے شائع ہوا تھا بڑے شوق سے پڑھا۔ ان سب چیزوں سے میرے دل میں ہندو دھرم کا احترام بڑھ گیا اور اس میں مجھے بہت سی خوبیاں نظر آنے لگیں مگر اس کے سبب سے میرے دل میں دوسرے مذہبوں کی طرف سے کسی قسم کا تعصب پیدا نہیں ہوا۔ میں نے واشنگٹن روٹنگ کی کتاب حضرت محمدؐ اور ان کے خلفاء کی سیرت“ اور کارلائل کا مقالہ پیغمبر اسلام کی روح میں پڑھا۔ ان کتابوں کی بدولت میری نظر میں آنحضرت کی عظمت اور زیادہ ہو گئی ایک اور کتاب ”اقوال زرتشت“ بھی میری نظر سے گزری تھی۔

اس طرح مختلف مذہبوں سے میری واقفیت بڑھ گئی۔ اس مطالعہ سے مجھے مشاہدہ نفس کا شوق ہو گیا اور اس بات کی عادت پڑ گئی کہ جو بات میرے دل کو لگے اس پر عمل کیا کروں۔ چنانچہ ہندو دھرم کی بعض کتابوں کو پڑھنے کے بعد میں یوگ کی کچھ ریاضتیں جس طرح میری سمجھ میں آئیں کرنے لگا۔ مگر میں نے دیکھا کہ اس طرح کام نہیں چلتا اور یہ طے کیا کہ جب ہندوستان واپس جاؤں گا تو کسی داقف کار کی مدد سے یہ ریاضتیں کروں گا۔

میں نے نائٹائی کی تصانیف کا بھی غور سے مطالعہ کیا۔ ان کی کتاب ”کتاب مقدس کا خلاصہ راہ عمل“ کا میرے دل پر بڑا گہرا اثر ہوا مجھے رفتہ رفتہ یہ یقین ہونے لگا کہ عالمگیر محبت کا اصول لامحدود امکانات رکھتا ہے۔

اسی زمانے میں مجھ سے ایک اور عیسائی خاندان سے راہ و رسم ہو گئی۔ میں ہر اتوار کو وسیلی گرجے میں جایا کرتا تھا۔ اس خاندان کی طرف سے مجھے عام دعوت تھی کہ اتوار کو رات کا کھانا ان

کے یہاں کھایا کروں۔ گرجے میں جانے سے میرے دل پر کچھ اچھا اثر نہیں پڑا وہاں کے دغظ مجھے تاثیر اور ذوق سے خالی معلوم ہوتے تھے۔ حاضرین بھی کچھ ایسے دیندار نظر نہیں آتے تھے۔ ان کے دلوں میں ذوق و شوق کا پتہ نہ تھا۔ دنیا داروں کی ایک جماعت تھی جو تفریق طبع اور رسم کی پابندی کے لئے گرجے چلی جاتی تھی میں یہاں کبھی کبھی بلا ارادہ اونگھنے لگتا تھا۔ مجھے شرم آتی تھی مگر اپنے ہم نشینوں کو اسی حال میں دیکھ کر کچھ تسکین ہو جاتی تھی۔ میں اس حالت کو زیادہ دن تک برداشت نہیں کر سکتا تھا۔ اسی لئے میں نے وہاں جانا چھوڑ دیا۔

اس گھرانے سے جہاں میں ہر اتوار کو مہمان ہوا کرتا تھا میرے تعلقات دفعتاً منقطع ہو گئے بلکہ یہ کہنا چاہئے کہ مجھے وہاں جانے کی مانعت کر دی گئی۔ اس اجمال کی تفصیل یہ ہے کہ میرے میزبان کی بیوی بڑی نیک اور بھولی بھالی تھیں مگر کسی قدر تنگ خیال تھیں۔ مجھ سے ان سے اکثر مذہبی مسائل پر گفتگو ہوا کرتی تھی۔ میں ان دنوں آرنلڈ کی ”نور ایشیا“ کا دوبارہ مطالعہ کر رہا تھا۔ ایک بار ہم دونوں حضرت عیسیٰ اور گوتم بدھ کی زندگی کا مقابلہ کر رہے تھے میں نے کہا ”دیکھئے گوتم بدھ کے دل میں دوسروں کا کتنا درد تھا ان کی ہمدردی انسانوں تک محدود نہ تھی بلکہ ساری مخلوق خدا کو محیط تھی۔ آپ ہی بتلائے جب ہم انہیں تصور کی آنکھ سے دیکھتے ہیں کہ ایک مینے کو کندھے پر بٹھائے جا رہے ہیں تو ہمارے دل میں محبت کا دریا منڈ آتا ہے یا نہیں؟ حضرت عیسیٰ کی زندگی میں ساری جانداروں سے یہ ہمدردی نظر نہیں آتی۔

اس مقابلے سے اس نیک خاتون کو دکھ ہوا۔ مجھے ان کے احساسات کا اندازہ ہو گیا۔ میں نے گفتگو وہیں پر ختم کر دی اور ہم سب اٹھ کر کھانا کھانے چلے آئے۔ ان کا پانچ سال کا پیارا پیارا بچہ بھی ساتھ تھا۔ میں بچوں سے مل کر جتنا خوش ہوتا ہوں کسی چیز سے نہیں ہوتا۔ اور اس بچے سے مجھ سے پرانی دوستی تھی۔ اس کی رکابی میں ایک گوشت کا ٹکڑا تھا اور میری رکابی میں سیب تھا۔ میں نے اس کے گوشت کی بڑی برائی کی اور اپنے سیب کی بہت تعریف کی۔ معصوم بچہ میری باتوں سے متاثر ہو کر پھل کی تعریف میں میرا ہم زبان ہو گیا۔

مگر میں نے ماں کو جو دیکھا تو عجیب حالت پائی۔ کالو تو ہوا نہیں بدن میں۔

میں متنبہ ہو گیا اور میں نے گفتگو کا موضوع بدل دیا۔ دوسرے ہفتے میں وہاں گیا تو مگر کچھ رکتا ہوا۔ میرے خیال میں یہ کوئی ایسی بات نہ تھی کہ میں آنا جانا بند کر دوں۔ مگر مجھے وہاں جانا کچھ اچھا بھی نہ معلوم ہوا۔ نیک خاتون نے میری یہ مشکل حل کر دی انہوں نے کہا۔ مسٹر گاندھی آپ برا نہ مانیں

میں اپنا فرض جان کر کہتی ہوں کہ میرے لڑکے کے لئے آپ کی صحبت اچھی نہیں۔ ہر روز اسے گوشت کھانے میں تامل ہوتا ہے۔ وہ مجھے آپ کی دلیلیں یاد دلاتا ہے اور پھل مانگتا ہے۔ بس اب حد ہو گئی۔ اگر اس نے گوشت چھوڑ دیا تو وہ بیمار پڑ جائے گا اور بیمار نہیں تو کمزور ضرور پڑ جائے گا بھلا مجھ سے یہ کیونکر دیکھا جاسکتا ہے؟ آپ اب جو کچھ بحث کریں بڑوں سے کریں بڑوں سے کیا کریں۔ بچوں کو اس سے یقیناً نقصان پہنچے گا۔“

میں نے کہا ”بیگم صاحبہ مجھے افسوس ہے میں آپ کی مادری محبت کا اندازہ کر سکتا ہوں کیونکہ میرے بھی بچے ہیں۔ اس ناگوار صورت حال کو رفع کرنا بہت آسان ہے۔ اگر میں یہاں آتا رہا تو بچہ دیکھے گا کہ میں کون سی چیز کھاتا ہوں اور کون سی نہیں کھاتا۔ اس کا اس پر میری گفتگو سے بھی زیادہ اثر پڑے گا۔ اس لئے سب سے بہتر یہ ہے کہ میں یہاں آنا چھوڑ دوں۔ اس کے یقیناً یہ معنی نہیں کہ ہم ایک دوسرے کی دوستی ترک کر دیں۔“

انہوں نے کہا ”بہت بہت شکریہ“ اور ان کے چہرے سے معلوم ہوتا تھا کہ ان کے دل پر سے بڑا بوجھ ہٹ گیا۔

خانہ داری

گھر بار کا انتظام کرنا میرے لئے کوئی نئی بات نہیں تھی۔ لیکن نٹال کا گھر بمبئی لندن والے گھر کی طرح نہ تھا۔ یہاں بعض معارف محض شان کے خیال سے کرنا پڑے تھے میں اسے ضروری سمجھتا تھا کہ اپنا سازد سامان ایسا رکھوں جو نٹال میں ایک ہندوستانی بیرسٹر اور قومی نمائندے کے مرتبے کے شایان ہو۔ اس لئے میں نے ڈربن کے اس جھے میں جہاں عمائد شہر رہا کرتے تھے ایک چھوٹا سا خوشنما مکان لیا اور اسے مناسب طریقے سے سجایا میری غذا سادہ تھی مگر چونکہ میں اکثر انگریز دوستوں اور ہندوستانی رفیقوں کی دعوت کیا کرتا تھا اس لئے خانہ داری کے مصارف بہت ہو جاتے تھے۔

ہر گھر کے لئے ایک اچھا نوکر ضروری ہے۔ مگر مجھے کبھی نوکر کو نوکر کی طرح رکھنا نہ آیا۔ میرے ساتھ میرا ایک دوست رفیق اور مددگار کی حیثیت سے رہتا تھا اور ایک باورچی تھا جو میرے خاندان کا ایک رکن بن گیا تھا۔ دفتر کے محرر بھی میرے یہاں رہتے تھے۔ اور میرے ساتھ کھانا کھاتے تھے۔

میرا خیال ہے کہ مجھے اس تجربے میں کافی کامیابی رہی مگر اسی کے ساتھ زندگی کے کچھ تلخ تجربے بھی ہوئے۔

میرا رفیق بہت تیز آدمی تھا اور میں اسے اپنا سچا ہی خواہ سمجھتا تھا مجھے اس معاملے میں دھوکا ہوا۔ میرے ساتھ ایک محرر رہتا تھا جس سے وہ جلنے لگا اور اس نے ایسا جال پھیلایا کہ مجھے اس محرر کی طرف سے شبہ سا ہو گیا۔ یہ بھلا آدمی بڑا نازک مزاج تھا۔ جیسے ہی اسے معلوم ہوا کہ مجھے اس پر شبہ ہے وہ میرے گھر اور دفتر دونوں کو خیر باد کہہ کر چل دیا۔ مجھے بڑا دکھ ہوا۔ مجھے یہ احساس تھا کہ شاید

میں نے اس کے ساتھ نا انصافی کی اور یہ غلش میرے دل سے کبھی نہیں گئی۔
 اس عرصے میں میرا باورچی کسی کام سے چلا گیا اور اس کی جگہ دوسرا شخص رکھنے کی ضرورت
 پڑی۔ اس نے شخص کے متعلق مجھے آگے چل کر معلوم ہوا کہ بڑا شریف ہے مگر میرے لئے تو یہ
 خدا داد نعمت ثابت ہوا۔ دو ہی تین دن میں اسے پتہ چل گیا کہ میرے گھر کے اندر میری لاعلمی میں
 ناجائز کارروائیاں ہوتی ہیں اور اس نے دل میں ٹھان لی کہ مجھے آگاہ کر کے رہے گا۔ میری نسبت
 مشہور تھا کہ میں دوسروں پر بے جا اعتماد کر لیتا ہوں مگر خود کھرا آدمی ہوں۔ اسی لئے اس نے جو کچھ
 دیکھا اس سے اسے اور بھی صدمہ ہوا۔ میں ایک بچے کھانا کھانے کے لئے دفتر سے گھر جایا کرتا۔
 ایک دن بارہ بچے یہ باورچی ہانپتا ہوا دفتر پہنچا اور اس نے مجھ سے کہا ”مہربانی سے ابھی میرے ساتھ
 گھر چلے چلئے۔ وہاں آپ کو عجیب تماشا نظر آئے گا۔“
 میں نے کہا یہ کیا بک رہے ہو۔ آخر کچھ معلوم تو ہو کہ بات کیا ہے۔ میں اس وقت دفتر چھوڑ
 کر کیسے جاسکتا ہوں؟“

”اگر آپ نہ چلے تو چھتائیے گا۔ اب میں اور کیا کہوں۔“

اس کے اصرار کا مجھ پر اثر ہوا۔ میں ایک محرر کو ساتھ لے کر گھر کی طرف چلا۔ باورچی آگے
 آگے تھا۔ وہ مجھے سیدھا کونٹھے پر لے گیا اور میرے رفیق کے کمرے کی طرف اشارہ کر کے کہنے لگا
 ”یہ دروازہ کھولئے اور اپنی آنکھ سے دیکھ لیجئے۔“

میں سمجھ گیا یہ کیا معاملہ ہے۔ میں نے دروازے پر دستک دی۔ صدائے درخواست اب کے میں
 نے دروازہ اتنی زور سے دھدھایا کہ دیواریں تک ہلنے لگیں آخر کواڑ کھلے۔ اندر دیکھا کہ ایک
 فاشہ عورت بیٹھی ہے۔ میں نے اس سے کہا کہ فوراً چلی جاؤ اور اب کبھی میرے گھر میں قدم نہ رکھنا۔
 اپنے رفیق سے میں نے کہا ”بس اب تم سے مجھے کوئی واسطہ نہیں۔ میں نے بڑا دھوکا کھایا۔
 خوب بیوقوف بنا۔ میں نے تم پر جو اعتماد کیا تھا اس کا یہی بدلہ ہے؟“

بجائے اس کے کہ وہ کچھ شپٹاتا اٹھا مجھے دھمکانے لگا کہ میں تمہارا پردہ فاش کر دوں گا۔
 میں نے کہا ”مجھے کوئی بات چھپانا نہیں ہے۔ میں نے جو کچھ کیا ہو ساری دنیا سے کہہ دو۔ مگر
 میرے گھر سے اسی دم چلے جاؤ۔“

اس پر وہ اور بھی بگڑا۔ اب میں مجبور ہو گیا۔ میں نے محرر سے جو نیچے کھڑا تھا، کہا۔
 مہربانی سے ذرا پولیس سپرنٹنڈنٹ کے پاس جا کر میرا سلام کہو اور یہ اطلاع دو کہ ایک شخص

جو میرے ساتھ رہتا تھا بری حرکت کا مرتکب ہوا ہے۔ اب میں اسے اپنے گھر نہیں رکھنا چاہتا مگر وہ جانے سے انکار کرتا ہے۔ اگر آپ چند سپاہیوں کو میری مدد کے لئے بھیج دیں تو بڑا احسان ہو گا۔“

اب اسے معلوم ہوا کہ میں واقعی سختی پر آمادہ ہوں۔ احساس جرم سے اس کے ہاتھ پاؤں پھول گئے۔ اس نے مجھ سے عاجزی سے درخواست کی کہ پولیس کو اطلاع نہ دو میں ابھی ابھی جاتا ہوں۔ چنانچہ وہ اپنا بوریا بندھنا لے کر رخصت ہو گیا۔

اس واقعے نے مجھے بردقت آگاہ کر دیا۔ اب جا کر مجھے معلوم ہوا کہ اس شیطان نے مجھے کس قدر بہکایا تھا۔ اسے اپنے گھر رکھ کر میں نے اچھے کام کے لئے بڑا ذریعہ اختیار کیا تھا۔ جو کے کھیت سے گیبوں کاٹنا چاہتا تھا۔ میں جانتا تھا کہ یہ آوارہ شخص ہے مگر پھر بھی مجھے یقین تھا کہ یہ میرے ساتھ وفا کرے گا اس کی اصلاح کی کوشش میں خود تباہ ہوتے ہوتے بچ گیا۔ میرے مہربان مجھے متنبہ کرتے رہے مگر میں نہ مانتا۔ دوستی نے مجھے اندھا کر دیا تھا۔

اگر یہ نیا بادرچی نہ آتا تو کبھی سچے واقعات کا پتہ نہ چلتا اور اس دوست کے اثر میں رہ کر میں کبھی بے تعلقی کی زندگی کے قابل نہ ہوتا جو میں نے اس کے بعد سے بسر کرنا شروع کی۔ میں اس شخص کے پیچھے اپنا دولت ضائع کرتا رہتا۔ اس میں یہ قدرت تھی کہ مجھے ہمیشہ غفلت اور گمراہی میں رکھتا۔

لیکن خدا نے جیسے ہمیشہ مجھے بچایا تھا۔ اس بار بھی بچایا۔ میری نیت پاک تھی اس لئے میں باوجود غلطیوں کے ہلاکت سے محفوظ رہا اور شروع ہی میں یہ تجربہ ہو جانے سے آئندہ کے لئے مجھے سبق مل گیا۔

یہ بادرچی گویا ایک ناسد غیبی تھا۔ وہ پکانا بالکل نہیں جانتا تھا اور بادرچی کی حیثیت سے میرے گھر میں نہیں رہ سکتا تھا۔ مگر یہ اسی کا کام تھا کہ اس نے مجھے خبردار کر دیا بعد میں مجھے معلوم ہوا کہ اس سے پہلے بھی میرے گھر میں عورتیں لائی جا چکی تھیں مگر کسی شخص میں یہ ہمت نہ تھی جو اس بادرچی میں تھی۔ سب جانتے تھے کہ میں اپنے رفیق پر آنکھ بند کر کے بھروسہ کرتا ہوں۔ یہ بادرچی گویا خاص اسی کے لئے آیا تھا کیونکہ اسی دولت اس نے جانے کی اجازت مانگی کہنے لگا ”میں آپ کے گھر میں نہیں رہ سکتا آپ بڑی جلدی دوسروں کے بہکانے میں آجاتے ہیں۔ میرا یہاں نباہ نہیں ہو سکتا۔“

میں نے اسے رخصت کر دیا۔

اب مجھے معلوم ہوا کہ اس رفیق نے مجھے خواہ مخواہ میرے محرر سے بدظن کر دیا تھا۔ میں نے اس محرر کے ساتھ جو بے انصافی کی تھی اب اس کی تلافی کی انتہائی کوشش کی مگر مجھے ہمیشہ اس کا افسوس رہا کہ اس کا دل کسی طرح مجھ سے صاف نہیں ہوا جو شیشہ ایک بار ٹوٹ گیا وہ کبھی نہیں جڑتا۔

وطن کا رخ

اب مجھے جنوبی افریقہ میں آئے تین سال ہو چکے تھے۔ میں یہاں کے لوگوں سے اچھی طرح واقف ہو گیا تھا اور یہ بھی مجھے خوب جان گئے تھے 1896ء میں میں نے ان سے چھ مہینے کے لئے اجازت مانگی۔ کیونکہ اب مجھے معلوم ہو گیا کہ مجھے جنوبی افریقہ میں بہت دن رہنا ہے۔ میری دکالت اچھی خاصی چلتی تھی اور مجھے احساس ہو گیا تھا کہ لوگوں کو میری ضرورت ہے اس لئے میں نے یہ ارادہ کر لیا کہ گھر جا کر بیوی بچے لے آؤں اور یہاں مستقل سکونت اختیار کر لوں۔ میں نے یہ بھی سوچا کہ وطن جا کر لوگوں کو جنوبی افریقہ کے حالات سے واقف کروں اور یہاں کے ہندوستانیوں کا ہمدرد بناؤں تو کچھ قومی خدمت بھی ہو جائے گی۔ تین پاؤنڈ کا محصول ہمارے جسم میں ناسور کی طرح تھا۔ جب تک یہ دور نہ ہو جائے ہمیں چین نہیں آسکتا۔

لیکن سوال یہ تھا کہ میرے بچے کانگریس اور تعلیمی انجمن کے کام کو کون سنبھالے میری نظر میں دو شخص تھے۔ آدم جی میاں خاں اور پارسی رستم جی۔ یوں تو ہمیں اب تاجروں کے طبقے سے بہت سے کارکن مل سکتے تھے۔ لیکن ان لوگوں میں جو سیکرٹری کے فرائض باقاعدہ انجام دے سکتے تھے جنوبی افریقہ کے ہندوستانیوں میں عزت کی نظر سے دیکھے جاتے تھے۔ سب سے ممتاز یہی دونوں حضرات تھے۔ ظاہر ہے کہ سیکرٹری کے لئے کام چلانے بھر کی انگریزی جانتا ضروری تھا۔ میں نے کانگریس میں آدم جی میاں خاں (جو اب انتقال کر چکے ہیں) کا نام پیش کیا اور وہ سیکرٹری مقرر کر دیئے گئے۔ تجربے سے معلوم ہوا کہ یہ انتخاب بہت موزوں تھا۔ آدم جی میاں خاں کے استقلال، فیاضی، مردت اور اخلاق سے سب لوگ خوش تھے اور ہر شخص پر یہ ثابت ہو گیا کہ سیکرٹری کے کام کے لئے ایسے شخص کی ضرورت نہیں جس نے بیرسنری کی ڈگری حاصل کی ہو یا انگلستان میں اعلیٰ

میں 1896ء کے وسط میں پنگولا جہاز سے جو کلکتے جا رہا تھا وطن روانہ ہوا۔ جہاز پر بہت کم مسافر تھے۔ ان میں سے دو انگریز افسر تھے جن کی مجھ سے بہت بے تکلفی ہو گئی۔ ان میں سے ایک کے ساتھ میں روزانہ ایک گھنٹہ شطرنج کھیلا کرتا تھا۔ جہاز کے ڈاکٹر نے مجھے ایک کتاب دی جس کا نام تھا ”بے معلم کے تامل سکھانے والی“ میں نے اس کتاب کو باقاعدہ پڑھنا شروع کر دیا۔ مجھے مثال میں تجربے سے یہ معلوم ہوا تھا کہ مجھے مسلمانوں سے حلا ملا پیدا کرنے کے لئے اردو اور مدراسیوں سے میل جول رکھنے کے لئے تامل سیکھنا چاہئے۔

میرا ایک انگریز دوست بھی میرے ساتھ اردو پڑھتا تھا۔ اس کی فرمائش سے میں نے تیسرے درجے کے مسافروں میں ایک اردو کا ”منشی“ ڈھونڈ نکالا اور ہم دونوں کی خوب پڑھائی ہونے لگی۔ اس انگریز کا حلقہ مجھے سے اچھا تھا۔ وہ جو لفظ ایک بار دیکھ لیتا تھا کبھی نہیں بھوتتا تھا۔ مجھے اکثر اردو حروف کے پہچانتے میں دقت ہوتی تھی میں نے بہت زور لگایا مگر اس کے برابر کبھی نہ پہنچ سکا۔

تامل میں میں نے خاصی ترقی کی۔ کوئی پڑھانے والا نہ ملا۔ لیکن کتاب بہت اچھی لکھی ہوئی تھی اور مجھے خارجی مدد کی کوئی ضرورت نہیں ہوئی۔

مجھے امید تھی کہ ہندوستان پہنچنے کے بعد بھی یہ مطالعہ جاری رکھ سکوں گا مگر یہ بالکل ناممکن تھا۔ 1893ء کے بعد سے اب تک میں نے جو کچھ پڑھا ہے زیادہ تر جیل خانے میں پڑھا ہے۔ جو تھوڑی بہت تامل اور اردو مجھے آتی ہے وہ میں نے جیل ہی میں سیکھی ہے۔ تامل جنوبی افریقہ کے جیل میں اور اردو یرادوا جیل میں۔ گھر تامل بولنا مجھے کبھی نہ آیا۔ اور پڑھنے کی مشق بھی اب چھوٹی جاتی ہے۔

مجھے اب تک یہ احساس ہے کہ تامل اور تلیگو نہ جاننے سے میں بڑے گھائے میں رہا۔ جنوبی افریقہ کے درادیدیوں نے میرے ساتھ جس محبت کا اظہار کیا تھا اس کی یاد مجھے اب تک عزیز ہے۔ جب کبھی کوئی تامل یا تلیگو دوست نظر آتا ہے تو مجھے بے اختیار اس کے ہم وطنوں کی عقیدت، استقلال، ایثار اور بے نفسی کا خیال آجاتا ہے جن کا میرا جنوبی افریقہ میں ساتھ تھا۔ ان میں سے اکثر لوگ مرد ہوں یا عورت، ان پڑھ تھے۔ جنوبی افریقہ کی لڑائی انہیں لوگوں کے لئے تھی اور یہی ان پڑھ سپاہی اس میں لڑتے تھے۔ غریبوں ہی کے لئے یہ لڑائی تھی اور غریب ہی اس میں دل و جان سے

شریک تھے۔ ان کی زبان نہ جانتے سے اور چاہے جو نقصان ہوا ہو مگر اپنے ان نیک اور بھولے ہموطنوں کا دل مٹھی میں لینے میں مجھے کوئی دشواری نہیں ہوئی۔ یہ لوگ ٹوٹی پھوٹی ہندوستانی اور انگریزی بول لیتے تھے اور ہمارا کام بغیر کسی دقت کے چلتا تھا۔ لیکن میں تامل اور تیلیگو سیکھ کر ان کی محبت کا معاوضہ کرنا چاہتا تھا۔ تامل تو میں نے تھوڑی بہت سیکھ لی مگر تیلیگو میں جس کے سیکھنے کی میں نے ہندوستان میں کوشش کی الف بے سے آگے نہ بڑھ سکا۔ اب میں غالباً یہ زبانیں کبھی نہ سیکھ سکوں گا۔ اس لئے میری ساری امید اسی پر منحصر ہے کہ درادیدی ہندوستانی سیکھ لیں گے۔ جنوبی افریقہ میں میں ان میں سے جو لوگ انگریزی نہیں جانتے وہ ہندی یا ہندوستانی ٹوٹی پھوٹی کسی مگر بول لیتے ہیں البتہ انگریزی جانتے والے اسے نہیں سیکھنا چاہتے گویا انگریزی جانتا خود اپنی زبانوں کے سیکھنے میں سدراہ ہے۔

مگر میں مطلب سے دور چلا گیا پہلے مجھے اپنے سفر کا بیان ختم کر لینا چاہئے ناظرین کا تعارف پتنگولا جہاز نے کپتان سے کرانا چاہتا ہوں جس سے میری دوستی ہو گئی تھی۔ یہ نیک کپتان پلیٹہ برادر تھا۔ ہم دونوں میں گفتگو جہاز رانی پر نہیں بلکہ مذہبی مسائل پر ہوتی تھی۔ اس کے نزدیک مذہب اور اطلاق دو جداگانہ چیزیں تھیں۔ انجیل کو وہ بچوں کا کھیل سمجھتا تھا جس کی ساری خوبی اس کی سادگی میں ہے۔ اس کا قول تھا کہ سب مرد اور بچے مسیح اور ان کی قربانی پر عقیدہ رکھیں تو ان کی نجات یقینی ہے اس دوست کو دیکھ کر مجھے پریٹوریا کا پلیٹہ برادر یاد آگیا۔ اس کا خیال تھا کہ جو مذہب اطلاق کیود عائد کرے وہ کسی کام کا نہیں۔ یہ ساری بحث میری نباتاتی غذا پر سے شروع ہوتی تھی۔ اس نے کہا کہ کوئی وجہ نہیں کہ تم گوشت نہ کھاؤ چاہے وہ گائے کا ہو یا کسی اور جانور کا؟ خدا نے جس طرح نباتات کو انسان کی راحت کے لئے پیدا کیا ہے اسی طرح ان حیوانات کو بھی کیا ہے۔ ان مسائل پر گفتگو کرتے کرتے مذہبی بحث چھڑ جانا لازمی تھا۔

ہم ایک دوسرے کی تسکین نہیں کر سکے میرے دل میں یہ عقیدہ جما ہوا تھا کہ مذہب اور اطلاق ایک چیز ہے۔ کپتان کا عقیدہ اس کے خلاف تھا جس کی صحت میں اسے ذرا بھی شبہ نہ تھا۔ چوبیس دن کے بعد یہ خوشگوار سفر ختم ہو گیا اور میں دریائے ہو گلی کے جن پر سرد فضا ہوا کلکتے پہنچ گیا۔ اسی دن میں ریل میں بیٹھ کر بمبئی روانہ ہو گیا۔

ہندوستان میں

بسی جاتے ہوئے میری ریل پنتالیں منٹ الہ آباد میں ٹھہری۔ میں نے کہا کہ میں اتنی دیر میں گاڑی میں بیٹھ کر شہر کی سیر کر آؤں۔ مجھے انگریزی دواؤں کی دکان سے کچھ دوا میں بھی خریدنا تھیں، دوکاندار ادنگہ رہا تھا اور اس نے دواؤں کے ملانے میں اتنی دیر کر دی کہ جب میں اسٹیشن پہنچا تو میری گاڑی سامنے سے نکل گئی۔ اسٹیشن ماسٹر نے ازراہ مہربانی ایک منٹ میری خاطر گاڑی روکی تھی۔ مگر جب میں آتا ہوا نظر نہیں آیا تو میرا سامان بہت احتیاط سے اتر دیا تھا۔

میں نے نوکیلیز کے ہوٹل میں ایک کمرہ لے لیا اور یہ قصد کر لیا کہ اپنا کام فوراً شروع کر دوں گا۔ میں نے الہ آباد کے اخبار پانیر کا نام بہت سنا تھا اور مجھے یہ معلوم ہوا تھا کہ ہندوستانیوں کے مطالبات کا مخالف ہے جہاں تک مجھے یاد ہے اس زمانے میں چھوٹے مسٹر چینی اڈیٹر تھے۔ میں ہر پارٹی کی مدد حاصل کرنا چاہتا تھا اس لئے میں نے مسٹر چینی کو ایک رقعہ لکھا جس میں اپنی گاڑی چھوٹ جانے کا ذکر کیا ان سے درخواست کی کہ مجھے ملاقات کے لئے کوئی ایسا دقت دیں کہ میں دوسرے دن روانہ ہو سکوں۔ وہ مجھ سے اسی دقت ملنے پر راضی ہو گئے۔ مجھے بڑی خوشی ہوئی خاص کر اس لئے کہ انہوں نے میری داستان صبر سے سنی۔ انہوں نے کہا کہ تم جو کچھ لکھو گے اس پر میں اپنے اخبار میں تبصرہ کروں گا مگر اس کا وعدہ نہیں کرتا کہ ہندوستانیوں کے سارے مطالبات کی تائید ہی کروں گا کیونکہ میرا یہ بھی تو فرض ہے کہ فریق ثانی کے نقطہ نظر کو سمجھوں اور اسے کافی اہمیت دوں۔

میں نے کہا۔ ”یہی بہت کافی ہے کہ آپ اس مسئلے پر غور کریں اور اپنے اخبار میں اس پر بحث کریں۔ میرا مطالبہ بس اتنا ہے کہ ہمارے ساتھ معمولی انصاف کیا جائے جو ہمارا حق ہے۔“

دن کا بقیہ حصہ میں نے شہر کی سیر میں تین دریاؤں کے خوش نما سنگم تربینی کے کنارے میں اور اپنے کام کے متعلق تدبیریں سوچنے میں گزارا۔

پانی کے ایڈیٹر سے یہ غیر متوقع ملاقات واقعات کے ایک مسئلے کا آغاز تھی جس کا انجام یہ ہوا کہ نٹال میں عوام نے مجھے قتل کرنے کی کوشش کی۔

میں بغیر بمبئی میں ٹھہرے سیدھا راجکوٹ پہنچا۔ اور جنوبی افریقہ کے حالات پر ایک پمفلٹ لکھنے کی تیاری کرنے لگا۔ اس کے لکھنے اور شائع کرنے میں ایک مہینہ لگ گیا۔ اس کا سرورق سبز تھا اس لئے آگے چل کر اس کا نام سبز پمفلٹ پڑ گیا۔ اس میں میں نے جنوبی افریقہ کے ہندوستانیوں کی مشکلات خاص کر کے ہلکے رنگ میں دکھائیں اور طرز بیان بھی اور دو پمفلٹوں کے مقابلے میں جس کا ذکر میں کر چکا ہوں معتدل رکھا۔ کیونکہ میں جانتا تھا کہ دور کی چیزیں جتنی اصل میں ہوتی ہیں اس سے بڑی معلوم ہوا کرتی ہیں۔

میں نے اس پمفلٹ کی دس ہزار کاپیاں چھپوائیں اور ہندوستان کے سارے اخباروں کو اور سب پارٹیوں کے مشہور لیڈروں کو بھیجیں۔ سب سے پہلے اس پر پانی کے ایڈیٹر نے تبصرہ کیا۔ رپورٹ نے اس کے مضمون کا خلاصہ تار کے ذریعے سے لندن بھیجا اور وہاں کے رپورٹر کے صدر دفتر نے اس خلاصے کا خلاصہ نٹال پہنچایا۔ یہ آخری تار تین سطر سے زیادہ نہ تھا میں نے جو تصویر اس سلوک کی جو نٹال میں ہندوستانیوں کے ساتھ کیا جاتا ہے کھینچی تھی اس کا اس تار میں چھوٹا سا عکس تھا مگر اس میں بہت مبالغے سے کام لیا گیا تھا اور جو الفاظ نقل کئے گئے تھے وہ میرے نہ تھے۔ اس کا نٹال میں جو اثر ہوا اس کا ذکر میں آگے چل کر کروں گا۔ ہندوستان کے ہر معقول اخبار میں اس پر بحث کی گئی۔

ان پمفلٹوں کو لفافوں میں رکھ کر ڈاک میں ڈالنا کوئی سہل کام نہ تھا اور اگر میں اجرت دیکر لفافہ وغیرہ بنواتا تو بہت مصارف پڑتے۔ مگر مجھے اس کی بڑی آسان ترکیب سوجھ گئی میں نے اپنے محلے کے سب لڑکوں کو جمع کیا اور ان سے کہا کہ صبح کو سکول کے وقت سے پہلے دو تین گھنٹے رضا کار کی حیثیت سے کام کیا کریں۔ وہ اس پر خوشی سے راضی ہو گئے۔ میں نے ان سے کہا کہ میں تمہیں دعائیں دوں گا اور افعام میں استعمال شدہ ٹکٹ بانٹوں گا۔ انہوں نے بات کی بات میں سارا کام نپٹا دیا۔ چھوٹے بچوں سے رضا کار کے طور پر کام لینے کا یہ میرا پہلا تجربہ تھا۔ ان چھوٹے دوستوں میں سے دو اس کتاب کی تحریر کے وقت میرے رفیق کانگریس

اسی زمانے میں بمبئی میں طاعون شروع ہوا اور چاروں طرف ایک ہنگامہ برپا ہو گیا۔ راجکوٹ میں بھی وبا پھیلنے کا خوف تھا۔ میرا خیال تھا کہ میں حفظانِ صحت کے شعبے میں مفید کام کر سکوں گا۔ اس لئے میں نے ریاست کے حکام کے سامنے اپنی خدمات پیش کیں۔ میری درخواست منظور ہوئی اور میں اس کمیٹی کا ممبر مقرر کیا گیا جو اس مسئلے پر غور کرنے کے لئے بنائی گئی تھی۔ میں نے پاخانوں کی صفائی پر بہت زور دیا اور کمیٹی نے یہ فیصلہ کیا کہ سب گھروں کے پاخانے معائنہ کئے جائیں۔ غریبوں نے کوئی مزاحمت نہیں کی بلکہ انہیں جو اصلاحی تجاویز بتائی گئیں ان پر خوشی سے عمل کیا۔ مگر جب ہم عمائد ریاست کے گھروں کا معائنہ کرنے گئے تو ہمارے مشوروں پر عمل کرنا تو درکنار ان میں سے بعض نے ہمیں اپنے گھر میں رہنے تک نہیں دیا۔ ہمیں عام طور پر یہ تجربہ ہوا کہ امیروں کے پاخانے زیادہ گندے ہیں۔ پاخانے کیا تھے تار یک بدبو دار کوٹھریاں تھیں۔ جن میں غلاظت کے اور کیردوں کے انبار لگے تھے ہم نے جو اصلاحی تجاویز بتائی تھیں وہ بالکل سیدھی سادی تھیں مثلاً کھڑی میں ناندیں رکھنا تاکہ میلا زمین پر نہ گرے۔ پیشاب بھی ناند میں کرنا اور زمین میں جذب نہ ہونے دینا۔ پاخانوں اور بیرونی دیواروں کے بیچ میں جو اڑ ہو اسے دور کر دینا تاکہ پاخانوں میں زیادہ روشنی اور ہوا آسکے اور مہتر کو پوری طرح صفائی کرنے میں دقت نہ ہو۔ اونچے طبقوں نے اس آخری تجویز کی بڑی مخالفت کی اور اکثر لوگوں نے اس پر عمل نہیں کیا۔

کمیٹی کو اچھوتوں کے محلوں کا بھی معائنہ کرنا تھا، صرف ایک ممبر میرے ساتھ وہاں جانے پر راضی ہوا اور لوگوں کے نزدیک ان محلوں میں جانا ہی ایک لغو بات تھی۔ چہ جائیکہ وہاں کے پاخانوں کا معائنہ کرنا۔ لیکن میں نے ان محلوں کو دیکھا تو بڑی حیرت اور خوشی ہوئی۔ مجھے اپنی عمر میں ایسی جگہ جانے کا پہلا اتفاق تھا۔ وہاں کے عورت مرد، ہم کو دیکھ کر متعجب ہوئے میں نے ان سے پاخانوں کے معائنے کی اجازت مانگی۔

انہوں نے متعجب ہو کر کہا ”پاخانوں کا ہمارے یہاں کیا کام ہم تو کھلے میدان میں جھاڑے جایا کرتے ہیں۔ پاخانے تو حضور جیسے امیروں کے لئے ہیں۔

میں نے کہا ”اچھا تو ہمیں اپنا گھر تو دکھاؤ گے؟

شوق سے دیکھئے۔ ایک ایک کو نا دیکھ ڈالئے، ہمارے گھر ہی کیا ہیں چوہے کے سے بل ہیں۔“

میں اندر گیا اور مجھے یہ دیکھ کر بڑی مسرت ہوئی کہ اندر بھی ویسی ہی صفائی ہے جیسی باہر ہے۔

دردازوں میں خوب جھاز دی ہوئی تھی۔ فرش سلیقے سے گوبر سے لپے ہوئے تھے۔ اور جو تھوڑے بہت باسن وغیرہ تھے وہ دھلے اور منجے ہوئے رکھے تھے۔ ان محلوں میں دبا پھیلنے کا کوئی اندیشہ نہ تھا۔ امیروں کے محلے میں ایک پاخانہ نظر آیا جس کا ذکر میں ضروری سمجھتا ہوں ہر کمرے میں ایک نالی تھی جس میں پانی بھی پھینکا جاتا تھا اور پیشاب بھی کیا جاتا تھا۔ یعنی سارے گھر میں بدبو پھیلی ہوئی تھی۔ ایک مکان میں کوٹھے پر ایک سونے کا کمرہ تھا۔ جس کے اندر کی نالی پیشاب اور پاخانے دونوں کے کام میں لائی جاتی تھی۔ اس نالی کے سرے پر ایک نل تھا جو نیچے کی منزل تک چلا گیا تھا۔ اس کمرے میں ایسی سڑی ہوئی بدبو تھی کہ دماغ پھٹا جاتا تھا خدا جانے لوگ اس میں کیونکر سو سکتے تھے۔ کمیٹی نے ویشنو حویلی کا بھی معائنہ کیا۔ حویلی کے متولی سے میرے خاندان والوں کے بڑے مراسم تھے اس لئے وہ اس پر راضی ہو گیا کہ ہم لوگ سارا مندر دیکھیں اور جو صلاحیتیں چاہیں تجویز کریں۔ اس عمارت کا ایک حصہ ایسا تھا جو انہوں نے خود کبھی نہیں دیکھا تھا۔ وہ جگہ تھی جہاں بچا کچا کھانا اور پتے جن پر بھوجن کیا جاتا تھا دیوار کے پیچھے پھینک دیئے جاتے تھے۔ یہاں کوڑوں اور چیلوں کا جوم رہتا تھا۔ ظاہر ہے کہ پاخانے بھی بہت گندے تھے۔ میرا قیام راجکوٹ میں بہت کم رہا اس لئے میں نہیں کہہ سکتا کہ ہم نے جو تدبیریں بتائی تھیں اس پر متولی نے کس حد تک عمل کیا۔

مجھے ایک عبادت گاہ میں اس قدر گندگی دیکھ کر بہت رنج ہوا۔ قاعدے سے تو ایسی جگہ جے لوگ مقدس سمجھتے ہیں حلقان صحت کے اصولوں کا حاصل اہتمام ہونا چاہئے۔ مجھے اس زمانے میں بھی یہ معلوم تھا کہ ہمرتیوں کے مصنفوں نے بیرونی اور اندرونی صفائی پر بہت زور دیا ہے۔

وفاداری کا جوش اور تیمارداری کا جذبہ

برطانوی آئین کا جتنا وفادار میں تھا اتنا میں نے کسی کو نہیں دیکھا۔ اب میں یہ سمجھتا ہوں کہ اس وفاداری کی تہہ میں حق کی محبت تھی۔ مجھ سے وفاداری یا کسی اور نیکی کا جھوٹا اظہار کبھی نہ ہو سکا۔ مثال میں میں جن جلسوں میں شریک ہوا کرتا تھا۔ وہاں نیشنل انتہیم (1) گایا جات تھا۔ میں اس زمانے میں اپنا فرض سمجھتا تھا کہ اس گیت میں شریک ہوں۔ اس کے یہ معنی نہیں کہ مجھے برطانوی حکومت کی حراہیوں کا علم نہ تھا مگر اس کے باوجود میں اسے مجموعی حیثیت سے قابل قبول سمجھتا تھا۔ اس زمانے میں میرا یہ خیال تھا کہ مجموعی حیثیت سے برطانوی حکومت رعایا کے لئے مفید ہے۔

رنگ اور نسل کا جو تعصب مجھے جنوبی افریقہ میں نظر آیا اسے میں برطانوی روایات کے منافی سمجھتا تھا اور مجھے یقین تھا کہ یہ محض مقامی اور عارضی چیز ہے اس لئے میں تاج برطانیہ کی وفاداری میں انگریزوں سے بازی لے جانے کی کوشش کرتا تھا۔ میں نے بڑی محنت سے نیشنل انتہیم کاراگ سیکھا اور جب کبھی یہ گیت گایا جاتا تھا میں بھی ساتھ دیتا تھا۔ بغیر تصنع اور نمائش کے وفاداری کے اظہار کا جو موقع ملتا تھا میں اس میں ضرور شرکت کرتا تھا۔

میں نے ساری عمر میں اس وفاداری سے کوئی فائدہ نہیں اٹھایا۔ کبھی اس کی بدولت اپنے ذاتی اغراض پورے کرنے کی کوشش نہیں کی۔ یہ میرے لئے ایک فرض سا تھا اور میں بغیر کسی معاوضے کے اسے انجام دیتا تھا۔

جب میں ہندوستان پہنچا تو یہاں ملکہ وکٹوریہ کی جوہلی منانے کی تیاریاں ہو رہی تھیں۔ راجکوٹ میں جو کمیٹی اس مقصد کے لئے بنائی گئی تھی مجھے اس میں شرکت کی دعوت دی گئی۔ میں

نے یہ دعوت قبول کر لی مگر مجھے یہ شبہہ تھا کہ اس جشن میں زیادہ تر نمائش سے کام لیا جائے گا۔ اس میں بہت ریاکاری نظر آئی جس سے مجھے بڑا دکھ ہوا۔ میں اس بہت پر غور کرتا رہا کہ مجھے کمیٹی میں رہنا چاہئے یا نہیں۔ آخر میں نے یہ فیصلہ کیا کہ مجھے اپنے حصے کا کام ایمانداری سے انجام دینے پر کفایت کرنا چاہئے۔

ایک تجویز یہ تھی کہ درخت لگائے جائیں۔ میں نے دیکھا کہ بہت سے لوگ دکھاوے کی خاطر اور افسروں کو خوش کرنے کے لئے ایسا کرتے ہیں۔ میں نے ان لوگوں کو سمجھایا کہ کوئی شخص درخت لگانے پر مجبور نہیں کیا گیا ہے۔ یہ محض ایک فرمائش ہے اگر یہ پوری کی جائے تو اچھی طرح کرنا چاہئے ورنہ تماشے سے کیا فائدہ۔ جہاں تک مجھے یاد ہے لوگ میرے ان خیالات پر ہنستے تھے۔ میں نے اپنے حصے کا درخت اسی طرح لگایا جیسے لگانا چاہئے اور بڑی محنت سے اس میں پانی دیتا رہا اور اس کی نگرانی کرتا رہا۔

میں نے نیشنل انتھیم اپنے گھر کے بچوں کو بھی یاد کرا دیا مجھے یاد ہے کہ میں نے یہ گیت راجکوٹ ٹریننگ اسکول کے طالب علموں کو بھی سکھایا تھا مگر یہ خیال نہیں کہ یہ جوہلی کا واقعہ ہے یا ایڈورڈسٹم کی تاجپوشی کے زمانے کا۔ آگے چل کر اس کے الفاظ میرے کانوں کو ناگوار ہونے لگے جوں جوں میرا "ہمسا" کا تصور پختہ ہوتا گیا میری احتیاط اپنے خیالات اور الفاظ کے بارے میں بڑھتی گئی۔ انتھیم کا یہ شعر۔

خدا اس کے دشمنوں کو منتشر
اور ہلاک کر دے۔

ان کی سیاست الٹ پلٹ ہو جائے
اور ان کی مفسدانہ سازشیں ناکام رہیں

خاص طور پر میرے جذبہ "اہما" کے منافی تھے۔ میں نے اپنا یہ خیال ڈاکٹر بوتھ سے ظاہر کیا۔ انہوں نے میری رائے سے اتفاق کیا کہ جو شخص "اہما" کا قائل ہے اسے الفاظ اپنی زبان سے ادا نہیں کرنا چاہئیں۔ یہ کیسے فرض کیا جاسکتا ہے کہ بادشاہ کے "دشمن" ہمیشہ "مضد" ہوتے ہیں؟ اور یہ کیا ضروری ہے کہ بادشاہ ہمیشہ حق پر ہو اور اس کے دشمن ناحق پر ہوں؟ ہم خدا سے صرف دعا کر سکتے ہیں کہ حقدار کا ساتھ دے۔ ڈاکٹر بوتھ نے میرے خیالات کی تصدیق کی اور اپنی جماعت کے لئے ایک نیا انتھیم تصنیف کیا۔ ان بزرگ کا ذکر آگے آئے گا۔

جس طرح وفاداری میری سرشت میں تھی اسی طرح تیمارداری کا بھی مجھے فطری ملکہ تھا۔ مجھے لوگوں کی تیمارداری کا شوق تھا خواہ وہ دوست ہوں یا دشمن ہوں۔

جن دنوں میں راجکوٹ میں جنوبی افریقہ کے پمفلٹ لکھنے میں مشغول تھا مجھے ایک آدھ روز کے لئے بمبئی جانے کا اتفاق ہوا۔ میرا یہ قصد تھا کہ سب شہروں میں جلسے کر کے لوگوں کو جنوبی افریقہ کے حالات سے واقف کروں اور ابتدا میں نے بمبئی سے کی۔ سب سے پہلے میں جنس راناڈے سے ملا۔ انہوں نے میری گفتگو غور سے سنی اور مجھے سرفیروز شاہ مہتا سے ملنے کی ہدایت کی۔ اس کے بعد میں جنس طیب جی سے ملا۔ انہوں نے بھی یہی مشورہ دیا۔ انہوں نے کہا ”مجھ سے اور جنس راناڈے سے بہت کچھ مل سکتی ہے۔ آپ کو ہماری حالت معلوم ہے ہم قومی معاملات میں عملی حصہ نہیں لے سکتے لیکن ہمیں آپ سے ہمدردی ضرور ہے۔ آپ کی پوری رہنمائی صرف ایک شخص کر سکتا ہے اور وہ سرفیروز شاہ مہتا ہیں۔“

میں خود سرفیروز شاہ مہتا سے ملنا چاہتا تھا لیکن جب ان بزرگوں نے مجھے ان کے مشورے پر عمل کرنے کی رائے دی تب مجھے پورا اندازہ ہوا کہ سرفیروز شاہ مہتا کا پبلک میں کتنا اثر ہے۔ کچھ دن کے بعد میں ان کے پاس حاضر ہوا۔ میرا خیال تھا کہ جب میں ان کے سامنے جاؤں گا تو مجھ پر رعب طاری ہو جائے گا۔ ان کو پبلک نے جو خطبات دیئے تھے وہ میں سن چکا تھا۔ مجھے معلوم تھا کہ میں ”شیر بمبئی“ ”اعلمہ بمبئی“ کے بے تاج بادشاہ کی ملاقات کے لئے جا رہا ہوں۔ مگر بادشاہ نے مجھے اپنے جاہ و جلال سے مرغوب نہیں کیا۔ وہ مجھ سے اس طرح پیش آئے جیسے باپ بیٹے سے ملتا ہے۔ یہ ملاقات ان کے دفتر میں ہوئی۔ وہ اپنے دوستوں اور پیروں کے حلقے میں بیٹھے ہوئے تھے ان میں مسز ڈی اے واپا اور مسز کما بھی تھے جن سے میرا تعارف کرایا گیا۔ میں مسز واپا کا ذکر پہلے سن چکا تھا۔ یہ سرفیروز شاہ مہتا کے دست راست سمجھے جاتے تھے اور ویر چند جی گاندھی نے مجھ سے کہا تھا کہ یہ اعداد و شمار کے بڑے ماہر ہیں۔ مسز واپا نے کہا ”گاندھی جی مجھ سے پھر ضرور ملے گا۔“

اس تعارف میں دو منٹ سے زیادہ نہیں لگے۔ اس کے بعد میں نے اپنا مدعا بیان کیا جسے سرفیروز شاہ غور سے سنتے رہے۔ میں نے ان سے کہا میں جنس راناڈے اور جنس طیب جی سے مل چکا ہوں۔ آخر انہوں نے کہا ”گاندھی میں سمجھتا ہوں کہ مجھے تمہاری ضرور مدد کرنا چاہئے مجھے یہاں جلسہ کرنا پڑے گا۔“ پھر اپنے سیکرٹری مسز منشی کی طرف مخاطب ہو کر انہوں نے جلسے کی تاریخ مقرر کرنے کا حکم دیا۔ تاریخ طے ہو گئی اور انہوں نے مجھے یہ کہہ کر رخصت کر دیا کہ جلسے سے ایک

روز پہلے میرے پاس پھر آنا۔ میرے دل میں جو کھٹکا تھا وہ اس ملاقت سے جاتا رہا اور میں خوش خوش گھر لوٹ آیا۔

بھئی کے قیام کے زمانے میں میں اپنے بہنوئی سے ملنے گیا جو یہاں علاج کے لئے آئے ہوئے تھے۔ وہ کوئی خوشحال آدمی نہیں تھے۔ ان کی تیمارداری کرنا میری بہن کے بس کی بات نہیں تھی۔ ان کی طبیعت زیادہ خراب تھی اس لئے میں نے ان سے کہا کہ آپ میرے ساتھ راجکوٹ چلئے۔ وہ اس پر آمادہ ہو گئے اور میں انہیں اور بہن کو ساتھ لے آیا۔ ان کی علالت نے توقع سے زیادہ طول کھینچا۔ میں نے انہیں اپنے کمرے میں ٹھہرایا اور رات دن ان کے پاس رہتا تھا۔ مجھے رات کو دیر تک جاگنا پڑتا تھا اور اسی تیمارداری کے دوران میں جنوبی افریقہ کا کام بھی کرنا پڑتا تھا۔ آخر میں مریض کا انتقال ہو گیا مگر مجھے اس خیال سے بڑی تسکین ہوئی کہ مجھے آخری وقت میں ان کی خدمت کا موقع مل گیا۔

مجھے تیمارداری سے جو مناسبت تھی اس نے رفتہ رفتہ انتہائی اہمناک کی صورت اختیار کر لی۔ یہاں تک کہ اکثر میں اس کی وجہ سے اپنے کام میں غفلت کرنے لگا اور کبھی کبھی میں اپنی بیوی بلکہ سارے گھر کو اس خدمت میں اپنے ساتھ کھینچ لیتا تھا۔

ایسی خدمت اسی وقت کچھ معنی رکھتی ہے کہ انسان کو اس میں لطف آئے۔ اگر یہ محض دکھاوے کے لئے یا عام رائے کے ڈر سے کی جائے تو یہ انسان کی نشوونما کو روکتی ہے اور اس کی روح کو کپیل ڈالتی ہے۔ وہ خدمت جس میں خوشی نہ ہو خادم کے کام آتی ہے نہ مخدوم کے۔ لیکن دلی مسرت کے ساتھ جو خدمت کی جائے اس کے آگے دنیا کی ساری راحت وہ دولت بچ ہے۔

حوالہ

1 - برطانیہ کا قومی کبیت جس میں بادشاہ کی سلامتی کی دعا مانگی جاتی ہے

بہمنی کا سفر

جس دن میرے بہنوئی کا انتقال ہوا اسی دن مجھے جلسے میں شریک ہونے کے لئے بہمنی جانا پڑا۔ مجھے اپنی تقریر تیار کرنے کا بالکل موقع نہیں ملا تھا۔ فکر و تردد کی حالت میں رات دن جاگنے میں پست ہو گیا تھا اور میری آواز بھر آگئی تھی۔ بہر حال میں خدا پر بھروسہ کر کے بہمنی روانہ ہو گیا۔ مجھے یہ خیال بھی نہیں آسکتا تھا کہ اپنی تقریر لکھ ڈالوں۔

سرفیروز شاہ کی ہدایت کے مطابق میں جلسے سے ایک دن پہلے شام کو پانچ بجے ان کے دفتر میں پہنچ گیا۔ انہوں نے پوچھا ”کہو گاندھی تمہاری تقریر تو تیار ہے نا؟“

میں نے ڈر سے کانپتے ہوئے کہا ”جی نہیں، میرا ارادہ دقت کی دقت تقریر کرنے کا ہے۔“ بہمنی میں اس طرح کام نہیں چلے گا۔ یہاں تقریروں کی رپورٹ بہت ناقص ہوتی ہے۔ اگر اس جلسے سے فائدہ اٹھانا ہے تو اپنی تقریر لکھ ڈالو اور وہ کل دن نکلنے سے پہلے چھپ کر تیار بھی ہو جائے۔ تم اس کا انتظام کر لو گے؟“

میں بہت سٹ پٹایا مگر میں نے کہا میں کوشش کروں گا۔

”اچھا تو منشی تمہارے پاس مسودہ لینے کے لئے کب آئیں؟“

میں نے کہا ”آج رات کو گیارہ بجے۔“

دوسرے دن جلسے میں پہنچ کر مجھے معلوم ہوا کہ سرفیروز شاہ کی ہدایت کیا مصلحت تھی۔ جلسہ سر کاؤس جی جہانگیر انسٹی ٹیوٹ کے ہال میں تھا۔ میں نے سنا تھا کہ جب سرفیروز شاہ مہتا کسی جلسے میں تقریر کرتے ہیں تو ہال کچا کچ بھرا رہتا ہے۔ خصوصاً طالب علم ان کی اسپچ سننے کے شوق میں بڑی

کثرت سے آتے ہیں۔ مجھے ایسے جلسے میں شریک ہونے کا پہلا اتفاق تھا۔ میں نے دیکھا کہ میری آواز کسی کو نہیں سنائی دیتی جب میں نے اپنی تقریر پڑھنا شروع کی تو میں کانپ رہا تھا۔ سرفیروز شاہ میری ہمت بڑھانے کے لئے بلڈ بار فرمائش کرتے تھے کہ آواز کو اور بلند کرو مگر مجھ پر اس کا اثر اٹا ہوا اور میری آواز اور گرتی گئی۔

میرے پرانے دوست کیشوراؤ جی دیشپانڈے میری مدد کے لئے اٹھے میں نے اپنی تقریر ان کے حوالے کر دی۔ ان کی آواز ایسے جلسے کے لئے بہت موزوں تھی مگر حاضرین کو اس سے تسکین نہیں ہوئی۔ ہر طرف سے ”واچا“ ”واچا“ کا شور اٹھا جس سے سارا ہال گونج گیا۔ اس لئے مسٹر واپا نے کھڑے ہو کر وہ تقریر پڑھی اور اس کا حیرت انگیز اثر ہوا۔ لوگ بالکل خاموش ہو گئے اور آخر تک بڑے غور سے سنتے رہے بیچ بیچ میں وہ تحسین کے اور جہاں نفریں کا موقع تھا ”شرم، شرم“ کے نعرے بلند کرتے جاتے تھے مجھے اس سے دلی مسرت ہو رہی تھی۔

سرفیروز شاہ کو یہ تقریر پسند آئی۔ میں خوشی کے مارے پھولانہ سماتا تھا۔ اس جلسے کی بدولت دیشپانڈے جی اور ایک پارسی دوست (جن کا نام بتانے میں مجھے تامل ہے کیونکہ وہ آج کل سرکاری ملازمت میں بڑے عہدے پر ممتاز ہیں) میرے عملی بہمدرد بن گئے۔ دونوں نے میرے ساتھ جنوبی افریقہ جانے پر آمادگی ظاہر کی مگر پارسی دوست کو مسٹر سی ایم کر سیٹ جی نے جو اس زمانے میں عدالت خفیہ کے جج تھے اس ارادے سے ہٹایا کیونکہ انہوں نے ان کے لئے شادی کا لاساٹا رکھا تھا۔ اب وہ یا تو شادی کرتے یا جنوبی افریقہ جاتے۔ انہوں نے شادی کو ترجیح دی۔ مگر ان کی عہد شکنی کی تلافی پارسی رستم جی نے کر دی اور ان کی بیوی کی اعانت جرم کی تلافی میں آج بہت سی پارسی بہنیں کھدر کا کام کر رہی ہیں اس لئے میں نے ان میاں بیوی کا تصور سچے دل سے معاف کر دیا۔ دیشپانڈے جی کو شادی کا لالچ نہ تھا مگر وہ بھی نہ جاسکے۔ آج وہ خود اپنی عہد شکنی کی اچھی طرح تلافی کر رہے ہیں۔ جنوبی افریقہ واپس جاتے ہوئے مجھے زنجبار میں طیب جی کے خاندان کے ایک رکن ملے تھے اور انہوں نے بھی میوٹیٹو کے لئے آنے کا وعدہ کیا تھا مگر نہیں آئے ان کے جرم کا کفارہ عباس طیب جی ادا کر رہے ہیں غرض میں نے عین بیرسٹروں کو جنوبی افریقہ لے جانے کی کوشش کی مگر کوئی کامیابی نہیں ہوئی۔

اس سلسلے میں پستونجی پادشاہ یاد آگئے۔ مجھ سے ان سے قیام انگلستان کے زمانے میں دوستانہ مراسم تھے۔ پہلی ملاقات ان سے لندن میں ایک باتائی ریستوران میں ہوئی تھی۔ میں نے ان کے

بھائی مسٹر برور جی پادشاہ کے متعلق سنا تھا کہ وہ خنطی ہیں۔ میں ان سے کبھی نہیں ملا تھا مگر لوگ انہیں مراتی کہتے تھے وہ گھوڑوں کی نرام پر نہیں بیٹھتے تھے کیونکہ انہیں غریب جانوروں پر رحم آتا تھا۔ باوجود غیر معمولی حافطے کے انہوں نے ڈگریاں لینے سے انکار کر دیا تھا۔ وہ اپنے خیالات میں کسی کے پابند نہ تھے اور باوجود پارسی ہونے کے نباتاتی تھے۔ پستونجی کو یہ شہرت تو نصیب نہ تھی مگر ان کی علمیت کالندن تک چرچا تھا۔ مجھ میں اور ان میں صرف نباتاتی مسلک کا رابطہ تھا اور نہ علم و فضل میں تو میں ان کی گرد کو بھی نہیں پہنچتا تھا۔

میں نے انہیں بمبئی میں ڈھونڈھ نکالا۔ وہ ہائیکورٹ میں سر دفتر تھے۔ ان دنوں وہ اعلیٰ گجراتی لغت کا ایک حصہ تیار کرنے میں مصروف تھے۔ جنوبی افریقہ کے کام میں مدد مانگنے کے سلسلے میں میں نے اپنے کسی دوست کو نہیں چھوڑا تھا چنانچہ میں نے پستونجی پادشاہ سے بھی اس کا ذکر کیا مگر انہوں نے نہ صرف میری مدد سے انکار کیا مجھے بھی نصیحت کی کہ جنوبی افریقہ نہ جاؤں۔

انہوں نے کہا ”میں تمہاری کوئی مدد نہیں کر سکتا بلکہ سچ پوچھو تو میں خود تمہارے جنوبی افریقہ جانے کو بھی پسند نہیں کرتا۔ کیا ہمارے ملک میں کام کی کمی ہے۔ ذرا دیکھو تو ہمیں اپنی زبان ہی کی ترقی کے لئے ابھی کتنا کچھ کرنا ہے۔ میرے سپرد علمی اصلاحیں تلاش کرنے کا کام ہے۔ یہ کل کام کی محض اک ذرا سی شاخ ہے۔ اپنے ملک کے افلاس پر غور کرو۔ یہ سچ ہے کہ جنوبی افریقہ میں ہمارے ہم وطن مصیبت میں ہیں۔ مگر مجھے یہ گوارا نہیں کہ تمہارے جیسا آدمی اس کام کے لئے قربان کیا جائے پہلے ہمیں یہاں آزادی حاصل کرنے دو اس سے وہاں ہمارے ہم وطنوں کو خود بخود مدد پہنچے گی۔ میں جانتا ہوں کہ تم میری بات نہیں مانو گے مگر مجھ سے یہ توقع نہ رکھو کہ تمہارے جیسے کسی شخص کو تمہارا ساتھ دینے کی رائے دوں گا۔“

مجھے یہ مشورہ پسند نہیں آیا مگر اس کی وجہ سے میرے دل میں مسٹر پستونجی پادشاہ کا احترام اور بڑھ گیا۔ مجھ پر اس محبت کا بہت اثر ہوا جو انہیں اپنے ملک سے اور اپنی زبان سے تھی۔ اس واقعے کے بعد میرا ان کا دلی رابطہ اور بڑھ گیا۔ میں ان کے نقطہ نظر کو اچھی طرح سمجھتا تھا مگر بجائے اس کے کہ میں اپنے جنوبی افریقہ کے ارادے کو ترک کر تا میرا ارادہ اور مضبوط ہو گیا۔ ایک محب وطن کو مادر وطن کی کسی خدمت سے منہ نہ موڑنا چاہئے اور میرے لئے گیتا کا صریحی اور تاکید حکم کافی تھا۔

آخر میں یہ بہتر ہے کہ آدمی جیسے بھی بن پڑے اپنا کام انجام دے چاہے پھر اس میں ناکام ہی

ہو، بہ نسبت اس کے کہ پرانے کام اپنے ذمے لے، چاہے وہ کیسے ہی اچھے معلوم ہوں۔
اپنا فرض انجام دیتے ہوئے مرجانا کوئی عیب نہیں لیکن جو دوسری راہیں تلاش کرتا ہے وہ
ہمیشہ مارا مارا پھرتا ہے۔

پونا اور مدراس

سرفیروز شاہ نے میرا کام بہت آسان کر دیا۔ بمبئی سے میں پونا پہنچا۔ یہاں دو پارٹیاں تھیں۔ میں ہر خیال کے لوگوں کی مدد چاہتا تھا پہلے میں لوکمانیہ تلک سے ملا۔ انہوں نے کہا۔

”آپ کی یہ رائے بالکل صحیح کہ ہر پارٹی سے مدد لینا چاہئے جنوبی افریقہ کے معاملے میں کسی اختلاف رائے کی گنجائش نہیں۔ مگر یہ بہت ضروری ہے کہ آپ صدر کسی ایسے شخص کو بنائیں جو کسی پارٹی میں نہ ہو۔ آپ پروفیسر بھنڈار کر کو لیں۔ انہوں نے کچھ دن سے پبلک معاملات میں حصہ لینا چھوڑ دیا ہے مگر ممکن ہے کہ وہ اس مسئلے پر اظہار خیال کریں، آپ ان سے ملئے اور وہ جو کچھ کہیں اس کی مجھے اطلاع دیجئے۔ میں آپ کی پوری پوری مدد کرنا چاہتا ہوں۔ آپ کا جب جی چاہے میرے پاس آئے مجھے کسی دقت آپ سے ملنے میں تامل نہ ہوگا۔“

مجھے لوکمانیہ سے ملنے کا یہ پہلا اتفاق تھا۔ میری سمجھ میں آ گیا کہ ان کی غیر معمولی ہردلعزیزی کا کیا راز ہے؟۔

اس کے بعد میں گو کھلے کے پاس گیا، فرگوسن کالج کے احاطہ میں ان سے ملاقات ہوئی انہوں نے بڑی محبت سے میرا استقبال کیا اور ان کے اخلاق نے میرے دل کو تسخیر کر لیا۔ ان سے بھی میں پہلی بار ملا تھا مگر ایسا معلوم ہوا جیسے مدتوں کے پچھڑے ہوئے دوست ملے ہوں۔ سرفیروز شاہ میری نظر میں بہالیہ کی طرح تھے اور لوکمانیہ سمندر کی طرح۔ مگر گو کھلے گنگا کی مانند تھے۔ اس پاک دریا میں آدمی جی کھول کر نہا سکتا تھا۔

بہالیہ پر چڑھنا محال تھا اور سمندر میں کشتی لے جانا دشوار مگر گنگا کو دیکھتا ہیلائے اپنی طرف بلاتی تھی۔ اس میں کشتی بجانے سے روحانی مسرت ہوئی تھی۔ گو کھلے نے مجھ سے کھود کھود کر سوال کئے جیسے

اسکول کے داخلے کے وقت استاد طالب علم کا امتحان لیتا ہے۔ انہوں نے بتایا کہ مجھے کن لوگوں کے پاس جانا چاہئے اور ان سے کیونکر ملنا چاہیے۔ انہوں نے بے تکلفی سے میری اسپینچ مانگ کر پڑھی اور مجھے کالج کی سیر کرائی مجھ سے کہنے لگے کہ تمہارا جب جی چاہے مجھ سے ملو۔ میں ہر وقت حاضر ہوں اور چلتے وقت تاکید کر دی کہ ڈاکٹر بھنڈار کی ملاقات کا جو نتیجہ ہو مجھے ضرور بتانا۔ میں ان کے پاس سے اٹھا تو میرا دل خوشی سے معمور تھا۔ سیاسی لوگوں میں سے میرے دل کو جو تعلق کو کھلے سے ان کی زندگی میں تھا اور اب تک ہے وہ اور کسی سے نہیں۔

ڈاکٹر بھنڈار کو میرے ساتھ پدزانه شفقت سے پیش آئے۔ میں جب ان کے پاس پہنچا تو دوپہر کا وقت تھا اس عالم مرتاض پر اس بات کا بڑا اثر ہوا کہ میں ایسی دھوپ میں لوگوں سے ملتا پھرتا تھا۔ میری یہ تجویز کہ جلسے کا صدر ایسا شخص ہو جو کسی پارٹی میں نہ ہو انہیں بہت پسند آئی اور وہ بے اختیار چلا اٹھے

”بالکل ٹھیک، بالکل ٹھیک“

جب میں اپنی داستان سنا چکا تو انہوں نے کہا ”تم جس سے پوچھو گے وہ کہہ دے گا کہ میں سیاست میں حصہ نہیں لیتا مگر تم سے میں عذر نہیں کر سکتا۔ تمہارا کام استناہم ہے اور تمہاری محنت اس قدر قابل تعریف ہے کہ مجھے تمہارے جلسے میں شریک ہونے سے انکار نہیں ہو سکتا۔ تم نے بہت اچھا کیا کہ تلک اور گو کھلے سے مشورہ کر لیا۔ اگر تکلیف نہ ہو تو ان سے جا کر کہہ دینا کہ میں بہت خوشی سے دونوں انجمنوں کے منحدہ جلسے میں صدارت کروں گا۔ جلسے کا وقت مجھ سے مقرر کرانے کی ضرورت نہیں۔ ان کے لئے جو وقت مناسب ہو وہ مجھے منظور ہے۔ یہ کہہ کر انہوں نے مجھے مبارک باد دی اور بزرگانہ دعاؤں کے ساتھ رخصت کر دیا۔“

پونا کے ان بے نفس عالموں نے بغیر کسی تکلف اور نمائش کے ایک چھوٹا سا جلسہ کیا جن سے مجھے بڑی خوشی ہوئی اور اپنے مشن کی کامیابی کا یقین ہو گیا۔

اس کے بعد میں مدراس گیا۔ یہاں لوگوں میں بے حد جوش تھا جلسے کے حاضرین پر بلا سدرم کے واقعے کا بڑا اثر ہوا۔ میری تقریر چھپی ہوئی تھی اور میرے اندازہ میں خاصی طویل تھی۔ مگر حاضرین ایک ایک لفظ کو غور سے سنتے رہے جب جلسہ ختم ہوا تو لوگ ”سبز پمفلٹ“ پر ٹوٹ پڑے۔ میں نے اس پر نظر ثانی کرنے کے بعد دوبارہ دس ہزار چھپوایا۔ اس کی بکری خوب ہوئی مگر مجھے معلوم ہوا کہ اتنی تعداد میں چھپوانے کی ضرورت نہ تھی۔ میں نے اپنے جوش میں مانگ کا انداز بہت زیادہ کیا تھا۔ میری تقریر کے مخاطب صرف انگریزی خواں تھے اور مدارس میں اس طبقے کے لوگوں میں دس ہزار نسخے نہیں کھپ

سکتے تھے۔

یہاں سب سے زیادہ مدد مجھے آنجہانی جی پریشورن پلے ایڈیٹر مدراس اسٹینڈرڈ سے ملی۔ انہوں نے اس مسئلے پر بہت اچھی طرح غور کیا تھا اور اکثر مجھے اپنے دفتر میں بلا کر ہدایتیں دیا کرتے تھے جی سبر اینیم ایڈیٹر ہندو اور ڈاکٹر نیر اینیم نے بھی مجھ سے بڑی ہمدردی کا اظہار کیا لیکن پریشورن جی نے تو مدراس اسٹینڈرڈ کے کالم میرے لئے وقف کر دیئے اور میں ان کی عنایت سے اکثر فائدہ اٹھاتا تھا۔ پاجتپال ہال کا جلسہ جہاں تک مجھے یاد ہے ڈاکٹر سبر اینیم کی صدارت میں ہوا تھا۔ اکثر دوستوں نے میرے ساتھ اس قدر محبت کا برتاؤ کیا اور میرے کام میں اتنا جوش اور انہماک ظاہر کیا کہ ہر چند میری ان کی بات چیت انگریزی میں ہوتی تھی مگر میں ان سے بالکل بے تکلف ہو گیا تھا۔ ایسا کونسا مجاب ہے جسے محبت دور نہ کر سکے۔

”جلد واپس آؤ“

مدراس سے میں کلکتہ گیا۔ یہاں مجھے بڑی دقت کا سامنا ہوا۔ کیونکہ میں اس شہر میں کسی کو نہیں جانتا تھا۔ میں نے گریٹ ایسٹرن ہوٹل میں ایک کمرہ کرایہ پر لے لیا۔ یہاں مسٹرایلر تھورپ سے ملاقات ہوئی جو ڈیلی ٹیلی گراف کے نمائندے تھے۔ وہ بنگال کلب میں ٹھہرے ہوئے تھے اور انہوں نے مجھے وہاں ملنے کے لئے بلایا۔ انہیں اس دقت تک معلوم نہ تھا کہ کلب کے ڈرائنگ روم میں ہندوستانیوں کو لیجانے کی ممانعت ہے۔ جب انہیں اس کی اطلاع ہوئی تو مجھے اپنے کمرے میں لے گئے۔ انہوں نے مقامی انگریزوں کے اس تعصب پر اظہارِ افسوس کیا اور مجھ سے معافی مانگ کے مجھے ڈرائنگ روم میں لیجا کر نہ بٹھا سکے۔

ظاہر ہے کہ مجھے سب سے پہلے ”بنگال کے دیوتا“ سر سید رناتھ بڑجی سے ملنا تھا۔ جب میں ان کے پاس پہنچا تو وہ دوستوں کے حلقے میں بیٹھے ہوئے تھے۔ میری درخواست سن کر کہنے لگے۔

”مجھے اندیشہ ہے کہ یہاں کے لوگوں کو آپ کے کام سے دلچسپی نہ ہوگی۔ آپ کو معلوم ہے کہ ہم لوگ کسی مشکلوں میں گھرے ہوئے ہیں مگر آپ اپنی طرف سے پوری کوشش کیجئے۔ آپ کو مہاراجوں کی بہمدردی حاصل کرنا ہوگی۔ برٹش انڈین ایسوسی ایشن کے نمائندے سے ضروری ملے۔ راجا سر پیارے موہن مکرجی اور مہاراجا نگور کے پاس جائیے یہ دونوں آزاد خیال ہیں اور پبلک کاموں میں خاصی دلچسپی لیتے ہیں۔“

میں ان حضرات سے ملا کوئی کامیابی نہیں ہوئی۔ دونوں مجھ سے سرد مہری سے پیش آئے انہوں نے کہا کلکتہ میں پبلک جلسہ کرنا بہت مشکل ہے۔ ہاں اگر کچھ ہو سکتا ہے تو سریندر ناتھ بڑجی کی کوشش سے ہو سکتا ہے۔

مجھے یہ محسوس ہوا کہ میرے کام میں نئی نئی دقتیں پیدا ہوتی جاتی ہیں۔ میں امرت بازار پتر کا کے دفتر گیا۔ جو حضرات وہاں ملے وہ مجھے یہ سمجھے کہ یہ کوئی آفاقی ہے۔ یونہی مارا مارا پھرا کرتا ہے۔ بنگباسی والے ان سے بھی بڑھ گئے۔ اس کے اڈیٹر نے مجھے ایک گھنٹہ انتظار میں رکھا۔ یہ میں بھی دیکھ رہا تھا کہ ان سے ملنے کے لئے بہت سے لوگ کھڑے ہیں۔ مگر ان سب کو نپٹانے کے بعد بھی انہوں نے میری طرف آنکھ اٹھا کر نہ دیکھا۔ میں انتظار کرتے کرتے تھک گیا تھا۔ اس لئے میں نے جرات کر کے خود گفتگو شروع کی۔ انہوں نے کہا ”تم دیکھتے نہیں کہ میں مصروف ہوں۔ تمہارے جیسے لوگ صبح سے شام تک سینکڑوں آیا کرتے ہیں۔ بہتر ہے کہ تم یہاں سے چل دو مجھے تمہاری باتیں سننے کی فرصت نہیں۔“

پہلے تو مجھے بڑا غصہ آیا مگر فوراً ہی یہ احساس ہوا کہ اڈیٹر کی دقتوں کو بھی تو دیکھنا چاہئے۔ میں نے بنگباسی کی شہرت سنی تھی اور اپنی آنکھوں سے دیکھ لیا تھا کہ ہر وقت آنے والوں کا تانتا لگا رہتا ہے اور یہ لوگ سب وہ تھے جن سے اڈیٹر سے واقفیت تھی۔ ان کے اخبار کے لئے مضامین کی کمی نہ تھی اور جنوبی افریقہ کو اس زمانے میں کوئی جانتا بھی نہ تھا۔

جو شخص اڈیٹر کے پاس کوئی شکایت لے کر جاتا ہے اسے اپنا معاملہ کتنا ہی اہم کیوں نہ معلوم ہو اڈیٹر کے نزدیک تو وہ ان بے شمار لوگوں میں سے ایک ہے جو اپنی اپنی شکایتیں لے کر اس کے دفتر پر ٹوٹ پڑتے ہیں۔ غریب اڈیٹر کس کس کی حاجت روائی کرے۔ اس کے علاوہ غرض مند یہ سمجھتے ہیں کہ اڈیٹر کا ملک میں بڑا اثر ہے مگر یہ اسی کا دل جانتا ہے کہ اس کا اثر جو کچھ ہے اخبار کے دفتر کیلئے کر رہے باہر کچھ بھی نہیں۔ میں اور اخباروں کے ایڈیٹروں سے بھی ملتا رہا۔ حسب معمول ایٹلو انڈین ایڈیٹروں کے یہاں بھی گیا۔ اسٹین مین اور انگلش مین نے اس مسئلے کی اہمیت محسوس کی۔ میں نے ان سے اس کے متعلق طویل گفتگو کی اور انہوں نے یہ پوری گفتگو چھاپ دی۔ انگلش مین کے ایڈیٹر مسٹر سانڈرس نے مجھے اپنی حمایت میں لے لیا۔ انہوں نے اپنا اخبار اور اپنا دفتر میرے لئے وقف کر دیا بلکہ یہاں تک کیا کہ اس مسئلے پر جو مقالہ افتتاحیہ لکھا تھا اس کے پر دے میرے پاس بھیج دیئے اور مجھے اجازت دیدی کہ اس میں حسب دلخواہ تغیر تبدیل کر دوں۔ اگر میں یہ کہوں کہ ان میں اور مجھ میں دوستی ہو گئی تو کچھ مبالغہ نہ ہو گا۔ انہوں نے مجھے حتی الامکان مدد دینے کا وعدہ کیا اور اس وعدے کو حرف بہ حرف پورا کیا۔ اس کے بعد بھی مجھ سے ان سے بہت دن تک خط و کتابت ہوتی رہی مگر ان کی شدید علالت کے بعد یہ سلسلہ موقوف ہو گیا۔

میری زندگی میں خوش قسمتی سے یہ اکثر ہوا ہے کہ لوگوں سے خود بخود دوستی ہو گئی جس کی کوئی توقع نہ تھی۔ مسٹر سانڈرس کو میرا سچ بولنا اور مبالغے سے پرہیز کرنا بہت پسند آیا۔ میرے کام سے ہمدردی کرنے سے پہلے انہوں نے مجھ سے کھود کھود کر سوالات کئے اور انہیں یہ یقین ہو گیا کہ میں ان کے سامنے جنوبی افریقہ کے حالات سچائی سے بیان کرنے میں یہاں تک کہ یورپیوں کے نقطہ نظر کو پیش کرنے میں بھی اپنی طرف سے کوئی دقیقہ نہیں اٹھا رکھا۔ انہوں نے یہ بھی دیکھا کہ میں یورپیوں کے جائز مطالبات کی قدر کرتا ہوں۔

مجھے تجربے سے یہ معلوم ہوا کہ دوسروں سے انصاف چاہنے کا سب سے زود اثر طریقہ یہ ہے کہ آدمی خود دوسروں کے ساتھ انصاف کرے۔

مسٹر سانڈرس کی غیر متوقع مدد سے مجھے یہ امید ہو چلی تھی کہ کوئی تعجب نہیں۔ کلکتے میں بھی جلسہ کرنے کی کوئی صورت نکل آئے کہ میرے پاس ڈربن سے یہ تار پہنچا۔

”پارلیمنٹ کا اجلاس جنوری سے شروع ہے فوراً واپس آؤ۔“

اس لئے میں نے ایک خط کے ذریعہ سے اخباروں کو اطلاع دی کہ ان ان وجہ سے اس قدر جلد کلکتے سے چلے جانے پر مجبور ہوں اور بمبئی روانہ ہو گیا۔ روانگی سے پہلے میں نے بمبئی میں دادا عبداللہ کمپنی کے ایجنٹ کو تار دیا کہ جو پہلا جہاز جنوبی افریقہ جاتا ہو اس کا ٹکٹ میرے لئے خریدے۔ دادا عبداللہ نے اسی زمانے میں مسافر جہاز ”کورلینڈ“ نیا نیا خریدا تھا انہوں نے بہت اصرار کیا کہ اسی جہاز سے چلو میں تمہیں اور تمہارے خاندان کو مفت میں پہنچا دوں گا۔ میں نے ان کی دعوت شکرے کے ساتھ قبول کر لی۔ اور شروع دسمبر میں اپنی بیوی دونوں لڑکوں اور اپنی بیوہ بہن کے اکلوتے لڑکے کو ساتھ لے کر دوبارہ جنوبی افریقہ روانہ ہو گیا۔ ہمارے جہاز کے ساتھ ایک اور جہاز ”نلدیری“ بھی ڈربن جا رہا تھا۔ اس کمپنی کی ایجنسی دادا عبداللہ کمپنی کے پاس تھی۔ ان دونوں جہازوں کے مسافر آٹھ سو کے قریب ہوں گے۔ ان میں سے آدھے ٹرانسوال جا رہے تھے۔

حصہ سوم

طوفان کی گرج

میرا یہ پہلا سفر تھا جس میں بیوی بچے ساتھ تھے۔ میں اس کتاب میں کئی جگہ کہہ چکا ہوں کہ اوسط طبقہ کے ہندوؤں میں صفر سنی کی شادی کی بددلت یہ اکثر دیکھنے میں آتا ہے کہ شوہر پڑھا لکھا ہے۔ مگر اس کی بیوی قریب قریب ان پڑھ ہے۔ اس طرح یہ دونوں ایک دوسرے سے بالکل نا آشنا رہتے ہیں اور شوہر کو بیوی کا معلم بتانا پڑتا ہے چنانچہ مجھے جنوبی افریقہ جاتے وقت سب جزویات طے کرنا پڑیں کہ میری بیوی اور بچوں کو کیسے کپڑے پہنتا چاہئیں۔ کیسا کھانا کھانا چاہئے اور نئی جگہ پہنچ کر کس طرح کے آداب و معاشرت اختیار کرنا چاہئے۔ اس زمانے کی بعض باتیں یاد کر کے نہیں آتی ہے۔ ہندو بیوی آنکھ بند کر کے شوہر کی اطاعت کرنے کو اپنے دھرم کی معراج سمجھتی ہے۔ ہندو شوہر اپنے آپ کو بیوی کا مالک سمجھتا ہے اور چاہتا ہے کہ وہ ہر وقت ہاتھ باندھے سامنے کھڑی رہے۔

ان دنوں میرا یہ عقیدہ تھا کہ ہم لوگوں کو اپنے لباس اور آداب معاشرت میں جہاں تک ہو سکے یورپیوں کی تقلید کرنا چاہئے۔ تاکہ ہم مہذب معلوم ہوں۔ میں سمجھتا تھا کہ صرف اسی طریقے سے ہم تھوڑا بہت اثر پیدا کر سکتے ہیں اور بغیر اثر کے قوم کی خدمت کرنا ناممکن ہے۔

اسے نظر رکھ کر میں نے اپنی بیوی اور بچوں کے لباس کی ایک وضع معین کی۔ اس زمانے میں پارسی ہندوستانیوں میں سب سے زیادہ مہذب سمجھے جاتے تھے۔ اس لئے جب بالکل یورپی وضع اختیار کرنا مناسب معلوم ہوا تو ہم نے پارسیوں کی وضع اختیار کی۔ میری بیوی پارسیوں کی سی ساڑھی باندھنے لگیں۔ اور میرے بچے پارسی کوٹ اور پتلون پہننے لگے۔ ظاہر ہے کہ انگریزی جوتے اور نموزے تو ہر شخص کے لئے لازمی تھے۔ میری بیوی اور بچوں کو ان چیزوں کا عادی ہونے میں

بہت دیر لگی انگریزی جوتے ان کے پیر کو دباتے تھے اور موزوں میں پسینے سے بدبو آنے لگتی تھی۔ پیر کی انگلیاں اکثر سوج جاتی تھیں۔ میرے پاس ان سب اعتراضوں کے جواب تیار رہتے تھے۔ لیکن میرا خیال ہے کہ یہ جواب ان کے لئے اتنے تشفی بخش نہ تھے جتنا میرے حکم کا اثر تھا۔ وہ لباس کی وضع بدلنے پر اس لئے راضی ہو گئے کہ اس کے سوا کوئی چارہ نہ تھا۔ اسی بددلی سے انہوں نے پھری کاٹنے کا استعمال شروع کیا بلکہ یہ انہیں اور بھی زیادہ ناگوار تھا۔ جب میرا جوش ان تہذیب کی نشانیوں کے بارے میں ٹھنڈا ہو گیا تو انہوں نے پھری کاٹنے کو خیر باد کہی۔ غالباً نئی وضع کا عادی ہو جانے کے بعد انہیں اس کے چھوڑنے میں بھی اتنی ہی دلت ہوئی ہوگی۔ مگر اب میں یہ دیکھتا ہوں کہ ”تہذیب“ کا زرق برق ببادہ اتارنے سے ہماری طبیعت بہت ہلکی ہو جاتی ہے۔

جس جہاز میں ہم تھے اسی میں ہمارے بعض رشتے دار اور شناسا بھی تھے۔ میں اکثر ان سے اور تیسرے درجے کے مسافروں سے ملنے کے لئے جایا کرتا تھا۔ کیونکہ جہاز دادا عبداللہ کے دوستوں کا تھا اور میں بے تکلف جہاں جی چاہے جا سکتا تھا۔

کیونکہ جہاز بغیر درمیانی بندر گاہوں پر ٹھہرے ہوئے سیدھا نٹال جا رہا تھا۔ اس لئے ہمارا سفر صرف اٹھارہ دن کا تھا۔ مگر نٹال پہنچنے سے چار روز پہلے بڑی سخت آندھی آئی گویا اس اصلی طوفان کا پیش خیمہ تھی جس سے ہمیں جنوبی افریقہ پہنچ کر سابقہ پڑنے والا تھا۔ کہہ ارض کے جنوبی حصے میں دسمبر برسات کا مہینہ ہے اس لئے اس زمانے میں بحر جنوبی میں چھوٹی بڑی آندھیاں آیا کرتی ہیں جس آندھی کا میں ذکر کر رہا ہوں یہ اتنے زور سے آئی اور اتنے دیر تک رہی کہ مسافر ڈر گئے۔ اس دلت عجب پراثر متفر تھا۔ عام خطرے کے مقابلے میں سب ایک ہو گئے تھے۔ ہندو، مسلمان، عیسائی سب کے سب آپس کے اختلافات بھول گئے تھے اور اس خدائے واحد کو جو سب کا معبود ہے یاد کر رہے تھے۔ بعض لوگوں نے طرح طرح کی نذریں مانیں۔ کپتان بھی مسافروں کے ساتھ دعائیں شریک ہو گیا۔ اس نے ہم سب کو یقین دلایا کہ گو طوفان خطرے سے خالی نہیں ہے مگر کچھ ایسا خونخاک بھی نہیں ہے۔ اس نے کہا کہ اچھا مضبوط جہاز قریب قریب ہر طرح کے موسم کو برداشت کر سکتا ہے مگر ان لوگوں کو کسی طرح تسکین نہیں ہوئی ہر لمحے چرچاہٹ کی آواز آتی تھی جس سے یہ ڈر ہوتا تھا کہ شاید جہاز کہیں سے ٹوٹ گیا ہے یا اس میں سوراخ ہو گیا ہے بچکولوں کا یہ عالم کہ لمحہ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ جہاز اب الٹا ہی چاہتا ہے۔ ڈیک پر جانا بالکل ناممکن تھا۔ ہر شخص زبان حال سے رضا بقضاد تسلیاً لامرہ کہہ رہا تھا۔ جہاں تک مجھے یاد ہے یہ کشمکش چوبیس گھنٹے کے قریب رہی آخر

آسمان سے بادل ہٹ گئے۔ سورج نکل آیا اور کپتان نے یقین دلایا کہ طوفان گزر گیا۔ لوگوں کے چہرے خوشی سے دکنے لگے اور خطرے کے بٹے ہی زبانوں پر خدا کا نام بھی نہیں رہا، پھر وہی کھانا پینا، گانا بجانا، رنگ رلیاں منانا شروع ہو گیا موت کے خوف سے نجات ملتے ہی خشوع و خضوع کی عارضی کیفیت رخصت ہو گئی اور دلوں پر "مایا" (1) کا تسلط ہو گیا۔ لوگ معمولی اوقات میں نمازیں پڑھتے۔ دعائیں مانگتے تھے۔ لیکن اب ان میں وہ حضور قلب نہ تھا جو اس ہولناک گھڑی میں پیدا ہو گیا تھا۔

مگر اس طوفان کے سبب سے مجھ میں اور دوسرے مسافروں میں بہت میل جول ہو گیا مجھے طوفان کا ڈر نہیں تھا کیونکہ میں ایسے موقعے پہلے بھی دیکھ چکا تھا۔ میری طبیعت بحری سفر سے مناسبت رکھتی ہے اور مجھے کبھی متلی یا دوران سر کی شکایت نہیں ہوئی۔ اس لئے میں سارے جہاز میں بے دھوک گشت لگاتا تھا۔ مسافروں کی تسلی اور دلہی کرتا تھا اور انہیں ہر گھنٹے کپتان کا پیام پہنچاتا تھا۔ آگے چل کر معلوم ہو گا کہ ان لوگوں کی دوستی میرے بڑے کام آئی۔

18 یا 19 دسمبر کو جہاز ڈربن میں لنگر انداز ہوا "نلیری جہاز" بھی اسی دن پہنچا۔

مگر اصل طوفان اب آگے آنے والا تھا۔

حوالہ

- 1 - ہندو فلسفے کی مشہور اصطلاح جس کا صحیح ترجمہ مشکل ہے عموماً اس کا ترجمہ "فریب خیال" "نیرنگ نظر" کیا جاتا ہے۔

طوفان

میں پہلے باب میں کہہ چکا ہوں کہ 18 دسمبر کو دونوں جہاز ڈربن کی بندرگاہ میں لنگر انداز ہوئے۔ جنوبی افریقہ کی بندرگاہوں میں جہازوں کو بغیر طبی معائنے کے ساحل پر آنے کی اجازت نہیں ہے۔ اگر کسی مسافر کو کوئی لگ جانے والی بیماری ہو تو اسے قرنطینے میں رہنا پڑتا ہے جب ہم بمبئی سے چلے گئے تو وہاں طاعون تھا اس لئے ہمیں یہ ڈر تھا کہ کہیں ہم لوگ بھی کچھ دن قرنطینے میں نہ رکھے جائیں۔ معائنے سے پہلے ہر جہاز پر ایک زرد جھنڈا نصب کیا جاتا ہے اور اس وقت تک نہیں اتارا جاسکتا جب تک کہ ڈاکٹر مسافروں کی صحت کی تصدیق نہ کر دے۔ مسافروں کے عزیزوں اور دوستوں کو زرد جھنڈے کے اتارے جانے کے بعد جہاز پر آنے کی اجازت ملتی ہے۔

چنانچہ ہمارے جہاز پر بھی زرد جھنڈا نصب کیا گیا اور ڈاکٹر معائنے کے لئے آیا۔ اس نے پانچ دن کے قرنطینے کا حکم دیا۔ کیونکہ اس کا خیال تھا کہ طاعون کی جراثیم کی نشوونما زیادہ سے زیادہ تین دن میں ہوتی ہے ہمارے جہاز کو یہ حکم سنایا گیا کہ جس دن بمبئی سے چلا تھا اس کے تیسویں دن تک قرنطینے میں رہے لیکن اس حکم میں حقائق صحت کے علاوہ دوسری مصلحتیں بھی تھیں۔

ڈربن کے یورپی باشندوں میں بڑی بے چینی پھیلی ہوئی تھی۔ وہ لوگ یہ جدوجہد کر رہے تھے کہ ہم سب اپنے ملک کو لوٹادیںے جائیں اور قرنطینے کے حکم کی ایک وجہ یہ جدوجہد بھی تھی۔ دادا عبداللہ کے آدمی مجھے برابر شہر کی خبریں پہنچاتے تھے۔ یورپی روز بڑے بڑے جلسے کرتے تھے۔ یہ لوگ دادا عبداللہ کمپنی کو طرح طرح کی دھمکیاں دیتے تھے اور کبھی کبھی لالچ بھی دلاتے تھے یہ کہتے تھے کہ اگر دونوں جہاز واپس کر دیئے جائیں تو ہم ہر جانہ دینے کو تیار ہیں۔ لیکن دادا عبداللہ کمپنی ان دھمکیوں میں آنے والی نہ تھی۔ اس زمانے میں سینٹ عبدالکریم آدم کمپنی کے شریک و منتظم تھے۔

وہ اس پر اڑے ہوئے تھے کہ چاہے جو کچھ بھی ہو دونوں جہازوں کو گودی پر لائیں گے اور مسافروں کو اتاریں گے۔ خوش قسمتی سے ان دنوں سکھ لال جی نظر بھی مجھ سے ملنے کے ارادے سے ڈربن آئے ہوئے تھے۔ یہ بڑے قابل اور جبری آدمی تھے اور ہندوستانیوں کی رہنمائی کر رہے تھے۔ ان کے وکیل مسز لائن بھی جرات (1) میں کچھ کم نہ تھے۔ وہ یورپیوں کے طرز عمل کو برا سمجھتے تھے اور ہندوستانیوں کو صرف مختانے کی خاطر نہیں بلکہ سچے دوست کی طرح مشورہ دیتے تھے۔

اس طرح ڈربن ایک زبردست اور ایک کمزور فریق کی جنگ کا مرکز بنا ہوا تھا۔ ایک طرف تھوڑے سے ہندوستانی اور ان کے معدودے چند انگریز دوست تھے۔ اور دوسری طرف یورپیوں کی صف تھی جو تعداد میں، قوت میں، تعلیم میں اور دولت میں ان سے کہیں بڑھے ہوئے تھے۔ پھر نٹال کی حکومت بھی کھلم کھلا ان کی مدد کر رہی تھی۔ مسز ہنری ایسکومب جو مجلس وزراء کے سب سے بااثر رکن تھے بے تکلف ان کے جلسوں میں شریک ہوتے تھے۔

غرض قرظینے کا اصلی مقصد یہ تھا کہ کمپنی کے اہل بختوں کو یا مسافروں کو دھمکا کر جہاز ہندوستان واپس کر دیئے جائیں اب ہمارے پاس بھی تہدید آمیز پیام پہنچنے لگے۔ ”اگر تم واپس نہ جاؤ گے تو ہم تمہیں سمندر میں ڈبو دیں گے لیکن اگر تم جانے پر راضی ہو جاؤ تو ممکن ہے تمہارا کرایہ تک واپس مل جائے۔“ میں برابر اپنے جہاز کے مسافروں سے ملتا جلتا رہتا تھا اور ان کی دلدادہی کرتا تھا۔ نلدیری کے مسافروں کو بھی تسلی آمیز پیام بھیجتا تھا۔ ان کے سکون اور ہمت میں ذرا بھی فرق نہیں آیا۔

ہم نے مسافروں کی تفریح کے لئے جہاز پر طرح طرح کے کھیلوں کا انتظام کیا۔ کرسمس کے دن کپتان نے اول درجے کے مسافروں کو ڈنر پر بلایا۔ علاوہ میرے اور میرے خاندان کے چند لوگ اور تھے۔ ڈنر کے بعد تقریریں ہوئیں اور میں نے مغربی تہذیب پر تقریر کی۔ میں جانتا تھا کہ یہ موقع سنجیدہ تقریر کا نہیں ہے۔ لیکن اپنی طبیعت سے مجبور تھا۔ میں خوشی منانے میں شریک تھا لیکن میرا دل اس لڑائی میں لگا ہوا تھا جو ڈربن میں ہو رہی تھی کیونکہ یہ لڑائی اصل میں میرے ہی خلاف تھی۔ مجھ پر دو الزام تھے۔

ایک یہ کہ میں نے ہندوستان میں نٹال کے یورپیوں کو بیجا مطعون کیا۔

دوسرے یہ کہ میں خاص کر کے دو جہاز بھر کے ہندوستانی لایا ہوں کہ نٹال کو ہندوستانیوں سے

بھردوں۔

مجھے اپنی ذمہ داری کا احساس تھا میں جانتا تھا کہ میری وجہ سے دادا عبداللہ کمپنی بڑے خطرے میں

بتلا ہے مسافروں کی جان کے لالے پڑے ہوئے ہیں اور اپنے خاندان کو بھی میں نے لا کر مصیبت میں پھنسا دیا ہے

مگر میرا اس میں کوئی قصور نہیں تھا۔ میں نے کسی کو مثال آنے کی ترغیب نہیں دی تھی۔ جب مسافر جہاز پر آئے تھے تو میں انہیں جانتا تک نہ تھا۔ اور اب بھی بخیر اپنے اور رشتے داروں کے جہاز میں سینکڑوں مسافروں میں کسی کے نام و نشان سے واقف نہیں تھا۔

اس لئے میں نے اپنی تقریر میں کہا افسوس ہے کہ اس تہذیب پر جس کا نمونہ مثال کے یورپی پیش کرتے ہیں اور جس کی حمایت کا انہیں دعویٰ ہے۔ کچھ عرصے سے میرے دل میں یہی خیال بسا ہوا تھا اس لئے میں نے اس چھوٹے سے مجمع کے سامنے اپنی تقریر میں اسی مسئلے پر بحث کی۔ کپتان اور دوسرے دوستوں نے بڑی توجہ سے میری تقریر سنی اور ان پر میرے خیالات کا اثر ہوا۔ جہاں تک مجھے معلوم ہے اس سے ان کی زندگی میں کوئی تبدیلی نہیں ہوئی۔ مگر اس کے بعد کئی بار کپتان اور جہاز کے دوسرے افسروں نے مجھ سے مغربی تہذیب کے متعلق طویل گفتگو کی۔ میں نے اپنی تقریر میں کہا تھا کہ مغربی تہذیب زیادہ تر تشدد پر مبنی ہے مگر مشرقی تہذیب میں یہ بات نہیں ہے۔ سوال کرنے والوں نے میری یہ بات پکڑ لی اور ان میں سے ایک نے غالباً کپتان نے مجھ سے پوچھا۔

”فرض کیجئے کہ یورپی اپنی دھمکیوں پر عمل کریں پھر آپ اپنے عدم تشدد کے اصول پر کس طرح قائم رہیں گے؟“

میں نے جواب دیا ”مجھے امید ہے خدا مجھے اتنی ہمت اور سمجھ دے گا کہ میں عضو سے کام لوں اور ان پر مقدمہ نہ چلاؤں۔ مجھے تو محض ان کی جہالت اور تنگدلی پر افسوس آتا ہے میں جانتا ہوں کہ وہ جو کچھ بھی کر رہے ہیں اچھا اور مناسب سمجھ کر کر رہے ہیں۔ پھر مجھے ان پر غصہ آنے کی کیا وجہ ہے؟“

سوال کرنے والا مسکرایا شاید اسے یہ بات یقین نہ آیا۔

اسی طرح جوں توں دن گزرتے رہے ابھی تک ٹھیک معلوم نہیں تھا کہ قرظینہ کب ختم ہو گا۔ قرظینہ کے افسر نے کہا کہ اب معاملہ میرے اختیار میں نہیں رہا جب حکومت کی طرف سے احکام آئیں گے میں آپ کو جہاز سے اترنے کی اجازت دیدوں گا۔

آخر کار ایک دن میرے اور دوسرے مسافروں کے پاس یہ اعلان جنگ پہنچا کہ اگر تم اپنی جان

کی سلامتی چاہتے ہو تو جو ہم کہتے ہیں اسے چپ چاپ مان لو۔ اس کے جواب میں میں نے اور دوسرے مسافروں نے کہلا بھیجا کہ ہمیں نشال کی بندرگاہ میں اترنے کا پورا حق ہے اور ہم نے جی میں ٹھان لی ہے کہ کچھ بھی ہو جائے نشال میں ضرور داخل ہوں گے۔

تین دن پورے ہونے پر جہازوں کو گودی میں آنے کی اور مسافروں کو اترنے کی اجازت مل گئی۔

حوالہ

The Laughton - 1

آزمائش

جہاز گودی پر لائے گئے اور مسافر اترنے لگے۔ مگر مسٹر ایلیکومب نے کپتان سے کہلا بھیجا کہ گاندھی سے کہہ دو ”یورپی تم سے سخت بیزار ہیں۔ تمہاری اور تمہارے خاندان کی جان خطرے میں ہے اس لئے بہتر یہ ہو گا کہ تم ٹھہرنے والے وقت جہاز سے اترو اور گودی کے سپرنٹنڈنٹ مسٹر ٹینٹ کی حفاظت میں گھر جاؤ“ کپتان نے یہ پیغام مجھ سے کہا اور میں اس پر عمل درآمد کرنے پر تیار ہو گیا۔ مگر اسے ابھی اسے آدھ گھنٹہ بھی نہیں ہوا تھا کہ مسٹر لائن کپتان کے پاس آئے اور کہنے لگے ”اگر مسٹر گاندھی راضی ہوں تو میں انہیں اپنے ساتھ لے جاؤں گا۔ میں کمپنی کے مشیر قانونی کی حیثیت سے آپ سے کہتا ہوں کہ آپ پر مسٹر ایلیکومب کے مشورے کی پابندی لازمی نہیں ہے۔“ اس کے بعد انہوں نے مجھ سے بھی کہا ”اگر آپ ڈرتے نہ ہوں تو میری رائے ہے کہ آپ کی بیوی اور بچے گاڑی میں رستم جی کے یہاں چلی جائیں۔ ہم آپ پیدل چلیں مجھے یہ اچھا نہیں معلوم ہوتا کہ آپ چوروں کی طرح رات کو شہر میں داخل ہوں۔ میرے خیال میں اب آپ پر حملے کا کوئی خطرہ نہیں۔ شہر میں ہر طرف سکون ہے۔ یورپی منتشر ہو چکے ہیں۔ بہر حال میرے نزدیک آپ کو شہر میں چھپ کر ہرگز نہیں جانا چاہئے۔“ میں فوراً راضی ہو گیا۔ میرے بیوی اور بچے گاڑی میں سوار ہو کر حفاظت کے ساتھ رستم جی کے یہاں پہنچ گئے۔ میں کپتان کی اجازت سے مسٹر لائن کے ساتھ روانہ ہوا۔ مسٹر رستم جی کا مکان گودی سے دو میل کے فاصلے پر تھا۔

جیسے ہی ہم کنارے پر پہنچے چند لڑکوں نے مجھے پہچان لیا اور ”گاندھی“ ”گاندھی“ ”پکارنے لگے۔ پانچ چھ آدمی اور دوڑ آئے اور انہوں نے لڑکوں کے ساتھ مل کر چلانا شروع کیا۔ مسٹر لائن ڈرے کہ کہیں مجمع زیادہ نہ ہو جائے اور انہوں نے ایک رکشا والے (1) کو پکارا مجھے رکشا پر بیٹھنا

پسند نہ تھا آج پہلی بار اس کا اتفاق ہوتا مگر لوگوں نے مجھے بیٹھنے نہیں دیا انہوں نے رکشا والے کو ایسا دھمکایا کہ وہ اپنی جان لے کر بھاگا۔ جوں جوں ہم آگے بڑھتے گئے مجمع بھی زیادہ ہوتا گیا۔ یہاں تک کہ راستہ بالکل رک گیا۔ پھر انہوں نے مسٹر لاشن کو پکڑ کر مجھ سے علیحدہ کر دیا اس کے بعد مجھ پر اینٹ پتھر اور گندے انڈوں کی بوچھاڑ کر دی۔ ایک شخص میری پگڑی لے بھاگا اور کچھ لوگ مجھے گھونے اور لاتیں مارنے لگے۔ مجھے غش آنے لگا اور میں ایک مکان کے جھنگے کے سہارے کھڑا ہو گیا کہ ذرا دم لے لوں مگر لوگوں نے اس کا موقع نہیں دیا انہوں نے پہنچ کر گھونے اور بکے مارنا شروع کئے۔ اتفاق سے سپرنٹنڈنٹ پولیس کی بیوی جو مجھ سے واقف تھیں ادھر سے گزر رہی تھیں۔ یہ بہادر خاتون میری مدد کے لئے آئیں اور اپنی چھتری کھول کر میرے اور مجھے کے درمیان حائل ہو گئیں۔ ان سے لوگوں کا ہلہ کچھ کم ہوا کیونکہ اگر مجھے مارتے تو مسز ایگزیکٹو کے بھی چوٹ آتی۔

اس عرصے میں ایک ہندوستانی لڑکا جس نے یہ واقعہ دیکھا تھا دوڑ کر کو توالی پہنچ گیا۔ سپرنٹنڈنٹ پولیس مسز ایگزیکٹو نے سپاہیوں کا ایک دستہ بھیجا کہ مجھے حلقے میں لے کر گھر پہنچا دے۔ یہ سپاہی عین وقت پر پہنچے۔ کو توالی ہمارے رستے میں تھی جب ہم وہاں پہنچے تو سپرنٹنڈنٹ نے کہا کہ تم یہیں کو توالی میں پناہ لو مگر میں نے شکریے کے ساتھ انکار کر دیا۔ میں نے ان سے کہا ”جب ان لوگوں کو اپنی غلطی کا احساس ہو گا تو آپ ہی خاموش ہو جائیں گے۔ مجھے ان کی انصاف پسندی پر اعتماد ہے“ پولیس کی حفاظت میں بغیر کسی مزید دقت کے رستم جی کے یہاں پہنچ گیا۔ میرا بدن جا بجا سے چھل گیا تھا۔ مگر سوائے ایک جگہ کے کہیں بھی زخم نہیں آیا تھا۔ جہاز کے ڈاکٹر دادی بار جو صاحب وہیں موجود تھے اور انہوں نے بہت توجہ سے میری مرہم مٹی کر دی۔

گھر کے اندر سکون تھا مگر باہر یورپی مکان گھرے ہوئے تھے۔ رات ہونے والی تھی اور مجمع کا پھاڑ پھاڑ کر چلا رہا تھا۔ ”کاندھی کو ہمارے حوالے کر دو۔“ بیدار مغز سپرنٹنڈنٹ پولیس موقع پر پہنچ گئے اور مجمع کو دھمکا کر نہیں بلکہ پرچا کر قابو میں لانے کی کوشش کر رہے تھے لیکن دل میں وہ بھی پریشان تھے انہوں نے مجھ سے کہا ”بیجا“ اگر آپ اپنے دوست کے گھر بار کو اور اپنے خاندان کو ان لوگوں کے ہاتھوں سے بچانا چاہتے ہیں تو جیسے میں کہوں بھیس بدل کر نکل جائیے۔

اس طرح ایک ہی دن میں دو متضاد حالتوں سے سابقہ پڑا۔ جب جان کا خطرہ محض خیالی تھا اس وقت مسٹر لاشن نے مجھے یہ مشورہ دیا کہ کھلے بندوں شہر میں جاؤں اور میں نے اسے قبول کیا۔

جب خطرہ سچ سچ آ رہا تھا تو ایک اور دوست نے مجھے اس کے خلاف رائے دی اور میں نے اسے بھی قبول کر لیا۔ خدا جانے میں نے یہ اس لئے کیا کہ مجھے اپنی جان خطرے میں نظر آئی یا اس لئے کہ اپنے دوست کے گھر بار کو یا اپنے بیوی بچوں کو خطرے سے بچاؤں؟ کون شخص دعویٰ سے کہہ سکتا ہے کہ میں اس وقت بھی حق بجانب تھا جب میں نے بقول دوسروں کے بہادری سے مجمع کا مقابلہ کیا۔ اور اس وقت بھی جب میں بھیس بدل کر ان کے مقابلے سے بھاگ نکلا؟۔

جو یہ باتیں ہو چکیں ان کی اچھائی یا برائی کا فیصلہ کرنا فضول ہے جو فائدہ ہی ہے وہ اس میں ہے کہ انسان انہیں سمجھے اور اگر ممکن ہو تو ان سے آئندہ کے لئے سبق حاصل کرے۔ پہلے سے یہ بتانا دشوار ہے کہ فلاں شخص فلاں موقع پر کیا کرے گا اور پھر کسی شخص کے ظاہری افعال سے اس کی نیت پر حکم لگانا بھی گویا ناکافی شہادت کی بنا پر فیصلہ کرنا ہے۔

بہر حال بھاگنے کی تیاری میں میں اپنی چونوں کی تکلیف کو بھول گیا۔ سپرنٹنڈنٹ کے مشورے کے مطابق میں نے ایک ہندوستانی کانسٹیبل کی وردی پہن لی اور سرپردھت کی ایک طشتری رکھ کر اس پر مدد اسی صافالیٹ لیا کہ خود کا کام دے سکے، میرے ساتھ دو سراغرساں تھے جن میں سے ایک نے ہندوستانی تاجر کا بھیس بدلا اور چہرے کو رنگ کر ہندوستانیوں کی سی شکل بنالی تھی۔ دوسرے کا بھیس مجھے یاد نہیں ہم ایک چھوٹی سی گلی سے ہو کر قریب کی دوکان پر پہنچے اور بوروں کے ڈھیر میں سے جو گودام میں لگا ہوا تھا گذر کر دوکان کے دروازے سے نکل گئے۔ یہاں مجمع میں گھس پیٹھ کر گلی کی نکل پر اس گاڑی تک پہنچے جو میرے لئے کھڑی تھی اس گاڑی نے ہمیں کو توالی میں پہنچا دیا جہاں تھوڑی دیر پہلے مسٹر ایگزیکٹو نے مجھ سے پناہ لینے کو کہا تھا۔ میں نے ان کا اور سراغرساںوں کا شکریہ ادا کیا۔

ادھر میں بھاگ رہا تھا اور ادھر مسٹر ایگزیکٹو یہ بول کر مجمع کو بہلا رہے تھے۔

پھانسی دے دو گاندھی کو

کھٹے سیب کے پیڑ پر

جب انہیں معلوم ہو گیا کہ میں حفاظت کے ساتھ کو توالی پہنچا دیا گیا تو انہوں نے مجمع سے مخاطب ہو کر کہا ”بھئی تمہارا شمار تو قریب کی دوکان سے ہو کر نکل گیا۔ میری صلاح یہ ہے کہ اب تم بھی گھر کی راہ لو۔“ بعض لوگ بگڑے، بعض ہنسنے لگے اور بعض کو اس بات پر یقین نہیں آیا۔ سپرنٹنڈنٹ نے کہا ”اچھا اگر تمہیں میری بات کا یقین نہیں آتا تو اپنی طرف سے دو ایک

نامندے مقرر کر دو میں انہیں گھر کے اندر لے جانے پر تیار ہوں۔ اگر وہ گاندھی کو ڈھونڈھ نکالیں تو میں وعدہ کرتا ہوں کہ اسے تمہارے حوالے کر دوں گا۔ لیکن اگر وہ نہ ملا تو پھر تم کو منتشر ہونا پڑے گا۔ تم کوئی رستم جی کا مکان ڈھانے یا گاندھی کے بیوی بچوں کو ستانے تھوڑی آئے ہو۔”

مجمع نے اپنے نامندے گھر کی تلاشی لینے کے لئے بھیجے۔ وہ تھوڑی دیر میں ناکام واپس آئے اور مجمع خدا خدا کر کے منتشر ہوا۔ اکثر لوگ سپرنٹنڈنٹ کی تعریف کر رہے تھے کہ انہوں نے بڑی موقع شناسی سے کام لیا اور بعض غصے سے ہونٹ چبا رہے تھے۔

مسٹر چیمبر لین آنجنانی جو اس زمانے میں وزیر نوآبادیات تھے مثال کو تار کے ذریعے ان لوگوں پر مقدمہ چلانے کا حکم دیا جنہوں نے مجھ پر حملہ کیا تھا۔ مسٹر ایلموب نے مجھے بلایا اور کہا ”مجھے سخت افسوس ہے کہ آپ کو یہ اذیتیں اٹھانا پڑیں۔ آپ یقین کیجئے کہ مجھے آپ کی خفیف سی تکلیف بھی گوارا نہیں۔ بے شک آپ کو یہ حق تھا کہ آپ مسٹر لائن کے مشورے کو مانیں اور بڑے سے بڑے خطرے کا مقابلہ کریں مگر مجھے یقین ہے کہ آپ میری رائے پر عمل کرتے تو یہ حادثہ پیش نہ آتا۔ اگر آپ حملہ کرنے والوں کو شناخت کر سکیں تو میں اس کے لئے تیار ہوں کہ انہیں گرفتار کر کے ان پر مقدمہ چلاؤں۔ مسٹر چیمبر لین نے بھی مجھ سے یہی خواہش کی ہے۔

میں نے جواب دیا ”میں کسی پر مقدمہ چلانا نہیں چاہتا ممکن ہے میں ان میں سے دو ایک کو پہچان لوں مگر انہیں سزا دلانے سے کیا فائدہ ہو گا؟ اور میرے نزدیک ان لوگوں کا کوئی قصور بھی نہیں۔ انہیں یہ یقین دلایا گیا کہ میں نے ہندوستان میں مثال کے یورپیوں کے متعلق مبالغہ آمیز روایتیں کیں اور انہیں بدنام کر دیا۔ ان باتوں کو سن کر انہیں طیش آگیا تو کون سی تعجب کی بات ہے؟ قصور جو کچھ ہے وہ ان کے لیڈروں کا یعنی دوسرے الفاظ میں خود آپ کا ہے۔ آپ ان کی صحیح رہنمائی کر سکتے تھے۔ مگر آپ نے خود ریورٹ کے بھروسے پر یہ فرض کر لیا کہ میں نے ضرور مبالغے سے کام لیا ہو گا۔ میں کسی سے مواخذہ کرنا نہیں چاہتا مجھے یقین ہے کہ جب صحیح حالات معلوم ہوں گے تو لوگوں کو اپنی ان حرکتوں پر ندامت ہوگی۔“

مسٹر ایلموب نے کہا ”اگر آپ کا کوئی برج نہ ہو تو یہ الفاظ مجھے لکھ کر دے دیجئے۔ کیونکہ مجھے مسٹر چیمبر لین کو اس مضمون کا تار دینا پڑے۔ میں یہ نہیں چاہتا کہ آپ عجلت میں بے سوچے سمجھے کوئی تحریر دیں۔ آپ کا جی چاہے تو آخری فیصلہ کرنے سے پہلے مسٹر لائن سے اور دوسرے دوستوں سے مشورہ کر لیجئے۔ یہ میں ضرور مانتا ہوں کہ اگر آپ حملہ آوروں کو سزا دلانے کے حق سے

دست بردار ہو جائیں تو مجھے امن قائم کرنے میں بڑی مدد ملے گی اور آپ کی بھی نیک نامی ہوگی۔“
 میں نے کہا ”میں آپ کی نوازش کا شکریہ ادا کرتا ہوں مجھے کسی سے مشورہ لینے کی ضرورت
 نہیں مجھے جو کچھ فیصلہ کرنا تھا میں نے آپ کے پاس آنے سے پہلے ہی کر لیا۔ یہ میرے عقیدے
 کے خلاف ہے کہ میں حملہ آوروں پر مقدمہ چلاؤں اور میں اسی وقت اپنا فیصلہ لکھ کر دینے کے لئے
 تیار ہوں۔“

یہ کہہ کر میں نے اپنا بیان لکھا اور ان کے حوالے کیا۔

حوالہ

1 - ایک ہلکی سی گاڑی جسے آدمی کھیلتا ہے۔

طوفان کے بعد سکون

جب میں مسٹر ایکومب سے ملنے گیا تو مجھے کو توہلی میں آئے ہوئے سمیرا دن تھا۔ میری حفاظت کے لئے دو کانسٹیبل ساتھ کر دیئے گئے تھے مگر یہ احتیاط ضروری ثابت ہوئی۔

جس دن میں جہاز سے اترنے والا تھا اسی روز زرد جھنڈے کے اترتے ہی نٹال ایڈور "ٹائر" (1) کا نامندہ مجھ سے سوال و جواب کرنے کے لئے پہنچ گیا تھا۔ اس نے مجھ سے بہت سی باتیں پوچھیں اور میں نے ان تمام الزامات کی جو مجھ پر لگائے گئے تھے کما حقہ تردید کر دی۔ سرفیروز شاہ مہتا کے مشورہ کی بدولت میں نے جتنی تقریریں کی تھیں سب لکھ کر کی تھیں اور میرے پاس ان کی اور اپنی دوسری تحریروں کی نقلیں موجود تھیں میں نے یہ سب چیزیں اخبار کے نامندے کو دے دیں اور اس پر مثبت کر دیا کہ میں نے ہندوستان میں جتنی باتیں کہیں وہ سب میں اس سے پہلے جنوبی افریقہ میں زیادہ سخت الفاظ میں کہہ چکا ہوں میں نے اسے یہ بھی یقین دلایا کہ کور لینڈ اور نلدیری کے مسافروں کو جنوبی افریقہ لانے میں مجھے کوئی دخل نہیں ہے ان میں تو بعض یہاں کے پرانے باشندے ہیں اور بہت سے ایسے ہیں جو نٹال میں رہنے کے لئے نہیں آرہے ہیں بلکہ ٹرانسوال جارہے ہیں۔ جو لوگ دولت کی تلاش میں جنوبی افریقہ آتے ہیں ان کے لئے نٹال سے بہتر موقع ٹرانسوال میں ہے۔ اس لئے اکثر ہندوستانی وہیں جانا پسند کرتے ہیں۔

ادھر تو یہ بیان شائع ہوا ادھر میں نے حملہ آوروں پر مقدمہ چلانے سے انکار کر دیا ان باتوں کا بڑا گہرا اثر ہوا اور ڈربن کے یورپی اپنی حرکتوں پر ناام ہوئے اخباروں نے میرا بے قصور ہونا تسلیم کر لیا اور عوام پر لعنت طامت کی اس لئے یہ حملہ آگے چل کر میرے لئے یعنی قومی مقصد کے لئے بہت مفید ثابت ہوا۔ اس سے جنوبی افریقہ میں ہندوستانیوں کی وقعت بڑھ گئی اور میرے کام میں

آسانی پیدا ہو گئی۔

تین چار دن کے بعد میں اپنے گھر چلا گیا اور تھوڑے ہی عرصے میں میں اطمینان سے کام کرنے لگا۔ اس واقعے سے میرے پاس مقدمے بھی زیادہ آنے لگے۔

مگر اس واقعے سے جہاں ہماری قوم کی وقعت بڑھی وہاں مخالفوں کے دلوں میں تعصب کی آگ اور بھی بھوک اٹھی۔ جب یہ ثابت ہو گیا کہ ہندوستانی مردانہ وار مقابلہ کر سکتا ہے تو لوگ ہندوستانیوں کو خطرناک سمجھنے لگے۔ مثال کی مجلس وضع قوانین میں دو قانونوں کے مسودے پیش ہوئے جس میں ایک کا مقصد ہندوستانی تاجروں کے مفاد کو پامال کرنا اور دوسرے کا مقصد ہندوستانیوں کے داخلے کو محدود کرنا تھا۔ خوش قسمتی سے اس جدوجہد کی بدولت جو ہم نے دوٹو کے حق کے لئے کی تھی، یہ فیصلہ ہو چکا تھا کہ آئندہ کوئی قانون خاص ہندوستانیوں کے خلاف پاس نہیں ہو سکے گا۔ یعنی قانون میں رنگ اور نسل کی کوئی تمیز نہیں ہو گی۔ مذکورہ بالا مسودوں کے الفاظ ایسے رکھے گئے کہ ان کا اطلاق سب پر ہو سکے مگر ان کا مقصد یقیناً یہی تھا کہ مثال کے ہندوستانی باشندوں پر مزید ٹیود ٹیود حاصل کی جائیں۔

ان مسودات قانون کی بدولت میرا قومی کام بہت بڑھ گیا اور ہندوستانیوں کو پہلے سے بھی زیادہ اپنے فرائض کا احساس پیدا ہو گیا۔ ان مسودوں کے ہندوستانی زبان میں ترجمے ہوئے اور تشریحیں کی گئیں تاکہ لوگ ان کی بارکیوں کو اچھی طرح سمجھ لیں۔ ہم نے وزیر نوآبادیات کو اس مسئلے کی طرف توجہ دلائی مگر انہوں نے مداخلت کرنے سے انکار کیا۔

اب میرا وقت زیادہ ترقوی کاموں میں صرف ہونے لگا۔ من سکھ لال جی جن کا میں اوپر ذکر کر چکا ہوں ڈربن میں موجود تھے وہ میرے ساتھ رہنے لگے اور چونکہ ان کا وقت قومی کاموں کے لئے وقف تھا اس لئے ان کے سبب سے میرا بوجھ کسی قدر ہلکا ہو گیا۔

میری عدم موجودگی میں سیٹھ آدم جی میاں خاں نے سیکرٹری کے فرائض بڑی خوبی سے انجام دیئے تھے۔ انہوں نے ممبروں کی تعداد بہت بڑھالی تھی اور مثال انڈین کانگریس کے پاس ایک ہزار پونڈ سرمایہ جمع ہو گیا تھا ہندوستانی مسافروں کے خلاف مظاہرے نے اور مسودوں نے جو بیداری پیدا کر دی تھی اس سے میں نے بہت فائدہ اٹھایا۔ بہت سے لوگ ممبر ہو گئے اور سرمائے کی تعداد 500 پونڈ تک پہنچ گئی میں چاہتا تھا کہ کانگریس کے لئے مستقل سرمایہ جمع ہو جائے جس سے جائیداد خرید لی جائے اور جائیداد کی آمدنی خرچ کی جائے مجھے کسی قومی ادارے کے انتظام کا یہ پہلا تجربہ

تھا۔ میں نے اپنی تجویز اپنے رفیقوں کے سامنے پیش کی اور انہوں نے اسے بہت پسند کیا۔ جو جائیداد خریدی گئی تھی وہ کرائے پر اٹھادی گئی اور اس کی آمدنی سے معمولی اخراجات اچھی طرح چلنے لگے۔ جائیداد کے لئے معقول ٹرستی مقرر کر دیئے گئے۔ یہ جائیداد اب تک موجود ہے مگر اس کی بدولت آپس میں نزاع پیدا ہو گئی ہے۔ چنانچہ اس کی آمدنی عدالت میں جمع ہوتی ہے۔

یہ افسوس ناک صورت حال میرے جنوبی افریقہ سے چلے آنے کے بعد پیدا ہوئی لیکن میرا خیال قومی اداروں کے لئے مستقل سرمایہ رکھنے کے بارے میں اس نزاع سے بہت پہلے بدل چکا تھا اور اب متعدد قومی اداروں کا وسیع تجربہ حاصل کرنے کے بعد میرا عقیدہ ہو گیا ہے کہ ان اداروں کو مستقل سرمائے کی مدد سے چلانا اچھا نہیں ہے۔ قومی ادارہ وہ ہے جو قوم کی مرضی سے اور اس کے روپے سے چلایا جائے جب یہ ادارہ قوم کی مدد سے محروم ہو جائے تو اسے باقی رہنے کا کوئی حق نہیں۔ جو ادارے مستقل سرمائے سے چلتے ہیں ان کے کارکن اکثر رائے عامہ کو نظر انداز کر دیتے ہیں بلکہ کبھی کبھی اس کے خلاف عمل کرتے ہیں۔ ہمیں اپنے ملک میں روز مرہ اس کا تجربہ ہوتا ہے۔ بعض نام نہاد مذہبی وقف ایسے ہیں جنہوں نے اپنے حسابات شائع کرنا موقوف کر دیا ہے۔ ٹرستی مالک بن بیٹھے ہیں اور وہ اپنے آپ کو کسی کا ماتحت نہیں سمجھتے۔ میرے نزدیک قومی اداروں کا نصب العین یہ ہونا چاہئے کہ وہ ان چیزوں کی طرح جو فطرت کی گود میں پلتی ہیں اپنی غذا روز کے روز حاصل کیا کریں۔

مگر میں ایک غلط فہمی کو رفع کر دینا چاہتا ہوں۔ میرا خطاب ان اداروں سے نہیں جن کے لئے مستقل عمارت ہونا لازمی ہے میرے کہنے کا منشا صرف یہ ہے کہ معمولی خرچ ان چندوں سے چلنا چاہئے جو لوگ اپنی خوشی سے ہر سال دیا کریں۔

جنوبی افریقہ کی ستیاگرہ کے زمانے میں ان خیالات کی تصدیق ہوئی۔ یہ شاندار جنگ جس میں لاکھوں روپے صرف ہوئے صرف چھ سال تک بغیر مستقل سرمائے کے جار رہی مجھے بعض ایسے موقعے یاد ہیں جب میری سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ اگر کل چندہ نہیں ملا تو کیا انجام ہو گا۔ لیکن یہ ذکر ابھی قبل از وقت ہے۔ آئندہ صفحوں کو پڑھ کر ناظرین پر اس ادارے کی صحت اچھی طرح ثابت ہو جائے گی۔

حوالہ

1 - اخبار کا نام ہے

بچوں کی تعلیم

جنوری 1897ء میں جب میں ڈربن پہنچا تو میرے ساتھ تین بچے تھے۔ میرا بھانجا جس کی عمر دس برس کی تھی اور میرے دونوں لڑکے جن میں سے بڑے کی عمر نو سال کی اور چھوٹے کی پانچ سال کی تھی۔ میرے سامنے یہ مسئلہ تھا کہ انہیں کہاں پڑھاؤں؟

میں انہیں یورپی بچوں کے اسکولوں میں بھیج سکتا تھا مگر اس صورت میں خاص رعایت اور استثناء کی درخواست کرنا پڑتی۔ ان اسکولوں میں ہندوستانی بچے داخل نہیں کئے جاتے تھے۔ ہندوستانیوں کے لئے مشن اسکول تھے مگر میں وہاں اپنے بچوں کو پڑھانا نہیں چاہتا تھا کیونکہ مجھے وہاں کی تعلیم پسند نہیں تھی۔ ایک تو وہاں پڑھائی انگریزی میں ہوتی تھی۔ یا شاید غلط ملط اردو یا تامل میں۔ اور اس کا اہتمام بھی دولت سے خالی نہ تھا۔ میں ان خرابیوں کو کسی طرح گوارا نہیں کر سکتا تھا۔ اس عرصے میں میں انہیں اپنے طور پر تھوڑا بہت پڑھاتا تھا۔ مگر اس میں اور کچھ نہیں تو یہ دولت ضرور تھی کہ پابندی سے پڑھائی نہیں ہوتی تھی اور کوئی گجراتی پڑھانے والا ملتا نہیں تھا۔

میری سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ کیا کروں۔ میں نے ایسے انگریز معلم کے لئے اشتہار دیا جو ان بچوں کو میری نگرانی میں تعلیم دے سکے۔ میں چاہتا تھا کہ یہ معلم انہیں تھوڑی دیر باقاعدہ تعلیم دیا کرے اور باقی دولت میں جب فرصت ملے میں پڑھا دیا کروں۔ چنانچہ میں نے ایک انگریز معلم سٹ پونڈ ماہوار پر رکھی کچھ دن اس طرح کام چلتا رہا۔ مگر اس نے میرا اطمینان نہیں ہوا میں بچوں کے ساتھ اٹھتے بیٹھتے ہمیشہ گجراتی میں گفتگو کرتا تھا جس کی بدولت انہیں اپنی مادری زبان تھوڑی بہت آگئی۔ میرا جی نہیں چاہتا تھا کہ انہیں ہندوستان بھیجوں کیونکہ میں چھوٹے بچوں کو والدین سے جدا کرنے کا مخالف تھا۔ اگر گھر سلیقہ کا ہو تو جو تعلیم بچے خود بخود اس فضا میں حاصل کرتے ہیں وہ

بورڈنگ ہاؤس میں کسی طرح حاصل نہیں ہو سکتی اس لئے میں نے اپنے بچوں کو اپنے ساتھ ہی رکھا ہندوستان میں میں نے اپنے بڑے بیٹے اور بھتیجے کو چند مہینے کے لئے اقامتی (1) مدرسوں میں بھیج کر دیکھا تھا مگر انہیں واپس بلا لینا پڑا۔ آگے چل کر میرا بڑا لڑکا جسے بلخ ہوئے بہت دن ہو چکے تھے گھر سے بھاگ کر ہندوستان چلا گیا اور احمد آباد کے ہائی سکول میں داخل ہو گیا۔ میرا خیال ہے کہ میرا بھتیجا اس تھوڑی بہت تعلیم سے جو اے میرے یہاں ملتی تھی مطمئن تھا۔ افسوس ہے کہ وہ تھوڑے دن بیمار رہ کر عین شباب میں مر گیا۔ میرے اور تینوں بیٹوں میں سے کوئی عام اسکولوں میں نہیں پڑھا البتہ انہوں نے کچھ دن اس ہنگامی مدرسے میں باقاعدہ تعلیم پائی ہے جو میں نے جنوبی افریقہ میں ستیا گریوں کے بچوں کے لئے کھولا تھا۔

ان میں سے کوئی تجربہ پوری طرح کامیاب نہیں ہوا۔ میں جتنا دلت ان بچوں میں صرف کرنا چاہتا تھا اتنا نہیں کر سکتا تھا۔ ان کی طرف پوری توجہ نہ کر سکنے سے اور بعض اور ناگزیر اسباب سے میں انہیں سب دلخواہ ادبی تعلیم نہ دے سکا اور انہیں اس بارے میں مجھ سے اکثر شکایت رہی ہے۔ جب کبھی وہ کسی ایسے شخص سے ملتے ہیں جو بی اے یا ایم اے یا صرف انٹرنیشنل ہی پاس ہو۔ تو انہیں اسکول میں تعلیم نہ پانے کی کمی محسوس ہوتی ہے۔

تاہم میرا یہ خیال ہے کہ اگر میں انہیں آنکھ بند کر کے عام اسکولوں میں بھیج دیتا تو یہ اس تربیت سے محروم رہتے جو صرف تجربے کے مکتب میں یا والدین کی صحبت ہی میں حاصل ہوتی ہے مجھے جیسا اطمینان ان کی طرف سے اب رہتا ہے ہرگز نہ رہتا اور مجھ سے بچھڑ کر انگلستان یا جنوبی افریقہ میں ان کو جو تعلیم ملتی وہ انہیں وہ سادگی اور جوش خدمت سکھائی جو آج ان کی زندگی میں نمایاں ہے۔ پھر ان کے مصنوعی طرز معاشرت سے میرے قومی کام میں بڑی مشکلیں پیش آئیں۔ اس لئے گو میں انہیں اتنی ادبی تعلیم نہیں دے سکا کہ میرے یا ان کے لئے قابل اطمینان ہوتی۔ لیکن جب میں گذرے ہوئے زمانے پر نظر ڈالتا ہوں تو یہ خیال ہوتا ہے کہ شاید میں نے ان کے حقوق ادا کرنے میں اپنے امکان بھر کو تاہی نہیں کی مجھے اس کا مطلق افسوس نہیں کہ میں نے انہیں عام اسکولوں میں نہیں بھیجا۔ مجھے ہمیشہ یہ احساس رہا ہے کہ میرے بڑے بیٹے کی سیرت میں جو بے عنوانیاں نظر آتی ہیں۔ یہ خود میری ابتدائی زندگی کی غامکاریوں کی بازگشت ہے۔ میں اپنی اس عمر کو ناقص علم اور نفس پرستی کا زمانہ سمجھتا ہوں یہ دن میرے بڑے بیٹے کے بچپن کے تھے۔ جب اس کا دل خارجی اثرات کو آسانی سے قبول کرتا تھا اسی سبب سے وہ اس بات کو نہیں مانتا کہ یہ میرا نفس پرستی اور

نا تجربہ کاری کا دور تھا۔ اسے یقین ہے کہ وہ زمانہ میری زندگی کی معراج کا تھا اور آگے چل کر جو تبدیلیاں ہوئیں وہ فریب نفس کا نتیجہ ہیں جسے غلطی سے بصیرت کہتے ہیں اور ان میں تعجب کی کیا بات ہے وہ یہ کیوں نہ سمجھے کہ میرا ابتدائی زمانہ بیداری کا دور تھا اور آگے چل کر جو انقلاب ہوا وہ محض خدغ نفس اور خود پرستی ہے؟ مجھ سے اکثر میرے دوستوں نے ایسے سوال کئے جن کا جواب دینا مشکل ہے؟ اگر تم اپنے بچوں کو اعلیٰ تعلیم دلاتے تو کیا برج تھا۔ تمہیں کیا حق تھا کہ ان کی دماغی نشوونما کو روک دو؟ تم نے انہیں ہی آزادی کیوں نہ دی کہ کالجوں سے سند لیں اور جو پیشہ انہیں پسند ہو اختیار کریں۔

میرے خیال میں اس قسم کے سوال بالکل فضول ہیں مجھے بہت سے طالب علموں سے سابقہ رہا ہے۔ مجھے جن تعلیمی تجربوں کا "خطبہ" ہے وہ میں نے خود یا دوسروں کے توسط سے اور بچوں پر بھی کر کے دیکھے ہیں۔ آج میں بہت سے نوجوانوں کو دیکھتا ہوں جو میرے لڑکوں کے ہم عمر ہیں اور میرے خیال میں میرے لڑکے ان سے ہر گز پیچھے نہیں ہیں۔

لیکن میرے تجربوں کا آخری نتیجہ ابھی مستقبل کے پردے میں چہنہاں ہے۔ میری غرض ان باتوں کے بیان کرنے سے یہ ہے کہ عمرانیات کا مطالعہ کرنے والوں کو کچھ اندازہ ہو جائے کہ گھر کی باضابطہ تعلیم میں اور اسکول کی تعلیم میں کیا فرق ہوتا ہے اور بچوں پر ان کے والدین کی زندگی کے تغیرات کا کیا اثر پڑتا ہے۔ اس سے یہ بھی معلوم ہو جائے گا کہ حق کے طالب کو تلاش حق میں کیا کچھ کرنا پڑتا ہے اور آزادی کے شیدا یہ دیکھ لیں گے کہ یہ پر جلال دیوی کتنی قربانیاں مانگتی ہے۔ اگر مجھ میں خودداری نہ ہوتی اگر میں اپنے بچوں کو وہ تعلیم دلا کر خوش ہوتا جو اور بچے نہیں پاسکتے تھے اور ان کی ادبی تعلیم تو ہو جاتی لیکن آزادی اور خودداری کی عملی تربیت سے وہ محروم رہتے جس کی خاطر میں نے اس ادبی تعلیم کو قربان کر دیا۔ ایسی صورت پیش آجائے کہ آزادی اور علم میں سے کسی ایک چیز کو اختیار کرنا ہو تو کون ایسا شخص ہے جو آزادی کو علم سے ہزار درجے بڑھ کر نہ سمجھے گا؟

جن نوجوانوں کو میں نے 1920ء میں غلامی کے گھروں یعنی اسکولوں اور کالجوں کے چھوڑنے کا مشورہ دیا تھا جن سے میں نے یہ کہا تھا کہ آزادی کی طرح ان پڑھ رہ کر ہتھر پھوڑنا اس سے اچھا ہے کہ آدمی زنجیروں میں جکڑا ہو ادبی تعلیم پاتا ہو۔ ان پر اب غالباً یہ کھل جائے گا کہ میرے مشورے کی بنیاد کیا تھی۔

حوالہ

جوش خدمت

میری دکھت اچھی طرح چل رہی تھی۔ مگر یہ میرے اطمینان کے لئے کافی نہ تھا۔ مجھے بہت دن سے اس خیال نے بے چین کر رکھا تھا کہ میں اپنی زندگی میں اور سادگی پیدا کروں اور اپنے ہم جنوں کی کوئی محسوس خدمت انجام دوں۔ ایک روز میرے پاس ایک کوڑھی آیا۔ میرے دل نے یہ گوارا نہ کیا کہ اسے کھانا کھلا کر رخصت کر دوں اس لئے میں نے اسے اپنے گھر ٹھہرایا اور اس کی مرہم پٹی اور خبر گیری کرنے کا مگر اس طرح کب تک کام چلانا تو مجھ میں اتنی استطاعت تھی اور نہ یہ میرا ارادہ تھا کہ اسے ہمیشہ اپنے ساتھ رکھوں اس لئے میں نے اسے پابند مزدوروں کے ہسپتال میں بھیج دیا۔

مگر اس سے مجھے تسکین نہیں ہوئی مجھے یہ آرزو تھی کہ رفاہ عام کا کوئی مستقل کام کروں ڈاکٹر بوتھ سینٹ ایڈان کی مشن کے سردار تھے۔ یہ بڑے رحمدل آدمی تھے اور مریضوں کا علاج مفت کرتے تھے۔ پارسی رستم جی کی فیاضی کی بدولت ہم نے ڈاکٹر بوتھ کی نگرانی میں ایک خیراتی ہسپتال کھلوا دیا۔ میں اس ہسپتال میں تیمارداری کی خدمت انجام دینے لگا۔ دوا تقسیم کرنے میں مجھے ایک سے لے کر دو گھنٹے تک لگ جاتے تھے میں نے یہ فیصلہ کیا کہ اتنا دولت اپنے دفتر کے کام سے بچا کر ہسپتال کے دوا خانے میں کمپوٹڈر کا کام کروں گا۔ دکھت میں مجھے زیادہ تر دفتری کام کرنا پڑتا تھا یعنی پچایت اور انتقال جائیداد کا کام کبھی کبھی مجھے مجسٹریٹ کی عدالت میں پیروی کے لئے بھی جانا پڑتا تھا۔ لیکن اکثر مقدمے سیدھے سادے ہوتے تھے۔ اور مسٹر خان نے جو میرے بعد جنوبی افریقہ آئے تھے اور میرے ساتھ ہی رہتے تھے۔ اس بات کا ذمہ لے لیا کہ اگر میں موجود نہ ہوں تو ان مقدموں کو سنبھال لیا کریں گے۔ اس طرح مجھے اس چھوٹے سے ہسپتال میں کام کرنے

کا دقت مل گیا۔ اس میں مجھے روز صبح کو (ہسپتال آنے جانے کا دقت ملا کہ دو گھنٹے صرف کرنا پڑتے تھے۔ اس کام سے میرے قلب کو کچھ تسکین ہوئی۔ میں مریضوں کے حالات دریافت کر کے ڈاکٹر سے بیان کرتا تھا اور پھر دوا بنا کر تقسیم کرتا تھا۔ اس طرح مجھے ہندوستانی مریضوں کو جن میں سے اکثر ثانی تیلیگویا شمالی ہندوستان کے پابند مزدور تھے۔ ملنے جلنے کا موقع ملا۔

یہ تجربے اس دقت میرے بہت کام آئے جب میں جنگ بوڑ میں رضا کار کی حیثیت سے بیمار اور زخمی سپاہیوں کی تیمارداری کر رہا تھا۔

مجھے بچوں کی تربیت کا خیال ہر دقت رہتا تھا۔ جنوبی افریقہ آنے کے بعد میرے دو لڑکے اور ہو چکے تھے ہسپتال میں کام کرنے سے مجھے ان بچوں کی تربیت میں بڑی مدد ملی مجھے اپنی آزادی پسند طبیعت کی بدولت اکثر تکلیفیں اٹھانا پڑتی تھیں۔ جب میری بیوی کے بچہ ہونے والا تھا تو ہم دونوں نے یہ طے کیا تھا کہ بہترین طب امداد حاصل کی جائے لیکن سوال یہ تھا کہ ڈاکٹر اور دائی نے دقت پر دھوکا دیا تو ہم کیا کریں گے؟ اس لئے یہ مناسب معلوم ہوا کہ دائی ہندوستانی ہو لیکن تربیت یافتہ دائی کا ملنا ہندوستان ہی میں مشکل ہے پھر آپ تکیا کر سکتے ہیں کہ جنوبی افریقہ میں کیا حال ہو گا۔ اس لئے میں نے طبی کتابوں کا مطالعہ شروع کیا کہ وضع حمل میں آسانی پیدا کرنے کے لئے جو ضروری باتیں ہیں وہ معلوم ہو جائیں میں نے ڈاکٹر ترمونداس کی کتاب ”مانے سکیت رہنمائے مادران“ پڑھی اور دونوں بچوں کی پرورش اس کی ہدایتوں کے مطابق شروع کی مگر اس میں کہیں کہیں اپنے تجربے سے بھی کام لیتا تھا۔ دونوں مرتبہ دو مہینے کے لئے دائی بھی رکھی گئی لیکن اس کا اصل کام میری بیوی کی مدد کرنا تھا بچوں کی پرداخت میں خود کرتا تھا۔

دوسرے بچے کی پیدائش میرے لئے بڑی آزمائش کا موقع تھا۔ میری بیوی کو دردناک اچانک شروع ہو گیا۔ ڈاکٹر فوراً نہیں آسکتا تھا۔ اور دائی کے لانے میں بھی دیر ہوئی اگر موجود بھی ہوتی تو اس سے وضع حمل میں کوئی مدد نہ ملتی۔ مجھے خود دائی کا کام کرنا پڑا۔ ڈاکٹر ترمونداس کی کتاب کا مطالعہ بہت کام آیا میرے اوسان قائم رہے۔ ذرا بھی ہراس نہیں ہوا۔

میرے خیال میں بچے کی مناسب تربیت کے لئے یہ ضروری ہے کہ والدین ان کی پرورش اور پرداخت کے عام اصول جانتے ہوں ان اصولوں کے مطالعے سے ہر ہر قدم پر فائدہ محسوس ہوا۔ اگر میں ان باتوں کو سیکھ کر کام میں نہ لاتا تو میرے بچوں کی عام صحت اتنی اچھی نہ ہوتی تھی اچھی اب ہے ہمارے دل میں ایک غلط خیال یہ جم گیا ہے کہ بچے کو اپنی زندگی کے پہلے پانچ سال میں کچھ

سیکھنا نہیں پڑتا حالانکہ واقعہ بالکل برعکس ہے بچہ پہلے پانچ سال میں جو چیز سیکھتا ہے وہ بڑا ہو کر کبھی نہیں سیکھ سکتا بچے کی تعلیم حمل قرار پاتے ہی شروع ہو جاتی ہے۔ اس خاص لحظے میں والدین کی جو جسمانی اور ذہنی حالتیں ہوتی ہیں وہ بچے میں پیدا ہو جاتی ہیں۔ پھر عمل کے زمانے میں اس پر ماں کی کیفیتوں، خواہشوں مزاج اور طرز معاشرت کا اثر پڑتا رہتا ہے ولادت کے بعد بچہ والدین کے حرکات و سکنات کی نقل کرتا ہے۔ اس لئے بہت برسوں تک اس کی نشوونما بالکل انہیں پر منحصر ہوتی ہے جو میاں بیوی ان باتوں کو سمجھ لیں گے وہ کبھی محض اپنی شہوانی خواہش پوری کرنے کے لئے مباشرت نہ کریں گے بلکہ صرف اس وقت ہمبستر ہوں گے جب انہیں اولاد کی خواہش ہو۔ میرے نزدیک یہ خیال انتہائی جہالت پر مبنی ہے کہ جماع بھی کھانے پینے کی طرح جسم کی ایک مستقل ضرورت ہے۔ یہ وہ فعل ہے جس پر دنیا کے وجود کا انحصار ہے اور چونکہ دنیا شاید حقیقی کی بازی گاہ اور اس کے حسن کی جلوہ گاہ ہے اس لئے اس فعل کو راہ پر لگا کر اس سے دنیا کی مستظم نشوونما کا کام لینا چاہئے۔ جس شخص پر یہ حقیقت کھل جائے گی وہ دل میں ٹھان لے گا کہ چاہے کچھ بھی ہو جائے شہوانی خواہش کو ضبط کرنا چاہئے اور بچوں کی جسمانی، ذہنی اور روحانی فلاح کے طریقے خود سیکھنا اور آئندہ نسلوں کو سکھانا چاہئے۔

”برہمچاریہ“ (۱)

اب ہم اس موقع پر پہنچ گئے ہیں جب میں برہمچاریہ کا عہد کرنے کی فکر میں غلطاں و جچاں رہا کرتا تھا۔ میں شادی کے بعد سے ایک بیوی کا پابند رہنے کا قائل تھا۔ کیونکہ بیوی سے عہد وفا نبھانے کو بھی میں حق کی محبت کا ایک جزو سمجھتا تھا۔ مگر یہ حقیقت مجھ پر جنوبی افریقہ آنے کے بعد کھلی کہ بیوی سے ”برہمچاریہ“ (1) برتنا ضروری ہے۔

میں یہ ٹھیک نہیں بتا سکتا کہ کس چیز نے یا کس کتاب نے مجھے اس طرف توجہ دلائی۔ مگر مجھے یہ خیال پڑتا ہے کہ اس میں جزو غالب رائے چند بھائی کا اثر تھا جن کا میں پہلے ذکر کر چکا ہوں۔ مجھ سے ان سے اس معاملے میں جو باتیں ہوئی تھیں وہ مجھے اب تک یاد ہیں، میں نے ان سے مسٹر گلڈاسٹن کی تعریف کی تھی کہ وہ اپنے شوہر کی بڑی وفادار ہیں۔ میں نے کہیں پڑھا تھا کہ وہ مسٹر گلڈاسٹن کے لئے دارالعوام میں خود چائے بنتی ہیں اور یہ بھی ان دونوں کی بااصول زندگی کا ایک اصول بن گیا ہے۔ میں نے یہ واقعہ رائے چند بھائی سے بیان کیا اور اسی سلسلے میں کہا میاں بیوی کی محبت بھی کیا اچھی چیز ہے۔ انہوں نے مجھ سے پوچھا ”تم ان دونوں چیزوں میں سے کسے زیادہ قابل قدر سمجھتے ہو۔ اس محبت کو جو یہ خاتون بیوی کی حیثیت سے مسٹر گلڈاسٹن سے رکھتی ہیں یا اس پر غلوں خدمت کو جو وہ بغیر ان تعلقات کے انجام دیتی ہیں؟ فرض کرو وہ ان کی بہن یا خادمہ ہوئیں اور ان کا اتنا ہی خیال رکھتیں جتنا اب رکھتی ہیں۔ تو کیا تو ان کی تعریف کرتے؟ کیا ایسے بہنوں یا پیش خدمتوں کی مثالیں موجود نہیں ہیں؟ فرض کرو تمہارا کوئی خدمت گار تم سے اتنی ہی محبت رکھتا اور تمہاری ایسی ہی خدمت کرتا تو تمہیں ایسی ہی خوشی ہوتی جو مسٹر گلڈاسٹن کے معاملے میں ہوتی ہے؟ ذرا اس پلٹ پر جو میں نے سمجھائی ہے غور کرنا۔“

رائے چند بھائی کی بھی شادی ہو چکی تھی۔ مجھے خیال پڑتا ہے کہ اس وقت ان کے الفاظ بہت تلخ معلوم ہوتے تھے مگر انہوں نے میرے دل کو تسخیر کر لیا۔ میں نے سوچا کہ واقعی خادم کی وفاداری بیوی کی محبت سے بدرجہا قابل تعریف ہے، بیوی کو میاں سے محبت ہونا کوئی تعجب کی بات نہیں کیونکہ ان دونوں میں وہ رشتہ ہوتا ہے جو کبھی نہیں ٹوٹ سکتا۔ یہ ایک بالکل قدرتی چیز ہے۔ لیکن نوکر کو آقا سے اتنی محبت پیدا کرنے کے لئے خاص کوشش کی ضرورت ہوتی ہے۔ شاعر کا نقطہ نظر آہستہ آہستہ میری سمجھ میں آنے لگا۔

میں نے اپنے دل میں کہا تو پھر مجھے اپنی بیوی سے کس طرح کا تعلق رکھنا چاہیے؟ کیا وفاداری اسی کا نام ہے کہ میں اسے اپنی شہوت رائی کا ذریعہ بناؤں؟ جب تک میں نفسانی خواہشوں کا بندوہوں میری وفاداری کوئی قدر قیمت نہیں رکھتی انصاف کی یہ بات ہے کہ میری بیوی کبھی مجھے ترغیب نہیں دلا تیں۔ اس لئے اگر میں دل پر رکھ لوں تو ”برہمچاریہ“ کا عہد کرنا کوئی بڑی بات نہیں، جو کچھ وقت ہے وہ میرے ارادے کی کمزوری اور میری بواہوسی کے سبب سے ہے۔

میرے ضمیر میں یہ احساس پیدا ہونے کے بعد بھی مجھے دوبارہ ناکامی ہوئی۔ اس ناکامی کا سبب یہ ہوا کہ میری سعی کا محرک کوئی اعلیٰ جذبہ نہ تھا۔ میرا اصلی مقصد یہ تھا کہ اور بچے نہ ہوں۔ انگلستان کے قیام کے زمانے میں میں نے بالغ عمل تندیروں کے متعلق کتابیں پڑھی تھیں۔ میں نے جو باب نباتاتی مشرب کے متعلق لکھا ہے۔ اس میں ڈاکٹر ایملینسن کی انضباط ولادت کا ذکر کیا ہے۔ اس کا مجھ پر کچھ عارضی اثر ہوا تھا لیکن اس سے زیادہ اور دیرپا اثر ڈاکٹر ہلس کے خیالات کا ہوا جو ان طریقوں کے مخالف تھے اور بیدنی کوشش کے بجائے اندرونی کوشش پر یعنی ضبط نفس پر زور دیتے تھے۔ اس لئے جب میں نے دیکھا کہ مجھے اور بچوں کی خواہش نہیں ہے تو میں ضبط نفس کی سعی کرنے لگا۔ یہ بڑا کٹھن کام تھا۔ ہم میاں بیوی الگ الگ کمروں میں سونے لگے۔ میں نے یہ التزام کیا کہ بستر پر اس وقت تک نہ جاؤں گا جب تک دن بھر کے کام سے تھک کر چور نہ ہو جاؤں گا۔ بقا پر یہ کوششیں زیادہ کارگر نہیں معلوم ہوتی تھیں لیکن جب میں پچھلے زمانے پر غور کرتا ہوں تو خیال ہوتا ہے کہ ان ناکام کوششوں کا اثر آہستہ آہستہ ہوتا رہا اور آخری فیصلہ اسی مجموعہ اثر کا نتیجہ تھا۔

قطعی ارادہ میں نے کہیں 1906ء میں جا کر کیا۔ اس وقت تک ہستیاگرہ شروع نہیں ہوا تھا بلکہ مجھے اس کا سان گمان تک نہ تھا۔ میں جنگ بوئر کے تھوڑے دن بعد زولو بغاوت کے زمانے میں نٹال کے شہر جوہانسبرگ میں وکالت کر رہا تھا میں نے اپنا فرض سمجھ کر اپنی خدمات نٹال کی

حکومت کے سامنے پیش کیں اور میری درخواست قبول ہوئی۔ اس کی تفصیل آگے چل کر معلوم ہو گی۔ یہاں تو مجھے صرف یہ کہنا ہے کہ اس کام کے سلسلے میں میں نے بڑے انہماک سے ضبط نفس کے مسئلے پر غور کرنا شروع کیا اور معمول کے مطابق اپنے رفیقوں سے اس پر مبادلہ خیالات کیا۔ مجھے یہ یقین ہو گیا کہ توالد و تیناسل کا مشغلہ قومی خدمت کے منافی ہے۔ مجھے زولو "بغاوت" کی مہم میں کام کرنے کی وجہ سے میرا جوہانسبرگ کا گھر بار درہم برہم ہو گیا اپنی خدمات پیش کرنے کے ایک مہینے کے اندر مجھے وہ مکان چھوڑنا پڑا جسے میں نے اتنی محنت سے آراستہ کیا تھا۔ میں اپنی بیوی بچوں کو فینکس (2) لے گیا اور وہاں اس ہندوستانی ایسوسی ایشن کور کی نگرانی کرنے لگا جو نٹال کی فوج کے ساتھ تھی۔ ہمیں روز کڑی منزلیں طے کرنا پڑتی تھیں ایک بار چلتے چلتے یہ خیال بجلی کی لہر کی طرح میرے ذہن میں دوڑ گیا کہ اگر میں اپنے آپ کو قوم کی خدمت کے لئے وقف کرنا چاہتا ہوں تو مجھے بال بچوں اور دھن دولت کا خیال چھوڑ کر "دنا پرست" یعنی مرد مجرد کی زندگی بسر کرنا چاہئے۔

"بغاوت" کی مہم میں میرے کل چھ ہفتے صرف ہوئے۔ مگر یہ مختصر عرصہ میری زندگی میں بہت اہم ثابت ہوا۔ نذر اور عہد کی حقیقت میرے دل پر پہلے سے زیادہ روشن ہو گئی۔ مجھے یہ معلوم ہو گیا کہ عہد سے سچی آزادی کا دروازہ بند نہیں ہوتا بلکہ کھلتا ہے۔ اب تک مجھے کامیابی نہ ہونے کی وجہ یہ تھی کہ میرا ارادہ مضبوط نہ تھا اور مجھے اپنی ذات پر اور توفیق الہی پر بھروسہ نہ تھا اور میرا دل شک کے ظلامت خیر سمندر میں بچکولے کھا رہا تھا۔ میں نے دیکھا کہ عہد نہ کرنے سے انسان ترفیہوں میں گرفتار ہو جاتا ہے اور عہد کر لینا گویا نفس پرستی سے گذر کر سچی ازدواجی زندگی میں قدم رکھنا ہے جو شخص یہ کہے "میں کوشش کا قائل ہوں، عہد کر کے اپنے ہاتھ پیر باندھنا نہیں چاہتا۔" تو وہ یہ ثابت کرتا ہے کہ اس کی طبیعت کمزور ہے اور جس چیز سے وہ بچتا ہے اس کی تمنا اس کے دل کے کسی گوشے میں چھپی ہوئی ہے۔ ورنہ آخری فیصلہ کرنے میں کون سی ایسی دشواری ہے؟ کہ جس سانپ کے متعلق میں جانتا ہوں کہ یہ مجھے ڈسے گا اس سے بھاگنے کا میں قطعی عہد کر لیتا ہوں۔ محض بھاگنے کی کوشش پر قناعت نہیں کرتا مجھے معلوم ہے کہ محض کوشش کرنے میں یقینی موت کا احتمال ہے محض کوشش کے معنی تو یہ ہونے کہ میں اس یقینی بات سے بے خبر ہوں کہ سانپ میری جان لیکر رہے گا اسی طرح ہر معاملے میں محض کوشش سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ کسی خاص عمل کی ضرورت بھی اچھی طرح ذہن نشین نہیں ہوتی ہے ہمارے دل میں اکثر اس قسم کے شے پیدا ہوتے ہیں۔ "فرض کر دو کہ میرے خیالات آگے چل کر بدل جائیں" میں عہد کر کے اپنی آزادی کیوں

کھو دوں؟ مگر ایسے شے بھی یہی ظاہر کرتے ہیں کہ جس چیز کو چھوڑنا ہے اس کے ترک کے متعلق ابھی ہمارے خیالات پوری طرح صاف نہیں ہوئے اسی لیے نکلنا نہ کہنا ہے۔

”اشیاء کا ترک بغیر خواہشات کے ترک کے کاغذ کی ناڈ ہے۔“

اس لئے اگر واقعی کسی شے کی خواہش دل سے نکل گئی ہے تو اس کے ترک کا عہد لازمی اور قدرتی بات ہے۔

حوالہ جات

1. تجرد - عصمت کی زندگی۔
2. نسا کاروں کا دستہ جو زخمیوں اور بیماروں کی خدمت کے لئے فوج کے ساتھ رہتا ہے۔

”برہمچاریہ“ (۲)

اچھی طرح بحث کرنے کے بعد اور خوب سوچ سمجھ کر میں نے 1906ء میں برہمچاریہ کا عہد کر لیا۔ میں نے ابھی تک اپنے خیالات کا ذکر اپنی بیوی سے نہیں کیا تھا مگر عہد کرتے وقت میں نے ان سے مشورہ کیا۔ انہوں نے بے تامل منظور کر لیا۔ مگر آخری فیصلہ کرنا میرے لئے سہل نہ تھا۔ میری ہمت جواب دے رہی تھی۔ میری سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ اپنے جذبات کو کیوں روکوں۔ اس زمانے میں یہ عجیب بات معلوم ہوتی تھی کہ شہر اپنی بیوی سے ہمہستر ترک کر دے۔ مگر میں خدا کا نام پلے کر اور اس کی مدد پر بھروسہ کر کے عہد کر گزرا۔

جب میں اس عہد کے بعد کی زندگی جسے اب بیس سال ہو گئے غور کرتا ہوں تو میرا دل خوشی اور رحمت سے معمور ہو جاتا ہے ضبط نفس کی کوشش میں 1901ء سے کر رہا تھا اور اس میں کم و بیش کامیابی ہی ہوئی تھی۔ لیکن خوشی اور آزادی کا احساس عہد کرنے کے بعد ہوا اور وہ پہلے کبھی نہیں ہوا تھا عہد کرنے سے پہلے مجھے ہر وقت ترغیب سے مغلوب ہو جانے کا خوف رہتا تھا اب یہ عہد ہر ترغیب کے مقابلے میں سپر کا کام دیتا تھا۔ برہمچاریہ کی عظیم الشان قوت کا مجھے روز بروز یقین ہوتا جاتا تھا۔ عہد کرنے کے وقت میں فینکس میں تھا۔ ایسبولینس کے کام سے فارغ ہوتے ہی وہاں آیا تھا۔ فینکس سے میں جوہانسبرگ واپس آ گیا۔ یہاں آئے ایک مہینے کے قریب ہوا تھا کہ ستیاگرہ شروع ہو گیا۔ گویا برہمچاریہ کا عہد مجھے بغیر میرے علم کے اس کے لئے تیار کر رہا تھا۔ ستیاگرہ کوئی پہلے سے سوچی ہوئی تجویز نہ تھی۔ یہ خود بخود میرے بغیر ارادے کے شروع ہو گئی لیکن یہ میں جانتا تھا کہ یہ میری پچھلی تمام جدوجہد کا لازمی نتیجہ ہے۔ میں نے جوہانسبرگ میں اپنے مصارف بہت گھٹا دیئے تھے اور فینکس آکر ”برہمچاریہ“ کا عہد کر لیا تھا۔

یہ بات شاستروں کے مطالعے سے نہیں سیکھی تھی کہ مکمل ”برہمچاریہ“ سی ”برہما“ کی معرفت حاصل ہوتی ہے۔ مجھے تجربے سے آہستہ آہستہ یہ احساس ہو گیا تھا۔ اس کے متعلق شاستروں کے ”اشلوک“ میری نظر سے آگے چل کر گزرے۔ عہد کے بعد سے مجھے روز بروز اس حقیقت کا علم ہوتا جاتا ہے کہ ”برہمچاریہ“ میں ہمارے جسم، ہمارے ذہن اور ہماری روح کی سلامتی ہے۔ کیونکہ اب ”برہمچاریہ“ میرے لئے کوئی کٹھن ریاضت کا معاملہ نہ تھا بلکہ تسکین اور راحت کا سرچشمہ۔ ہر روز مجھے اس میں ایک نئی خوبی نظر آتی تھی۔

لیکن اگر یہ میرے لئے روز افزوں مسرت کا سرمایہ تھا تو اس کے یہ معنی نہیں کہ یہ کوئی سہل کام تھا۔ اب چھپن سال کی عمر میں بھی مجھے اس کی دشواریاں محسوس ہوتی ہیں مجھے روز بروز یقین ہوتا جاتا ہے کہ ”برہمچاریہ“ برتنا گویا تلوار کی دھار پر چلنا ہے اور اس میں انسان کو ہر لحظہ ہوشیار رہنا چاہئے کہ کہیں قدم ڈگمگانہ جائے۔

اس عہد کی پابندی کے لئے پہلی ناگزیر شرط یہ ہے کہ انسان ذائقے کے معاملے میں ضبط نفس سے کام لے۔ میں نے دیکھا کہ ذائقے کو پوری پوری طرح قابو میں رکھنے سے اس کی پابندی بہت آسان ہو جاتی ہے۔ اس لئے اب میں غذا کے متعلق جو تجربے کرتا تھا۔ ان میں سے صرف نباتاتی مشرب کی رعایت نہ ہوتی تھی بلکہ برہمچاری، نقطہ کا بھی لحاظ تھا۔ ان تجربوں سے میں نے یہ نتیجہ نکالا ”برہمچاری“ کی غذا قلیل، سادہ، بے مسالے کی اور ممکن ہو تو بے پکی ہونا چاہئے۔

چھ سال کے تجربے سے مجھے یہ معلوم ہوا ہے کہ برہمچاری کے لئے بہترین غذا تازہ پھل اور اخروٹ، مونگ پھلی وغیرہ ہیں۔ اس غذا کے استعمال کے دوران میں میرا دل شہوانی خواہشوں سے جس قدر پاک رہا اتنا اس کے چھوڑنے کے بعد کبھی نہیں رہا۔ جنوبی افریقہ میں جہاں میں سوائے تر اور خشک میوؤں کے کچھ نہیں کھاتا تھا مجھے ”برہمچاریہ“ کے لئے کوئی خاص سعی نہیں کرنا پڑتی تھی۔ لیکن جب سے میں نے دودھ کا استعمال شروع کیا ہے اس عہد کی پابندی کے لئے بڑی سخت کوشش کی ضرورت ہوتی ہے۔ یہ آگے چل کر معلوم ہو گا کہ میں نے پھل چھوڑ کر دودھ کی طرف کیوں رجوع کیا۔ یہاں صرف اتنا کہہ دینا کافی ہے کہ میرے نزدیک دودھ کے استعمال سے یقیناً ”برہمچاریہ“ برتے میں دشواری ہوتی ہے۔ اس سے یہ نتیجہ نہیں نکالنا چاہئے کہ ہر برہمچاری کے لئے دودھ ترک کر دینا لازمی ہے۔ یہ تو متعدد تجربوں کے بعد بھی معلوم ہو سکتا ہے کہ مختلف غذاؤں کے استعمال کا ”برہمچاریہ“ پر کیا اثر پڑتا ہے مجھے اب تک دودھ کا کوئی ایسا بدل نہیں مل سکا جو

عضلات کی نشوونما میں بھی مدد دیتا ہو اور آسانی سے ہضم بھی ہو جاتا ہو۔ میں نے ڈاکٹروں، دیدوں، حکیموں سب سے پوچھ دیکھا مگر کوئی مجھے ایسی چیز نہ بتا سکا اس لئے گو میں جانتا ہوں کہ دودھ ایک محرک ہے مگر میں فی الحال کسی کو اس کے ترک کرنے کا مشورہ نہیں دے سکتا۔

”برہمچاریہ“ کو مدد دینے کی خارجی تدبیروں میں سے روزہ بھی استنا ہی ضروری ہے جتنی غذا کی سادگی اور قلت صحت کی خواہشیں اتنی قوی ہیں کہ انہیں قابو میں رکھنے کے لئے جب تک ہر طرف سے گھیرا نہ ڈالا جائے کام نہیں چلتا ہر شخص جانتا ہے کہ غذا نہ ملنے سے ان کا زور ٹوٹ جاتا ہے۔ اس لئے میرے نزدیک حیات کو قابو میں لانے کی غرض سے روزہ رکھنا بہت مفید ہے۔ بعض لوگوں کو اس سے کچھ فائدہ نہیں پہنچتا کیونکہ یہ سمجھ کر کہ محض فاقے سے شہوانی خواہشوں سے نجات مل جائے گی وہ معدہ کو خالی رکھتے ہیں مگر تصور میں طرح طرح کی لذتوں کے مزے لیا کرتے ہیں اور ہر وقت سوچا کرتے ہیں کہ جب روزہ کھولیں گے تو یہ کھائیں گے اور یہ پیئیں گے۔ اس طرح کے نہ روزے سے نہ تو ذائقے کو قابو میں لانے میں مدد ملتی ہے اور نہ شہوانی خواہش کو دبانے میں۔ روزہ تبھی مفید ہوتا ہے جب دل بھی بھوکے جسم کے ساتھ دے یعنی جن چیزوں کو جسم نے ترک کیا ہے ان سے دل بھی بھر جائے دل ہی شہوانی خواہشوں کی جڑ ہے اس لئے روزہ کا فائدہ محدود ہے کیونکہ ممکن ہے کہ روزہ رکھ کر انسان بدستور خواہشوں میں گھرا رہے پھر بھی شہوانی خواہشوں کا استیصال بیروزے کے ناممکن ہے۔ اس لئے ”برہمچاریہ“ میں یہ ایک ناگزیر چیز ہے ”برہمچاریہ“ کے بہت سے طالب اس وجہ سے ناکامیاب ہوتے ہیں کہ دوسری خواہشوں کی باگ وہ اس طرح ڈھیلی چھوڑ دیتے ہیں جیسے غیر برہمچاری۔ اس لئے ان کی مثال اس شخص کی سی ہے جو انتہائی گرمی میں یہ کوشش کرتا ہے کہ کڑا کے کے جاڑے کا لطف اٹھائے۔ برہمچاری اور غیر برہمچاری کی زندگی میں نمایاں حد فاصل ہونا چاہئے۔ دونوں میں جو مشابہت ہے وہ محض دیکھنے کی ہے اور وہ جو فرق ہے وہ روز روشن کی طرح ظاہر ہے دونوں اپنی آنکھوں سے کام لیتے ہیں مگر برہمچاری ان سے خدا کے جلوؤں کا مشاہدہ کرتا ہے اور دوسرا شخص بے حقیقت کھلونوں سے کھیلتا ہے دونوں اپنے کانوں کو کام میں لاتے ہیں مگر پہلا ذرے ذرے سے خدا کی حمد سن کر وجد کرتا ہے اور دوسرا واہیات باتوں پر سرد ہنستا ہے۔ دونوں اکثر رات کو دیر تک جاگتے ہیں مگر پہلا سارا وقت عبادت میں بسر کرتا ہے اور دوسرا بہبودہ رنگ رلیوں میں گنواتا ہے۔ دونوں کھانا کھاتے ہیں مگر پہلا صرف اس لئے کھاتا ہے کہ اس کا جسم جو خدا کا گھر ہے صحت کے ساتھ قائم رہے اور دوسرا دنیا بھر کی

چیزیں ٹھونس کر اس پاک گھر کو گندی نالی بنا دیتا ہے۔ غرض دونوں میں بعد المشرقین ہے اور جوں جوں دن گزرتے جائیں گے یہ فاصلہ کم نہیں ہو گا بلکہ اور بڑھتا جائے گا۔

”برہمچاریہ“ کے معنی ہیں خیال قول اور فعل میں ضبط نفس سے کام لینا۔ مجھے کو روز بروز اس قسم کے ضبط کی ضرورت کا احساس بڑھتا جاتا ہے۔ ترک لذات کی بھی ”برہمچاریہ“ کی طرح کوئی حد نہیں۔ مکمل ”برہمچاریہ“ انسان کی کوشش سے حاصل نہیں ہو سکتا۔ بہت سے لوگوں کے لئے یہ محض ایک نصب العین رہے گا۔ ”برہمچاریہ“ کے طالب کو ہمیشہ اپنی کوتاہیوں کا احساس رہتا ہے اور اپنے دل کے گوشوں سے چھپی ہوئی خواہش کھود کھود کر نکالتا ہے اور ان سے نجات پانے کی کوشش کرتا ہے جب تک خیال پوری طرح ارادے کا تابع نہ ہو جائے مکمل ”برہمچاریہ“ حاصل نہیں ہو سکتا۔ غیر ارادی خیال ایک نفسی کیفیت ہے اور اسے دبانے کے یہ معنی ہیں کہ انسان اپنے نفس کو دباتا ہے جو کہ ہوا کو دبانے سے بھی زیادہ مشکل ہے، تاہم چونکہ انسان کے دل میں خدا کا جلوہ موجود ہے اس لئے وہ نفس کو بھی قابو میں لا کر مانتا ہے۔ یہ چیز مشکل ضرور ہے مگر ہی ہرگز نہیں سمجھنا چاہئے کہ یہ ناممکن ہے۔ یہ سب سے اعلیٰ مقصد ہے اس لئے کوئی تعجب نہیں کہ اسے حاصل کرنے کے لئے سب سے زیادہ کوشش کرنا پڑتی ہے۔

مگر یہ بات مجھے ہندوستان آکر معلوم ہوئی کہ ایسا ”برہمچاریہ“ محض انسان کی کوشش سے حاصل نہیں ہو سکتا۔ اس وقت میں اس دھوکے میں تھا کہ محض پھل کھانے کا التزام تمام نفسانی خواہشوں کو مٹا دینے کے لئے کافی ہے۔ اور میں نے یہ سمجھ رکھا تھا کہ مجھے کسی اور تدبیر کی ضرورت نہیں۔

مگر مجھے اپنی روحانی کشمکش کی داستان وقت سے پہلے بیان نہیں کرنا چاہئے۔ البتہ یہاں میں اتنا کہہ دینا چاہتا ہوں کہ جو لوگ خدا کی معرفت حاصل کرنے کے لئے ”برہمچاریہ“ برتنا چاہتے ہیں انہیں مایوس نہیں ہونا چاہئے بشرطیکہ انہیں خدا پر عقیدہ اور اپنی سعی پر بھروسہ ہو۔

پرہیزگاروں کے نفس سے محسوس اشیاء کا خیال دور ہو جاتا ہے مگر ان کی لذت کا اثر رہ جاتا ہے جب خدائے برتر کی معرفت حاصل ہوئی ہے تو یہ اثر بھی زائل ہو جاتا ہے۔ ”(بھگوت گیتا (2-59))

اس لئے ”موکشا“ کے طالب علموں کے لئے آخری وسیلہ خدا کا نام ہے اور اس کی توفیق ہے۔ یہ حقیقت مجھ پر ہندوستان آنے کے بعد کھلی۔

سادہ زندگی

میں نے عیش و آرام کی زندگی شروع کی تھی مگر یہ صرف چند روز رہی۔ گو میں نے اپنے مکان کو آراستہ کرنے میں بہت اہتمام کیا تھا مگر مجھے اس سے کوئی وابستہ نہیں تھی۔ تھوڑے ہی عرصے میں میں نے مصارف میں کزیونت شروع کر دی، میرا دھوبی ایک تو دھلائی بہت لیتا تھا۔ دوسرے وقت پر کپڑے نہیں دیتا تھا اس لئے دو تین درجن قمیض اور کالر بھی میرے لئے کافی نہیں ہوتے تھے۔ کالر روز بدلتا پڑتا تھا اور قمیض روز نہیں تو ایک دن بچ۔ اس سے بہت خرچ پڑ جاتا تھا جو میرے خیال میں بالکل فضول تھا۔ اس خرچ کو بچانے کے لئے میں نے کپڑے دھونے کا سامان خریدا اور اس مضمون پر کتاب خرید کر پڑھی اس طرح میں نے کپڑے دھونا سیکھ لیا۔ اور اپنی بیوی کو بھی سکھا دیا۔ اس سے میرا کام تو ضرور بڑھ گیا مگر ایک نئی چیز تھی اس لئے لطف بھی آتا تھا۔

میں نے جو پہلا کالر اپنے ہاتھ سے دھویا تھا وہ ہمیشہ یاد رہے گا میں نے کالر میں پچ ضرورت سے زیادہ تھوپ دی۔ استری کافی گرم نہیں کی اور اور جلنے کے خوف سے کالر کو اچھی طرح دیا بھی نہیں۔ اس کا یہ نتیجہ ہوا کہ کالر خاصا سخت تو ہو گیا مگر اس میں پچ ٹپکتی جاتی تھی یہی کالر لگا کر عدالت میں گیا۔

میرے ہم چشم بیرسٹروں نے میرا مذاق اڑایا۔ مگر مجھے اس زمانے میں بھی اس کی کوئی پروا نہ تھی کہ لوگ مجھ پر نہیں گے۔

میں نے کہا۔ ”بھئی بات یہ ہے کہ مجھے اپنے ہاتھ سے کالر دھونے کا یہ پہلا موقع ہے اس لئے پچ بھری رہ گئی مگر میرا اس میں کوئی ہرج نہیں اور یہ فائدہ بھی ہے کہ آپ لوگوں کیلئے

تفریح کا سامان ہو گیا۔

ایک دوست نے پوچھا "آخر کیوں؟ کیا یہاں دھوبیوں کی کمی ہے؟ میں نے جواب دیا، دھلائی بہت دینا پڑتی ہے کالر کی دھلائی قریب قریب اتنی ہی ہے جتنی اس کی قمیص اور پھر ہمیشہ دھوبی کا پابند رہنا پڑتا ہے۔ اس سے میں بہتر سمجھتا ہوں کہ اپنے کپڑے اپنے ہاتھ سے دھوؤں۔"

مگر میں اپنے دوستوں کو اپنی مدد آپ کرنے کی خوبی محسوس نہ کر سکا۔ تھوڑے دن میں مجھے اتنی مہارت ہو گئی کہ اپنے کپڑے بڑی آسانی سے دھولیتا تھا اور میرے دھوئے کپڑے دھوبی کے یہاں کے کپڑوں سے کسی طرح برے نہیں ہوتے تھے، میرے کالر ویسے ہی سخت اور چمکدار ہوتے تھے جیسے دوسروں کے۔ جب گو کھلے جنوبی افریقہ آئے تو ان کے پاس ایک مغلر تھا جو انہیں مہادیو گوند رانا ڈانے تحفے کے طور پر دیا تھا وہ اس نشانی کو بہت عزیز رکھتے تھے اور صرف خاص خاص موقعوں پر استعمال کرتے تھے۔ جب جوہانسبرگ کے ہندوستانیوں نے ان کے اعزاز میں ڈنر دیا تو اس کے باندھنے کا موقع آیا مگر یہ مل دیا گیا تھا اور اس پر استری کی ضرورت تھی اتنا دولت نہ تھا کہ دھوبی کے یہاں دھلویا جائے۔ میں نے کہا لائیے میں اپنا ہنر آزماؤں۔

گو کھلے نے کہا "میں دکالت میں تمہاری قابلیت پر بھروسہ کر سکتا ہوں۔ مگر دھوبی کے کام میں نہیں تم نے اسے خراب کر دیا تو پھر میں کیا کروں گا؟ تم جانتے ہو یہ مجھے کس قدر عزیز ہے؟" یہ کہہ کر انہوں نے بڑے شوق سے اس تحفے کے ملنے کا قصہ سنایا۔ مگر میں نے اصرار کیا اور انہیں یقین دلایا کہ میں بہت عمدگی سے کام کروں گا۔ آخر اجازت مل گئی اور میں نے اس پر استری کر دی جسے دیکھ کر وہ میرے ہنر کے قائل ہو گئے۔ اس کے بعد چاہے ساری دنیا اس سے انکار کرتی مجھے کوئی پروا نہ تھی۔

جس طرح میں نے دھوبی کی پابندی سے نجات پائی اسی طرح نائی کا بھی محتاج نہیں رہا۔ وہ لوگ جو انگلستان جایا کرتے ہیں سب کے سب داڑھی مونڈھنا سیکھ جاتے ہیں۔ لیکن جہاں تک مجھے معلوم ہے اپنے ہاتھ سے بال کاٹنا کوئی بھی نہیں سیکھتا۔ مجھے یہ بھی سیکھنا پڑا۔ ایک بار میں پریٹوریا میں ایک انگریز حجام کے یہاں گیا اس نے حقارت کے انداز میں میرے بال کاٹنے سے انکار کیا۔ ظاہر ہے کہ مجھے اس سے تکلیف ہوئی۔ مگر میں نے فوراً ایک بال کاٹنے کی مشین خرید لی اور آئینہ سامنے رکھ کر اپنے بال کاٹنے لگا۔ سامنے کے بال کاٹنے میں تو مجھے کم و بیش کامیابی ہوئی۔ مگر گردن کے بال خراب ہو گئے۔ عدالت میں میرے دوست انہیں دیکھ کر ہنستے ہنستے لوٹ گئے۔

”گاندھی یہ تمہارے بالوں کو کیا ہوا۔ چوہے کتر کر لے گئے؟“

”نہیں یورپی حجام نے میرے کالے بالوں کو ہاتھ لگانے میں اپنی ذلت سمجھی۔ اس لئے میں نے یہ فیصلہ کیا ہے کہ اپنے ہاتھوں سے کاٹوں گا۔ چاہے کیسے ہی خراب کیوں نہ کٹیں۔“

اس جواب سے میرے دوستوں کو کوئی تعجب نہیں ہوا۔

حجام نے جو میرے بال کاٹنے سے انکار کیا اس میں اس کا قصور نہ تھا۔ اگر کالے آدمیوں کا کام کرتا تو اس کے یورپی گاہک چھوٹ جاتے۔ ہم بھی تو اپنے نائیوں کو اچھوتوں کا کام نہیں کرنے دیتے۔ مجھے اس سلوک کا بدلا جنوبی افریقہ میں ایک بار نہیں بیسیوں بار ملا۔ اور چونکہ میرا عقیدہ تھا کہ یہ ہمارے گناہوں کی سزا ہے اس لئے مجھے اس پر غصہ نہیں آیا۔

میری سادگی اور اپنی مدد آپ کرنے کے اصول نے آگے چل کر جو انتہائی صورتیں اختیار کر لیں ان کا ذکر مناسب موقع پر آئے گا۔ ان کا بیج بہت دن پہلے بویا جا چکا تھا۔ اس کے جڑ پکڑنے اور پھولنے پھلنے کے لئے صرف پانی دینے کی ضرورت تھی اور یہ آبیاری آہستہ آہستہ ہوتی رہی۔

جنگ بوئر

میں نے 1890ء سے 1896ء تک کے بہت سے واقعات کو چھوڑ کر صرف جنگ بوئر کا ذکر کرتا ہوں۔

اعلان جنگ کے وقت مجھے ذاتی طور پر بوئروں سے ہمدردی تھی۔ مگر ان دنوں میرا خیال تھا کہ ایسے معاملات میں مجھے یہ حق نہیں کہ دوسروں کو اپنی انفرادی رائے پر چلاؤں میں نے ”جنوبی افریقہ کی سنیاگرہ کی تاریخ“ میں اس اندرونی کشمکش کا ذکر تفصیل سے کیا ہے اور یہاں اسے دہرانے کی ضرورت نہیں۔ جن لوگوں کو اس کے معلوم کرنے کا شوق ہو وہ اس کتاب کو پڑھیں۔ یہاں صرف اتنا کہہ دینا کافی ہے کہ برطانوی حکومت کی وفاداری کے جذبے نے مجھے اس لڑائی میں انگریزوں کی طرف کھینچ لیا۔ میں نے سوچا اگر میں سلطنت برطانیہ کے شہری کی حیثیت سے حقوق کا طالب ہوں تو میرا فرض ہے کہ اس سلطنت کی حفاظت میں شرکت کروں۔ میرا ان دنوں یہ خیال تھا کہ ہندوستان کو کامل آزادی صرف سلطنت برطانیہ کی مدد سے اور اس کے ماتحت رہ کر حاصل ہو سکتی ہے۔ اس لئے مجھے جتنے ساتھی مل سکے سب کو جمع کر کے میں نے ایک ایسبولینس کور بنائی اور حکومت نے اس کی خدمات قبول کر لیں۔

انگریزوں کا عام طور پر یہ خیال تھا کہ ہندوستانی بزدل ہوتے ہیں۔ جو کھم سے گھبراتے ہیں اور ان کی نظر اپنے فوری فائدے سے آگے نہیں جاتی۔ اس لئے بہت سے انگریز دوستوں نے میری تجویز کی مخالفت کر کے میرے جوش کو ٹھنڈا کر دیا۔ مگر ڈاکٹر بوتھ نے دل و جان سے اس کی حمایت کی۔ انہوں نے ہماری ایسبولینس کور کو کام سکھایا۔ ہم نے اس کام کی اہلیت کے طبی تصدیق نامے حاصل کئے۔ مسٹر لاشن اور مسٹر ایسکو مب آنجہانی نے بڑے جوش کے ساتھ ہماری تجویز کی تائید

کی اور خدا خدا کر کے وہ دقت آیا کہ ہم میدان جنگ میں جانے کی درخواست کریں۔ حکومت نے ہمارا شکریہ ادا کیا لیکن یہ کہا کہ ابھی آپ کی خدمات کی ضرورت نہیں۔ مگر میں اس انکار سے ماتنے والا نہ تھا۔ ڈاکٹر بوتھ کے ذریعے سے میں مثال کے بشب (اسقف) سے ملا۔ ہماری کور میں بہت سے عیسائی بھی تھے وہ میری تجویز سن کر بہت خوش ہوئے اور انہوں نے وعدہ کیا کہ ہماری خدمات کو قبول کئے جانے میں مدد کریں گے۔

واقعات بھی ہمارا ساتھ دے رہے تھے۔ بوڑوں نے توقع سے زیادہ جرات بہادری اور استقلال دکھلایا۔ آخر ہماری خدمات قبول کر لی گئیں۔

ہماری کور میں کل گیارہ سو آدمی تھے جن میں چالیس افسر تھے۔ ان میں سے تین سو آزاد ہندوستانی تھے اور باقی سب پابند مزدور تھے۔ ڈاکٹر بوتھ بھی ہمارے ساتھ تھے۔ ہماری کور نے اچھا خاصا کام کیا۔ ہمارا مقام محاذ جنگ کے پیچھے تھا اور ہم صلیب احمر کی حفاظت میں تھے مگر ایک بار ایک نازک موقع پر ہم سے میدان جنگ میں کام لیا گیا۔ ہم تو خود یہی چاہتے تھے۔ ابتداء میں جنگی افسر ہمیں گولہ باری کی زد میں نہیں بھیجنا چاہتے تھے مگر اسپینوں کاپ کی پسپائی کے بعد صورت حال بدل گئی۔ ہمارے پاس جنرل بلر کا پیام آیا کہ گو آپ لوگ اس پر مجبور نہیں کہ اپنی جان خطرے میں ڈالیں لیکن آپ زخمیوں کو میدان جنگ سے لے آیا کریں تو حکومت آپ کی بہت ممنون ہوگی ہم نے بے تامل منظور کر لیا۔ اس لئے اسپینوں کاپ کے معرکے میں ہم خطہ جنگ پر موجود تھے ان دنوں ہمیں زخمیوں کو ڈولی میں اٹھا کر بیس چکیں میل روزانہ چلنا پڑتا تھا۔ بجز ان کے ہمیں جنرل دوڈھیٹ کے سے سپاہیوں کو اٹھانے کا فخر حاصل ہوا۔

چھ ہفتے کے کام کے بعد کور کے لوگ چھٹی پر بھیج دیئے گئے اسپینوں کاپ اور دال کراڑ کی شکستوں کے بعد برطانوی سپہ سالار نے لیڈی اسمتھ وغیرہ کو دھاوا کر کے مدد پہنچانے کا خیال ترک کر دیا اور یہ فیصلہ کیا کہ آہستہ آہستہ آگے بڑھیں تاکہ اس عرصے میں انگلستان سے اور ہندوستان سے مدد پہنچ جائے۔

اس موقع پر حقیر خدمت کی بہت تعریف کی گئی اور لوگوں کی نظر میں ہندوستانی کی وقعت بڑھ گئی۔ اخباروں نے مدحیہ نظمیں شائع کیں۔ ترجیح بند لکھے گئے جن کے آخر میں اس مضمون کا مصرعہ آتا تھا۔ "لاکھ کچھ ہو پھر ہم سلطنت کے فرزند ہیں۔"

جنرل بلر نے اپنی رپورٹ میں کور کے کام کی تعریف کی اور اس کے افسروں کو تمغہ جنگ

عنایت کیا۔

ہندوستانیوں میں تنظیم پہلے سے بہت بہتر ہو گئی مجھے پابند مزدوروں سے اچھی طرح ملنے کا موقع ملا۔ ان میں بیداری پیدا ہو گئی اور ان کے دل میں اسی خیال نے جڑ پکڑ لی کہ ہندو، مسلمان، عیسائی، گجراتی، سندھی سب بھارت ماتا کے بیٹے ہیں ہر شخص کو یقین تھا کہ اب ہندوستانیوں کی شکایتیں رفع کر دی جائیں گی۔ ان دنوں کے یورپیوں کے طرز عمل میں نمایاں فرق نظر آتا تھا۔ لڑائی کے زمانے میں ہم سے اور یورپیوں سے بہت اچھے تعلقات پیدا ہو گئے تھے ہمیں ہزاروں کوروں سے ملنے کا موقع ملا تھا۔ وہ ہم سے اچھی طرح پیش آتے تھے اور ہمارے شکر گزار تھے کہ ہم ان کی خدمت کے لئے آئے ہیں۔

میرا بے اختیار جی چاہتا ہے کہ یہاں ایک واقعے کا ذکر کروں۔ جس کی یاد بہت خوشگوار ہے۔ یہ اس بات کا ثبوت ہے کہ انسانی فطرت کی انتہائی خوبی آزمائش کے وقت ظاہر ہوتی ہے۔ ہم شیو کی کیمپ جا رہے تھے جہاں لارڈ رابرٹس کے بیٹے لیفٹنٹ رابرٹس نے کاری زخم کھا کر جان دی تھی۔ ہماری کور کو یہ فخر حاصل ہے کہ ان کی لاش میدان جنگ سے اٹھا کر لائی۔ اس روز بڑی سخت گرمی تھی۔ ہر شخص پیاس سے بیتاب تھا۔ راہ میں اک چھوٹا سا چشمہ تھا۔ جہاں ہم اپنی پیاس بجھا سکتے تھے۔ مگر سوال یہ تھا کہ پہلے کون پانی پینے جائے۔ ہم چاہتے تھے کہ پہلے گورے پی لیں تب ہم جائیں۔ مگر انہیں یہ گوارا نہ تھا اور وہ ہم سے اصرار کر رہے تھے۔ دیر تک یہ خوشگوار مقالہ ہوتا رہا جس میں ہر فریق دوسرے کو آگے بڑھا کر خود پیچھے رہنا چاہتا تھا۔

حفظانِ صحت کا اہتمام اور قحط کا امدادی کام

مجھے یہ بات ہمیشہ سے بری معلوم ہوتی ہے کہ ہنیت اجتماعی کا کوئی رکن بیکار رہے۔ مجھے یہ گوارا نہیں کہ اپنی قوم کی کمزوریوں پر پردہ ڈالوں یا ان سے چشم پوشی کروں۔ اگر میں ایک طرف اپنی قوم کے حقوق کے لئے لڑتا ہوں تو دوسری طرف اس کے عیوب کی اصلاح بھی کرتا ہوں۔ اس لئے جب میں نے نئال کی سکونت اختیار کی تھی میں ہندوستانیوں کے سرسے ایک الزام دور کرنے کی کوشش کر رہا تھا جو ان پر لگایا جاتا تھا۔ اور ایک حد تک بجا تھا۔ اکثر یہ کہا جاتا تھا کہ ہندوستانی پھومڑ ہوتے ہیں اپنے مکان اور گرد و پیش کی زمین صاف نہیں رکھتے قوم کے سربر آوردہ افراد اپنے مکانوں کی صفائی کرنے لگے تھے۔ مگر خانہ دار معائنہ صرف اس زمانے میں شروع ہوا جب ڈربن میں طاغون پھیلنے کا خوف تھا۔ میونسپلٹی کے ممبروں نے اس کام کو پسند کیا اور اس میں ہماری مدد کی کیونکہ وہ خود چاہتے تھے کہ ہم ان سے اتحاد عمل کریں۔ اس اتحاد عمل کی بدولت انہیں بھی آسانی ہوئی اور ہماری دتھیں بھی کم ہو گئیں کیونکہ جب کبھی وبا پھیلتی ہے تو انتظامی افسر عموماً بے صبری سے کام لے کر سختیاں شروع کر دیتے ہیں اور جن لوگوں سے خفا ہوتے ہیں ان سے تشدد کا برتاؤ کرتے ہیں۔ ہماری قوم نے خود حفظانِ صحت کی تدابیر پر عمل کرنا شروع کر دیا۔ اس لئے وہ اس تشدد سے محفوظ رہی۔

مگر مجھے بعض باتوں میں بڑی سخت مایوسی ہوئی۔ میں نے دیکھا کہ جب میں اپنی قوم کے لئے حقوق کا مطالبہ کرتا ہوں تو وہ بڑی خوشی سے ساتھ دیتی ہے مگر جب اس سے کہتا ہوں کہ اپنا فرض ادا کرے تو اتنی مستعدی نہیں دکھاتی۔ کہیں لوگوں نے مجھے ذلیل کیا اور کہیں اطلاق سے پیش آئے لیکن میری بات پر کوئی توجہ نہیں کی۔ لوگ اتنی زحمت نہیں اٹھانا چاہتے تھے کہ اپنے محلوں کو

صاف رکھیں۔ ان سے یہ توقع رکھنا کہ اس کام میں روپے سے امداد دیں بالکل فضول تھا۔ ان تجربوں سے مجھے اور بھی یقین ہو گیا کہ لوگوں کو کسی کام پر آمادہ کرنے کے لئے بے حد صبر کی ضرورت ہے۔ اصلاح کی فکر صرف اصلاح کرنے والوں کو ہوتی ہے سماج کو نہیں ہوتی۔ اس سے ماسوائے مخالفت، نفرت اور ایذا رسانی کے کوئی توقع نہیں رکھنا چاہئے۔ اصلاح کرنے والا جس چیز کو جان کے برابر عزیز رکھتا ہے اسے سماج تنزل سے تعبیر کرتی ہے اور کیوں نہ کرے؟۔

تاہم اس جدوجہد کا نتیجہ یہ ہوا کہ ہندوستانیوں کو اس ضرورت کا احساس ہو گیا کہ اپنے مکان اور محلے صاف رکھنا چاہئے۔ میری وقعت حکام کی نظر میں بڑھ گئی انہیں معلوم ہو گیا کہ ایک طرف میں اپنی قوم کی شکایتوں کو ظاہر کرتا ہوں اور حقوق پر زور دیتا ہوں تو دوسری طرف اس کی اندرونی اصلاح میں بھی اتنی ہی سرگرمی سے کام لیتا ہوں۔

البتہ ایک کام ابھی باقی تھا وہ یہ کہ نوآباد ہندوستانیوں کو یہ احساس دلایا جائے کہ بھارت ماتا کی محبت اور خدمت ان پر فرض ہے۔ ہندوستان غریب ملک ہے۔ نوآباد ہندوستانی دولت کی تلاش میں جنوبی افریقہ آتے ہیں انہیں چاہئے کہ اپنی کمائی کے ایک حصے سے اپنے ہموطنوں کی آڑے وقت مدد کریں۔ یہ فرض ان لوگوں نے اس قحط کے زمانے میں جو 1897 سے 1899 تک پڑا تھا انہوں نے 1897 میں قحط کے امدادی کام میں بہت معقول چندہ دیا اور 1899 میں اس سے بھی زیادہ دیا۔ ہم نے انگریزوں سے بھی چندہ مانگا اور انہوں نے اچھی خاصی رقم دی۔ پابند مزدوروں تک نے چندے میں شرکت کی اور یہ طریقہ جنوبی افریقہ میں قحط کے زمانے میں شروع ہوا تھا اور اب تک جاری ہے اور ہم دیکھتے ہیں کہ جب ہماری قوم پر مصیبت پڑتی ہے تو جنوبی افریقہ کے ہندوستانی برابر معقول رقمیں چندے میں بھیجتے ہیں۔

اس طرح میں نے جنوبی افریقہ میں جو خدمت ہندوستانیوں کی انجام دی اس سے مجھے ہر ہر قدم پر نئے نئے پہلو نظر آئے۔ حق ایک عظیم الشان درخت کی طرح ہے اور اسے جتنا زیادہ سنبھلے اتنا ہی زیادہ پھل دیتا ہے حق کے معدن کو جتنا گہرا کھودیے اتنے ہی زیادہ جواہرات ہاتھ لگتے ہیں یعنی سماج کی خدمت کے نت نئے اور بہتر موقعے ملتے ہیں۔

ہندوستان کو واپسی

جنگ کی خدمت سے فرصت پانے کے بعد مجھے یہ محسوس ہوا کہ میرا کام اب جنوبی افریقہ میں نہیں بلکہ ہندوستان میں ہے۔ اس کے یہ معنی نہیں کہ جنوبی افریقہ میں اب کچھ کرنے کے لئے نہ تھا بلکہ یہ خوف تھا کہ کہیں میرے دولت کا زیادہ حصہ روپیہ کمانے میں نہ صرف ہو جائے۔

وطن میں میرے احباب میری واپسی پر مصر تھے اور مجھے ہی خیال ہوا کہ میں ہندوستان کی زیادہ خدمت کر سکوں گا۔ جنوبی افریقہ کے کام کو سنبھالنے کے لئے خان صاحب اور منکمہ لال جی نظر موجود تھے۔ اس لئے میں نے اپنے رفیقوں سے رخصت کی درخواست کی۔ یہ درخواست بڑی مشکل سے منظور ہوئی اور وہ بھی اس شرط پر کہ اگر جنوبی افریقہ کے ہندوستانیوں کو ایک سال کے اندر میری ضرورت پڑی تو مجھے واپس آنا پڑے گا۔ مجھے یہ شرط بڑی سخت معلوم ہوئی مگر اس محبت کی وجہ سے جو مجھے اپنے وطنی بھائیوں سے تھی میں نے اسے منظور کر لیا۔ میرا بائی نے کہا ہے۔

”میرے مالک نے مجھے باندھ رکھا ہے محبت کے سچے دھاگے میں۔ میں اس کا غلام ہوں۔“
میرے لئے بھی برادرانہ رشتہ محبت کا توڑنا ممکن نہ تھا۔ زبان خلق نقارہ خدا کہلاتی ہے۔ میں اپنے دوستوں اور وطنی بھائیوں کے کہنے کو کیونکر ٹال سکتا تھا؟ میں نے یہ شرط قبول کر لی اور مجھے جانے کی اجازت مل گئی۔

میرے تعلقات اس زمانے میں صرف مثال تک محدود تھے۔ مثال کے ہندوستانیوں نے مجھ پر مہربان محبت کا مینہ برسایا۔ ہر جگہ رخصتی جلسوں کا انتظام کیا گیا اور مجھے تمیمی تحفے دیئے گئے۔

جب میں پہلی بار یہاں سے ہندوستان جا رہا تھا تب بھی مجھے تحفے دیئے گئے تھے۔ مگر اس مرتبہ رخصت میں بیچہ جوش و خروش تھا۔ تحفوں میں سونے چاندی کی چیزوں کے علاوہ بعض جڑواؤ

چیزیں بھی تھیں۔

مجھے ان تحفوں کے قبول کرنے کا کیا حق تھا؟ اگر میں انہیں قبول کر لیتا تو اپنے دل میں کیونکر سمجھتا کہ میں اپنے بھائیوں کی خدمت بلا معاوضے کر رہا ہوں؟ سوائے چند تحفوں کے جو میرے موکلوں نے دیئے تھے اور سب مجھے قومی خدمت کی وجہ سے دیئے گئے تھے۔ پھر میں اپنے موکلوں اور رفیقوں میں فرق بھی نہیں کر سکتا تھا کیونکہ میرے موکل بھی مجھے قومی کاموں میں مدد دیتے تھے۔

ایک سونے کا کنٹھا جس کی قیمت پچاس گنی تھی میری بیوی کو دیا گیا تھا لیکن یہ تحفہ بھی میری قومی خدمات کی وجہ سے ملا تھا۔ اس لئے اس میں دوسرے تحفوں میں کوئی فرق نہیں کیا جاسکتا تھا۔

جس شام کو یہ تحفے دیئے گئے تھے اس کے بعد کی رات مجھے جاگتے گزری میں الجھن اور پریشانی کے عالم میں اپنے کمرے میں ٹہلتا رہا مگر اس مسئلے کو حل کرنے کی کوئی صورت سمجھ میں نہیں آتی تھی۔ سینکڑوں کی قیمت کے تحفوں کو پھیر دینا کچھ سہل نہ تھا۔ مگر انہیں رکھ لینا میرے لئے اس سے زیادہ دشوار تھا۔

میں نے سوچا کہ فرض کیجئے میں انہیں رکھ لوں تو میرے بچوں پر اور میری بیوی پر اس کا کتنا خراب اثر پڑے گا۔ انہیں میں یہ تعلیم دے رہا تھا کہ اپنی زندگی قومی خدمت میں گذاریں اور خدمت کو معاوضے سے بے نیاز سمجھیں۔

ہمارے گھر میں قیمتی زیور نہیں تھے کیونکہ ہم روز بروز سادگی اختیار کرتے جاتے تھے۔ ہم سے سونے کی گھڑیاں باندھنا سونے کی زنجیریں اور انگوٹھیاں پہنتا کیونکہ نہہ سکتا تھا؟ انہیں دنوں میں لوگوں پر تاکید کر رہا تھا کہ زیوروں کی ہوس چھوڑیں پھر میں ان زیوروں کو کیسے لے لیتا؟ آخر میں نے یہ فیصلہ کر لیا کہ میں ان چیزوں کو اپنے گھر میں نہیں رکھ سکتا۔ میں نے پیٹھ کر خط کا مسودہ لکھا کہ میں ان چیزوں کو قومی کاموں کے لئے وقف کرتا ہوں اور پارسی رستم جی اور چند اور اشخاص کو وقف کا متولی مقرر کرتا ہوں۔ صبح کو میں نے اپنی بیوی بچوں سے مشورہ کیا اور خدا خدا کر کے اسکا لوجھ کو اپنے سر سے ہٹایا۔

مجھے یقین تھا کہ اپنی بیوی کو اس بات پر آمادہ کرنے میں مجھے کسی قدر دقت ہوگی۔ مگر بچے آسانی سے مان لیں گے اس لئے میں نے سوچا کہ بیوی کو سمجھانے میں بچوں کو اپنا وکیل بناؤں گا۔

بچے فوراً راضی ہو گئے۔ انہوں نے کہا ”ہمیں ان قیمتی زیوروں کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔ اس لئے ہمیں چاہئے کہ یہ زیور اپنے وطنی بھائیوں کو لوٹادیں۔ اگر ہمیں ضرورت ہوگی تو جب چاہیں گے دوسرے زیور خرید لیں گے۔“

مجھے بڑی خوشی ہوئی، میں نے ان سے پوچھا ”تو پھر تم اپنی والدہ کو بھی سمجھا لو گے؟“ انہوں نے کہا ”کوئی بڑی بات ہے۔ یہ آپ ہم پر چھوڑ دیجئے۔ وہ خود تو زیور پہننتی نہیں اگر لیں گی تو ہمارے لئے ہی لیں گی۔ پھر جب ہمیں یہ منظور نہیں تو انہیں واپس کرنے میں کیا عذر ہوگا؟“ انہوں نے کہنے کو تو کہہ دیا مگر جب کرنے کا وقت آیا تو مشکل پڑی۔

میری بیوی نے کہا ”تمہارے بچے زیور نہیں چاہتے ہیں تو نہ چاہیں۔ انہیں تم پھسلا کر جو چاہو کہلوالو۔ مگر میری بیوی نہیں جو آئیں گی؟ ان کو زیور کی ضرورت ہوگی یا نہیں؟ کسی کو کیا خبر کہ کل کیا ہونے والا ہے؟ مجھ سے یہ نہ ہو گا کہ لوگوں نے جو تحفے اتنی محبت سے دیئے ہیں وہ لوٹادوں۔“ بحث کا دریا منڈ آیا اور آخر میں آنسوؤں کا سیلاب آگیا۔ مگر بچے اپنی بات پر اڑے رہے اور میں بھی نہ بوجھا۔“

میں نے نرمی سے کہا ”بچوں کی شادی کا ابھی کیا ہے۔ ہمیں ان کا بیاہ کم سنی میں تو کرنا نہیں جب بڑے ہو جائیں گے تو اپنے آپ نپٹ لیں گے اور پھر ہم ان کے لئے ایسی دلہنیں کیوں لانے لگے جنہیں زیور کا شوق ہو؟ اور فرض کر دو زیور کی ضرورت ہو تو میں تو موجود ہوں تم مجھ سے کہنا۔“ اور کیا تمہیں سے تو کہوں گی۔ میں نے تمہیں اتنے دن میں خوب دیکھ لیا۔ تم نے میرے پیچھے پڑ کر میرا سارا زیور لے لیا۔ بوڑوں کے لئے تم ضرور خریدو گے۔ بچوں کو گو تم ابھی سے سادھو بنانے کی فکر میں ہو انہیں صاحب میں یہ زیور واپس نہیں ہونے دوں گی اور یہ تو کہو میرا کنٹھا واپس کرنے کا تمہیں کون سا حق ہے؟ میں نے کہا ”اخوا! یہ کنٹھا تمہیں میری ہی خدمت کی وجہ سے ملا ہے۔“

یہ سچ ہے مگر وہ تمہاری خدمت ہوئی یا میری خدمت بات ایک ہی ہے میں نے جو تمہارے کام کی خاطر دن رات مشقت اٹھائی وہ کسی گنتی ہی میں نہیں؟ تم نے دنیا بھر کے مردے میرے گھر میں لا کر بھر دیئے مجھے آٹھ آٹھ آنسو رلایا اور مجھے ان کی مرہم پٹی کرنا پڑی۔“

یہ باتیں میرے دل پر تیر کی طرح لگیں مگر میں نے یہ ٹھان لی تھی کہ زیور لوٹا کر رہوں گا۔ اپنی بیوی کو میں نے کسی نہ کسی طرح راضی کر لیا۔ جتنے تحفے، 1896 سے 1901 تک ملے تھے

سب واپس کئے گئے ایک وقف نامہ لکھا گیا اور یہ سب چیزیں ایک بینک میں جمع کر دی گئیں کہ میں خود یا وقف کے متولی انہیں جس طرح چاہیں قومی کاموں میں صرف کریں۔

اکثر ایسا اتفاق ہوا کہ مجھے قومی کاموں کے لئے روپے کی ضرورت ہوئی اور میں نے یہ ارادہ کر لیا کہ وقف سے مدد لوں مگر ہمیشہ مجھے یہ روپیہ چندوں سے مل گیا اور وقف کی رقم میں ہاتھ لگانے کی نوبت نہ آئی۔ یہ وقف اب تک موجود ہے۔ ضرورت کے وقت اس سے روپیہ لیا جاتا ہے اور اس کی آمدنی جمع ہوتی ہوئی ایک معقول رقم ہو گئی ہے۔

مجھے آج تک کبھی اپنے اس فعل پر افسوس نہیں ہوا اور میری بیوی کو بھی رفتہ رفتہ یقین ہو گیا ہے کہ یہ دانشمندی کا فعل تھا۔ اس نے ہمیں بہت سی ترغیبوں سے بچایا۔

میرا یہ راسخ عقیدہ ہے کہ قومی کام کرنے والوں کو قیمتی تحفے قبول نہیں کرنا چاہئیں۔

پھر ہندوستان میں

غرض میں پھر دیس روانہ ہو گیا۔ جہاز کا ایک مقام ماریش میں بھی تھا اور چونکہ یہاں کئی دن ٹھہرنا تھا اس لئے میں شہر جا کر وہاں کی زندگی کا مشاہدہ کیا کرتا تھا۔ ایک راستہ میں اس نوآبادی کے گورنر سر رابرٹ بروس کا مہمان رہا۔

ہندوستان پہنچ کر میں کچھ دن سارے ملک کا دورہ کرتا رہا۔ 1901ء میں کانگریس کلکتے میں ہو رہی تھی اور اس کے صدر مسٹر ڈنشاڈ اچا تھے (جو اب سر ڈنشاڈ اچا کہلاتے ہیں) میں بھی اس میں شریک ہوا۔ میرے لئے کانگریس کی شرکت کا یہ پہلا موقع تھا۔

بمبئی سے میں اسی گاڑی میں سوار ہوا جس میں سرفیروز شاہ مہتا تھے کیونکہ مجھے ان سے جنوبی افریقہ کے معاملات کے متعلق باتیں کرنا تھیں۔ مجھے معلوم تھا کہ وہ بڑی شان سے رہتے ہیں۔ انہوں نے اپنے لئے ایک ڈبہ رزرو کرایا تھا اور مجھے یہ حکم تھا کہ ایک خاص اسٹیشن سے کچھ دور تک ان کے ڈبے میں سفر کروں اور جب موقع ملے گفتگو کر لوں۔ چنانچہ میں مقررہ اسٹیشن پر ان کی خدمت میں حاضر ہوا۔ ان کے ساتھ مسٹر واپا اور مسٹر رحمن لال ستیلواد تھے (جو اب سر رحمن لال کہلاتے ہیں) یہ تینوں آپس میں سیاسی معاملات پر گفتگو کر رہے تھے سرفیروز شاہ نے دیکھتے ہی کہا ”بھئی گاندھی ہم تمہاری کوئی مدد نہیں کر سکتے۔ جو ریزولوشن تم چاہتے ہو اسے ہم ضرور پاس کرادیں گے۔ مگر ہمیں اپنے ہی ملک میں کون سے حقوق حاصل ہیں؟ میرے خیال میں جب تک ہمیں اپنے ملک میں قوت حاصل نہ ہو جائے ہماری نوآبادیوں کی بھی ایسی ہی خراب حالت رہے گی جیسی ہماری ہے۔ میں بکا بکارہ گیا۔ مسٹر ستیلواد کی بھی یہی رائے معلوم ہوتی تھی۔ مسٹر واپا نے میری طرف رحم اور تعلق کی نظر سے دیکھا۔

میں نے سرفیروز شاہ کو سمجھانے کی کوشش کی۔ مگر بھلا میرا جیسا شخص بمبئی کے بے تاج بادشاہ سے کیا پیش پاتا میں نے اسی کو غنیمت سمجھا کہ مجھے رزولوشن پیش کرنے کی اجازت مل گئی۔

مسز داچا نے میری ہمت افزائی کے لئے کہا، ”بھئی رزولوشن مجھے ضرور دکھالینا“

غرض یہ کلکتے پہنچ گئے۔ صدر کو مجلس استقبالیہ کے اراکین بڑی دھوم دھام سے کیمپ میں لے گئے۔ میں نے ایک رضا کار سے پوچھا کہ میں کہاں جاؤں۔ وہ مجھے رپن کالج لے گیا جہاں بہت سے ڈیلیگیٹ ٹھہرے ہوئے تھے۔ میری قسمت نے یاوری کی۔ لوکمانیہ بھی اسی جھے میں ٹھہرائے گئے جس میں میں تھا مجھے یاد پڑتا ہے کہ وہ ایک دن بعد آئے تھے۔

ظاہر ہے کہ جہاں لوکمانیہ ہوں وہاں ان کا دربار بھی ضرور ہو گا۔ اگر میں مصور ہوتا تو آج بھی ان کی تصویر اسی انداز میں کھینچ دیتا جس طرح میں نے انہیں بستر پر بیٹھے دیکھا تھا۔ وہ مسٹر میری نظروں میں پھر رہا ہے۔ ان کے پاس بے شمار اشخاص ملنے کے لیے آئے مگر مجھے ان میں سے صرف ایک صاحب یعنی امرت بازار پتر کا کے اڈیٹر بابو موتی لال گھوش آنجہانی یاد ہیں۔ ان لوگوں کا ہنسنا بولنا، قہقہے لگانا اور حاکم قوم کی زیادتیوں کا ذکر کرنا مجھے کبھی نہ بھولے گا۔

مگر اس کیمپ کے انتظام کا ذکر کسی قدر تفصیل سے کروں گا۔ رضا کار آپس میں لڑتے جھگڑتے رہتے تھے۔ آپ ایک شخص سے کسی کام کو کہئے۔ وہ دوسرے پر ٹال دیتا تھا۔ دوسرا تیسرے پر اور یہ سلسلہ یوں ہی چلا جاتا تھا۔ رہے ڈیلیگیٹ تو وہ کسی شمار میں نہ تھے۔

میں نے چند رضا کاروں سے ملاقات پیدا کی۔ جب میں نے انہیں جنوبی افریقہ کے قصبے سنائے تو انہیں کسی قدر شرم آئی۔ میں نے انہیں خدمت کا راز سمجھانا چاہا۔ وہ سمجھ تو گئے مگر خدمت کوئی خود درخت تو نہیں کہ ہر زمین پر آگ آئے۔ اس کے لئے پہلی شرط خلوص نیت ہے اور دوسری تجربہ۔ ان نیک دل بھولے نوجوانوں میں خلوص کی کمی نہ تھی۔ مگر تجربہ انہیں ذرہ برابر بھی نہ تھا۔ کانگریس سال میں تین دن اپنی بہار دکھا کر غفلت کی نیند سو جاتی تھی۔ یہ جو سال میں تین دن تماشاً ہو کر رہ جاتا تھا اس میں انہیں کیا تجربہ حاصل ہو سکتا تھا؟ اور ڈیلیگیٹوں کا بھی وہی حال تھا جو رضا کاروں کا۔ یہ بھی اس سے زیادہ یا اس سے بہتر تجربہ نہیں رکھتے وہ خود کوئی کام نہیں کرنا چاہتے تھے۔ بس بیٹھے رضا کاروں کو حکم دیا کرتے تھے ”جاؤ یہ کام کر لاؤ، جاؤ وہ کام کر لاؤ۔“

یہاں بھی چھوت چھات کا خاصا تجربہ ہوا۔ تاملی لوگوں کا باورچی خانہ اور باورچی خانوں سے دور تھا۔ تامل ڈیلیگیٹ کھانا کھانے کے وقت دوسروں کی جھلک بھی دیکھ لیں تو چھوت ہو جاتی تھی

اس لئے ان کے واسطے کالج کے احاطے میں علیحدہ باورچی خانہ بنایا گیا اور اس کے آس پاس مٹیاں لگائی گئیں۔ اس میں دھوئیں کا یہ عالم تھا کہ دم گھلتا تھا۔ اسی لئے دروازے کے صندوق میں کھانا پکتا تھا۔ یہیں کھایا جاتا تھا اور۔۔۔ بہیں برتن دھلتے تھے مجھے تو ورن دھرم (1) کی مسخ کی ہوئی صورت معلوم ہوتی تھی۔ میں نے اپنے جی میں کہا جب کانگریس کے ڈیلیگیٹوں کا یہ حال ہے تو جن لوگوں کی یہ نمائندگی کرتے ہیں ان کا حال تو اور بھی بدتر ہو گا۔ یہ خیال کر کے میں نے ایک آہ سرد کھینچی اور دم بخود ہو گیا۔

غلاظت کی کوئی انتہا نہ تھی۔ ہر جگہ پانی گڑھوں میں جمع رہتا تھا۔ پاخانے بہت تھوڑے تھے اور ان میں بلا کا تعفن تھا کہ اس کے خیال سے اب بھی تکلیف ہوتی ہے۔ میں نے رضا کاروں کو اس پر توجہ دلائی۔ انہوں نے صاف کہہ دیا ”یہ ہمارا کام نہیں۔ بھنگی کا کام ہے۔“ میں نے ایک شخص سے جھاڑو مانگی۔ وہ حیرت سے منہ تکلنے لگا۔ میں نے کہیں سے جھاڑو لا کر پاخانہ صاف کیا۔ مگر اس سے صرف میرا کام چلا۔ آدمی بہت تھے اور پاخانے تھوڑے۔ اس لئے بار بار صاف کرنے کی ضرورت تھی۔ مگر یہ میرے بس کی بات نہ تھی اس لئے مجھے اسی پر تھامت کرنا پڑی کہ اپنی فکر کر لوں اور دوسروں کو اس بدبو اور غلاظت کی کوئی پروا بھی نہ تھی۔

اس سے بھی بڑھ کر سنئے بعض ڈیلیگیٹ رات کو بے تامل اپنے کمروں سے آگے برآمدے میں رفع حاجت کرتے تھے۔ ایک روز صبح کو میں نے رضا کاروں کو غلیظ دکھایا۔ کوئی اسے صاف کرنے پر راضی نہ ہوا۔ اس لئے مجھے تنہا یہ عزت حاصل کرنا پڑی۔ اب حالت بہتر ہو گئی ہے مگر اب بھی بعض ایسے ناسمجھ ڈیلیگیٹ ہیں جو کانگریس کمیٹی کے اندر جہاں جی چاہتا ہے رفع حاجت کر کے کمیٹی کو غلیظ کرتے ہیں اور بہت کم رضا کار اسے صاف کرنے پر تیار ہوتے ہیں۔

یہ حالت دیکھ کر مجھے یقین ہو گیا کہ اگر کانگریس کے اجلاس میں کچھ روز کی توسیع کر دی جاتی تو وبا پھیلنے کا پورا پورا سامان ہو جاتا۔

حوالہ

1 - ہندو سماج کی چاروں تقسیمیں اور ان کے فرائض۔

محرر اور خدمت گار

ابھی کانگریس کا اجلاس شروع ہونے میں دو دن تھے۔ میں نے پہلے سے یہ ارادہ کر لیا تھا کہ اپنی خدمات کانگریس کے دفتر کے لئے پیش کروں گا تاکہ کچھ تجربہ حاصل ہو جائے۔ چنانچہ کلکتے پہنچتے ہی میں ہاتھ منہ دھو کر سیدھا کانگریس کے دفتر میں پہنچا۔

بابو بھوپندر ناتھ اسوا اور گھوشال بابو سیکرٹری تھے۔ میں نے بھوپندر بابو کے پاس جا کر اپنی خدمات پیش کیں۔ انہوں نے میری طرف دیکھ کر فرمایا ”میرے یہاں تو کوئی کام نہیں مگر ممکن ہے گھوشال بابو آپ کو کوئی کام دیں۔ مہربانی کر کے ان کے پاس جائیے۔“

میں ان کے پاس گیا۔ انہوں نے مجھے سر سے پیر تک دیکھا اور مسکرا کر کہا۔ ”میں تمہیں صرف محرری کا کام دے سکتا ہوں“ تم کر دو گے؟

میں نے جواب دیا ضرور کروں گا۔ میں اسی لئے آیا ہوں کہ جو کام بھی ملے اسے انجام دوں بشرطیکہ وہ میری قابلیت سے بڑھ کر نہ ہو۔“

انہوں نے کہا ”شاباش نوجوانوں میں یہی خلوص ہونا چاہئے۔“ ان رضا کاروں کو مخاطب کر کے جو ان کے گرد کھڑے تھے کہنے لگے ”سنتے ہو یہ جوان کیا کہہ رہے ہیں؟“

پھر میری طرف مڑ کر بولے۔ ”لو یہ خطوط کا انبار ہے جن کا جواب دینا ہے۔ اس کرسی پر بیٹھ جاؤ اور کام شروع کر دو۔ تم دیکھتے ہو میرے پاس سینکڑوں آدمی آتے ہیں اب میں ان سے باتیں کروں یا ان دغل در مقبولات دینے والوں کو جواب دوں جنہوں نے خطوط کے مارے میرا ناک میں دم کر رکھا ہے؟ میرے پاس کوئی ایسے محرر نہیں جن کے سپرد یہ کام کر سکوں۔ بہت سے خطوط میں کوئی کام کی بت نہیں مگر مہربانی کر کے ان پر ایک نظر ڈال لو۔ ان میں سے جو جواب کے

قابل ہوں ان کا جواب دے دو اور اگر کوئی خاص بات ہو تو مجھ سے دریافت کر لو۔“
مجھے بڑی خوشی ہوئی کہ انہوں نے مجھ پر اتنا اعتبار کیا۔

گھوشال بابو نے جب مجھے یہ کام دیا اس وقت تک مجھ سے بالکل واقف نہیں تھے۔ بہت دیر کے بعد انہوں نے مجھ سے میرا نام و نشان پوچھا۔

مجھے اس خطوط کے انبار کو پڑھنے اور اس کا جواب دینے میں کوئی دقت نہیں ہوئی۔ ذرا سی دیر میں میں نے یہ کام نپنا دیا۔ گھوشال بابو بہت خوش ہوئے۔ وہ بڑے باتونی آدمی تھے گھنٹوں بیٹھے باتیں کیا کرتے تھے۔ جب انہیں میرے حالات معلوم ہوئے تو افسوس کرنے لگے کہ میں نے تمہیں محرری کا کام دیا۔ مگر میں نے انہیں یہ کہہ کر مطمئن کر دیا۔

آپ کچھ تردد نہ کیجئے میری آپ کے آگے کیا حیثیت ہے؟ آپ کی عمر کانگریس کی خدمت میں گذری ہے اور آپ میرے بزرگ ہیں۔ میں محض ایک نا تجربہ کار نوجوان ہوں، یہ کام میرے سپرد کر کے مجھ پر بہت بڑا احسان کیا ہے کیونکہ مجھے کانگریس کے کام کا شوق ہے اور آپ کی بدولت مجھے یہ نادر موقع ملا ہے کہ اس کام کی جزئیات کو سمجھ لوں۔

گھوشال بابو نے کہا ”شاباش“ قومی کام کرنے والوں کا یہی خیال ہونا چاہئے۔ مگر آج کل کے نوجوانوں کو اس کا احساس نہیں ہے، بیشک میں کانگریس کو اس وقت سے جانتا ہوں جب سے یہ قائم ہوئی بلکہ سچ پوچھو تو میں دعویٰ کر سکتا ہوں کہ اس کے قائم کرنے میں میں بھی مسٹر ہیوم کے ساتھ شریک تھا۔

اس طرح ہم دونوں میں خاصی دوستی ہو گئی۔ وہ بڑے اصرار سے مجھے دوپہر کا کھانا اپنے ساتھ کھلاتے تھے۔

گھوشال بابو کی قمیض کے بن ان کا خدمت گار لگایا کرتا تھا۔ میں نے یہ کام اپنے ذمے لے لیا اور مجھے اس میں بڑی خوشی ہوتی تھی کیونکہ میں ہمیشہ سے بزرگوں کی بڑی عزت کیا کرتا تھا۔ جب انہیں یہ معلوم ہوا تو وہ اکثر ایسے چھوٹے چھوٹے کام مجھ سے لینے لگے۔ جب میں ان کی قمیض کے بن لگاتا تو وہ کہتے جاتے تھے دیکھتے ہو کانگریس کے سیکرٹری کو اپنی قمیض میں بن لگانے کا بھی دقت نہیں ملتا۔ ہمیشہ کوئی نہ کوئی کام رہتا ہے۔

گھوشال بابو کے بھولے پن پر مجھے ہنسی آتی ہے لیکن اس سے میری خدمت کے شوق میں کوئی کمی نہیں ہوتی۔ ان کی خدمت سے مجھے اتنا فائدہ پہنچا جس کا اندازہ نہیں کر سکتا۔

چند روز میں میں کانگریس کے طور طریقے سے اچھی طرح واقف ہو گیا۔ مجھے اکثر ایڈروں سے ملنے اور گو کھلے اور سریندر ناتھ جیسے شیر مردوں کے طرز عمل کو دیکھنے کا موقع ملا۔ میں نے اس بات پر غور کیا کہ یہاں کتنا وقت ضائع ہوتا ہے اور یہ دیکھ کر مجھے بہت افسوس ہوا۔ ہمارا سارا کاروبار انگریزی میں ہوتا ہے قوت عمل کو کفایت کے ساتھ خرچ کرنے کا کسی کو خیال تک نہ تھا۔ کہیں ایک شخص کا کام کئی آدمی کرتے تھے اور کہیں ضروری کام اس لئے رہ جاتے تھے کہ کوئی کام کرنے والا نہ تھا۔

گو میں ان چیزوں کو تنقیدی نظر سے دیکھتا تھا مگر میری طبیعت میں اتنی رواداری تھی کہ میں سمجھتا تھا کہ شاید موجودہ حالت میں اس سے بہتر کام نہیں ہو سکتا اور اسی وجہ سے میں نے کسی کام کی بے قدری نہیں کی۔

کانگریس میں

خدا خدا کر کے میں کانگریس پہنچا۔ اس دل بادل خیمے کو، رضا کاروں کی شاندار صفوں کو، اور ڈانس پر بڑے بڑے لیڈروں کو دیکھ کر میری آنکھیں کھل گئیں میں دل میں کہتا تھا کہ اس عظیم الشان اجتماع میں مجھے کون پوچھے گا۔

خطبہ صدارت ایک مستقل کتاب تھی۔ اسے اول سے آخر تک پڑھنا بالکل ناممکن تھا، اس لئے صرف اس کے چند حصے پڑھے گئے۔

اس کے بعد سبجیکٹس کمیٹی کے ممبروں کا انتخاب ہوا۔ گو کھلے مجھے کمیٹی کے جلسوں میں لے جایا کرتے تھے۔

سرفیروز شاہ نے میرے رزولوشن کو پیش کرانے کا وعدہ کر لیا تھا۔ مگر میں اس فکر میں تھا کہ دیکھوں یہ سبجیکٹس کمیٹی میں کب پیش ہوتا ہے اور کون پیش کرتا ہے۔ کیونکہ ہر رزولوشن کے ساتھ طویل طویل تقریریں ہوتی تھیں اور وہ بھی انگریزی میں اور ہر رزولوشن کی تائید کوئی مشہور لیڈر کرتا تھا۔ اس نقار خانے میں بھلا میری طوطی جیسی آواز کو کون سنتا۔ جب میں نے دیکھا کہ رات ہونے آئی اور وہ رزولوشن اب تک پیش نہیں ہوا تو میرا دل دھوکے لگا جہاں تک مجھے یاد ہے آخری رزولوشن بہت جلدی جلدی نپٹائے جا رہے تھے۔ اب گیارہ بج چکے تھے۔ میں گھو کھلے سے مل کر ان کو اپنا رزولوشن دکھا چکا تھا۔ اس لئے میں نے ان کی کرسی کے پاس جا کر ان کے کان میں کہا ”مہربانی کر کے میرے معاملے میں کچھ کیجئے۔ انہوں نے کہا۔ ”میں تمہارے رزولوشن کو بھولا نہیں ہوں۔ تم دیکھتے ہو کتنی تیزی سے کام ہو رہا ہے دم لینے کی فرصت نہیں۔ مگر میں اس کا خیال رکھوں گا کہ تمہارا رزولوشن نظر انداز نہ ہونے پائے۔“

اتے میں سرفیروز شاہ مہتانے کہا "اب تو سب رزولوشن ہو گئے
گھوکھلے چلا اٹھے "نہیں نہیں ابھی جنوبی افریقہ والا رزولوشن باقی ہے مسٹر گاندھی دیر سے
انتظار کر رہے ہیں۔"

سرفیروز شاہ نے پوچھا "آپ نے وہ رزولوشن دیکھا ہے۔"

"جی ہاں، دیکھا ہے۔"

"آپ کو پسند ہے"

"ہاں اچھا خاصا ہے"

"اچھا گاندھی اپنا رزولوشن پڑھ کر سناؤ۔"

میں نے کانپتے ہوئے وہ رزولوشن پڑھا۔

گھوکھلے نے اس کی تائید کی۔

سب چلا اٹھے۔ "بالا اتفاق منظور۔"

مسٹر داچا نے کہا "گاندھی تمہیں اس پر تقریر کرنے کے لئے پانچ منٹ ملیں گے۔"
مجھے اس کارروائی سے بالکل خوشی نہیں ہوئی۔ کسی شخص نے رزولوشن کو سمجھنے کی زحمت
نہیں اٹھائی۔ ہر شخص کو جانے کی بہت جلدی تھی اور چونکہ گھوکھلے اس رزولوشن کو دیکھ چکے تھے
اس لئے یہ ضروری نہیں خیال کیا گیا کہ دوسرے بھی اسے دیکھیں یا سمجھیں۔

صبح اٹھ کر میں اپنی تقریر کی فکر میں الجھ گیا۔ میں دل میں سوچتا تھا کہ پانچ منٹ میں کیا کہہ
سکوں گا۔ میں نے اچھی طرح تیاری کر لی تھی مگر اس وقت مناسب الفاظ سمجھ میں نہیں آتے تھے۔
میں یہ طے کر چکا تھا کہ اپنی اپنی پہلے سے نہیں لکھوں گا۔ بلکہ وقت کے وقف تقریر کروں گا۔
جنوبی افریقہ میں روانی سے تقریر کرنے کی مشق ہو گئی تھی۔ وہ اس وقت کام آئی۔

جیسے ہی میرے رزولوشن کا وقت آیا مسٹر داچا نے میرا نام لے کر پکارا، میں کھڑا ہو گیا۔
میرے سر میں چکر آرہے تھے۔ کسی شخص نے ایک نظم چھپوا کر ڈیلیگیٹوں میں تقسیم کی تھی۔ جس
میں غیر ملکوں میں جا کر رہنے کی تعریف کی تھی۔ میں نے یہ نظم پڑھی اور اسی سلسلہ میں ان مصیبتوں
کا ذکر کرنے لگا جو نوآباد ہندوستانیوں کو جنوبی افریقہ میں اٹھانا پڑتی ہیں۔ عین اس وقت مسٹر داچا
نے گھنٹی بجائی۔ مجھے یقین تھا کہ ابھی پانچ منٹ نہیں ہوئے۔ مجھے یہ نہیں معلوم تھا کہ اس گھنٹی
سے اطلاع دینا مقصود ہے کہ دو منٹ میں تقریر ختم کر دو۔ میں نے دوسروں کو تیس تیس بلکہ

پنٹالیس پینتالیس منٹ تقریر کرتے سنا تھا اور ان کے لئے کبھی گھنٹی نہیں بجائی گئی تھی۔ مجھے یہ بہت ناگوار ہوا اور میں گھنٹی بجتے ہی بیٹھ گیا۔ میرا یہ طفلانہ خیال تھا کہ یہ نظم سرفیردز شاہ کی ہے تو جی کا کافی جواب ہے۔ رزولوشن کے پاس ہونے میں تو کوئی شک ہی نہ تھا۔ ان دنوں وزیٹروں اور ڈیلیگیٹوں میں کوئی فرق نہیں کیا جاتا تھا ہر شخص ہاتھ اٹھا دیتا تھا اور سب رزولوشن بالا اتفاق پاس ہوتے تھے۔ میرے رزولوشن کا بھی یہی حشر ہوا۔ اس لئے میری نظر میں اس کی کوئی اہمیت نہیں رہی۔ مگر میرے لئے یہی کچھ کم خوشی کی بات نہ تھی کہ اسے کانگریس نے پاس کر دیا اور مجھ پر کیا موقوف ہے جس کو یہ علم ہوتا کہ کانگریس کی تائید گویا سارے ملک کی تائید ہے وہی اس بات پر خوش ہوتا۔

لارڈ کرزن کا دربار

کانگریس ختم ہو گئی۔ مجھے جنوبی افریقہ کے کام کے سلسلے میں ایوان تجارت کے ممبروں اور کچھ اور لوگوں سے ملنا تھا۔ اس لئے میں کلکتہ میں ایک مہینہ اور ٹھہر گیا۔ اس بار میں نے ہونٹل میں ٹھہرنا پسند نہیں کیا بلکہ بعض دوستوں نے انڈیا کلب کے منتظموں سے میرا تعارف کرا دیا اور مجھے وہاں ایک کمرہ مل گیا۔ اس کے ممبر بعض ممتاز ہندوستانی تھے اور میں یہ چاہتا تھا کہ ان لوگوں سے مل کر انہیں جنوبی افریقہ کے معاملات کی طرف توجہ دلاؤں۔ گو کھلے اکثر اس کلب میں انٹاکھیلنے جایا کرتے تھے اور جب انہیں معلوم ہوا کہ میں ابھی کچھ دن کلکتے میں رہوں گا تو انہوں نے مجھ سے اصرار کیا کہ میرے ساتھ آکر ٹھہرو۔ میں نے اس دعوت کو شکرے کے ساتھ قبول کر لیا۔ مجھے بغیر ان کے دوبارہ بلائے وہاں جانا مناسب نہیں معلوم ہوا۔ انہوں نے دو ایک دن انتظار کیا۔ اس کے بعد خود آکر مجھے لے گئے۔ انہیں معلوم ہو گیا کہ میری طبیعت دیر آشنا ہے اور انہوں نے مجھ سے کہا۔ ”کانڈھی! تمہیں اس ملک میں رہنا ہے ایسی دیر آشنائی سے کام نہیں چلے گا۔ تمہیں تو چاہیے جتنے زیادہ لوگوں سے ممکن ہو میل جول پیدا کر دو میں چاہتا ہوں کہ تم کانگریس کا کام کرو۔“

گو کھلے کی صحبت کا ذکر کرنے سے پہلے میں انڈیا کلب کا ایک واقعہ بیان کروں گا۔ اس زمانے میں لارڈ کرزن نے دربار منعقد کیا۔ بعض راجا مہاراجا جو دربار میں بلائے گئے تھے کلب کے ممبر تھے۔ کلب میں میں نے انہیں ہمیشہ بنگالی دھوتی باندھے قمیض پہنے اور گلے میں چادر ڈالے دیکھا تھا۔ دربار کے دن کیا دیکھتا ہوں کہ دھوتی کی جگہ پتلون ہے جیسی خانسلٹل پہنتے ہیں اور پیر میں چمکدار بوٹ مجھے یہ دیکھ کر بڑی تکلیف ہوئی اور میں نے ان میں سے ایک سے پوچھا کہ آپ نے اپنی وضع کیوں تبدیل کی؟

انہوں نے جواب دیا ”ہم جس شامت میں مبتلا ہیں اسے ہم ہی جانتے ہیں کسی کو کیا خبر کہ ہمیں دولت اور خطاب کی خاطر کیا کیا دلتیں اٹھانا پڑتی ہیں۔“

میں نے پوچھا مگر یہ خانسماؤں ”جیسی پگڑی باندھنے اور چمکدار بوٹ پہننے کا کیا سبب ہے؟“ انہوں نے کہا ”ہم میں اور خانسماؤں میں فرق ہی کیا ہے، وہ ہمارے ”خانساں“ ہیں۔ اور ہم لارڈ کرزن کے ”خانساں“ ہیں۔ اگر میں دربار نہ جاؤں تو آفت آجائے اگر اپنے معمولی کپڑے پہن کر جاؤں تو مجرم ٹھہرایا جاؤں اور کیا آپ کے خیال میں وہاں مجھے لارڈ کرزن سے گفتگو کرنے کا موقع ملے گا؟ جی تو بہ کیجئے؟“

مجھے ان صاف گو دوست پر بڑا رحم آیا۔

اسی سلسلے میں مجھے اور دربار یاد آگیا۔

جب لارڈ ہارڈنگ نے ہندو یونیورسٹی کا سنگ بنیاد رکھا تو ایک دربار منعقد کیا گیا اور ظاہر ہے کہ وہاں راجا مہاراجا ہی بلائے گئے تھے۔ مگر پنڈت مالوی جی نے مجھے بھی بڑے اصرار سے دعوت دی چنانچہ میں بھی گیا۔

مجھے یہ دیکھ کر سخت افسوس ہوا کہ سب مہاراجے عورتوں کی طرح بن ٹھن کر آئے ہیں۔ یہ لوگ ریشمی پاجامے اور ریشمی اچکنیں پہنے تھے۔ ان کے گلے میں موتیوں کے مالے تھے۔ ہاتھوں میں کنگن تھے۔ پگڑیوں میں زرتار طرے اور کمر میں تلواریں جن کے قبضے سونے کے تھے۔

مجھے معلوم ہوا کہ یہ نشانیاں ان کی بادشاہی کی نہیں ان کی غلامی کی ہیں میں سمجھتا تھا کہ انہوں نے یہ نامردی کے طوق اپنی خوشی سے گلے میں ڈالے ہوں گے مگر معلوم ہوا کہ راجاؤں کے لئے لازمی ہے کہ ایسے موقعوں پر اپنے سارے زیور اور ہیرے موتی لاد کر آئیں۔ میں نے یہ بھی سنا کہ ان میں سے بعض ان چیزوں کے پہننے کو قطعاً ناپسند کرتے ہیں اور سوائے دربار وغیرہ کے کبھی نہیں پہنتے۔

مجھے معلوم نہیں کہ یہ بات کہاں تک صحیح ہے مگر چاہے وہ اور موقعوں پر یہ چیزیں پہنتے ہوں یا نہ پہنتے ہوں یہی کیا کم قابل افسوس ہے کہ انہیں دائسرائے کے دربار میں ایسے زیور پہن کر آنا پڑے جو صرف بعض مخصوص عورتیں پہنتی ہیں۔

دولت، قوت اور عزت کی خاطر انسان کو کن کن ذلتوں اور گناہوں کا بوجھ اٹھانا پڑتا ہے۔

ایک مہینہ گو کھلے کی صحبت میں (۱)

میں گو کھلے کے یہاں جا کر رہا تو وہ مجھ سے اس طرح پیش آئے کہ میں پہلے ہی دن سے بے تکلف ہو گیا وہ مجھ سے ایسی محبت کرتے تھے جیسے بڑے بھائی کو چھوٹے بھائی سے ہوتی ہے۔ وہ مجھ سے میری ضروریات معلوم کر کے ایک ایک کی فراہمی کا اہتمام کرتے تھے۔ اتنا اچھا تھا کہ میری ضروریات بہت کم تھیں اور چونکہ میں نے اپنی مدد آپ کرنے کی عادت ڈالی تھی اس لئے مجھے نوکر کی حاجت بھی بہت کم ہوتی تھی ان پر اس بات کا کہ میں اپنا کام اپنے ہاتھ سے کرتا ہوں، اور میری صفائی، یا صابننگی اور استطلاق کا بڑا اثر ہوا۔ اور وہ اکثر میری تعریفیں کر کے مجھے شرمندہ کر دیتے تھے۔

وہ مجھ سے کوئی بات نہ چھپاتے تھے مجھے ان سب بڑے آدمیوں سے جو ان کے پاس آیا کرتے تھے، ملاتے تھے۔ ان لوگوں میں سے ڈاکٹر پی، سی رائے (جو اب سرینی سی رائے کہلاتے ہیں) کی تصویر میرے حلقے میں سب سے زیادہ نمایاں ہے وہ بہت قریب رہتے تھے اور اکثر آیا جایا کرتے تھے۔

انہوں نے ڈاکٹر رائے کو مجھ سے یہ کہہ کر ملایا۔ ”یہ پروفیسر رائے ہیں جو آٹھ سو روپیہ تنخواہ پاتے ہیں اور اس میں سے چالیس روپیہ خود لیتے ہیں اور باقی قومی کاموں میں صرف کر دیتے ہیں۔ شادی انہوں نے نہ کی ہے نہ کرنا چاہتے ہیں۔“

میں نے ڈاکٹر رائے کو اس وقت بھی قریب قریب ویسا ہی دیکھا تھا جیسا اب دیکھتا ہوں۔ ان کے لباس میں وہی سادگی تھی جو اب ہے فقط امتیاز فرق ہوا ہے کہ اس زمانے میں ہندوستانی ملوں کا کپڑا پہنتے تھے اور اب کھادی پہنتے ہیں۔ گو کھلے اور ڈاکٹر رائے کی گفتگو سنتے سے میرا جی کبھی نہیں

بھرتا تھا کیونکہ یہ گفتگو قومی مفاد کے متعلق ہوتی تھی یا دوسری حیثیتوں سے تعلیمی اہمیت رکھتی تھی۔ کبھی کبھی ان دونوں کی باتیں سن کر تکلیف بھی ہوتی تھی۔ کیونکہ وہ قومی لیڈروں پر بڑی سختی سے نکتہ چینی کرتے تھے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ بعض لوگ جنہیں میں شیر سمجھتا تھا اب بھیر نظر آنے لگے۔

گو کھلے کو کام کرتے دیکھ کر خوشی بھی ہوتی تھی اور تعلیمی فائدہ بھی پہنچتا تھا۔ وہ ایک منٹ بھی ضائع نہیں کرتے تھے۔ ان کے ذاتی تعلقات اور ان کی دوستی بھی قومی مقاصد کے لئے ہوتی تھی۔ ان کی گفتگو کا موضوع ہمیشہ ملک کی بھلائی ہوتی تھی اور اس میں مبالغے یا بناوٹ کا نام بھی نہ تھا۔ وہ ہمیشہ ہندوستان کی غلامی اور افلاس کے رنج میں گھلا کرتے تھے۔ اس کے سوا انہیں کوئی نکر نہ تھی۔ مختلف لوگ انہیں مختلف کاموں میں کھینچنا چاہتے تھے مگر وہ سب کو یہی جواب دیتے تھے۔ ”یہ آپ خود ہی کیجئے مجھے میرا کام کرنے دیجئے مجھے تو ملک کے آزاد کرانے کی دھن ہے، آزادی مل جائے تو پھر اور کاموں کی طرف توجہ کرنے کا وقت آئے گا۔ یہی کام استنا بڑا ہے کہ میرا سارا دلت اور ساری قوت اس میں کھپ جاتی ہے۔“

انہیں راناڈے سے جو عقیدت تھی اس کا اظہار ہر لمحہ ان کے قول اور عمل سے ہوتا تھا۔ میری ان کی یکجائی کے زمانے میں ایک بار راناڈے کی ولادت کا یا شاید وفات کا دن آیا۔ گو کھلے ان دونوں دنوں کی یادگار مناتے تھے۔ اس روز ان کے ساتھ میرے علاوہ چودھیر کٹھو آئے اور ایک سب جج بھی تھے۔ انہوں نے ہم لوگوں کو بھی اس رسم میں شریک کیا اور ایک تقریر کی جس میں راناڈے کے بہت سے قصے سنائے۔ دوران تقریر میں وہ ضمناً راناڈے۔ تیلانگ اور سندھ لک میں باہم مقابلہ کرنے لگے۔ انہوں نے کہا تیلانگ کا دلکش اسلوب اور منڈ لک کا اصلاحی جوش قابل تعریف ہے۔ منڈ لک کو اپنے مولوں کا اس قدر خیال رہتا تھا کہ ایک بار انہیں ایک مقدمے میں باہر جانا تھا اور گاڑی چھوٹ گئی تو انہوں نے ایک اسپیشل ٹرین کرائے پر لی تاکہ عدالت میں دلت پر پہنچیں اور ان کے موکل کا ہرج نہ ہو مگر راناڈے ان سب سے بڑھے ہوئے تھے۔ ان کا ذہن ہمہ گیر تھا وہ صرف ایک قابل جج ہی نہیں تھے بلکہ مورخ ماہر اقتصادیات اور مسلح کی حیثیت سے بھی ان کا پایہ بہت بلند تھا۔ باوجود جج ہونے کے وہ کانگریس میں شریک ہوتے تھے اور سب لوگوں کو ان کی دانشمندی پر اس قدر بھروسہ تھا کہ ان کے فیصلوں کو بے چوں و چرا تسلیم کر لیتے تھے۔ گو کھلے ان ذہنی اور اخلاقی خوبیوں کو بیان کرتے ہوئے جو ان کے گرد کی ذات میں جمع تھیں خوشی

سے پھولے نہ سماتے تھے۔

اس زمانے میں گو کھلے کے پاس ایک گھوڑا گاڑی تھی۔ مجھے یہ نہیں معلوم تھا کہ بعض وجوہ سے وہ گھوڑا گاڑی رکھنے پر مجبور ہیں۔ اس لئے میں نے ان سے شکایت کے طور پر کہا۔ ”آپ ٹرام میں کیوں نہیں جایا کرتے؟ کیا یہ لیڈری کی شان کے خلاف ہے؟“

انہیں اس سے کسی قدر تکلیف ہوئی اور انہوں نے کہا ”تمہیں بھی میری نیت کا اندازہ نہیں ہو سکا! مجھے کونسل سے جو الاؤنس ملتا ہے اسے میں اپنی ذاتی آسائش پر صرف نہیں کرتا مجھے تم پر رشک آتا ہے کہ تم آزادی سے ٹرام میں بیٹھ سکتے ہو۔ میں یہ نہیں کر سکتا۔ جب تم میری طرح شہرت کی بلا میں گرفتار ہو گئے تو تمہیں معلوم ہو جائے گا۔ کہ ٹرام میں آنا جانا ناممکن نہیں تو دشوار ضرور ہے۔ تم نے خواہ مخواہ یہ کیوں سمجھ لیا کہ لیڈر جو کچھ کرتے ہیں اپنے آرام کے لئے کرتے ہیں مجھے تمہاری سادگی بہت پسند ہے۔ میں اپنے امکان بھر سادگی سے رہتا ہوں مگر میرے جیسے شخص کے لئے کچھ نہ کچھ مصارف ضرور ہیں۔“

اس معاملے میں انہوں نے میرا پورا اطمینان کر دیا۔ مگر مجھے ایک اور شکایت تھی جس کا وہ کوئی معقول جواب نہ دے سکے۔

”لیکن آپ ٹہلنے بھی تو نہیں جاتے۔ اسی وجہ سے آپ کی صحت خراب رہتی ہے۔ کیا قومی کام میں یہ بھی شرط ہے کہ درزش کا دقت نہ ملے؟“

انہوں نے کہا ”تم دیکھتے ہو مجھے کبھی اتنی فرصت ملتی ہے کہ ٹہلنے جاؤں؟“

میرے دل میں گو کھلے کا احترام اس قدر تھا کہ میں کبھی ان سے محبت نہیں کرتا تھا۔ اگرچہ اس جواب سے میرا اطمینان نہیں ہوا۔ مگر میں چپ ہو رہا۔ میرا اس دقت بھی یہی خیال تھا اور اب بھی ہے کہ خواہ انسان کو کتنا ہی کام کرنا ہو اسے درزش کے لئے بھی اسی طرح دقت نکالنا چاہئے جیسے کھانے کے لئے نکالنا ہے میری ناقص رائے ہے کہ اس سے مجموعی کام کم نہیں بلکہ زیادہ ہوتا ہے۔

ایک مہینہ گو کھلے کی صحبت میں (۲)

گو کھلے کے ساتھ قیام کے زمانے میں گھر پر بہت رہتا تھا۔
 مں نے جنوبی افریقہ میں اپنے عیسائی دوستوں سے وعدہ کیا تھا کہ ہندوستان کے عیسائی بھائیوں
 سے ملوں گا اور ان کی حالت کا مشاہدہ کروں گا۔ میں نے بابو کانچن بڑی کا نام سنا تھا اور ان کا بہت
 احترام کرتا تھا وہ کانگریس میں بہت پیش پیش تھے اور مجھے ان کی طرف سے وہ شکوک نہ تھے جو عام
 عیسائیوں کی طرف سے۔ ان کے کانگریس میں شریک نہ ہونے اور ہندو مسلمانوں سے الگ رہنے
 کی وجہ سے تھے۔ جب میں نے گو کھلے کے سامنے ان سے ملنے کا ارادہ ظاہر کیا تو انہوں نے کہا
 ”ان سے مل کر کیا کرو گے؟ اس میں شک نہیں کہ بڑے اچھے آدمی ہیں۔ مگر مجھے یہ اندیشہ ہے کہ تم
 ان سے مل کر مطمئن نہ ہو گے۔ میں انہیں اچھی طرح جانتا ہوں۔ پھر بھی تمہارا جی ان سے ملنے کو چاہتا
 ہے تو ضرور ملو۔“

میں نے ان سے ملاقات کی درخواست کی جسے انہوں نے فوراً منظور کر لیا جب میں ان کے
 یہاں گیا تو دیکھا کہ ان کی بیوی بستر مرگ پر ہیں۔ ان کا گھر بار بالکل سیدھا سادھا ہے۔ کانگریس میں
 میں نے انہیں کوٹ پتلون پہنے دیکھا تھا۔ مگر اس وقت مجھے یہ دیکھ کر خوشی ہوئی کہ وہ قمیض پہنے
 ہیں اور بنگالی دھوتی باندھے۔ گو میں خود اس زمانے میں کوٹ پتلون پہنتا تھا۔ مگر مجھے ان کی سادگی
 بہت پسند آئی۔ میں نے بغیر کسی تمہید کے اپنی مشکلات ان کے سامنے بیان کر دیں۔ انہوں نے
 پوچھا۔

”آپ گناہ آدم کے (1) مسئلے کو مانتے ہیں۔ یا نہیں۔“

میں نے کہا ”میں مانتا ہوں۔“

وہ کہنے لگے ”بس تو پھر معاملہ صاف ہے، ہندو دھرم میں اس گناہ کو عذاب سے نجات پانے کی کوئی صورت نہیں۔ عیسائیت میں موجود ہے۔ گناہ کی جزا ہلاکت ہے اور انجیل کہتی ہے کہ نجات کی صرف ایک صورت ہے۔“ ”مسیح پر ایمان لانا۔“

میں نے ”بھگوت گیتا“ کی ”بھگتی مرگ“ کا ذکر کیا۔ مگر انہوں نے ایک نہ سنی۔ میں نے ان کی عنایت کا شکریہ ادا کیا۔ وہ میرا اطمینان نہیں کر سکے۔ مگر ان کی گفتگو سے مجھے کچھ فائدہ ضرور پہنچا۔

ان دنوں میں کلکتے کی گلیوں میں مارا مارا پھرتا تھا۔ اکثر مقامات پر پیدل جایا کرتا تھا میں جنس مترا اور گرداس بزجی سے ملا جن سے میں جنوبی افریقہ کے کام میں مدد لینا چاہتا تھا۔ اسی زمانے میں مجھے راجا سر پیارے موہن مکرجی سے ملنے کا اتفاق ہوا۔

کالی چرن بزجی نے مجھ سے کالی مندر کا ذکر کیا تھا اور مجھے پہلے سے بھی اس کے دیکھنے کا شوق تھا۔ کیونکہ میں نے کتابوں میں ان کا ذکر اکثر پڑھا تھا۔ چنانچہ ایک دن اس مندر میں پہنچا۔ جنس مترا کا گھر بھی اسی محلے میں تھا۔ اس لئے جس دن میں ان سے ملنے گیا اسی دن مندر چلا گیا۔ راہ میں بھیزوں کا گلہ نظر آیا جو کالی پر بلدان کی جانے والی تھیں۔ مندر کی گلی میں فقیروں کی قطار تھی۔ جن میں سادھو بھی تھے۔ میں ان دنوں بھی بٹنے کئے فقیروں کو بھیک دینے کا مخالف تھا۔ ان کا ایک غول میرے پیچھے لگ گیا اسی شکل کا ایک شخص غلام گردش میں بیٹھا نظر آیا۔ اس نے مجھے روک کر کہا ”بچہ کہاں جاتا ہے؟“ میں نے کہا مندر دیکھنے جاتا ہوں۔

اس نے مجھ سے اور میرے ساتھی سے بیٹھنے کو کہا۔ چنانچہ ہم دونوں بیٹھ گئے۔ میں نے اس سے پوچھا ”آپ اس بلدان کو دھرم کے مطابق سمجھتے ہیں؟“

”کون شخص جانوروں کی جان لینے کو دھرم سمجھے گا؟“

”پھر آپ اس کے خلاف اپدیش کیوں نہیں دیتے۔“

”یہ ہمارا کام نہیں۔ ہمارا کام بھگتی کرنا ہے۔“

”مگر آپ کو بھگتی کرنے کے لئے کوئی اور جگہ نہیں ملتی۔“

”ہمارے لئے ہر جگہ یکساں ہے۔ دنیا کے لوگ بھیز کے گلے کی طرح ہیں۔ جدھر ان کے

اگوالے جائیں چلے جاتے ہیں۔ ہم سادھوؤں کو اس سے کیا؟“

ہم نے زیادہ بحث نہیں کی بلکہ آگے بڑھ کر۔ مندر کے قریب خون کے نالوں نے ہمارا

استقبال کیا۔ مجھ سے وہاں کھڑا نہ ہوا گیا مجھے بڑی جھلاہٹ اور بے چینی تھی وہ مستقر آج تک میرے دل سے محو نہیں ہو سکا ہے۔

اسی رات کو مجھے چند بنگالی دوستوں کی طرف سے کھانے کی دعوت دی گئی تھی۔ وہاں میں نے ایک دوست سے اس دھیانہ طریقہ عبادت کا ذکر کیا۔ انہوں نے کہا ”بھیروں کو کچھ محسوس تھوڑا ہی ہوتا ہے۔ شور و غل سے اور ڈھولک کی آواز سے الم کا حس جاتا رہتا ہے۔“

مجھ یہ بات یقین نہیں آئی اور میں نے ان سے کہا کہ ”اگر بھیروں کی زبان ہوتی تو وہ کچھ اور داستان سناتیں۔ میں نے یہ محسوس کیا کہ اس ظالمانہ رسم کو موقوف کرنا ضروری ہے۔ مجھے گوتم بدھ کا قصہ یاد آگیا۔ مگر میں جانتا تھا کہ یہ میرے بس کی بات نہیں۔“

میری آج بھی وہی رائے ہے جو اس زمانے میں تھی۔ میرے نزدیک ایک مہینے کی زندگی انسان کی زندگی سے کم قیمتی نہیں ہے مجھے یہ گوارا نہیں کہ انسان کے جسم کی خاطر ایک مہینے کی جان لی جائے۔ میں تو یہ کہتا ہوں کہ کمزور جانور ہو اتنا ہی وہ اس کا مستحق ہے کہ انسان کے ظلم سے بچایا جائے۔ لیکن جو نفس خدمت کا اہل نہیں وہ اس کی حفاظت نہیں کر سکتا۔ میں ابھی اور تڑکیہ نفس اور قربانی کروں تب جا کر ہی امید کی جاسکتی ہے کہ میں ان مہینوں کو اس ناپاک بلدان سے بچا سکوں گا۔ میرا خیال ہے کہ میں اس تڑکیہ نفس اور قربانی کی آرزو میں گھل گھل کر مر جاؤں گا۔ میں ہمیشہ خدا سے دعا مانگتا ہوں کہ دنیا میں کوئی نفس قدسی خواہ وہ مرد ہو یا عورت، ایسا پیدا ہو جس کا دل ابدی رحم سے معمور ہو۔ جو ہمیں اس شرمناک گناہ سے نجات دے بے چارے معصوم جانوروں کی جان بچائے اور مندر کو اس آلودگی سے پاک کر دے میری سمجھ میں نہیں آتا کہ بنگال والے باوجود اس علم، ذہانت، قربانی اور زود حسی کے اس خونریزی کو کیوں نکر برداشت کرتے ہیں۔

ایک مہینہ گو کھلے کی صحبت میں (۳)

اس فوٹاک بھینٹ کو دیکھ کر جو دھرم کے نام سے کالی پر چڑھائی جاتی ہے مجھے اور بھی شوق پیدا ہوا کہ بنگالیوں کی زندگی کا مشہدہ کروں، میں نے برہمو سماج کے متعلق بہت کچھ سنا تھا۔ میں پر تپ چندر موزدار کی زندگی کے حالات سے واقف تھا۔ بعض جلسوں میں ان کی تقریریں سننے کا بھی اتفاق ہوا تھا۔ میں نے ان کی کیشب چندر سین کی سوان عمری بہم پہنچائی اور بڑے شوق سے اس کا مطالعہ کیا۔ اسے پڑھ کر مجھے معلوم ہو گیا کہ سدھروں برہمو سماج اور ادی برہمو سماج میں کیا فرق ہے۔ میں پنڈت شیوناتھ شاستری سے ملا اور پروفیسر کٹھوٹے کے ساتھ مہارشی دیویندر ناتھ نگور کی زیارت کے لئے گیا۔ لیکن وہ اس زمانے میں کسی سے نہیں ملتے تھے اس لئے ملاقات نہ ہو سکی۔ مگر ان کے گھر برہمو سماج کا ایک جلسہ ہوا جس میں ہم دونوں بلائے گئے۔ یہاں بہترین بنگالی گانا سننے میں آیا۔ اس دن سے مجھے بنگالی گانے کا بڑا شوق ہو گیا ہے۔

برہمو سماج کے دیکھنے کے بعد سوامی دیو کاند کو دیکھے بغیر چین نہیں آسکتا تھا۔ اس لئے میں بڑے جوش اور خلوص کے ساتھ بیلور ناتھ روانہ ہوا اور دور تک یا شاید سارے رستے پیدل گیا۔ مجھے یہ جگہ جو دنیا کے شور و شر سے الگ تھی بہت پسند آئی مگر جب وہاں یہ سنا کہ سوامی جی اپنے کلکتہ والے مکان میں بیمار پڑے ہیں اور کسی سے مل نہیں سکتے تو بہت افسوس اور مایوسی ہوئی۔

پھر میں نے بھگتی لیو دتیا کے گھر کا پتہ معلوم کیا اور چورنگی کے ایک عالی شان مکان میں ان سے ملا۔ ان کی شان و شوکت کو میں دیکھ کر دنگ رہ گیا اور گفتگو میں بھی میری ان کی میزان نہ پٹی۔ میں نے گو کھلے سے اس کا ذکر کیا۔ انہوں نے کہا اس سیلاب و ش غاتوں سے تمہارا دل نہ ملنا کوئی تعجب کی بات نہیں۔

مجھے ان سے ایک بار پستونجی بادشاہ کے یہاں پھر ملاقت ہوئی۔ جب میں پہنچا تو وہ پستون جی کی بوڑھی ماں سے باتیں کر رہی تھیں اور میں نے ان کی ترجمانی کی خدمت انجام دی۔ گو مجھ میں اور ان میں اتفاق رائے نہیں ہو سکا مگر میں نے دیکھا کہ ان کا دل ہندو دھرم کی محبت سے معمور ہے اور مجھے ان کی یہ بات بہت پسند آئی۔ ان کی کتابوں کا مطالعہ میں نے بعد میں کیا۔

میں دن کا کچھ حصہ کلکتے کے سربر آوردہ لوگوں سے مل کر جنوبی افریقہ کے متعلق گفتگو کرنے میں صرف کرتا تھا اور باقی دولت شہر کے مذہبی اور قومی اداروں کا مشاہدہ کرتا تھا۔ میں نے ایک جلسے میں جس کے صدر ڈاکٹر ملک تھے "جنگ بوز میں ہندوستانی ایسوسی ایشن کو ر کی خدمات" پر تقریر کی۔ اس موقع پر بھی انگلش مین کے ایڈیٹر کی ملاقات میرے کام آئی۔ مسٹر سانڈرس اس زمانے میں علیل تھے پھر بھی انہوں نے مجھے اتنی ہی مدد دی جتنی 1896ء میں دی تھی۔ گو کھلے کو میری یہ تقریر پسند آئی۔ جب انہوں نے ڈاکٹر رائے کو اس کی تعریف کرتے سنا تو انہیں بڑی خوشی ہوئی۔

غرض گو کھلے کے ساتھ ٹھہرنے کی بدولت مجھے کلکتے میں اپنا کام کرنے میں بڑی آسانی ہوئی اور بنگال کے ممتاز خاندانوں سے میل جول پیدا کرنے کا موقع ملا۔ اسی لئے ان تعلقات کی بنیاد پڑی جو مجھ سے اور اہل بنگال میں ہیں۔

جگہ کی کمی کے سبب سے میں اس یادگار مہینے کے بہت سے واقعات نظر انداز کرتا ہوں صرف برما کے سفر کا ذکر کروں گا۔ کلکتے سے میں چند دن کے لئے برما گیا اور وہاں کے چھو گیتوں سے ملا مجھے ان کی کاہلی دیکھ کر بہت دکھ ہوا۔ میں نے سنہری مندر کی بھی زیارت کی۔ مجھے وہاں بے شمار چھوٹی چھوٹی تمہیلوں کا ہلنا پسند نہ آیا اور اس مقدس گھر میں چوہوں کی کثرت کو دیکھ کر مجھے وہ واقعہ یاد آگیا جو سوامی دیانند کو موز کی میں پیش آیا تھا۔ برمی عورتوں کی آزادی اور مستعدی سے مجھے بڑی خوشی ہوئی اور مردوں کی آرام طلبی نے اس خوشی پر پانی پھیر دیا۔ ان چند دنوں کے قیام میں مجھے یہ بات محسوس ہوئی کہ جیسے بمبئی ہندوستان نہیں ہے اسی طرح رنگون بھی برما نہیں ہے۔ اور جیسے ہم ہندوستانی انگریزوں کے کمیشن ایجنٹ بن گئے ہیں اسی طرح ہم نے برما میں انگریز تاجروں سے مل کر برہمنوں کو اپنا کمیشن ایجنٹ بنا لیا ہے۔

برما سے لوٹ کر میں گو کھلے سے رخصت ہو گیا۔ ان سے جدا ہونا مجھ پر بہت شاق تھا مگر چونکہ اب بنگال میں بلکہ یوں کہنا چاہئے کہ کلکتے میں میرا کوئی کام نہیں رہا تھا۔ اس لئے یہاں

ٹھہرنے کی کوئی وجہ نہیں تھی۔

میرا یہ ارادہ تھا کہ کسی جگہ مستقل قیام کرنے سے پہلے تیسرے درجے میں ہندوستان کا سفر کروں اور یہ معلوم کروں کہ تیسرے درجے کے مسافروں کو کیا کیا تکلیفیں اٹھانا پڑتی ہیں۔ میں نے گو کھلے سے اس کا تذکرہ کیا۔ پہلے تو انہوں نے اس خیال کا مصحکہ اڑایا جب میں نے اپنی تجویز تفصیل سے بیان کی تو انہوں نے بڑی خوشی سے اس کی تائید کی۔ اس زمانے میں مسز پینٹ بنارس میں بیمار تھیں۔ میں نے سوچا کہ سب سے پہلے وہاں جا کر ان کے درشن کر لوں۔

تیسرے درجے کے سفر کے لئے نیا مسلمان مہیا کرنا ضروری تھا۔ گو کھلے نے اپنے پاس سے مجھے ایک پیتل کا ناشتے دان اور اس میں پوریاں اور لڈو بھر دئیے۔ میں نے ایک کرچ کا تھیلا بارہ کرنے میں خریدا اور چھایا کے (1) ادنی کپڑے کا ایک لمبا سا ادنی کوٹ بنوایا۔ تھیلا اس لئے تھا کہ اس میں یہ کوٹ، ایک دھوتی ایک تولیا اور ایک قمیض رکھ لوں۔ اس کے علاوہ میرے پاس ایک کمبل اور لوٹا بھی تھا۔ اس سارو سامان سے میں نے اپنا سفر شروع کیا۔ گو کھلے اور ڈاکٹر رائے مجھے پہنچانے اسٹیشن آئے۔ میں نے ان دونوں سے درخواست کی کہ یہ زحمت نہ اٹھائیں مگر وہ نہ مانے۔ گو کھلے نے کہا ”اگر تم اول درجے میں جاتے تو میں نہ چلتا۔ مگر اب ضرور چلوں گا۔ گو کھلے کو کسی نے پلیٹ فارم پر جانے سے نہیں روکا۔ وہ ریشمی پگڑی اور دھوتی باندھے اور کوٹ پہنے تھے۔ ڈاکٹر رائے بنگالی وضع میں تھے انہیں نکت کلکٹر نے ٹوکا مگر گو کھلے نے کہا کہ یہ میرے دوست ہیں تو انہیں اندر جانے کی اجازت مل گئی۔

غرض ان دونوں کی دعائیں لے کر میں روانہ ہوا۔

حوالہ

1 - پور بندر کے قریب ایک گاؤں جس کا موٹا ادنی کپڑا گرد و نواح میں مشہور ہے۔

بنارس میں

مجھے کلکتے سے راجکوٹ جانا تھا اور راستے میں بنارس، آگرہ، بے پور اور پالن پور ٹھہرنے کا مقصد تھا اور مقامات پر بھی ٹھہرنا۔ مگر اتنا وقت نہ تھا۔ ہر شہر میں میں نے ایک ایک دن قیام کیا اور سوائے پالن پور کے سب کہیں معمولی جاتیوں کی طرح دھرم سالوں میں یا پنڈتوں کے یہاں مہمان رہا۔ اس سارے سفر میں (مع ریل کے کرائے کے) اکتیس روپے سے زیادہ صرف نہیں ہوئے۔

اس تیسرے درجے کے سفر میں میں نے اکثر پیسفر میں جانے کو ڈاک گاڑی میں جانے پر ترجیح دی۔ کیونکہ ڈاک میں ایک تو مسافروں کی بہت کثرت ہوتی تھی دوسرے کرایہ کسی قدر زیادہ تھا۔ اب بھی تیسرے درجے کی گاڑی اتنی ہی میلی ہیں اور پاخانہ کا انتظام اتنا ہی خراب ہے جتنا اس زمانے میں تھا۔ ممکن ہے کہ کچھ تھوڑی سی ترقی ہوئی ہو، لیکن اب بھی اول درجے اور تیسرے درجے میں جتنا فرق ہے وہ کرائے کے تناسب سے بہت زیادہ ہے۔ تیسرے درجے کے مسافروں سے بھیدوں کا سا برتاؤ ہوتا ہے اور ان کے ڈبے بھی بھیدوں کے باڑے معلوم ہوتے ہیں یورپ میں میں تیسرے درجے میں سفر کا کرتا تھا۔ مگر ایک بار میں نے اول درجے میں سفر کیا کہ دیکھوں دونوں میں کیا فرق ہے۔ وہاں مجھے کوئی زیادہ فرق نظر نہیں آیا۔ جنوبی افریقہ میں تیسرے درجے کے مسافر عموماً جنتی ہوتے ہیں۔ پھر بھی وہاں تیسرے درجے میں ہندوستان سے کہیں زیادہ آسائش ہے جنوبی افریقہ کے بعض حصوں میں تو تیسرے درجے کے مسافروں کے لئے گدے دار بنچیں ہیں اور سونے کا بھی انتظام ہے۔ مسافروں کے بٹھانے میں اس کا خیال رکھا جاتا ہے کہ بہت بھید نہ ہو جائے۔ مگر ہندوستان میں عموماً ہر ڈبے میں مقررہ تعداد سے زیادہ مسافر بھر جاتے ہیں۔

ایک تو ریلوے کے منتظمین تیسرے درجے کے مسافروں کی آسائش کی مطلق پروا نہیں کرتے دوسرے یہ مسافر خود اتنے میلے اور بے لحاظ ہوتے ہیں کہ جس شخص کے مزاج میں صفائی ہو اس کے لئے تیسرے درجے میں سفر کرنا ایک مصیبت ہے۔ ان لوگوں کی عادت ہوتی ہے کہ ہر طرح کا کوڑا کچرا ریل کے ڈبے کے فرش پر پھینکے جاتے ہیں۔ ہر جگہ اور ہر وقت تمباکو پیتے رہتے ہیں۔ پان پھلایا کرتے ہیں اور سارے ڈبے کو اگلا دن بنا دیتے ہیں۔ ان کے شور و غل گالی گلوچ سے دوسرے مسافروں کو چاہے جتنی تکلیف ہو۔ انہیں اس کی پروا نہیں ہوتی۔ میں نے 1902ء میں تیسرے درجے کا سفر کیا تھا۔ پھر 1902ء سے 1919ء تک مسلسل کرتا رہا۔ مگر اتنے عرصے میں مجھے تیسرے درجے کی حالت میں کوئی فرق نہیں معلوم ہوا۔

مجھے اس صورت حال کا صرف ایک علاج نظر آتا ہے اور وہ یہ ہے کہ تعلیمیافتہ اپنے اوپر لازم کر لیں کہ ہمیشہ تیسرے درجے میں سفر کریں گے۔ عام مسافروں کی عادتوں کو سدھاریں گے اور ریل کے ملازموں کو کبھی چین نہ لینے دیں گے بلکہ جب ضرورت ہوگی شکایتوں کی بھرمار کر دیں گے۔ اپنے آرام کے لئے رشوت یا دوسرے ناجائز ذرائع سے کام نہ لیں گے اور کسی کو قواعد کی خلاف ورزی نہ کرنے دیں گے۔ اگر ایسا ہو تو مجھے یقین ہے کہ بہت کچھ اصلاح ہو جائے گی۔

افسوس ہے کہ 1918-19ء کی شدید علالت کے سبب سے مجھے تیسرے درجے میں سفر کرنے کا معمول ترک کرنا پڑا مجھے اس کا بڑا رنج اور بڑی شرمندگی ہے خصوصاً اس لئے کہ یہ معذوری ایسے زمانے میں پیش آئی جب تیسرے درجے کے مسافروں کی شکایات رفع کرنے کی تحریک اچھی خاصی چل رہی تھی۔ ریل اور جہاز کے غریب مسافروں کی تکلیفیں جو خود ان کی نامعقول عادتوں سے اور بڑھ جاتی ہیں۔ وہ ناجائز رعایتیں جو حکومت نے غیر ملکوں کی تجارت کو دے رکھی ہیں اور اسی قسم کی اور چیزیں بجائے خود ایسے اہم مسائل ہیں کہ دو ایک حوصلہ مند اور مستقل مزاج آدمیوں کو اپنا سارا وقت ان کے لئے وقف کر دینا چاہئے۔

تیسرے درجے کے مسافروں کا ذکر نہیں چھوڑ کر میں وہ واقعات بیان کرتا ہوں جو بنارس میں پیش آئے ہیں صبح کے وقت وہاں پہنچائیں نے یہ طے کیا کہ کسی پنڈے سے کے یہاں ٹھہروں گا۔ جیسے ہی میں گاڑی سے اترتا مجھے بہت سے برہمنوں نے آگھیرا۔ میں نے ان میں سے ایک شخص کا انتخاب کیا جو دوسروں کے مقابلہ میں صاف ستھرا اور معقول معلوم ہوتا تھا۔ آگے چل کر معلوم ہوا کہ یہ انتخاب صحیح تھا۔ اس کا مکان دو منزلہ تھا۔ صحن میں ایک گائے بندھی ہوئی تھی۔ مجھے اس

نے اوپر کی منزل میں ٹھہرایا۔ میں پرانی رسم کے مطابق کھانا کھانے سے پہلے گنگا اشنان کرنا چاہتا تھا۔ پنڈا اس کا سلمان کرنے لگا۔ میں نے اس سے پہلے کہہ دیا تھا کہ میں تمہیں سواروپیہ سے زیادہ دکشا نہیں دوں گا۔ تم اسی لحاظ سے سب کام کرنا۔

وہ اس پر راضی ہو گیا اور کہنے لگا۔ چاہے جاتری امیر ہو یا غریب دونوں کی سیوا ایک کرنا چاہئے۔ اب رہی دکشا جو جس کی جیسی حیثیت ہوتی ہے دے دیتا ہے جہاں تک مجھے معلوم ہے پنڈے نے پوجا وغیرہ کے سوا ادا کرنے میں کسی طرح کی کمی نہیں کی پوجا گیارہ بجے ختم ہوئی اور میں درشن کے لئے کاشی دشوانا تھ پہنچا۔ میں نے وہاں جو کچھ دیکھا اس سے مجھے بڑی تکلیف ہوئی۔ 1891ء میں جب میں بمبئی میں وکالت کرتا تھا۔ میں نے پورا تھنا سماج میں کاشی جاترا پر ایک لکچر سنا تھا۔ اس لئے میں پہلے سے سمجھتا تھا کہ یہاں آکر مایوسی ہوگی۔ لیکن اتنی سخت مایوسی کی توقع نہ تھی۔

مندر میں ایک سنگ گلی سے ہو کر جانا پڑتا تھا۔ جہاں پیر پھسلتا تھا۔ خاموشی اور سکون نام کو نہ تھا۔ کھیوں کے جوم سے اور دوکانداروں اور جاتریوں کے شور و غل سے ناک میں دم آنے لگا۔ یہ وہ جگہ تھی جہاں دھیان گیا ان کی فضا ہونا چاہئے تھی۔ مگر معاملہ بالکل الٹا تھا۔ یہ فضا تلاش کرنے کے لئے انسان کو اپنے قلب کی طرف رجوع کرنا پڑتا تھا۔ میں نے بعض عبادت گزار بہنوں کو دیکھا کہ دھان میں ڈوبی ہوئی ہیں اور انہیں کچھ خبر نہیں کہ آس پاس کیا ہو رہا ہے لیکن اس میں مندر کے منتظمین کی کوئی تعریف نہ تھی ان کا یہ کام تھا کہ مندر میں ایک پاکیزہ، پرسکون اور دلکش جہانی اور روحانی فضا پیدا کریں۔ اس کے بجائے مجھے وہاں ایک بازار نظر آیا جس میں چاک وکاندار مٹھائیاں اور جدید ترین وضع کے کھلونے بیچ رہے تھے۔

مندر کے دروازے پر پہنچا تو دیکھا کہ سڑے ہوئے پھولوں کا ڈھیر لگا ہے جن کی بدبو سے دماغ پھٹا جاتا ہے مندر کا فرش نفیس سنگ مرمر کا ہوتا مگر کسی بد مذاق خوش عقیدہ شخص نے اسے جا بجائے اکھاڑ کر روئے جڑا دیئے تھے جن سے بہتر گرد میں اٹھنے کے لئے کوئی چیز نہیں ہو سکتی میں جن دہنی کے قریب گیا اس کے آس پاس کی جگہ بہت میلی تھی میں نے یہاں خدا کو ڈھونڈا مگر وہ مجھے نہ ملا۔ میں جھلایا ہوا تھا اور میرا جی نہیں چاہتا تھا کہ وہ دکھتا دوں۔ میں نے ایک پائی نکال کر اس پنڈے کے سامنے پیش کی جو "جن دہنی" کا نگران تھا۔ وہ مجھ پر برس پڑا اور کہنے لگا تو اس ایمان کی سزا میں ترک میں جائے گا۔"

مجھ پر اس کا کوئی اثر نہیں ہوا۔ میں نے کہا ”مہاراج میرا جو کچھ انجام ہوتا ہے وہ ہو گا مگر آپ کو برہمن ہو کر لام کاف زبان سے نہ نکالنا چاہئے۔“

اس نے جواب دیا، چل دور ہو مجھے تیری پائی نہیں چاہئے۔ اور اس کے بعد گالیوں کی بازو چلی۔ میں نے وہ پائی اٹھالی۔ خوش خوش چلا کہ برہمن کے ہاتھ سے پائی بچالی۔ مگر وہ کب چھوڑنے والا تھا۔ اس نے پکار کر کہا۔ اچھا پائی یہاں دھر دے۔ میں تیرا جیسا نہیں ہونا چاہتا۔ اگر میں تجھ سے یہ پائی نہ لوں تو تیرے لئے بہت برا ہو گا۔

میں نے بادل ناخواستہ پائی اس کے حوالے کی اور وہاں سے روانہ ہو گیا۔

اس کے بعد مجھے دوبار کاشی دشوانا تم جانے کا اتفاق ہوا مگر یہ وہ زمانہ تھا کہ میرے نام کے ساتھ مہاتما کا دم چھلا لگایا جا چکا تھا۔ جن واقعات کا میں نے اوپر ذکر کیا ہے ان کا پیش آنا اب ناممکن تھا۔ لوگ میرے درشن کے شوق میں لڈے آتے تھے اور مجھے مندر کا درشن نہیں کرنے دیتے تھے۔ مہاتماؤں پر جو کچھ گذرتی ہے انہیں کا دل جانتا ہے پھر بھی استنا میں نے دیکھ لیا کہ یہاں کے میلے پن اور شور و شغب کا وہی حال ہے جو پہلے تھا۔

اگر کسی کو خدا کے بے حساب عفو اور رحم کی شان دیکھنا ہو تو ان مقدس مقامات کو دیکھے۔ یہ جو گیوں کا داتا لوگوں کو اپنے نام سے کیسی کیسی ریا کاری اور بیدینی کرتے دیکھتا ہے اور در گذر کرتا ہے۔ اس نے مدت ہوئی ہمیں آگاہ کر دیا ہے۔ ”جیسا کرنا ویسا بھرنا“ ”کرم“ کے اٹل قانون سے کسی کو مضر نہیں۔ پھر خدا کو دخل دینے کی کیا ضرورت ہے۔ اس نے تو قانون بنا کر گویا دنیا کو اس کے حال پر چھوڑ دیا ہے۔

مندر کی زیارت کے بعد میں مسز بسینٹ کے درشن کیلئے گیا مجھے معلوم تھا کہ وہ ابھی بیماری سے اٹھی ہیں۔ میری اطلاع ہوتے ہی وہ باہر تشریف لے آئیں۔ میں نے صرف سلام کے لئے کہا تھا۔ اس لئے میں نے عرض کیا۔ ”مجھے معلوم ہے کہ آپ کی طبیعت ناساز ہے بس صرف سلام کرنا تھا۔ میں آپ کی اس عنایت کا شکر گزار ہوں کہ باوجود علالت کے آپ نے مجھ سے ملنا قبول فرمایا۔ میں آپ کو زیادہ زحمت نہیں دینا چاہتا۔“

بھیسٹی میں بس جانے کا ارادہ ہے

گو کھلے کا اصرار تھا کہ میں بھیسٹی میں بس جاؤں اور دہلی کے ساتھ ساتھ قومی کام بھی کروں قومی کام سے مراد ان دنوں کانگریس کی خدمت تھی اور انہوں نے جو ادارہ قائم کیا تھا وہ بھی زیادہ تر کانگریس ہی کا کام کرتا تھا۔

مجھے گو کھلے کا مشورہ پسند آیا۔ مگر مجھے دہلی چلنے کی کچھ زیادہ امید نہ تھی۔ میں اب تک پہلی ناکامی کی تلخی کو نہیں بھولا تھا اور مقدمے حاصل کرنے کیلئے خوشامد کرنا مجھے اب زہر لگتا تھا۔

اس لئے میں نے یہ فیصلہ کیا کہ پہلے راجکوٹ میں کام شروع کروں۔ وہاں میرے پرانے عنایت فرما کیول رام باؤجی دیو جنہوں نے مجھے انگلستان جانے پر آمادہ کیا تھا۔ موجود تھے۔ انہوں نے مجھے پہلے ہی دن مقدمے لا کر دیئے۔ دو اسپیل تھیں جو پولیٹیکل ایجنٹ کاٹھیادار کے جوڈیشل اسسٹنٹ کے یہاں پیش ہونے والی تھیں اور ایک ابتدائی مقدمہ جام نگر کا یہ معاملہ کسی قدر اہم تھا۔ میں نے کہا مجھے اپنے اوپر بھروسہ نہیں کہ اس مقدمے کی پیردی، جیسی چاہئے۔ کر سکوں گا۔ کیول رام دیو بولے تمہیں ہارنے جیتنے سے کیا غرض۔ تم تو اپنی ہی کوشش کر ڈالو۔ آخر میں بھی تو تمہاری مدد کے لئے موجود ہوں۔“

دوسری طرف سے سمر تھا جی آنجنہانی وکیل تھے میں نے غاصی جیاری کی تھی میں خود تو ہندوستان کے قانون سے اچھی طرح واقف نہ تھا مگر کیول رام دیو نے مجھے ساری اونچ نیچ سمجھا دی۔ میں نے جنوبی افریقہ جانے سے پہلے دوستوں سے سنا تھا کہ سرفیروز شاہ مہتا کو قانون شہادت از بریاد ہے اور یہی ان کی کامیابی کا راز ہے۔ میں نے یہ بات دل میں رکھی تھی اور سفر کے دوران میں قانون شہادت اور اس کی شرحوں کا مطالعہ اچھی طرح کر لیا تھا۔ پھر جنوبی افریقہ میں اتنے دن

وکالت کر کے جو تجربہ حاصل ہوا تھا وہ بھی اس وقت کام آیا۔

میں مقدمہ جیت گیا اور مجھے اپنی قابلیت پر تھوڑا بہت بھروسہ ہو گیا۔ ایپیلوں کے بارے میں مجھے کوئی کھٹکا نہیں تھا۔ ان دونوں میں کامیابی ہوئی۔ ان سب باتوں سے میری ڈھارس بندھ گئی کہ شاید بمبئی میں بھی کام چلا لوں۔

لیکن بمبئی جانے کے اسباب بیان کرنے سے پہلے میں ایک واقعہ بیان کروں گا جس سے مجھے انگریز افسر کی جہالت اور بدسلوکی کا تجربہ ہوا۔ جوڈیشل اسسٹنٹ کی عدالت کا کوئی مقام متعین نہ تھا۔ وہ ہمیشہ دورے پر رہتا تھا اور دکیلوں اور موکلوں کو اس کے پیچھے پیچھے جانا پڑتا تھا۔ دکیل جب صدر مقام سے باہر جاتے تھے تو نفیس زیادہ لیتے تھے۔ اس لئے بے چارے موکل پر دہرا خرچ پڑتا تھا۔ اس کی اس مصیبت کی جج کو کوئی پروا نہ تھی۔

جس ایپل کا میں نے ذکر کیا ہے وہ دیرادل میں سنا جانے والا تھا۔ جہاں شدت سے طاغون پھیلا ہوا تھا۔ مجھے یاد ہے کہ اس چھوٹی سی جگہ میں جس کی آبادی ساڑھے پانچ ہزار تھی، روز پچاس کسٹیکس ہو جاتے تھے۔ قصبہ قریب قریب خالی ہو گیا تھا۔ میں ایک دھرم سالے میں ٹھہر گیا جو شہر سے کچھ دور کے فاصلے پر واقع تھا۔ لیکن بے چارے موکل کہاں ٹھہرتے۔ ان میں سے جو غریب تھے ان کا خدا ہی حافظ تھا۔

میرے ایک دوست نے جن کے چند مقدمے اسی عدالت میں تھے مجھے تار دیا کہ تم دیرادل میں طاغون ہونے کی بنا پر درخواست دے دو کہ پڑاؤ کسی اور جگہ منتقل کر دیا جائے۔ جب میں نے یہ درخواست دی تو صاحب نے کہا "آپ ڈرتے ہیں؟"

میں نے جواب دیا "میرے ڈرنے نہ ڈرنے کا سوال نہیں میں تو اپنی فکر کر لوں گا مگر موکل کیا کریں گے۔" صاحب بولے "طاغون نے تو اب ہندوستان میں ڈیرا ڈال دیا ہے اس سے ڈرنا کیا؟ دیرادل کی آب و ہوا بڑی اچھی ہے (صاحب قصبے سے دور سمندر کے کنارے ایک عالی شان خیمے میں رہتے تھے) لوگوں کو کھلی ہوا میں رہنے کی عادت ڈالنی چاہئے۔"

اس فلسفے کے آگے ساری دلیلیں بیکار ثابت ہوئیں۔ صاحب نے سررشتہ دار سے کہا "مسٹر گاندھی جو کہتے ہیں اسے نوٹ کر لیجئے اور یہ دریافت کر لیجئے کہ کیا واقعی دکیلوں یا موکلوں کو یہاں آنے میں بہت زیادہ تکلیف ہوتی ہے۔"

ظاہر ہے کہ "صاحب نے جو کچھ کیا نیک نیتی سے مناسب سمجھ کر کیا لیکن اسے کیا خبر کہ

غریب ہندوستان پر کیا مصیبتیں گذرتی ہیں؟ وہ کیا جانے کہ ہندوستانیوں کی ضرورتیں عادتیں خصوصیتیں کیا ہیں؟ جو شخص سونے کی گنیوں سے حساب کرنے کا عادی ہو وہ ایک دم تانبے کے پیسوں کی گنتی کیونکر سمجھ سکتا ہے۔ جس طرح ہاتھی چاہے اپنی طرف سے کتنی ہی کوشش کرے دنیا کو چوٹی کی نظر سے نہیں دیکھ سکتا اسی طرح انگریز جو ہاتھی کی سی ضرورتیں رکھتا ہے چوٹی کی زندگی بسر کرنے والے ہندوستانیوں کے طرز خیال کو اختیار کرنے اور اس کے مطابق قانون بنانے سے معذور ہے۔

خیر یہ جملہ معترضہ تھا۔ اب میں اصل قصے کی طرف رجوع کرتا ہوں۔ باوجود اس کی کہ میری دکالت خوب چل رہی تھی میرا مقصد ابھی اور کچھ دن راجکوٹ ہی میں رہنے کا تھا مگر ایک دن کیول رام دیو آکر مجھ سے کہنے لگے ”بھئی گاندھی ہم سے یہ نہیں دیکھا جاتا کہ تم راجکوٹ میں پڑے سوکھا کرو۔ اب تو تمہیں بمبئی میں جا کر رہنا چاہئے۔“

میں نے پوچھا ”مگر وہاں میرے لئے کام کون فراہم کرے گا؟ کیا آپ میرے اخراجات کا ذمہ لیتے ہیں؟“ انہوں نے جواب دیا ”ہاں میں اس کا ذمہ لیتا ہوں۔ ہم لوگ تمہیں کسی دن بڑے نامی بیرسٹر کی حیثیت سے یہاں بلائیں گے اور عرضداشتیں لکھنے کا کام دیں بھیج دیا کریں گے۔ یہ تو ہم دیکھوں گے ہاتھ میں ہے کہ جس بیرسٹر کو چاہیں بڑھا دیں جسے چاہیں گھٹا دیں۔ تم نے جام نگر اور دیرادل کے مقدموں میں اپنی قابلیت ثابت کر دی ہے۔ اس لئے مجھے تمہاری طرف سے پورا اطمینان ہے۔ تمہیں خدا نے قومی کام کرنے کے لئے پیدا کیا ہے ہم تمہیں کاٹھیاوار میں گمنامی کی زندگی بسر نہیں کرنے دیں گے۔ اب بتاؤ بمبئی کب جاؤ گے؟“

میں نے کہا ”مجھے نٹال سے ایک رقم کا انتظار ہے۔ اس کے آتے ہی چلا جاؤں گا کوئی دو ہفتے میں روپیہ آگیا اور میں بمبئی روانہ ہو گیا۔ میں نے چین گلبرٹ اور سیانی کے دفتر میں کمرے کرائے پر لے لئے اور بظاہر معلوم ہوتا تھا کہ اب میرا مستقل قیام بمبئی میں رہے گا۔“

دھرم کی آزمائش

اگرچہ میں نے فورٹ میں دفتر کے لئے کمرے اور گرجا میں مکان لے لیا تھا مگر خدا کو یہ منظور نہ تھا کہ میں یہاں مستقل قیام کروں نئے مکان میں آتے ہی میرا منجھلا بیٹا منی لال جسے چند سال پہلے پیچک کا شدید دورہ ہو چکا تھا تپ محرقہ میں مبتلا ہو گیا۔ اسی کے ساتھ اس کے پھیپھڑے میں درم ہوا اور رات کو ہدیان کے آثار ظاہر ہونے لگے۔

ڈاکٹر بلایا گیا۔ اس نے کہا کہ دوا سے کچھ کام نہیں چلے گا مگر انڈے اور چوزے کی سخنی دیجئے اس سے فائدہ ہو گا۔

منی لال اس زمانے میں صرف دس برس کا تھا۔ اس سے تو میں کیا پوچھتا مجھے اس کے دلی کی حیثیت سے خود ہی فیصلہ کرنا تھا۔ یہ ڈاکٹر پارسی تھا اور بڑا اچھا آدمی تھا میں نے اس سے کہا کہ ہم سب نباتاتی ہیں۔ یہ دونوں چیزیں بچوں کو نہیں دی جاسکتیں۔ آپ کوئی اور چیز بتائیے۔

نیک ڈاکٹر بولا۔ ”آپ کے لڑکے کی زندگی خطرے میں ہے۔ یہ ہو سکتا ہے کہ اسے دودھ میں پانی ملا کر دیا جائے مگر اس میں کافی غذائیت نہیں ہے۔ آپ جانتے ہیں کہ میں بہت سے ہندو گھرانوں میں بلایا جاتا ہوں ان لوگوں کو میں جو کچھ بتاتا ہوں بے تکلف استعمال کرتے ہیں۔ خدا کے لئے آپ اپنے بچے پر یہ ظلم نہ کیجئے۔“

میں نے کہا ”آپ بجا کہتے ہیں ڈاکٹر کو یہی کہنا چاہئے۔ مگر میری ذمہ داری بہت بڑی ہے اگر لڑکا سیانا ہوتا تو میں یقیناً اسی سے پوچھتا اور جو وہ کہتا وہی کرتا مگر مجھے تو اس کے بجائے خود فیصلہ کرنا ہے میرے خیال میں ایسے ہی موقع پر انسان کے عقیدے کی آزمائش ہوتی ہے۔ اب چاہے یہ ٹھیک ہو یا نہ ہو مگر میرا مذہبی عقیدہ ہے کہ انسان کو گوشت انڈے وغیرہ نہیں کھانا چاہئے، زندگی کی

ضروریات کی بھی آخر حد ہوتی ہے۔ بعض باتیں ایسی ہیں جو جان بچانے کی خاطر بھی نہیں کرنا چاہئیں۔ میرا مذہب مجھے ایسے موقعوں پر بھی اجازت نہیں دیتا کہ میں گوشت اور انڈے کھاؤں یا اپنے بچوں کو کھلاؤں۔ اس لئے مجھے چار دن چار اس خطرے کا مقابلہ کرنا ہے جس کا آپ کو احتمال ہے۔ آپ سے میری ایک درخواست ہے کہ آپ کی تدبیر پر عمل کرنے سے تو میں معذور ہوں اس لئے میرا مقصد ہے کہ پانی کے علاج سے کام لوں جس سے مجھے واقفیت ہے مگر میں نہ بچے کی نبض دیکھ سکوں گا اور نہ اس کے سینے سے پھیپھڑے وغیرہ کا معائنہ کر سکوں گا۔ اگر آپ کبھی کبھی اس کا معائنہ کر لیا کریں اور مجھے اس کی حالت بتا دیا کریں تو بڑا احسان ہو۔

نیک ڈاکٹر میری مشکلوں کو سمجھ گیا اور اس نے میری درخواست قبول کر لی۔ گو منی لال خود کوئی فیصلہ کرنے کی صلاحیت نہیں رکھتا تھا۔ مگر میں نے اپنی اور ڈاکٹر کی گفتگو اس کو سنائی اور پوچھا کہ تمہاری کیا رائے ہے؟

اس نے کہا "آپ تو پانی کا علاج کیجئے مجھے انڈے دندے سخنی دشنی نہیں چاہئے۔" اس سے مجھے خوشی ہوئی۔ اگرچہ یہ میں جانتا تھا کہ میں اسے یہ چیزیں دیتا تو وہ انکار نہ کرتا۔

میں کوہنے کے طریقہ علاج سے واقف تھا اور اس کا تجربہ بھی کر چکا تھا میرا خیال تھا کہ فائق سے بھی فائدہ ہو گا اس لئے میں نے منی لال کو کوہنے کی ہدایت کے مطابق تین تین منٹ کے "ہپ ہاتھ" دینا شروع کئے اور تین دن تک سوائے لیو کے آبثورے کی کھانے پینے کو کچھ نہیں دیا۔

مگر بخار کسی طرح 104 درجے سے کم نہیں ہوتا تھا۔ رات کو اس پر ہذیانی کیفیت طاری ہو جاتی تھی۔ مجھے بڑا تردد ہو گیا۔ میں دل میں سوچتا تھا کہ لوگ مجھے کیا کہیں گے؟ بڑے بھائی میری نسبت کیا خیال کریں گے؟ کسی اور ڈاکٹر کو نہ بلا لوں دید کا علاج کیوں نہ کروں؟ ماں باپ کو کیا حق ہے کہ جس چیز کا انہیں ضبط ہے اس پر خواہ مخواہ بچوں کو بھی مجبور کریں؟

اس قسم کے دوسوے میرے دل میں پیدا ہوتے تھے مگر پھر خیالات کا رخ بدل جاتا تھا۔ میرا دل کہتا تھا کہ خدا یقیناً اس بات سے خوش ہو گا کہ میں اپنے بچے کا وہی علاج کر رہا ہوں جو اپنا کرتا۔ مجھے پانی کے علاج پر عقیدہ ہے اور ڈاکٹری علاج پر نہیں ہے۔ ڈاکٹر اس بات کا دعویٰ نہیں کر سکتے کہ ضرور صحت ہوگی۔ وہ بھی زیادہ سے زیادہ تجربہ ہی کر سکتے ہیں موت زندگی خدا کے ہاتھ میں ہے۔ مجھے توکل سے کام لینا چاہئے۔ اور جس علاج کو میں مناسب سمجھتا ہوں وہی کرنا چاہئے۔

مجھے ان متضاد خیالات نے کشمکش میں ڈال رکھا تھا۔ رات کا وقت تھا میں منی لال کے پاس اسی کے پلنگ پر لیٹا ہوا تھا۔ سوچتے سوچتے میں نے یہ طے کیا کہ کپڑا بھگو کر اس کے جسم پر لپیٹوں۔ میں فوراً اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ ایک چادر پانی میں بھگوئی اور خوب نچوڑ کر منی لال کے سارے دھڑ پر لپیٹ دی۔ اوپر سے دو کمبل ڈال دیئے اور سر پر ایک گیلا تولیہ رکھ دیا۔ سارا بدن گرم لوہے کی طرح تپ رہا تھا۔ پسینا کا نام بھی نہ تھا۔

اس وقت میرے دل کی عجیب حالت تھی میں منی لال کی ماں کو اس کے پاس چھوڑ کر چوپائی کی طرف نکلنے نکل گیا کہ ذرا حواس درست کر لوں۔ دس بج چکے تھے۔ راہ گیر اکاد کا نظر آتے تھے۔ میں اپنے خیالات میں اس قدر ڈوبا ہوا تھا کہ ان کی طرف آنکھ اٹھا کر بھی نہیں دیکھتا۔ دل ہی دل میں دعا مانگ رہا تھا یا اللہ اس امتحان میں عزت تیرے ہاتھ ہے۔ ”اور زبان کو ”رام نام“ کی رٹ لگی تھی۔ کچھ دیر کے بعد گھر لوٹا۔ میرا دل دھڑک رہا تھا۔

جیسے ہی میں نے گھر میں قدم رکھا۔ منی لال نے کہا۔ ”باپو تم آگئے؟“
 ”ہاں بنا آگیا۔“

”یہ چادر تو ہٹائیے۔ میرا گرمی کے مارے برا حال ہے۔“

”کیا پسینہ نکل رہا ہے؟“

”سارا بدن تر تر ہے۔ خدا کے لئے اب ہٹائیے۔“

میں نے اس کے ماتھے پر ہاتھ رکھا۔ پسینے کے قطرے موتی کی طرح جھلک رہے تھے۔ بخار کم ہو رہا تھا۔ میں نے خدا کا شکر ادا کیا۔

”منی لال۔ بس اب تمہارا بخار اترنے ہی والا ہے، ذرا دیر اور پسینہ نکل لے۔ پھر میں چادر ہٹائے لیتا ہوں۔“

”نہیں میرے باپو میں ہاتھ جوڑتا ہوں مجھے اس بھٹی سے نکالئے۔ چاہے پھر کبھی لپیٹ دیجئے۔“
 میں نے اسے سمجھا بھجا کر چند منٹ اور چادر لپیٹی رہنے دی۔ اس کے ماتھے سے پسینے کی اولتی نپک رہی تھی میں نے چادر ہٹائی اور اس کا بدن سکھایا۔ پھر ہم باپ بیٹے ایک ہی پلنگ پر سو گئے۔ دونوں گھوڑے بیچ کر سوئے۔ صبح کو منی لال کا بخار کم ہو گیا۔ چالیس دن تک اسے صرف پانی ملا۔ دودھ اور پھلوں کا عرق دیا گیا۔ اب مجھے کوئی ڈر نہ تھا۔ یہ بڑا موذی بخار تھا مگر اب قابو میں آگیا۔

آج منی لال میرے لڑکوں میں سب سے زیادہ تندرست ہے۔ کون کہہ سکتا ہے کہ اے محض خدا کے فضل سے صحت ہوئی۔ یا پانی کے علاج سے یا غذا اور تیمارداری میں احتیاط کرنے سے؟ ہر شخص اپنے عقیدے کے مطابق جو چاہے سمجھ لے۔ مجھے تو یہ یقین تھا کہ خدا نے میری عزت رکھ لی اور یہی یقین آج تک قائم ہے۔

پھر جنوبی افریقہ چلا

منی لال اچھا ہو گیا۔ مجھے یہ محسوس ہوا کہ گر کام والا گھر رہنے کے قابل نہیں ہے۔ اس میں سیلن تھی اور کافی روشنی نہیں پہنچتی تھی۔ اس لئے ریواشنکر جگ جیون جی کے مشورے سے میں نے یہ طے کیا کہ بمبئی کے مضافات میں کوئی ہوادار بنگلہ لوں۔ میں باندر اور سانتا کرز میں گشت لگاتا رہا۔ باندر اس لئے پسند نہیں آیا کہ وہاں مسلخ تھا۔ گھٹ کو پار اور اس کے گرد و نواح کے مقامات سمندر سے دور تھے۔ آخر ہم نے سانتا کرز میں ایک خوبصورت بنگلہ انتخاب کیا اور چونکہ وہ حقان صحت کے اعتبار سے بہت اچھا تھا اس لئے اسی کو لیا۔

میں نے سانتا کرز سے چرچ گیٹ تک کا اول درجے کا سیزن ٹکٹ خرید لیا۔ مجھے یاد ہے کہ بعض اوقات درجے میں میرے سوا کوئی مسافر نہیں ہوتا تھا اور اس پر میرے نفس کو ایک غرور سا بعض اوقات محسوس ہوتا تھا۔ اکثر میں باندر تک پیدل جاتا تھا اور وہاں سے تیز گاڑی میں بیٹھتا تھا۔ جو چرچ گیٹ تک سچ میں کسی اسٹیشن پر نہیں رکتی تھی۔

مجھے اپنے پیشے میں توقع سے زیادہ کامیابی ہوئی۔ میرے جنوبی افریقہ کے موکل اکثر مجھے اپنے مقدمے دیا کرتے تھے اور میری گذراوقات کے لئے کافی تھے۔

ابھی تک مجھے ہائیکورٹ کا کام نہیں ملا تھا۔ ان دنوں ہائیکورٹ کے وکلا مشق کے لئے فرضی مقدموں میں بحیثیت کیا کرتے تھے اور میں بھی وہاں جایا کرتا تھا۔ اگرچہ سمٹ میں شریک ہونے کی کبھی ہمت نہیں ہوئی۔ مجھے یاد ہے کہ جمعیت مرام ناتا بھائی اس میں نمایاں حصہ لیا کرتے تھے۔ دوسرے نومشق بیرسٹروں کی طرح میں بھی ہائیکورٹ میں مقدموں کی بحیثیت سنے جایا کرتا تھا۔ لیکن سچ پوچھئے تو مجھے اپنے علم میں اضافہ کرنے کی اتنی خواہش نہ تھی جتنی سمندر کی ہوا کی۔ جو تھپکیاں دے

کر سلا دیتی تھی۔ میں نے دیکھا کہ صرف میں ہی اس نیند کے مزے نہیں لیتا ہوں بلکہ اور لوگ بھی ہیں۔ وہاں یہ فیشن سا ہو گیا تھا۔ اس لئے اس میں کوئی شرم کی بات نہ تھی۔

تاہم میں ہائیکورٹ کے کتب خانہ سے فائدہ اٹھاتا تھا اور نئے نئے لوگوں سے ملاقات ہوا کرتی تھی۔ مجھے توقع تھی کہ تھوڑے دن میں ہائیکورٹ کا کام ملنے لگے گا۔

غرض ادھر تو میری دکالت میں کسی قدر اطمینان کی صورت پیدا ہو رہی تھی اور ادھر گو کھلے جو مجھے ہمیشہ نظر میں رکھتے تھے۔ میرے لئے کچھ اور ہی تدبیریں سوچ رہے تھے۔ وہ ہفتے میں دو تین بار میرے دفتر میں آجاتے تھے اکثر اپنے ساتھ ان دوستوں کو لاتے تھے جن سے وہ مجھے ملانا چاہتے تھے۔ وہ مجھے اپنے طریقہ کار سے ہمیشہ باخبر رکھتے تھے۔

مگر میری زندگی کے بارے میں یہ کہا جاسکتا ہے کہ میں نے خود جتنے منصوبے سوچے خدا نے کسی کو پورا نہ ہونے دیا۔ اس نے مجھ سے وہی کام لیا جو اسے منظور تھا۔

عین اس وقت جب میں یکسوئی سے اپنے کاروبار میں مشغول ہونے والا تھا۔ جنوبی افریقہ سے یہ تار پہنچا کہ ”یہاں چیمبرلین کے آنے کی خبر ہے۔ مہربانی کر کے فوراً چلے آئیے۔ مجھے اپنا وعدہ یاد آیا اور میں نے اس مضمون کا تار دیا کہ ”میں آنے کو تیار ہوں، جب آپ روپیہ بھیجیں گے۔“ تار پہنچتے ہی روپیہ آگیا۔ میں نے اپنا دفتر توڑ دیا اور جنوبی افریقہ روانہ ہو گیا۔ میرا تھکاس تھا کہ جس کام کے لئے جا رہا ہوں اس میں کم از کم ایک سال لگے گا۔ اس لئے میں نے مناسب سمجھا کہ برنگلہ رہنے دوں اور بال بچوں کو اسی میں چھوڑ جاؤں۔

ان دنوں میرا خیال تھا کہ من چلے نوجوانوں کو اپنے ملک میں کام نہ ملے تو انہیں ترک وطن کر کے دوسرے ملکوں میں چلا جانا چاہئے۔ اس لئے میں نے اپنے ساتھ ایسے چار پانچ نوجوانوں کو لے لیا جن میں کمن لال گاندھی بھی تھے۔

ہمارا خاندان ان دنوں بڑا تھا اور اب بھی بڑا ہے۔ میں چاہتا تھا کہ ان میں سے جتنے پرانی لکیر کو چھوڑ کر باہر جانے کی ہمت رکھتے ہوں انہیں ساتھ لے جاؤں۔ میرے والدین میں سے اکثر کو ریاستوں میں نوکر رکھا دیتے تھے۔ میں انہیں اس طلسم سے نکالنا چاہتا تھا۔ انہیں کسی دوسری جگہ نوکری دلانا میرے اختیار میں نہ تھا اور ہوتا بھی تو بھی میں کبھی نہ دلاتا۔ میری تو یہ خواہش تھی کہ یہ اپنے اوپر بھروسہ کرنا سیکھیں۔

لیکن جوں جوں میرا نصب العین بلند ہوتا گیا میں ان نوجوانوں کو بھی اپنی تقلید پر آمادہ کرنا گیا اور

کسن لال گاندھی کی تربیت میں مجھے بڑی کامیابی ہوئی۔ اس کی تفصیل آگے آئے گی۔

بیوی بچوں سے بچھڑنا مجھے بڑے کارخانے کو توڑنا۔ ٹھور سے بے ٹھور ہونا تھوڑی دیر مجھ پر شاق گذرا۔ مگر میں بے اطمینانی کی زندگی کا عادی ہو چکا تھا میرے خیال میں اس دنیا میں اطمینان کی توقع رکھنا بڑی غلطی ہے۔ یہاں سوائے حق کے یعنی ذات الہی کے کسی چیز کا ٹھور ٹھکانا نہیں۔ یہ سارے کھیل جو دنیا کے پردے پر نظر آتے ہیں چلتی پھرتی تصویریں ہیں کسی کا بھروسہ نہیں، کسی کو ثبات نہیں، ہاں اس پردے کے اندر ایک بلند اور برتر ذات ہے اور وہ سراپا حقیقت ہے۔ خوش حال اس کے جو حقیقت کی جھلک دیکھ لے۔ جو حق کا دامن تھام لے حق کی تلاش ہی زندگی کی معراج ہے۔

میں عین وقت پر ڈربن پہنچا۔ میرے لئے کام تیار رکھا تھا۔ مسٹر جیمبرلین کی خدمت میں وفد کے جانے کی تاریخ مقرر ہو چکی تھی مجھے ان کے سامنے پیش کرنے کے لئے عرضداشت مرتب کرنا تھی اور وفد کے ساتھ جانا تھا۔

حصہ چہارم

محبت کے سارے جتن بیکار گئے

مسٹر جمیبرلین جنوبی افریقہ سے ساڑھے تین کروڑ پونڈ نذر لینے اور انگریزوں اور بوٹروں کی کی دلجوئی کرنے آئے تھے۔ اس لئے انہوں نے ہندوستانی وفد کو سوکھا ٹال دیا۔

انہوں نے ”آپ جانتے ہیں کہ جن نو آبادیوں کو حکومت خود اختیاری حاصل ہے ان کے معاملات میں دخل دینے کا اسپیریل گورنمنٹ کو بہت کم حق ہے۔ آپ کی شکایتیں بجا معلوم ہوتی ہیں۔ مجھ سے جو کچھ بن پڑے گا کروں گا۔ مگر آپ کو یوروپیوں کے ساتھ رہنا ہے تو انہیں خوش رکھنے کی کوشش کیجئے۔“

اس جواب سے وفد کے ارکان کی امیدوں پر اداسی پڑ گئی۔ مجھے بھی بڑی مایوسی ہوئی۔ اس نے ہماری آنکھیں کھول دیں اور ہمیں بتا دیا کہ سارا کام از سر نو شروع کرنا پڑے گا۔ میں نے یہ صورت حال اپنے رفیقوں کو سمجھائی۔

سچ پوچھئے تو مسٹر جمیبرلین کا جواب کچھ بے جا نہیں تھا۔ بہت اچھا ہوا کہ انہوں نے اصل بات صاف صاف کہہ دی۔ انہوں نے ہمیں نرم الفاظ میں جس کی لافھی اس کی بھینس کا اصول یا تلوار کا قانون سمجھا دیا۔

مگر ہم تلوار تو کیا تلوار کھانے کا بل بوتہ بھی نہ رکھتے تھے۔ مسٹر جمیبرلین نے اتنے بڑے ملک کو تھوڑے سے وقت میں دیکھا۔ اگر سری نگر سے اس کماری تک انیس سو میل کا فاصلہ ہے تو ڈربن سے کیپ ٹاؤن بھی 1100 میل سے کم نہیں۔ مسٹر جمیبرلین نے یہ فاصلہ آندھی کی سی رفتار سے طے کیا۔

مثال سے وہ ٹرانسوال گئے مجھے ٹرانسوال کے ہندوستانیوں کے مطالبات بھی مرتب کر کے ان کی

خدمت میں پیش کرنا تھے۔ مگر سوال یہ تھا کہ میں پرہٹوریا کیونکر جاؤں؟ وہاں کے ہندوستانی میرے داخلے کے قانونی مراحل اتنی جلدی طے نہیں کر سکتے تھے۔ لڑائی نے ٹرانسوال کو ویران کر دیا تھا۔ نہ وہاں کھانے پینے کا سامان بہم پہنچتا تھا۔ نہ کپڑا ملتا تھا۔ بہت سی دوکانیں خالی تھیں بہت سی بند پڑی تھیں۔ خالی دوکانوں کا بسنا اور بند دوکانوں کا کھلنا ذرا دیر طلب تھا جن لوگوں نے یہاں سے بھاگ کر دوسرے ملکوں میں پناہ لی تھی ان تک کو واپسی کی اجازت نہیں دی جاسکتی تھی تا وقتیکہ دوکانوں میں کھانے پینے کا سامان نہ ملنے لگے۔ اس لئے ہر ٹرانسوال کے باشندے کو وہاں جانے کے لئے پروانہ راہداری لینا پڑتا تھا۔ یورپیوں کو یہ پروانہ آسانی سے مل جاتا تھا مگر ہندوستانیوں کے لئے بڑی دشواریاں تھیں۔

جنگ کے زمانے میں ہندوستان اور لنکا سے بہت سے فرنگی افسر اور گورے سپاہی جنوبی افریقہ آئے تھے۔ برطانی حکام کا یہ فرض سمجھا جاتا تھا کہ ان میں سے جو لوگ یہاں بسنا چاہیں ان کے لئے معاش کا کچھ بندوبست کریں۔ آخر انہیں نئے عہدہ دار رکھنا تھے پھر ان تجربہ کار لوگوں کو کیوں نہ رکھتے؟ ان لوگوں نے جوڑ توڑ لگا کر ایک نیا محکمہ قائم کر لیا۔ حبشیوں کی نگرانی کے لئے ایک خاص محکمہ تھا ہی پھر کیا وجہ تھی کہ ایشیائیوں کے واسطے نہ ہو؟ بات بظاہر معقول تھی جب میں ٹرانسوال پہنچا تو یہ محکمہ کھل چکا تھا اور اس کا جال آہستہ آہستہ پھیل رہا تھا۔ جو حکام پناہ گزینوں کی واپسی کے لئے پروانہ راہداری جاری کرتے تھے وہ اوروں کو تو خود پروانے دے دیتے تھے مگر ایشیائیوں کے داخلے کے بارے میں بھلا نیا محکمہ بے مداخلت کیسے کیسے رہ سکتا تھا؟ اس کے اہل کاروں نے ان حکام سے کہا کہ آپ ایشیائیوں کو ہماری سفارش کے پروانے دے دیا کیجئے۔ اس سے آپ کا کام بھی ہلکا ہو جائے گا اور ذمہ داری بھی کم ہو جائے گی۔ مگر یہ سب کہنے کی باتیں تھیں۔ اصل بات یہ تھی کہ نئے محکمے کو کچھ نہ کچھ کام دکھانا تھا اور اس کے اہل کاروں کو اپنا پیٹ پانا تھا۔ اگر کوئی کام نہ ہوتا تو یہ محکمہ غیر ضروری سمجھ کر توڑ دیا جاتا۔ اس لئے کسی نہ کسی طرح کام نکالا گیا۔

ہندوستانیوں کو داخلے کی اجازت کے لئے اس محکمے میں درخواست دینی پڑتی تھی۔ مدت کے بعد درخواست کا جواب ملتا تھا۔ داخلے کے خواہشمند بے شمار تھے اور اجازت میں یہ دشواریاں۔ اس لئے بہت سے دلال پیدا ہو گئے تھے جنہوں نے افسروں کے ساتھ مل کر غریب ہندوستانیوں کو خوب لوٹا مچھ سے لوگوں نے کہا کہ بغیر سفارش کے پروانہ نہیں مل سکتا اور بعض دولت تو سفارش بھی کافی نہیں ہوتی بلکہ سو پونڈ تک کی رشوت دینا پڑتی ہے۔ اس لئے تمہیں اجازت ملنے کی کوئی صورت نظر نہیں آتی۔ میں

نے اپنے پرانے دوست ڈربن کے سپرنٹنڈنٹ سے جا کر کہا ”مہربانی کر کے پرمٹ کے افسر سے میرا تعارف کرا دیجئے۔ آپ جانتے ہیں کہ میں ٹرانسوال میں عرصے تک رہ چکا ہوں۔ انہوں نے فوراً ہیٹ سر پر رکھی اور میرے ساتھ جا کر مجھے پروانہ دلوادیا۔ میری گاڑی چھوٹنے میں مشکل سے ایک گھنٹہ باقی تھا مگر میرا سامان پہلے سے بندھا رکھا تھا۔ میں نے مسٹرا لیکزینڈر کا شکریہ ادا کیا اور پریٹوریا روانہ ہو گیا۔

اب مجھے اپنے کام کی دشواریوں کا اندازہ ہوا۔ پریٹوریا پہنچتے ہی میں نے عرضداشت مرتب کر لی۔ جہاں تک مجھے یاد ہے ڈربن میں ہندوستانیوں سے وفد کے ارکان کی فہرست پہلے مانگی گئی تھی مگر یہاں تو نیا محکمہ موجود تھا۔ اس نے یہ میخ لگادی پریٹوریا کے ہندوستانیوں کو یہ خبر مل گئی تھی کہ اس محکمے کے افسر میرا نام وفد سے خارج کرنا چاہتے ہیں۔

یہ واقعہ افسوسناک بھی تھا اور مصحک بھی مگر اسے بیان کرنے کے لئے ایک اور باب کی ضرورت

ہے۔

ایشیائے آئے ہوئے صاحب بہادر

نئے محکمے کے افسر حیران تھے کہ میں ٹرانسوال میں کیونکر داخل ہوا۔ انہوں نے ان ہندوستانیوں سے جو ان سے ملنے جایا کرتے تھے دریافت کیا مگر کچھ پتہ نہ چلا۔ انہیں یہ شبہہ تھا کہ شاید میں پرانے تعلقات سے فائدہ اٹھا کر بے اجازت چلا آیا۔ اگر یہ صورت تھی تو میں گرفتار کیا جاسکتا تھا۔

عام قاعدہ ہے کہ جب بڑی لڑائی ختم ہوتی ہے تو حکومت کی غیر معمولی اختیارات دے دیئے جاتے ہیں۔ جنوبی افریقہ میں بھی یہی ہوا تھا۔ حکومت نے ضابطہ تحفظ امن کے نام سے ایک ہنگامی قانون پاس کیا تھا جس کی رو سے وہ شخص جو بغیر پردانہ راہداری کے ٹرانسوال میں داخل ہو گرفتاری اور قید کا مستوجب تھا۔ نئے محکمے کے افسروں میں صلاح ہوئی کہ اس ضابطے کے ماتحت مجھے گرفتار کریں۔ مگر کسی کی ہمت نہیں پڑتی تھی کہ مجھ سے پردانہ مانگے۔

ان افسروں نے ڈر بن تار دے کر پوچھا تو معلوم ہوا کہ میں پردانہ لے کر آیا ہوں انہیں بڑی مایوسی ہوئی۔ مگر یہ ہار مانتے والے آسامی نہ تھے انہوں نے کہا یہ شخص ٹرانسوال آگیا تو آجائے مگر اسے چیمبر لین سے نہ ملنے دیں گے۔

اسی لئے ہندوستانیوں سے کہا گیا کہ وفد کے ارکان کے نام بھیجیں۔ رنگ کا تعصب تو جنوبی افریقہ میں ہر جگہ نظر آتا تھا مگر مجھے یہ توقع نہ تھی کہ یہاں کے افسروں میں بھی وہی کمینہ پن کی حرکتیں اور کلٹ پھانس کی ترکیبیں ہوں گی جن سے مجھے ہندوستان میں سابقہ پڑا کرتا تھا۔ جنوبی افریقہ میں پبلک محکمے وہاں کے باشندوں کی فلاح و بہبود کے لئے قائم کئے گئے تھے اور رائے عامہ کے ماتحت تھے۔ اس لئے ان کے عہدے داروں میں شائستگی اور بردباری پائی جاتی تھی جس کا تھوڑا بہت فائدہ کالے آدمیوں کو بھی پہنچتا تھا۔ ایشیائے آئے ہوئے ایشیائے آئے وہ ایشیائے آئے کے مطلق العنانی اور دوسری عادتیں جو مطلق العنانی سے پیدا ہوتی ہیں ساتھ لائے۔ جنوبی افریقہ میں تو کسی قدر آئینی حکومت اور جمہوریت بھی تھی مگر ایشیائے آئے کی مال کی کمیپ آئی اس میں خالص مطلق العنانی تھی۔ ایشیائے آئے غیر قوم کے ماتحت تھے

انہیں ذمہ دار حکومت کہاں نصیب؟ جنوبی افریقہ میں فرنگی لوگ باہر سے آکر آباد ہوئے تھے۔ انہیں افریقی شہریوں کے حقوق اور محکمے افسروں پر اقتدار حاصل تھا۔ اب ایشیا کے صاحب بہادر پہنچے اور بیچارے ہندوستانی غم صیاد و فکر باغباں کی دو عملی میں پھنس گئے۔

میں خود مطلق العنانی کا شکار ہوا اس لئے مجھے اس کا اچھا خاصا اندازہ ہو گیا پہلے مجھے اس محکمے کے افسر اعلیٰ نے بلا بھیجا۔ شاید "بلا بھیجنے" کے لفظ سے کسی کو غلط فہمی ہو اس لئے میں تصریح کئے دیتا ہوں۔ مجھے کوئی حکم نہیں بھیجا گیا تھا۔ ہندوستانی لیڈر اکثر اس محکمے کے افسروں سے ملنے جایا کرتے تھے۔ ایک بار سیٹھ طیب جی حاجی خان محمد افسر اعلیٰ سے ملنے گئے تو انہوں نے پوچھا کہ یہ گاندھی کون ہے اور یہاں کیوں آیا ہے؟ سیٹھ طیب نے کہا "وہ ہمارے مشیر ہیں اور ہمارے بلائے پر آگئے ہیں۔" صاحب بہادر نے پوچھا "پھر ہم لوگ کس لئے ہیں؟ ہم اسی لئے تو مقرر کئے گئے ہیں کہ تمہارے حقوق کی حفاظت کریں۔ گاندھی کو یہاں کے حالات کی کیا خبر؟ طیب سیٹھ سے جو کچھ جواب بن پڑا انہوں نے دیا۔

"بیشک آپ ہماری حمایت کے لئے موجود ہیں۔ مگر گاندھی ہمارے آدمی ہیں وہ ہماری زبان جانتے ہیں اور ہماری طبیعتوں کو سمجھتے ہیں۔ آپ لاکھ کچھ ہوں پھر بھی سرکاری عہدے دار ہیں۔" صاحب بہادر نے طیب سیٹھ کو حکم دیا کہ مجھے لے جا کر ان کے سامنے پیش کریں۔ میں سیٹھ طیب اور کچھ اور لوگوں کے ساتھ ان کی خدمت میں حاضر ہوا۔ کسی سے بیٹھنے کے لئے نہیں کہا گیا۔ ہم سب کھڑے رہے۔

صاحب نے مجھ سے مخاطب ہو کر پوچھا "تم یہاں کیوں آئے؟"

میں نے جواب دیا "میں اپنے ہموطنوں کے کہنے سے آیا ہوں کہ انہیں مشورہ دوں۔"

"مگر کیا تمہیں یہ معلوم نہیں کہ ٹرانسوال آنے کا کوئی حق نہیں؟ جو پردانہ تمہارے پاس ہے وہ غلطی سے دے دیا گیا تھا۔ تم نو آباد ہندوستانی قرار نہیں دئے جاسکتے۔ تمہیں فوراً واپس جانا پڑے گا۔ مسٹر چیمبرلین سے ملنے کی اجازت نہیں دی جائے گی۔" ایشیائی محکمہ "خاص طور سے ہندوستانیوں کے حقوق کی حفاظت کے لئے قائم کیا گیا ہے۔ اچھا اب تم جاؤ" یہ کہہ کر انہوں نے مجھے بغیر جواب کا موقع دیئے رخصت کر دیا مگر میرے ساتھیوں کو روک لیا۔ ان لوگوں کو انہوں نے خوب ڈانٹا اور کہا گاندھی کو رخصت کر دو۔

وہ کھسپائے ہوئے لوٹے۔ اب ہمارے سامنے ایسی صورت حال تھی جس کے لئے ہم بالکل تیار نہ

ذلت چپ چاپ سے لی

مجھے اس توہین سے بڑی تکلیف ہوئی مگر میں پہلے بہت ذہنتیں اٹھا چکا تھا۔ اور ان کا عادی ہو گیا تھا۔ اس لئے میں نے یہ بٹے کیا کہ یہ ذلت بھی چپ چاپ سے لوں گا اور جو کچھ کروں گا صورت حال پر ٹھنڈے دل سے غور کرنے کے بعد کروں گا۔

”ایشیائی محکمے“ کے افسر اعلیٰ کے یہاں سے ایک خط آیا کہ چونکہ گاندھی ڈربن میں مسٹر چیمبرلین سے مل چکے ہیں اس لئے ان کا نام اس وفد سے خارج کر دیا گیا ہے۔ جو اب موصوف کی خدمت میں جانے والا ہے۔

اس خط کو دیکھ کر میرے رفیقوں میں ضبط کی تاب نہیں رہی انہوں نے یہ تجویز کی کہ وفد کا خیال ہی ترک کر دیا جائے۔ میں نے ان سے کہا کہ یہ مناسب نہیں ”اگر آپ لوگ اپنے مطالبات مسٹر چیمبرلین کے سامنے پیش نہ کریں گے تو یہ سمجھا جائے گا کہ آپ کے کوئی مطالبات ہی نہیں ہیں اصل چیز تو عرضداشت ہے اور وہ لکھی جا چکی ہے اسے میں پڑھوں یا کوئی اور بات ایک ہی ہے۔ مسٹر چیمبرلین ہم سے بحث تو کریں گے نہیں۔ میرے خیال میں تو سوائے اس کے کوئی چارہ نہیں کہ ہم اس ذلت کو چپ چاپ سے لیں۔

ابھی میں نے بات ختم نہ کی تھی کہ طیب سیٹھ بول اٹھے ”کیا تمہاری ذلت ساری برادری کی ذلت نہیں ہے؟ آخر تم ہمارے نمائندے ہو یا نہیں؟“

میں نے جواب دیا ”یہ بالکل بجا ہے۔ مگر اس طرح کی ذہنتیں برادری کو بھی سہنا پڑیں گی۔ سوائے اس کے چارہ ہی کیا ہے؟“

طیب سیٹھ نے کہا ”چاہے جو کچھ ہو مگر ہمیں یہ ذلت برداشت نہیں کرنا چاہئے۔ آخر کوئی ہمارا

کر کیا لے گا؟ ہمارے ایسے کون سے بہت حقوق ہیں جو چھین جائیں گے؟“
مجھے یہ تیکھا جواب پسند آیا مگر میں جانتا تھا کہ اس تیکھے پن سے کام نہیں چلے گا۔ مجھے اپنی برادری کی کمزوریوں کا حال معلوم تھا۔ میں نے اپنے دوست کو دھپایا کیا اور انہیں یہ صلاح دی کہ میری جگہ مسٹر گاڈفرے (ایک ہندوستانی بیرسٹر) کو لے جائیں۔

چنانچہ مسٹر گاڈفرے کی سرکردگی میں دند گیا۔ مسٹر جمیر لین نے اپنے جواب میں میرے واقعے کی طرف اشارہ کیا۔ انہوں نے تالیف تلوپ کی غرض سے کہا ”کیا یہ بہتر نہیں کہ بار بار ایک ہی نمائندے کے آنے کے بجائے اب کے نیا شخص آیا ہے؟“
مگر ان باتوں سے بجائے اس کے کہ کوئی فیصلہ ہو میرا اور میری برادری کا کام اور بڑھ گیا۔ ہمیں نئے سرے سے ابتدا کرنی پڑی۔

لوگ مجھے یہ کہہ کر طہنے دینے لگے ”تمہارے ہی کہنے سے برادری نے لڑائی میں مدد کی تھی۔ اب تم ہی دیکھو کہ اس کا کیا نتیجہ ہوا“ مگر مجھ پر اس طعن کا کوئی اثر نہیں ہوا۔ میں نے جواب دیا ”میں نے جو مشورہ دیا تھا اس کا مجھے ذرا بھی افسوس نہیں میرے نزدیک تو ہم لوگوں نے بہت اچھا کیا کہ جنگ میں شریک ہونے سے ہمارا فرض تھا جو ہم نے ادا کر دیا ہمیں کوئی حق نہیں کہ اپنی محنت کے معاوضے کی توقع رکھیں۔ مگر مجھے دل سے یقین ہے کہ اچھے کام کا پھل ضرور ملتا ہے۔ خیر جو ہوا سو ہوا اب ہمیں آئندہ کی فکر کرنا چاہئے۔“ اس بات سے سب نے اتفاق کیا۔

پھر میں نے کہا ”سچ پوچھئے تو جس کام کے لئے آپ نے مجھے بلایا تھا وہ اب ختم ہو گیا ہے۔ مگر میں سمجھتا ہوں کہ جہاں تک ممکن ہو مجھے بھی ٹرانسوال ہی میں رہنا چاہئے گو آپ مجھے واپسی کی اجازت بھی دے دیں۔ بجائے مثال میں رہ کر کام کرنے کے اب میرے لئے یہیں رہنا مناسب ہے۔“
ایک سال کے اندر ہندوستان واپس جانے کا خیال چھوڑ کر ٹرانسوال کی عدالت العلیہ سے اجازت لے لینا چاہئے۔ مجھے اپنے اد پر بھروسہ ہے کہ اس نئے محکمے سے اچھی طرح نبت لوں گا۔ اگر یہ نہ ہوا تو ہماری برادری خوب لڑے گی اور ہمارا اس ملک میں رہنا دشوار ہو جائے گا۔ روز نئی نئی ذلتوں کا سامنا ہو گا مسٹر جمیر لین کا مجھ سے نہ ملنا یا اس عہدے دار کا ہانت آمیز برتاؤ اس ذلت کے مقابلے میں کوئی چیز نہیں جو ہماری برادری کو اٹھانا پڑے گی ہم سے یہ چاہا جائے گا کہ ہم کتوں کی سی زندگی بسر کریں اسے ہم کیونکر برداشت کریں گے۔“

غرض میں نے ہرچہ بادباد کہہ کر کام شروع کر دیا اور پریٹوریا اور جوہانسبرگ کے ہندوستانیوں

سے مشورہ کر کے جوہانسبرگ میں اپنا دفتر قائم کر دیا۔

مجھے نرانسوال کی عدالت عالیہ سے وکالت کی اجازت ملنا بہت مشتبہ تھا مگر مجلس وکلا نے میری

درخواست کی مخالفت نہیں کی اور عدالت نے منظوری دے دی۔

دفتر کے معاملے میں یہ دشواری تھی کہ اچھے محلوں میں کسی بندوستانی کو مکان نہیں ملتا تھا۔ مگر مجھ

سے وہاں کے ایک تاجر مسز رچ سے میل جول ہو گیا تھا۔ ان کے ایک ملاقاتی مکانوں کے ایجنٹ تھے

۔ ان کی مہربانی سے مجھے شہر کے اس محلے میں جہاں عدالتیں تھیں معقول کمرے مل گئے اور میں نے

وکالت شروع کر دی۔

جوش ایثار میں ترقی

ژان سوال میں تو آباد ہندوستانیوں کے حقوق کے لئے جو لڑائی لڑنا پڑی اور ایشیائی محکمے سے جو معرکے پیش آئے ان کے بیان سے پہلے مجھے اپنی زندگی کے دوسرے پہلوؤں کا تھوڑا سا ذکر کر دینا چاہئے۔

اب تک میرے دل میں ایک دورنگی سی تھی۔ اثار کے جوش کے ساتھ ساتھ یہ فکر بھی لگی ہوئی تھی کہ آئیندہ کے لئے کچھ سرمایہ جمع کر لوں۔

جس زمانے میں میں نے بمبئی میں اپنا دفتر قائم کیا تھا وہاں ایک امریکی بیمہ ایجنٹ آیا۔ یہ ایک خوشرد اور شیریں زبان شخص تھا اور مجھ سے اس طرح گھل مل کے باتیں کرنے لگا جیسے برسوں کا دوست ہو۔ اس نے میری آئیندہ زندگی کی فلاح و بہبود کا ذکر کرتے ہوئے کہا ”امریکہ میں آپ جیسی حیثیت کے لوگ سب اپنی زندگی کا بیمہ کراتے ہیں۔ آپ کو بھی آئیندہ کی فکر کر لینا چاہئے۔ زندگی کا کیا بھروسہ؟ ہم امریکہ والے بیمہ کرائڈ بھی فرض سمجھتے ہیں۔ میرا کہنا مانئے اور ایک چھوٹی سی بیمہ پالیسی خرید لیجئے۔“ اس سے پہلے مجھے جنوبی افریقہ اور ہندوستان میں جتے بیمہ ایجنٹ ملے میں نے سب کو سوکھا ناں دیا تھا کیونکہ میں زندگی کا بیمہ کرانے کو بزدلی اور منافی توکل سمجھتا تھا۔ مگر اس وقت مجھ پر اس امریکی ایجنٹ کا جادو چل گیا۔ ادھر وہ یہ گفتگو کر رہا تھا اور ادھر میری نظروں میں بیوی بچوں کی تصویر پھر رہی تھی۔ میں نے اپنے دل میں کہا ”بھلے آدمی تو نے اپنی بیوی کا سارا زیور ٹھکانے لگا دیا۔ کل کو تجھے سانحہ پیش آجائے تو تیری بیوی بچوں کی کفالت غریب بھائی کے سر ہوگی جس نے اپنے اوپر تکلیفیں اٹھا کر تجھے بیٹے کی طرح رکھا۔ اس وقت تجھے شرم تو نہ آئے گی؟“ اس قسم کی دلیلوں سے میں نے اپنے دل کو سمجھایا اور دس ہزار روپے کی پالیسی خرید لی۔

مگر جنوبی افریقہ پہنچ کر میری زندگی بدل گئی اور اسی کے ساتھ خیالات بھی بدلے۔ اس امتحان کے وقت میں نے جو کچھ کیا خدا کے لئے کیا اور اسی کے بھروسے پر کیا۔ مجھے کچھ خبر نہ تھی کہ جنوبی افریقہ میں کب تک رہنا ہے۔ یہ ڈر تھا کہ شاید کبھی ہندوستان واپس نہ جاسکوں اس لئے میں نے یہ طے کیا کہ بیوی بچوں کو ساتھ رکھنا چاہئے تاکہ وہ میری جدائی میں نہ تڑپیں اور صرف اتنا کمنا چاہئے کہ ان کی پرورش کے لئے کافی ہو جائے۔ ان خیالات کے سبب سے میں بہت ہمت دیکھتا تھا کہ میں نے بیمہ ایجنٹ کے فکروں میں آکر پالیسی خرید لی۔ میں نے اپنے دل میں کہا کہ اگر میرے بھائی واقعی باپ کے برابر ہیں تو ضرورت کے وقت میری بیوہ کی پرورش ان پر ہرگز بار نہ ہوگی۔ اور آخر یہ کیوں سمجھ لیا جائے کہ مجھے دوسروں سے پہلے موت آجائے گی؟ حافظ حقیقی خداوند تعالیٰ کی ذات ہے میری یا میرے بھائی کی کیا بساط ہے۔ میں نے اپنی زندگی کا بیمہ کرا کر اپنے بیوی بچوں کو اپنے بل سے محروم کر دیا۔ انہیں کیوں نہ ان کے حال پر چھوڑ دیا جائے؟ آخر دنیا میں اتنے غریب آدمی مرتے ہیں ان کے بیوی بچے کیسے بھر کرتے ہیں؟ میں بھی اپنے آپ کو ان میں سے کیوں نہ سمجھ لوں؟

اس قسم کے پیشمار خیالات میرے دل میں آئے مگر ان پر فوراً عمل نہیں کیا مجھے یاد ہے کہ میں نے جنوبی افریقہ میں بیمہ پالیسی کی کم از کم ایک قسط ضرور ادا کی تھی۔

مگر خارجی واقعات سے میرے ان خیالات کو اور مدد ملی۔ پہلی بار جنوبی افریقہ کے قیام کے زمانے میں میرے دل میں مذہبی احساس کو عیسائیوں کے اثر نے قائم کر رکھا تھا۔ اس مرتبہ تھیوسوفی اثر نے اے گہرا کر دیا اور مسٹر رچ تھیوسوف تھے اور ان کے ذریعے سے میری رسائی جو ہانسبرگ کی تھیوسوفی جماعت میں ہوئی۔ مجھے اس کے عقائد سے بہت سی باتوں میں اختلاف تھا اس لئے میں اس کا ممبر تو نہیں ہوا مگر مجھے فریب قریب کل تھیوسوفیوں سے میل جول پیدا کرنے کا موقع ملا۔ میری ان سے روزانہ مذہبی بحث ہوتی تھی۔ کبھی کبھی تھیوسوفی کتابیں پڑھی جاتی تھیں اور ایک آدھ بار مجھے ان کے جلسوں میں تقریر کرنے کا بھی اتفاق ہوا۔ تھیوسوفی میں سب سے بڑی بات یہ ہے کہ اخوت کے اصول پر بہت زور دیا جاتا ہے۔ اس مسئلہ پر اکثر بحث ہوتی تھی اور اگر مجھے کسی بات میں ممبروں کا عمل ان کے نصب العین کے منافی معلوم ہوتا تھا تو میں ان پر اعتراض کیا کرتا تھا۔ اس تنقید سے مجھے بھی فائدہ پہنچا۔ اس کی بدولت مجھے مشاہدہ نفس کا موقع ملا۔

حوالہ

Rootaurant - 1

مشاہدہ نفس کا نتیجہ

1893ء میں جب مجھے عیسائی دوستوں سے میل جول پیدا کرنے کا موقع ملا میں محض مبتدی تھا۔ یہ لوگ انتہائی کوشش کرتے تھے کہ مجھے مسیح کا پیام سمجھا کر ان کا پیر و بنا لیں اور میں کھلے دل سے ادب اور عاجزی کے ساتھ ان کی گفتگو سنا کرتا تھا۔ اسی کو سمجھنے کی کوشش کیا کرتا تھا۔

1903ء میں صورت حال ذرا بدل گئی تھی اب تھیوسوف دوست مجھے اپنی صحبت میں کھینچ بلانے تھے مگر ان کی غرض یہ تھی کہ مجھ سے ہندو دھرم کے متعلق کچھ معلومات حاصل کریں۔ تھیوسوفی کتابیں ہندو دھرم کے اثرات سے بھری ہوئی ہیں۔ ان دوستوں کو یہ بہت توقع تھی کہ مجھ سے انہیں ان کتابوں کے سمجھنے میں بہت مدد ملے گی۔ میں نے انہیں سمجھایا کہ میری سنسکرت کی استعداد بہت معمولی ہے۔ میں نے ہندو دھرم کی اصلی کتابوں کی مطالعہ نہیں کیا اور ترجمے بھی بہت سرسری طور پر پڑھے ہیں۔ مگر چونکہ وہ مسمسکار (پہلے جنم کے اثرات) اور "پنر جنم" (دوبارہ پیدا ہونے) کے قائل تھے اس لئے انہوں نے یہ فرض کر لیا تھا کہ میں کچھ نہ کچھ مدد ضرور دے سکوں گا۔ غرض میری وہ مثل تھی کہ اندھوں میں کانارا جا۔ میں نے بعض دوستوں کے ساتھ سوامی دیویکانند کی "راج یوگ" اور بعض کے ساتھ م، ن دیویدی کی "راج یوگ" کا مطالعہ شروع کیا۔ ایک دوست کے ساتھ پٹن علی کی "یوگ شاستر" اور کچھ اور حضرات کے ساتھ بھگوت گیتا بھی پڑھتا تھا۔ ہم سب طالبان حق نے ایک کلب سا بنایا جہاں سب مل کر پابندی سے مطالعہ کرتے تھے۔ گیتا کا میں پہلے ہی سے معتقد تھا اور میرے دل کو اس سے ایک خاص تعلق تھا۔ اب مجھے یہ ضرورت محسوس ہوئی کہ میں اس کا اور گہرا مطالعہ کروں۔ میرے ہاتھ دو ایک ترجمے تھے جن کی مدد سے میں اصل سنسکرت متن کو سمجھنے کی کوشش کرتا تھا اور روز دو ایک اشلوک زبانی یاد کر لیتا تھا۔ اس کے لئے میں نے صبح کا وقت مخصوص کر لیا۔

مجھے روز دانت مانجھنے میں پندرہ منٹ اور نہانے میں بیس منٹ لگتے تھے۔ اسی دوران میں میں گیتا کے اشلوک یاد کرتا تھا۔ کاغذ کے پرچوں پر لکھ کر چپکا دیتا تھا اور اشلوک پڑھتے پڑھتے جہاں بھوتا تھا ان پرچوں کو دیکھ لیتا تھا۔ اتنا وقت روز کا سبق یاد کرنے اور آموختہ دہرانے کے لئے کافی ہوتا تھا مجھے یاد ہے کہ میں نے اس طرح تیرہ باب حفظ کر لئے تھے مگر کچھ دن بعد اور کاموں کے جوم میں یہ مسئلہ چھوٹ گیا۔ ستیا کرہ کا بیج بونے کے بعد میرا سارا وقت اسی پودے کے سنبھنے میں صرف ہونے لگا اور اب تک ہوتا ہے۔

گیتا کے مطالعہ کا میرے دوستوں پر جو اثر ہوا ہے اسے وہی بتا سکتے ہیں مگر میرے لئے تو یہ کتاب قانون عمل بن گئی میں روز مرہ کے کاموں میں اس کا حوالہ یوں ڈھونڈتا تھا جیسے کوئی لغت دیکھا کرتا ہے۔ جس طرح مشکل انگریزی الفاظ کے معنی میں انگریزی کی ڈکشنری سے نکالتا تھا اسی طرح اپنی عملی مشکلوں کو اس قاموس اخلاق سے حل کرتا تھا۔ ”اپری گرہ“ (ترک املاک) اور ”سمبھو“ (عدل) جیسے الفاظ میرے دل کو مسخر کر لیتے تھے۔ سوال یہ تھا کہ یہ ”عدل“ اختیار کیوں کر کیا جائے۔ میں حیران تھا کہ آخر اس حکم کے کیا معنی ہیں کہ میں ان دل آزار، بد تمیز، رشوت خوار عہدے داروں سے جو کل تک میرے رفیق تھے اور آج میری راہ میں بے کار روڑے اٹکا رہے تھے اسی طرح پیش آؤں جیسے اپنے پرانے محسنوں سے؟ اور انسان کل املاک کو کیوں کر ترک کر سکتا ہے؟ خود ہمارا جسم بھی تو ہماری ملک ہے؟ بیوی بچے بھی تو املاک میں داخل ہیں؟ کیا میں اپنی کتابوں کی الماری کو آگ لگا دوں؟ کیا میں اپنی کشتی ”پھونک دوں اپنا گھر بار لٹا دوں اور“ اس کے پیچھے ہوں؟ میرے دل کی گہرائیوں سے یہ جواب ملا ”میرا قانون انگلستان کا مطالعہ اس وقت بہت کام آیا۔ مجھے اسٹیل کی بحث اصول عدالت پر یاد آگئی۔ میں اس میں ”ٹرسٹی“ (این یا ستولی) کا لفظ دیکھا کرتا تھا مگر اب اس کا صحیح مفہوم اب جا کر گیتا کی تعلیم کی بدولت سمجھ میں آیا۔ میں نے گیتا کے ”ترک املاک“ کے حکم کا مطلب یوں سمجھا کہ جو لوگ نجات ابدی چاہتے ہیں انہیں چاہئے کہ اپنے مال سے ٹرسٹی کا متعلق رکھیں جو بڑی بڑی رقموں اور جائیدادوں کا انتظام کرتا ہے مگر اس میں سے ایک کوڑی کو بھی اپنی ملک نہیں سمجھتا۔ مجھ پر یہ بات اچھی طرح روشن ہو گئی کہ ”املاک“ اور ”عدل“ کے لئے پہلی شرط یہ ہے کہ انسان اپنا طرز خیال بالکل بدل دے۔

میں نے ریواشکر بھائی کو لکھا کہ بیمہ پالیسی کو ضبط ہو جانے دیں۔ اگر کچھ مل جائے تو لے لیں ورنہ جتنی قسطیں دی جا چکی ہیں ان سے ہاتھ دھو لیں کیونکہ اب میرا یہ عقیدہ ہو گیا ہے کہ وہی خدا جس

نے مجھے اور میری بیوی بچوں کو پیدا کیا ہے ان کو رزق پہنچانے گا اپنے بھائی کو جنہوں نے مجھے ہمیشہ بیٹے کی طرح رکھا تھا میں نے یہ اطلاع دی کہ اب تک میں اپنا اندوختہ آپ کی خدمت میں پیش کیا کرتا تھا مگر اب آپ مجھ سے کچھ توقع نہ رکھئے کیونکہ اب میں جو کچھ جمع کروں گا وہ ہندوستانی برادری کی بہبود کے لئے صرف کیا جائے گا۔

بھائی کو اس فیصلہ کے وجہ سمجھانے میں مجھے بڑی دلت ہوئی۔ انہوں نے خٹکی کے الفاظ میں مجھے میرے فرائض اور اپنے حقوق سے آگاہ کیا انہوں نے لکھا کہ تمہیں والد سے زیادہ دانشمند بننے کا حوصلہ نہیں کرنا چاہئے اور جس طرح میں خاندان کی مدد کرتا ہوں تمہیں بھی کرنا چاہئے۔ میں نے اس کے جواب میں عرض کیا کہ میں بھی وہی کر رہا ہوں جو والد کیا کرتے تھے۔ آپ خاندان کے مفہوم کو کسی قدر وسیع کر دیجئے تو میرے طرز عمل کی مصلحت سمجھ میں آجائے گی۔

بھائی صاحب میری طرف سے مایوس ہو گئے اور انہوں نے مجھ سے خط و کتابت بند کر دی مجھے بہت رنج ہوا مگر جس چیز کو میں اپنا فرض سمجھتا تھا اسے چھوڑ دیتا تو اس سے بڑھ کر رنج ہوتا۔ اس لئے میں اپنی بات پر قائم رہا۔ مگر مجھے ان سے جو محبت اور عقیدت تھی اس میں ذرا بھی فرق نہیں آیا۔ انہیں زیادہ صدمہ اسی لئے تھا کہ وہ مجھ سے بے حد محبت رکھتے تھے۔ میرے روپے کی انہیں اتنی پروا نہ تھی جتنی اس بات کی کہ میں اپنے خاندان کے ساتھ اچھا سلوک کروں۔ مگر آخری دلت میں انہیں میرے نقطہ نظر کی قدر ہوئی۔ بستر مرگ پر انہیں یہ محسوس ہوا کہ میں نے جو کچھ کیا ٹھیک کیا۔ ایک دردناک خط میں انہوں نے مجھ سے اس انداز میں معذرت کی جیسے باپ بیٹے کے آگے اظہارِ ندامت کرتا ہے اور لکھا کہ میں اپنے بیٹوں کو تمہارے سپرد کرتا ہوں جس طرح جی چاہے ان کی تربیت کرو۔ پھر ان کا تار آیا کہ میں جنوبی افریقہ آنا چاہتا ہوں۔ مگر میں نے فوراً جواب دیا کہ ضرور تشریف لائے۔ مگر تقدیر کو یہ مستحور نہ تھا روانگی سے پہلے ہی ان کا انتقال ہو گیا۔ بیٹوں کے بارے میں بھی ان کی خواہش پوری نہ ہونے پائی۔ ان لوگوں نے پرانی فضا میں پرورش پائی تھی اور اب وہ اپنا طرز زندگی بدل نہیں سکتے تھے۔ میں نے چاہا کہ وہ مجھ سے مانوس ہو جائیں مگر کامیابی نہیں ہوئی۔ اس میں ان کا کوئی قصور نہ تھا۔ ہر شخص کی طبیعت ایک دریا ہے جس کے دھارے کو وہ روکنا بھی چاہے تو نہیں روک سکتا۔ پیدائش کے وقت اس کے دل کی لوح پر جو گہرے نقوش ہوتے ہیں وہ اس کے مٹائے نہیں ملتے۔ یہ امید فضول ہے کہ کسی کی اولاد زیادہ بچے جو اس کی ولایت میں ہیں اسی راہِ رفتار پر چلیں گے جس پر وہ خود چلتا ہے۔

اس مثال سے کسی قدر اندازہ ہوتا ہے کہ صاحب اولاد ہونا کتنی بڑی ذمہ داری کی چیز ہے۔

نباتاتی مشرب کے لئے ایک قربانی

جوں جوں میں سادگی اور ایثار کے نصب العین سے قریب تر ہوتا جاتا تھا میری روزمرہ زندگی میں احساس اور نباتات مشرب کی تبلیغ کا جوش بڑھتا جاتا تھا۔ مجھے تبلیغ کا صرف ایک ہی طریقہ معلوم ہے اور وہ یہ کہ انسان اپنے عمل کی مثال پیش کرے اور جو لوگ حق کے طالب ہیں ان سے بحث مباحثہ کرے۔

جو ہانسبرگ میں ایک جرمن نے جو کوہنے کے ”پانی کے علاج“ کا قائل تھا ایک نباتاتی ریستوران قائم کیا تھا۔ میں خود اس ریستوران میں جاتا اور اپنے انگریز دوستوں کو بھی لے جاتا تھا۔ مگر میں نے دیکھا کہ یہ ریستوران چلنے والا نہیں کیونکہ یہ ہمیشہ مالی مشکلات میں مبتلا رہتا ہے میں اسے جتنی مدد کا مستحق سمجھتا تھا اس میں میں نے دریغ نہیں کیا مگر آخر میں اس کے مالک کو ریستوران بند ہی کرنا پڑا۔

اکثر تصویسوف کم و بیش نباتاتی مشرب رکھتے ہیں۔ ایک باہمت خاتون نے جو تصویسونی انجمن کی ممبر تھیں ایک نباتاتی ریستوران بڑے پیمانے پر کھولنے کا ارادہ کیا۔ مگر ان کی طبیعت کو اس کام سے مناسبت نہ تھی۔ وہ فنون لطیفہ کی شائق، فضول خرچی کی عادی اور حساب کتاب سے ناواقف تھیں۔ ان کے دوستوں کا حلقہ خاصا وسیع تھا انہوں نے ابتداء میں چھوٹا سا ریستوران کھولا تھا مگر اب وہ یہ چاہتی تھیں کہ اس کے لئے بڑا مکان لیں اور اسے وسیع پیمانے پر لے آئیں۔ انہوں نے مجھ سے اس کام میں مدد مانگی مجھے اس وقت تک ان کی مالی حالت معلوم نہیں تھی میں نے ان کے اعتبار پر یہ سمجھ لیا کہ جو تخمینہ انہوں نے بتایا ہے صحیح ہے۔ میرے لئے ان کی مدد کرنے کی ایک صورت بھی نکل آئی۔ میرے موکل

میرے پاس بڑی بڑی رقمیں رکھوایا کرتے تھے۔ ان میں ایک سے اجازت لے کر میں نے اس کی طرف سے ایک ہزار پونڈ ان خاتون کو قرض دے دئے۔ یہ بڑا دل والا آدمی تھا اور جس پر اعتبار کرتا تھا اس پر پوری طرح کرتا تھا۔ یہ ابتداء میں ”پابند مزدور“ کی حیثیت سے جنوبی افریقہ آیا تھا۔ جب میں نے اس سے روپیہ قرض دینے کی اجازت مانگی تو اس نے کہا ”آپ کا جی چاہے تو یوں ہی دے ڈالئے میں ان باتوں کو نہیں جانتا میں تو آپ کو جانتا ہوں“ اس شخص کا نام بدری تھا۔ اس نے آگے چل کر ستیاگرہ میں بہت نمایاں حصہ لیا اور تلمیذ بھی بھگتی غرض میں نے اس اجازت کو کافی سمجھ کر روپیہ قرض دے دیا۔

دو تین مہینے کے بعد معلوم ہوا کہ روپیہ واپس ملنے کی کوئی امید نہیں۔ میرے لئے اس نقصان کو برداشت کرنا سہل نہ تھا مگر روپیہ تو ڈوب ہی گیا تھا۔ اتنے روپے سے میرے بہت سے کام چلتے۔ میں نے سوچا بے چارہ بدری جو مجھ پر اتنا اعتبار کرتا ہے کیوں نقصان اٹھائے۔ اس نے تو میرے بھروسے پر دیا تھا۔ میں نے رقم اپنے پاس سے ادا کر دی۔

ایک موکل نے جس سے میں نے اس معاملے کا ذکر کیا تھا، مجھے بہت ملامت کی۔ انہوں نے کہا : ”بھائی“ خوش قسمتی سے میں اس دولت تک ”مہاتا“ ”کیا“ ”باپو“ بھی نہیں کہلاتا تھا۔ میرے دوست مجھے ”بھائی“ کے پیارے لقب سے مخاطب کیا کرتے تھے۔ آپ کو ایسا نہیں کرنا چاہئے تھا۔ یہ تو سوچئے کہ ہم لوگ آپ پر کتنا بھروسہ کرتے ہیں۔ اب اس رقم سے ہاتھ دھور کھئے یہ میں جانتا ہوں کہ آپ بدری کا نقصان نہ ہونے دیں گے اور یہ روپیہ اپنے پاس سے بھریں گے لیکن آپ اپنے اصلاحی کاموں کی امداد مولوں کے روپے سے کرتے رہے تو ایک دن یہ بے چارے بھی تباہ ہو جائیں گے اور آپ بھی بھیک مانگنے لگیں گے۔ آپ ہمارے رہنما ہیں اگر آپ کی یہ نوبت ہوئی تو ہمارا سارا قومی کام رک جائے گا۔

یہ دوست خدا کے فضل سے اب تک زندہ ہیں۔ میں نے جنوبی افریقہ میں بلکہ کہیں بھی ان سے بڑھ کر پاک نفس آدمی آج تک نہیں دیکھا۔ میں نے دیکھا ہے کہ اگر انہیں کسی شخص پر شبہ ہو جائے اور ان کا شبہ بے بنیاد ثابت ہو تو وہ جا کر اس سے معافی مانگتے تھے اور عرق ندامت سے اپنے دل کو دھو کر پاک کرتے تھے۔

ان کی تنبیہ بالکل بجا تھی۔ میں نے بدری کے نقصان کی تلافی کر دی۔ لیکن اگر پھر کسی معاملے میں اس طرح نقصان ہوتا تو میں ہزار پونڈ کہاں سے لاتا؟ نتیجہ یہ ہوتا کہ مجھے قرض لینا پڑتا جو میں نے آج تک کبھی نہیں لیا اور جس سے مجھے تخت نفرت ہے۔ مجھ پر یہ بات کھل گئی کہ اصلاح کے جوش میں بھی

انسان کو جائز حد سے آگے نہیں بڑھنا چاہئے۔ میں نے اپنے موکل کی احسان مندی سے فائدہ اٹھا کر اس کا روپیہ قرض دے دینے میں گیتا کے اس اہم ترین حکم کی ظرافت درزی کی تھی کہ عادل کو کسی کام میں معاوضے کی توقع نہیں رکھنا چاہئے۔ یہ ٹھوکر میرے لئے شمع ہدایت بن گئی۔

یہ قربانی جو میں نے نباتاتی مشرب کے لئے کی جان بوجھ کر نہیں کی اور نہ مجھے پہلے سے اس کی خبر تھی۔ یہ تو مارے باندھے کی نیکی تھیں۔

مٹی پانی کے علاج کے تجربے

میری زندگی میں جتنی سادگی بڑھتی گئی اسی قدر میرا دل دواؤں سے پھرنا گیا۔ جن دنوں میں ڈر بن میں دکالت کرتا تھا مجھے کچھ عرصے تک گھٹیا کی شکایت رہی جس کے سبب سے بدن سوج گیا اور نقابت بہت بڑھ گئی۔ مگر ڈاکٹر پ۔ ج۔ مہتا کے علاج سے صحت ہو گئی اور اس کے بعد سے ہندوستان جانے تک کبھی کوئی ایسی شکایت نہیں ہوئی جو قابل ذکر ہو۔

مگر جو ہانسبرگ آنے کے بعد مجھے اکثر قبض اور درد سر رہتا تھا۔ کھانے میں احتیاط رکھنے سے اور کبھی کبھی ملین دواؤں کے استعمال سے میری طبیعت سنٹھلی رہی۔ مگر اس حالت میں میں اپنے آپ کو تندرست نہیں کہہ سکتا تھا اور اس فکر میں رہتا تھا کہ کسی طرح ملین دواؤں کے جنجال سے نجات ملے۔ اسی زمانے میں میں نے کسی اخبار میں پڑھا کہ منچسٹر میں ایک انجمن ان لوگوں کی بنی ہے جنہوں نے ناشتہ ترک کر دیا ہے۔ یہ لوگ کہتے تھے کہ انگریز بار بار کھاتے ہیں اور بہت کھاتے ہیں، صبح سے آدھی رات تک کھانے کا سلسلہ جاری رہتا ہے۔ اسی لئے ڈاکٹروں کی فیس دیتے دیتے ان کا دیوالہ نکل جاتا ہے اگر انہیں اس کی اصلاح منظور ہے تو انہیں کم سے کم ناشتہ ترک کر دینا چاہئے۔ اگرچہ میری حالت انگریزوں جیسی نہ تھی پھر بھی مجھے یہ محسوس ہوا کہ ایک حد تک یہ الزام مجھ پر عائد ہوتا ہے۔ میں دن میں تین بار پیٹ بھر کے کھانا کھاتا تھا اور سہ پہر کی جائے اس کے علاوہ تھی۔ میں ہمیشہ سے خوش خوراک دلیق ہوا تھا اور جتنے مزے دار نباتاتی کھانے بے مرچ مسالے کے پک سکتے تھے سب اڑایا کرتا تھا میں صبح چھ سات بجے سے پہلے سو کر نہیں اٹھتا تھا اور چند گھنٹے کے بعد درہہ بہر کے کھانے کا وقت آجایا کرتا تھا۔ اس لئے میں نے سوچا کہ میں بھی ناشتہ چھوڑ دوں۔ شاید اس طرح سے سر کا درد جاتا رہے۔ میں نے اس کا تجربہ کیا۔ چند روز تک ذرا بھوک کی تکلیف تو رہی مگر سر کا درد بالکل جاتا رہا۔ اس لئے میں

نے یہ نتیجہ نکالا کہ میری غذا ضرورت سے زیادہ تھی۔

مگر ناشتے کے ترک کرنے سے قبض کو کوئی فائدہ نہیں ہوا۔ میں نے کوہنہ کے ”گم اور کولے کے غسل“ کا تجربہ کیا اس سے کچھ تخفیف تو ہوئی مگر پوری طرح ازالہ نہیں ہوا۔ اس اثنا میں اس جرمن نے جو ریستوران کا مالک تھا یا کسی اور دوست نے مجھے جسٹ کی کتاب ”رجوع بہ فطرت“ دی۔ اس کے پڑھنے سے مجھے مٹی کے علاج کا طریقہ معلوم ہوا مصنف نے اس پر بھی زور دیا تھا کہ تازے پھل اور نٹ (اخرنٹ، مونگ پھلی وغیرہ) انسان کی قدرتی غذا ہے۔ میں نے یہ تو نہیں کیا کہ سوائے پھلوں کے اور سب چیزیں ایک اخت چھوڑ دیں ہوں مگر مٹی کا علاج فوراً شروع کر دیا اور اس سے حیرت انگیز فائدہ ہوا۔ علاج کا طریقہ یہ تھا کہ ایک بار ایک کپڑے کی پٹی لے کر اس پر صاف مٹی کی تہہ جمادی اور اسے پانی سے تر کر کے پیٹ پر باندھ لیا۔ میں سوتے وقت یہ پٹی باندھ لیتا تھا اور صبح کو یا رات میں جس وقت آنکھ کھلے کھول ڈالتا تھا۔ یہ تدبیر تیر ہدف ثابت ہوئی۔ اس کے بعد میں نے بارہا اس علاج کا تجربہ خود کیا اور اپنے دوستوں کو کرایا ہے۔ اور ہمیشہ فائدہ ہوا ہے۔ ہندوستان میں مجھے اس کا پورا تجربہ کرنے کا موقع نہیں ملا کیونکہ ایک جگہ جم کر رہنا نصیب نہیں ہوا۔ مگر مجھے اس پر اب بھی وہی عقیدہ ہے جو پہلے تھا۔ آج بھی میں ایک حد تک مٹی پانی کے علاج پر عامل ہوں اور ضرورت کے وقت اپنے دوستوں کو بھی یہی بتاتا ہوں۔ گو میں اپنی عمر میں دوبار سخت بیمار ہوا مگر میرا عقیدہ ہے کہ انسان کو دواؤں کے استعمال کی کوئی ضرورت نہیں۔ ہزار مریضوں میں سے نو سو تانوں سے محض غذا میں احتیاط کرنے، مٹی پانی کے علاج اور اسی قسم کے گھریلو چٹکوں سے اچھے ہو سکتے ہیں۔ جو شخص ذرا ذرا سی بات کے لئے ڈاکٹر، وید یا حکیم کے پاس دوڑا جاتا ہے اور دنیا بھر کی نباتاتی اور معدنی دواہیں نکلا کرتا ہے اس کی زندگی ہی نہیں گھٹ جاتی بلکہ وہ اپنے جسم کا غلام بن کر ضبط نفس کھو دیتا ہے اور انسانیت سے خارج ہو جاتا ہے۔

میں یہ باتیں اس وقت لکھ رہا ہوں جب میں خود بستر عیال پر ہوں۔ مگر اس بنا پر کسی کو ان کی سچائی میں شبہ نہیں کرنا چاہئے مجھے اپنی بیماری کے اسباب معلوم ہیں۔ مجھے پوری طرح احساس ہے کہ اس میں سراسر میرا ہی قصور ہے۔ اور اسی احساس کی وجہ سے مجھے بے صبری نہیں بلکہ خدا کا شکر ادا کرتا ہوں کہ اس نے مجھے میری غلطیوں پر متنبہ کر دیا اور ہر قسم کی دواؤں سے پرہیز کرتا ہوں۔ میں جانتا ہوں کہ میری اس ضد سے میرے معالج ڈاکٹروں کو بہت تکلیف ہوتی ہے مگر ان کی مہربانی ہے کہ وہ ان باتوں کو برداشت کرتے ہیں اور میرے علاج سے دست کش نہیں ہوتے۔

خیر یہ جملہ معترضہ تھا اب مجھے اصل قصے کی طرف رجوع کرنا چاہئے۔ مگر اس سے پہلے اس کتاب کے پڑھنے والوں کو متنبہ کر دینا ضروری سمجھتا ہوں۔ جو لوگ اس باب کے مطالعے کی بنا پر جسٹ کی کتاب خریدیں وہ یہ نہ سمجھ لیں کہ اس میں جو کچھ لکھا ہے حرف بحرف صحیح ہے۔ جو شخص کوئی کتاب لکھتا ہے وہ اکثر ایک خاص نقطہ نظر کو پیش کرتا ہے۔ حالانکہ ہر مسئلہ پر غور کرنے کے مختلف نقطہ نظر ہوتے ہیں۔ ممکن ہے کہ ان میں سے ہر نقطہ نظر اپنی اپنی جگہ صحیح ہو مگر ایک ہی وقت میں اور ایک ہی صورت حال میں سب صحیح نہیں ہو سکتے۔ دوسری بات یہ ہے کہ بہت سی کتابیں خریدار بہم پہنچانے کے لئے اور نام و نمود کی غرض سے لکھی جاتی ہیں۔ ایسی کتابوں کا مطالعہ کرنے والوں کو چاہئے کہ بہت سمجھ بوجھ سے کام لیں اور نئے تجربے کرنے سے پہلے کسی تجربہ کار سے مشورہ کر لیں یا خود ہی ان کتابوں کو غور سے پڑھیں کہ ان کے مطالب پر پوری طرح حاوی ہو جائیں اور اس کے بعد ان پر عمل کریں۔

تنبیہ

سچ میں ایسی بات چھڑ گئی ہے کہ مجھے یہ پورا باب اسی کی نذر کرنا پڑے گا مٹی کے علاج کے تجربوں کے ساتھ ساتھ میں غذائیات کے تجربے بھی کرتا رہا۔ یہاں میں ان کا تھوڑا سا ذکر کرتا ہوں اور آگے بھی مناسب موقعوں پر ان کی طرف اشارہ کروں گا۔

غذائیات کے تجربوں پر تفصیل سے بحث کرنے کی ضرورت نہیں کیونکہ ان پر گجراتی میں ایک سلسلہ مضامین لکھ چکا ہوں۔ بہت دن ہوئے یہ مضامین "انڈین اوپینین" میں چھپے تھے اور پھر انگریزی میں "رہنمائے صحت" کے نام سے ایک رسالے کی شکل میں شائع ہوئے۔ میری مختصر تصانیف میں بھی رسالہ مشرق اور مغرب میں سب سے زیادہ مقبول ہوا۔ اس کی وجہ آج تک میری سمجھ میں نہیں آئی۔ اصل میں یہ "انڈین اوپینین" پڑھنے والوں کے لیے لکھا گیا لیکن مجھے معلوم ہے کہ اس کا اثر مشرق اور مغرب میں بہت سے ایسے لوگوں کی زندگی پر پڑا ہے۔ جنہوں نے کبھی "انڈین اوپینین" کی شکل تک نہیں دیکھی بہت سے لوگ مجھ سے اس بارے میں خط و کتابت کرتے رہے اور اب تک کرتے ہیں۔ اس لئے یہ مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اس رسالے کا ذکر کر دیا جائے۔ میں نے جو خیالات اس میں ظاہر کئے تھے ان پر اب بھی قائم ہوں۔ لیکن میرے عمل میں بعض اہم تبدیلیاں ہوئی ہیں جن سے اس رسالے کے پڑھنے والے واقف نہیں ہیں۔ انہیں ان تبدیلیوں سے آگاہ کر دینا ضروری معلوم ہوتا ہے۔ دوسری کتابوں کی طرح میں نے یہ رسالہ بھی روحانی مقصد کو پیش نظر رکھ کر لکھا ہے میرا ہر عمل اسی مقصد کا تابع ہوتا ہے۔ مگر مجھے اس بات کا بڑا صدمہ ہے کہ آج کل میں اس رسالے کے بعض اصولوں پر عمل نہیں کر سکتا۔

میرا قطعی عقیدہ ہے کہ انسان کو بغیر ماں کے دودھ کے جو وہ بچپن میں پیتا ہے دودھ کے استعمال کی مطلق ضرورت نہیں۔ اس کی غذا میں سوائے دھوپ میں پکے ہوئے پھلوں اور مونگ پھلی، اخروٹ وغیرہ کے اور کچھ نہیں ہونا چاہئے۔ اس کے رگ پتھوں کے لئے جتنی غذا کی ضرورت ہے وہ انگور جیسے تازہ پھل اور بادام جیسے خشک میوے سے حاصل ہو سکتی ہے جو شخص ان چیزوں پر زندگی بسر کرتا ہے اسے شہوت جنسی اور دوسرے جذبات کی روک تھام میں آسانی ہوتی ہے۔ میں نے اور میرے رفیقوں نے تجربہ کر کے دیکھ لیا کہ ہندوستان کی مثل ”آدی جس قسم کی غذا کھائے گا ویسی ہی اس کی طبیعت بن جائے گی“ بڑی حد تک صحیح ہے۔ یہی خیالات اس رسالے میں تفصیل سے بیان کئے گئے ہیں۔

مگر افسوس ہے کہ ہندوستان میں مجھے اپنے بعض اصولوں کے خلاف عمل کرنا پڑا۔ جن دنوں میں کمید میں رنگروٹ بھرتی تھا کھانے میں کچھ بے اختیاطی ہوئی اور میں ایسا بیمار پڑا کہ بچنے کی امید نہ رہی۔ اس بیماری نے میرے جسم کو توڑ دیا اور میں نے لاکھ کوشش کی کہ بغیر دودھ کے قوت آئے مگر کسی طرح کام نہ چلا۔ میں نے اپنی جان پہچان کے سارے ڈاکٹروں، ویدوں، اور سائنس دانوں سے پوچھا کہ دودھ کا بدل کیا ہو سکتا ہے۔ بعض نے مونگ پانی بتایا بعض نے مہورا کاتیل اور بادام کا شیرہ تجویز کیا۔ میں نے ان چیزوں کا تجربہ کر کے اپنے جسم کو گھلا ڈالا مگر کسی طرح اتنی قوت نہ آئی کہ بستر سے اٹھ سکوں۔۔۔۔۔ ویدوں نے مجھے چرک پڑھ کر سنائی کہ دوا و علاج میں مذہبی خدشوں کو دخل نہیں دینا چاہئے اس لئے انہی سے یہ توقع بے کار تھی کہ مجھے بغیر دودھ کے جینے کی کوئی تدبیر بتائیں گے۔ جب ان کا یہ حال تھا تو وہ لوگ جو گائے کے گوشت کی سختی اور برانڈی تجویز کرتے ہیں مجھے دودھ سے بچنے کی تدبیر کیسے بتا سکتے تھے؟ گائے بھینس کے دودھ کا استعمال کرنے سے تو میں اپنے عہد کی وجہ سے معذور تھا۔ اصل میں عہد کا منشا تو یہی تھا کہ ہر قسم کا دودھ ترک کر دیا جائے مگر کچھ اسے خیال سے کہ عہد کرتے وقت میرے پیش نظر گائے اور بھینس کا دودھ تھا اور کچھ اس لئے کہ مجھے زندگی کی خواہش تھی میں نے اپنے دل کو پھسلا کر اس پر راضی کر لیا کہ عہد کے الفاظ کی پابندی پر تمنا کرتے اور میں بکری کا دودھ استعمال کرنے لگا۔ جب میں نے پہلی بار بکری کا دودھ پیا تو میں اچھی طرح جانتا تھا کہ میں اپنے عہد کے اصل مقصد کو برباد کر رہا ہوں۔

مگر مجھے اس زمانے میں روٹ ایکٹ کو منسوخ کرانے کی دھن تھی۔ اس لئے زندگی کی خواہش غالب آگئی اور میری زندگی کا اہم ترین تجربہ ادھورا رہ گیا۔

مجھے معلوم ہے بعض لوگ یہ دلیل پیش کرتے ہیں کہ روح کچھ کھاتی پیتی نہیں اس لئے ہمارے کھانے کا اس پر کوئی اثر نہیں ہوتا اور اصل سوال یہ نہیں ہے کہ انسان پیٹ میں کیا چیز ڈالتا ہے بلکہ یہ ہے کہ وہ دل و دماغ سے کیا بات نکالتا ہے۔ مگر میں اس کا جواب دینے کے بجائے محض اس پر کھلم کھلا کر تاہوں کہ اپنا دلی عقیدہ ظاہر کر دوں۔ میرے نزدیک طالب حق کے لئے جو خوف خدا میں زندگی بسر کرنا چاہتا ہے اور دیدار الہی کی آرزو رکھتا ہے اپنے خیال اور کلام کی طرح اپنی غذا کے کیف و کم میں بھی ضبط نفس سے بھی کام لینا ضروری ہے۔

مگر جب میں خود اس معاملے میں اپنے اصول پر عمل نہ کر سکا تو مجھے محض واقعات بیان کرنے پر اکتفا کرنا چاہئے بلکہ دوسروں کو متنبہ بھی کر دینا چاہئے۔ جن لوگوں نے میرے اصول کے مطابق دودھ کا استعمال چھوڑ دیا ہے انہیں میں تاکید کے ساتھ یہ مشورہ دیتا ہوں کہ اسے ترک کر دیں البتہ اگر انہیں اس میں ہر طرح فائدہ محسوس ہوتا ہو یا تجربہ کار طبیبوں کی رائے ہو تو ضرور جاری رکھیں۔ اب تک مجھے ہندوستان کے تجربے سے یہی معلوم ہوا ہے کہ جو لوگ صاحب فراش ہیں یا جن کا ہاضمہ کمزور ہے ان کے لئے دودھ جیسی ہلکی اور مقوی اور کوئی غذا نہیں ہے۔

اگر کوئی شخص جسے ان معاملات میں درک ہو، کتابوں کے حوالے سے نہیں بلکہ اپنے ذاتی تجربے سے، مجھے دودھ کا کوئی نباتاتی بدل بتا سکے جو اسی قدر مقوی اور زود ہضم ہو تو مجھ پر بڑا احسان ہو گا۔

حکومت سے مقابلہ

اب ایشیائی محکمے کا حال سنے۔

اس کے عہدے داروں کا جتنا زور جوہانسبرگ میں تھا اور کہیں نہ تھا۔ میں دیکھ رہا تھا کہ یہ لوگ ہندوستانیوں، چینیوں وغیرہ کے حقوق کی حفاظت کرنے کے بجائے اور اٹنا نہیں ہیں رہے تھے۔ روز مرہ اس قسم کی شکایتیں سنے میں آتی تھیں ”جو داخلے کی حقدار ہیں وہ داخل نہیں ہونے پاتے اور جنہیں کوئی حق نہیں وہ سو پونڈ دے کر مزے میں چلے آتے ہیں۔ اگر تم اس اندھیر کی روک تھام نہیں کر دے گے تو کون کرے گا۔“ میرا بھی یہی خیال تھا میں دل میں کہتا تھا کہ اگر میں اس بلا کو دور نہ کر سکا تو میرا ٹرانسوال میں رہنا بے کار ہے۔

اس لئے میں نے ان شکایتوں کے ثبوت فراہم کرنا شروع کئے اور جب کافی مسئلہ جمع ہو گیا تو میں پولس کمشنر کے پاس پہنچا۔ وہ منصف مزاج آدمی نکلا۔ مجھے ٹالنے کے بجائے اس نے بہت صبر سے میری باتیں سنیں اور کہا کہ تمہارے پاس جو کچھ ثبوت ہے مجھے دکھاؤ اس نے خود گواہوں کی شہادت سن کر اپنا پورا اطمینان کر لیا۔ مگر وہ بھی جانتا تھا اور میں بھی جانتا تھا کہ جنوبی افریقہ میں کوئی فرنگیوں کی جوری کالے آدمیوں کے مقابلے میں گورے افسروں کو ملزم ٹھہرائے گی۔ مگر اس نے کہا ”کم سے کم ایک بار کوشش تو کرنا چاہئے۔ یہ بھی تو ٹھیک نہیں کہ ایسے مجرموں پر محض اس خوف سے ہاتھ نہ ڈالا جائے کہ جوری انہیں رہا کر دے گی۔ میں تو انہیں گرفتار کئے بغیر نہ مانوں گا میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ میں اپنی طرف سے کوئی دقیقہ اٹھانے رکھوں گا۔“

مجھے اس کے بے کہے اس بات کا یقین تھا مجھے بہت سے عہدہ داروں پر شبہ تھا مگر چونکہ میرے

پاس ان سب کے خلاف قطعی شہادت نہیں تھی اس لئے میں نے صرف دو شخصوں کے نام وارنٹ جاری کرائے جن پر جرم بالکل ثابت تھا۔

میری یہ عادت نہیں کہ اپنی نقل و حرکت پوشیدہ رکھوں۔ بہت سے لوگ جانتے تھے کہ میں قریب قریب روزانہ پولس کمشنر کے یہاں جاتا ہوں۔ جن دو عہدہ داروں کی گرفتاری کے لئے وارنٹ جاری ہوئے تھے انہوں نے منبر لگا رکھے تھے۔ یہ لوگ میرے دفتر کے گرد چکر لگانا کرتے تھے اور میری نقل و حرکت کی رپورٹ ان عہدے داروں کو پہنچاتے تھے۔ مگر یہ دونوں اس قدر بدطنیت تھے کہ انہیں جاسوس بھی مشکل سے ملتے ہوں گے ہندوستانی اور چینی تو ان سے اس قدر نلاں تھے کہ انہوں نے ان کی گرفتاری میں پولیس کی امداد کی ورنہ ان کا ہاتھ آنا مشکل تھا۔

ان میں سے ایک تو فرار ہو گیا تھا۔ کمشنر پولیس نے اس کی سپردگی کے لئے وارنٹ جاری کر کے دوسری حکومتوں کے پاس بھیجا اور وہ گرفتار کر کے ٹرانسوال لایا گیا۔ ان دونوں کے مقدمے کی تحقیقات ہوئی اور باوجود یہ کہ ان کے خلاف بہت قوی شہادت تھی اور جوری کو یہ بھی معلوم تھا کہ ان میں سے ایک فرار ہو گیا تھا مگر دونوں بے قصور قرار دے کر بری کر دئے گئے۔

مجھے سخت مایوسی ہوئی کمشنر پولیس کو بھی بہت رنج ہوا میرا دل قانون کے پیشے سے پھر گیا بلکہ مجھے سرے سے ذہنی قابلیت سے نفرت ہو گئی۔ کیونکہ میں نے دیکھا کہ یہ روپے کے بدلے مجرموں کے جرم پر پردہ ڈالنے میں صرف کی جاتی ہے۔

مگر ان دونوں عہدہ داروں کا جرم اتنا کھلا ہوا تھا کہ ان کے بری ہو جانے پر بھی حکومت انہیں اپنی ملازمت میں نہ رکھ سکی۔ دونوں برخاست کر دئے گئے۔ ایشیائی محکمہ پہلے کے مقابلے میں پاک صاف ہو گیا اور ہندوستانیوں کے تھوڑے بہت آنسو چھ گئے۔

اس واقعے سے میری دھاک بیٹھ گئی اور میرے پاس کثرت سے مقدمے آنے لگے۔ ہماری برادری جو سیکڑوں پونڈ رشوت کے ہر مہینے دیا کرتی تھی اس میں سے بھی بہت بڑا حصہ بچ گیا۔ سب اس لئے نہیں بچ سکا کہ بے ایمان لوگوں نے اب بھی اپنی حرکتیں نہیں چھوڑیں مگر کم سے کم اتنا ہو گیا کہ اب ایماندار لوگ اپنی ایمانداری قائم رکھ سکتے تھے۔

گویہ عہدے دار اس قدر بد کردار تھے مگر مجھے ان سے کوئی ذاتی مخالفت نہیں تھی انہیں خود بھی اس کا احساس تھا۔ چنانچہ آڑے دلت مجھے انہوں نے میرا سہارا ڈھونڈا اور میں نے اپنے مقدور بھران کی مدد کی۔ انہیں جو ہانسبرگ کی میونسپلٹی میں ملازمت مل رہی تھی مگر یہ اسی صورت میں ممکن تھا کہ

میں اس تجویز کی مخالفت نہ کروں۔ ان کے ایک دوست کے کہنے سننے سے میں اس پر راضی ہو گیا کہ اس معاملے میں مزاحمت نہ کروں گا چنانچہ دونوں کو جگہ مل گئی۔

میرے اس طرز عمل کا یہ اثر ہوا کہ جن عہدے داروں سے مجھے سابقہ تھان کا دل میری طرف سے صاف ہو گیا اور باوجود اس کے کہ مجھے اکثر ان کے محکمے میں لاڑنا پڑتا تھا اور اکثر سخت سست کہنے کی بھی نوبت آجاتی تھی ان کا برتاؤ میرے ساتھ ہمیشہ دوستانہ رہا۔ اس وقت تک مجھے پوری طرح اس بات کا احساس نہ تھا کہ یہ رواداری میری سرشت میں ہے آگے چل کر مجھے معلوم ہوا کہ یہ ”ستیاگرہ“ کی جان اور ”اہمسا“ کی شان ہے۔

انسان کی ذات اور اس کے افعال یہ دو جداگانہ چیزیں ہیں۔ اچھے فعل پر تحسین اور برے پر یقین کرنا چاہئے لیکن فاعل اگر اچھا ہے تو عزت کا برابرے تو رحم کا مستحق ہے۔ ”نفرت جرم سے نہ کر دو“ ایسی تعلیم ہے جس کا سمجھنا تو سہل ہے مگر اس پر عمل بہت کم کیا جاتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ نفرت کا زہر دنیا میں پھیل رہا ہے۔

یہی ”اہمسا“ تلاش حق کی بنیاد ہے۔ مجھ پر روز بروز یہ بات روشن ہوتی جاتی ہے کہ حق تک رسائی کی کوشش بے ”اہمسا“ کے زینے کے بالکل فضول ہے۔ کسی نظام کی مزاحمت یا تخریب کی کوشش جائز ہے مگر اس کے بانی کے آزار کے درپے ہونا خود اپنے ساتھ بدسلوکی کرنا ہے۔ کیونکہ ہم سب ایک ہی سانچے میں ڈھلے ہیں۔ ایک ہی خالق کی مخلوق ہیں۔ ہم میں سے ہر شخص بحر حقیقت کا قطرہ ہے اور قطرہ بحر کی طرح نامحدود ہے۔ کسی قطرے کو حقیر سمجھنا دریا کی حقارت کرنا ہے۔ کسی بندے کا دل دکھانا ساری خدائی کا دل دکھادینا ہے۔

ایک گناہ اور اس کی ندامت

میری زندگی میں کچھ ایسے واقعات پیش آئے کہ مجھے مختلف مذہب و ملت کے لوگوں سے سابقہ رہا اور ان تجربوں کی بنا پر میں یہ کہہ سکتا ہوں کہ میں نے کبھی اپنے اور غیر، ویسی اور بد ویسی، گورے اور کالے، ہندو، مسلمان، پارسی، عیسائی، یہودی میں فرق نہیں کیا بلکہ یوں کہنا چاہئے کہ میری طبیعت میں اس طرح کافرق کرنے کا مادہ ہی نہیں ہے۔ اس میں میری کوئی تعریف نہیں کیونکہ میں نے یہ صفت اپنی سنی سے حاصل نہیں کی بلکہ یہ میری سرشت میں ہے۔ برعکس اس کے ”اہمسا“ ”برہمچاریہ“ ”اپری گرہ“ اور دوسری بنیادی نیکیوں کے حصول کے لئے مجھے مسلسل کوشش کرنا پڑی اور اب بھی کرنا پڑتی ہے۔

جب میں ڈربن میں وکالت کرتا تھا تو میرے دفتر کے محرر اکثر میرے گھر میں رہا کرتے تھے۔ ان میں سے بعض گھبراتی ہندو تھے اور بعض تامل عیسائی۔ میں انہیں اپنے عزیزوں کی طرح رکھتا تھا اور میری بیوی کبھی اس میں مزاحمت کرتی تھیں تو میری ان سے ان بن ہو جاتی تھی۔ ان ہی محرروں میں ایک عیسائی تھا جس کے ماں باپ ”پنجم“ تھے۔

ہمارا مکان مغربی وضع کا تھا۔ اس کے کمروں میں نالیاں نہیں تھیں اور ہونا بھی نہیں چاہئے تھیں۔ ہر کمرے میں ”پاٹ“ رکھ دئے گئے تھے مجھے یہ پسند نہ تھا کہ انہیں مہتر سے یا نوکروں سے صاف کراؤں۔ اس لئے میں خود یا میری بیوی انہیں صاف کیا کرتی تھیں۔ جو محرر ہم لوگوں میں گھل مل گئے تھے وہ اپنے ”پاٹ“ آپ صاف کر لیا کرتے تھے۔ مگر یہ عیسائی محرر نیا نیا آیا تھا اس لئے اس کے کمرے کی صفائی کرنا ہمارا فرض تھا۔ دوسروں کے ”پاٹ“ صاف کرنے میں میری بیوی نے کبھی عذر نہیں کیا۔ مگر جو شخص ”پنجم“ سے عیسائی ہوا تھا اس کا میلا اٹھانا انہیں کسی طرح گوارا نہیں ہوا۔ اس بات پر ہم دونوں میں ان بن ہو گئی۔ ان سے نہ تو یہ دیکھا جاتا تھا کہ میں اس شخص کا پاٹ اٹھاؤں اور نہ وہ خود اٹھانا

پسند کرتی تھیں۔ میری آنکھوں میں آج تک وہ تصویر پھرتی ہے کہ وہ پاٹ ہاتھ میں لئے سیزوٹی سے اتر رہی ہیں، آنکھیں غصے سے لال ہیں، رخساروں پر آنسو بہ رہے ہیں اور مجھے برا بھلا کہہ رہی ہیں مگر مجھے ان سے جو محبت تھی وہ ظلم کا پہلو لئے ہوئے تھی میں اپنے آپ کو ان کا معلم سمجھتا تھا۔ میری اندھی محبت سے ان کی جان عذاب میں تھی۔

صرف ان کا "پاٹ" اٹھالینا میرے اطمینان کے لئے کافی نہ تھا۔ میں چاہتا تھا کہ وہ یہ خدمت خندہ پیشانی سے انجام دیں اس لئے میں نے درشتی کے ساتھ کہا "مجھے اپنے گھر میں یہ یہودگی پسند نہیں۔" یہ لفظ ان کے دل میں تیر کی طرح لگے۔

انہوں نے جھنجھلا کر جواب دیا "تمہیں اپنا گھر مبارک ہو مگر میرا یہاں نباہ نہیں ہو سکتا۔"

میں یہ سن کر اپنے آپے میں نہ رہا اور میرے دل میں رحم کا سرچشمہ خشک ہو گیا۔ میں ان بے چاری کا ہاتھ پکڑ کر کھینچتا ہوا سیزوٹی کے سامنے پھاٹک میں لے گیا۔ اور دروازہ کھولنے لگا کہ انہیں باہر ڈھکیں دوں۔ وہ زار و قطار روتی جاتی تھیں اور کہتی جاتی تھیں "تمہیں ذرا بھی شرم نہیں آتی، آدمیت سے گزرے جاتے ہو، آخر میں جاؤں کہاں؟"

یہاں نہ میرے ماں باپ ہیں نہ بھائی بند میں جو میرے سر پر ہاتھ رکھیں۔ میں تمہاری بیوی ہوں اس لئے تم چاہتے ہو کہ میں ٹھوکریں کھاؤں اور اف نہ کروں، خدا کے لئے ہوش میں آؤ دروازہ بند کرو، لوگ ہمیں اس حالت میں دیکھیں گے تو کیا کہیں گے؟"

بظاہر میں تیس مار خان بنا رہا لیکن دل میں بہت شرمندہ ہوا اور میں نے دوازہ بند کر دیا۔ نہ میری بیوی مجھے چھوڑ سکتی تھیں نہ میں انہیں چھوڑ سکتا تھا۔ ہم دونوں میں اکثر لڑائیاں ہوئیں مگر ہمیشہ صلح پر خاتمہ ہوا۔ میری بیوی کو اپنے بے مثل صبر و تحمل کی بدولت ہر معرکے میں فتح ہوئی۔

آج میں اس واقعہ کو کسی قدر بے تکلفی سے بیان کر سکتا ہوں کیونکہ یہ اس دور کا ذکر ہے جس سے میں خوش قسمتی سے گزر چکا ہوں۔ اب میں وہ محبت سے اندھا شوہر نہیں ہوں اور نہ اپنی بیوی کا معلم بنتا ہوں۔ اب اگر وہ چاہیں تو مجھے اتنا ہی ستا سکتی ہیں جتنا میں انہیں پہلے ستایا کرتا تھا۔ ہم دونوں میں دوستی ہے جو بہت سے امتحانوں میں پوری اتر چکی اور اب ہم ایک دوسرے کو خواہشات نفسانی کا موضوع نہیں سمجھتے ہیں۔ انہوں نے میری بیماریوں میں ہمیشہ بے نفسی سے میری تیمارداری کی۔

یہ واقعہ 1898ء میں ہوا جب مجھے برہمچاریہ کی ہوا تک نہیں لگی تھی۔ ان دنوں میں بیوی کو شوہر کی رفیق مددگار، اس کی رنج و راحت کی شریک نہیں بلکہ اس کی خواہشات نفسانی کا کھلونا سمجھتا تھا۔

1900 میں ان خیالات میں کایا پلٹ ہو گئی اور 1906 میں انہوں نے ایک معینہ صورت اختیار کر لی۔ مگر اس کا ذکر میں مناسب موقعہ پر کروں گا۔ یہاں اتنا کہہ دینا کافی ہے کہ میری نفسانی خواہشوں کے معدوم ہو جانے سے میری گھریلو زندگی روز بروز پر امن، خوشگوار اور مسرت بخش ہوتی جاتی ہے۔

اس واقعے سے، جس کی یاد کو میں تبرک سمجھ کر عزیز رکھتا ہوں کوئی یہ نہ سمجھ لے کہ ہم دونوں کے تعلقات میاں بیوی کے اتحاد کا کامل نمونہ ہیں یا میرا اور میری بیوی کا نصب العین بالکل ایک ہے۔ یوں تو ان بے چاری کو احساس بھی نہیں کہ وہ کوئی علیحدہ نصب العین رکھتی ہیں مگر بہت ممکن ہے کہ میری بعض باتیں انہیں اب بھی پسند نہ ہوں ہم دونوں میں کبھی ان چیزوں پر گفتگو نہیں ہوتی۔ میں اسے بے کار سمجھتا ہوں کیونکہ ان غریب کو نہ تو ان کے ماں باپ نے پڑھایا اور نہ میں نے اس زمانے میں تعلیم دی جو ان کے لئے مناسب تھا۔ ان میں یہ بہت بڑا وصف ہے جو ایک حد تک سب بندہ بیویوں میں ہوتا ہے کہ چاہے ان کا جی چاہتا ہو یا نہ چاہتا ہو۔ انہیں اس کا احساس ہو یا نہ ہو۔ انہوں نے ہمیشہ میری پیردی کو باعث سعادت سمجھا اور میری ضبط نفس کو سعی میں کبھی رکاوٹ نہیں ڈالی۔ اس لئے گو ہم دونوں کی ذہنی قابلیت میں بڑا فرق ہے مگر جہاں تک میں سمجھتا ہوں ہماری زندگی اطمینان، مسرت اور ترقی کی زندگی ہے۔

فرنگیوں سے میل جول (۱)

اس مقام پر ناظرین کو یہ بتادینا ضروری ہے کہ یہ آپ بیٹی میں نے ہفتہ وار مضامین کی شکل میں لکھی ہے۔

جب میں نے یہ کتاب لکھنا شروع کی تو میرے پیش نظر کوئی معینہ خاکہ نہ تھا میرے پاس کوئی روزنامہ یا دوسری تحریریں نہیں ہیں جن سے اپنے تجربوں کی داستان لکھنے میں مدد لے سکوں مجھ سے استاد ازل جو لکھواتا ہے قلم برداشتہ لکھ دیتا ہوں۔ میں یقین کے ساتھ نہیں کہہ سکتا کہ میرا ہر خیال اور ہر فعل خدا کی طرف سے ہے مگر جب میں ان چھوٹے بڑے کاموں پر غور کرتا ہوں جو میرے ہاتھ سے انجام کو پہنچے تو یہ کہنا بے جا نہیں معلوم ہوتا کہ ان سب میں کچھ اوپر کا اشارہ ضرور تھا۔

مجھے نہ خدا کا دیدار نصیب ہوا نہ اس کی معرفت حاصل ہوئی۔ ساری خدائی کو خدا کا قائل دیکھ کر میں بھی قائل ہو گیا۔ مگر میرا عقیدہ اتنا راسخ ہے کہ میں اسے تجربے کے برابر سمجھتا ہوں۔ ممکن ہے لوگ یہ اعتراض کریں کہ عقیدے کو تجربہ کہنا حق کا منہ چڑانا ہے۔ اس لئے غالباً یہ کہنا زیادہ صحیح ہے کہ مجھے خدا پر جو عقیدہ ہے اسے بیان کرنے کے لئے مجھے کوئی موزوں لفظ نہیں ملتا۔

اب شاید لوگوں کو میرا یہ فقرہ سمجھنے میں آسانی ہو کہ یہ آپ بیٹی اسی طرح لکھتا ہوں جیسے استاد ازل لکھواتا ہے۔ جب میں نے پچھلا باب لکھنے کے لئے قلم اٹھایا تو اس کا عنوان وہ رکھا تھا جو اس باب کا ہے مگر پھر یہ خیال آیا کہ فرنگیوں سے میل جول کا ذکر کرنے سے قبل تمہید کے طور پر ایک واقعہ جو کئی سال پہلے گزرا تھا بیان کر دینا چاہئے۔ اس لئے میں نے عنوان بدل کر وہ واقعہ لکھ دیا۔

مگر یہ باب شروع کرتے وقت میں پھر الجھن میں پڑ گیا ہوں میری سمجھ میں نہیں آتا کہ میں جن

انگریز دوستوں کا ذکر کرنے والا ہوں ان کی کون سی باتیں لکھوں اور کون سی نہ لکھوں۔ اگر ضروری باتیں چھوٹ گئیں تو حقیقت دھندلی ہو کر رہ جائے گی۔ سرسری نظر میں یہ کیسے معلوم ہو کہ کونسی چیز ضروری ہے؟ مجھے تو اسی میں شبہ ہے کہ اس کتاب کا لکھنا بھی ضروری ہے یا نہیں۔

بہت دن ہوئے میں نے پڑھا تھا کہ آپ بیتی بحیثیت تاریخ کے ناقص ہوتی ہے۔ آج اس بات کی تصدیق ہو گئی۔ مجھے جتنی باتیں معلوم ہیں سب تو میں اس کتاب میں لکھ نہیں سکتا۔ اب یہ کون کہہ سکتا ہے کہ حق کی صحیح تفسیر کے لئے ان میں سے کیا کیا لے لینا چاہئے اور کیا کیا چھوڑ دینا چاہئے؟ اور پھر میری زندگی کے متعلق میری ایک طرف شہادت جتنے باب میں لکھ چکا ہوں ان کے متعلق مجھ سے جرح کرنے لگے تو شاید ان کا مطلب زیادہ واضح ہو جائے گا اور اگر اس کی جرح مخالفانہ ہو تو یہ بھی ممکن ہے کہ اسے "میرے دعووں کی پول کھول دینے" پر فخر کا موقع ملے۔

ذرا دیر کے لئے میرے دل میں یہ دوسوہ پیدا ہوتا ہے کہ اب اس دفتر کو تہ کر دوں۔ مگر جب تک اندرونی آواز مجھے منع نہ کرے گی میں لکھتا جاؤں گا مجھے اس حکیمانہ اصول پر عمل کرنا چاہئے کہ جو کام ایک بار شروع کر دیا جائے اسے کبھی نہیں چھوڑنا چاہئے بغیر اس صورت کے کہ اس میں کوئی اخلاقی برائی نظر آئے۔

میں یہ آپ بیتی نقادوں کو خوش کرنے کے لئے نہیں لکھ رہا ہوں۔ اس کا لکھنا خود تلاش حق کا ایک تجربہ ہے۔ ایک مقصد یہ بھی ہے کہ اپنے رفیقوں کے لئے روحانی غذا اور تسکین فراہم کروں بلکہ انہیں کے اصرار سے میں نے یہ کتاب لکھنا شروع کیا۔ اگر بے رام داس اور سوامی آئند کا اصرار نہ ہوتا تو یہ کبھی نہ لکھی جاتی۔ اگر یہ تجویز قابل الزام ہے تو میرے ساتھ یہ دونوں بھی ملزم ہیں۔

اب اصل مطلب پر آتا ہوں جس کی طرف اس باب کے عنوان میں اشارہ ہے جس طرح ڈربن میں میرے ساتھ ہندوستانی مہمان عزیزوں کی طرح رہتے تھے اسی طرح انگریز بھی رہتے تھے۔ ان میں سے بعض لوگوں کو میرے یہاں رہنا پسند نہ تھا مگر میں اصرار سے رکھتا تھا۔ اس معاملے میں میں نے غلطیاں بھی کیں اور کچھ لوگوں کا مجھے بہت تلخ تجربہ ہوا۔ جن میں ہندوستانی بھی تھے اور فرنگی بھی۔ مگر باوجود ان تجربوں کے اور باوجود اس پریشانی اور تکلیف کے جو میرے دوستوں کو میری وجہ سے اٹھانا پڑی میں نے اپنا یہ معمول ترک نہیں کیا اور وہ بے چارے بھی میری خاطر سب کچھ سہتے رہے۔ جب کبھی میرے دوستوں کو میرا احتساب سے میل جول رکھنا گوارا ہوا میں نے ہمیشہ انہیں ملامت کی۔ میرا عقیدہ ہے کہ جن لوگوں کو دوسروں میں اور اپنے آپ میں ایک ہی خدا کا جلوہ نظر آتا ہے انہیں باہم اور بے ہمہ

زندگی بسر کرنے کی عادت ڈالنا چاہئے۔ اور یہ عادت اس طرح پڑتی ہے کہ جب آپ ہی آپ دوسروں سے میل جول کا موقع نکل آئی تو اسان پہلو نہ بچائے بلکہ سچے جذبہ خدمت کے ساتھ ان کا خیر مقدم کرے مگر اپنے دل کو ان سے وابستہ نہ ہونے دے۔

اس لئے گو جنگ بور کے آغا کے دلت میرا گھر مہمانوں سے بھرا ہوا تھا میں نے دو انگریزوں کو جو جوہانسبرگ سے آئے تھے اور ٹھہرایا۔ یہ دونوں تھیو سوف تھے۔ ان میں سے ایک مسٹر کچن تھے جن کا ذکر آگے تفصیل سے آئے گا۔ ان دوستوں کی بدولت میری بیوی اکثر آٹھ آٹھ آنسو روتی تھیں۔ وہ میرے ہاتھوں پہلے بھی اس قسم کی تکلیفیں اٹھا چکی تھیں۔ یہ پہلا موقع تھا کہ انگریز میرے ساتھ بے تکلفی سے انگریزوں کی طرح آن کر رہے تھے۔ میں نے انگلستان میں انگریزوں کے گھر رہ چکا تھا مگر وہاں ان کے طریقوں کی پابندی کرتا تھا اور پھر اتنی بے تکلفی بھی نہ تھی۔ یہاں معاملہ بالکل الٹا تھا۔ انگریز دوست ہم میں گھل مل گئے تھے اور انہوں نے بہت سی باتوں میں انگریزی طریقہ اختیار کر لیا تھا۔ میرے گھر میں ظاہری ساز و سامان تو مغربی تھا مگر اندرونی زندگی زیادہ تر ہندوستانی تھی۔ مجھے یاد ہے کہ گو مجھ کو ان سے بے تکلف ہونے میں کسی قدر دلت ہوئی مگر وہ بہت جلد میرے گھر کی زندگی سے مانوس ہو گئے۔ جوہانسبرگ میں اس قسم کے میل جول کے موقعے ڈربن سے بھی زیادہ ملے۔

فرنگیوں سے میل جول (۲)

جو ہانسبرگ میں ایک زمانے میں میرے یہاں چار محرر تھے جنہیں میں اپنے پیٹوں کی طرح سمجھتا تھا۔ مگر کام اتنا تھا کہ یہ بھی کافی نہ ہوئے۔ کاغذات ٹائپ کرنے کی بہت ضرورت پڑتی اور ٹائپ نویسی ہم سب میں اگر کوئی تھوڑا بہت جانتا تھا تو میں ہی جانتا تھا میں نے دو محرروں کو سکھانا چاہا مگر ان کی استعداد انگریزی میں بہت کم تھی اس لئے ترقی نہ کر سکے پھر ان میں سے ایک کو میں محاسب کا کام سکھانا چاہتا تھا۔ مثال سے کسی کو بلا نہیں سکتا تھا کیونکہ ٹرانسوال میں بغیر پروانے کے داخل ہونے کی ممانعت تھی اور مجھے اپنے ذاتی کام کے لئے پرمٹ افسر کا ممنون احسان ہونا مستور نہیں تھا۔

میری سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ کیا کروں۔ کام کی بقایا کا انبار بڑھتا جاتا تھا میں بڑی محنت کرتا تھا لیکن پیٹے کا کام اور قومی کام مل کر اتنا ہو گیا کہ کسی طرح نہ سنبھلتا تھا میں اس پر تیار تھا کہ فرنگی محرر رکھوں مگر مجھے یقین نہ تھا کہ کوئی فرنگی مرد یا عورت میرے جیسے کالے آدمی کا کام کرنے پر راضی ہو جائے گی۔ بہر حال میں نے یہ طے کیا کہ کوشش ضرور کرنا چاہیے۔ میں نے ایک ٹائپ نویسوں کے ایجنٹ سے فرمائش کی کہ مجھے ایک مختصر نویس ڈھونڈ دو۔ اس نے کہا کہ نوجوان عورتیں مل سکتی ہیں میں ان میں سے کسی کو نوکری پر راضی کر لوں گا۔ اسے ایک نوجوان اس کا قاتی خانوں مس ڈک مل گئی جو سیدھی اسکاتستان سے آئی تھیں۔ یہ جائز طریقہ پر روزی کمانے پر تیار تھیں چاہے کسی کا بھی کام کرنا پڑے اور حاحتمند بھی تھیں۔ اس لئے ایجنٹ نے انہیں میرے پاس بھیج دیا۔ میں نے صورت دیکھتے ہیں ان کی طرف سے اچھا خیال قائم کر لیا۔

میں نے پوچھا "آپ کو ہندوستانی کے یہاں کام کرنے میں تامل تو نہیں؟"

انہوں نے جواب دیا "مطلق نہیں"

”آپ تنخواہ کیا چاہتی ہیں؟“

”یہی سولہ سترہ پونڈ یہ تنخواہ زیادہ تو نہیں؟“

”نہیں اگر آپ کا کام میرے حسبِ مشاہدہ تو زیادہ نہیں۔ آپ کب سے کام شروع کر سکتی ہیں؟“

”آپ چاہیں تو اسی وقت شروع کر دوں۔“

میں بہت خوش ہوا اور میں نے فوراً خط لکھوانا شروع کر دئے

تھوڑے ہی دن میں انہیں محرر نہیں بلکہ اپنی چھوٹی بہن یا بیٹی کی طرح سمجھنے لگا۔ ان کا کام ہر طرح قابلِ اطمینان تھا۔ اکثر ان کی تحویل میں ہزار پونڈ رہتے تھے اور سارا حساب کتاب وہی رکھتی تھیں۔ مجھے ان پر پورا بھروسہ ہو گیا اور وہ بھی مجھ پر اتنا اعتماد کرنے لگیں کہ اپنے دلی خیالات اور جذبات مجھ پر اظہار کر دیا کرتی تھیں۔ انہوں نے شوہر کے انتخاب میں بھی مجھ سے مدد لی اور ان کا تاحی باب بھی میں ہی بنا جب مس ڈک مسز سیکلڈ انڈ ہو گئی تو انہیں میری ملازمت ترک کرنا پڑی۔ لیکن اس کے بعد بھی جب کبھی کام کی کثرت ہوئی اور میں نے ان سے مدد کی درخواست کی انہوں نے میری بات کبھی نہیں ٹالی۔ مگر اب ان کی جگہ ایک مستقل مختصر نویس کی ضرورت تھی اور خوش قسمتی سے مسز کیلین باخ جن کا ذکر آگے آئے گا مس شلیزن کو میرے پاس لے آئے۔ آج کل وہ ٹرانسوال کے ایک ہائی اسکول میں معلمہ ہیں۔ جس زمانے میں وہ میرے یہاں آئیں ان کی عمر سترہ برس کی تھیں۔ بعض وقت ان کی سنک سے مجھے اور مسز کیلین باخ کو بہت تکلیف ہوتی تھی۔ انہیں کام کرنے کی اتنی فکر نہ تھی جتنی تجربہ حاصل کرنے کی۔ رنگ کا تعصب ان میں بالکل نہ تھا۔ مگر ان لوگوں کا جو عمر یا تجربے میں آنے بڑے تھے بالکل ادب نہیں کرتی تھیں۔ انہیں کسی شخص کی توہین کرنے میں یا اسے اس کے منہ پر برا بھلا کہنے میں ذرا بھی تامل نہیں ہوتا تھا۔ ان کی تنگ مزاجی بعض وقت بڑی مشکل پڑ جاتی تھی مگر ان کی صاف دلی اور سادگی کی بدولت فوراً ہی رفع بھی ہو جاتی تھیں۔ میں اکثر ان کے لکھے ہوئے خطوں پر بے نظر ثانی کئے ہوئے دستخط کر دیتا تھا۔ مگر ان کی انگریزی مجھ سے اچھی تھی اور ان کی دیانت داری پر مجھے پورا بھروسہ تھا۔

انہوں نے بڑے ایثار سے کام لیا۔ عرصے تک وہ صرف چار پونڈ ماہوار تنخواہ لیتی رہیں اور انہوں نے یہ عہد کر لیا تھا کہ کبھی دس پونڈ سے زیادہ نہیں لیں گی جب کبھی میں ان کی تنخواہ بڑھانے پر اصرار کرتا تھا وہ مجھے یہ کہہ کر جھوک دیتی تھیں ”میں یہاں تنخواہ کے لالچ میں کام نہیں کرتی ہوں۔ میں اس لئے آئی ہوں کہ مجھ آپ کے ساتھ کام کرنے سے خوشی ہوئی ہے اور میں آپ کے نصب العین کی قدر کرتی ہوں۔“

ایک بار انہیں مجھ سے چالیس پونڈ لینے کی ضرورت ہوئی مگر انہیں یہ اصرار تھا کہ یہ رقم انہیں قرض کے طور پر دی جائے اور گزشتہ سال انہوں نے یہ روپیہ ادا کر دیا۔ ان کی ہمت بھی ان کے ایثار سے کم نہ تھی اور وہ ان محدودے چند عورتوں میں سے ہیں جن کی ملاقات کو میں اپنی خوش قسمتی سمجھتا ہوں جن کا دل آئینہ کی طرح صاف ہے جن کی ہمت پر سو ماؤں کو رشک آتا ہے اب وہ سن کہوت کو پہنچ گئی ہیں مجھے اب ان کی سیرت کا استنادازہ نہیں جتنا اس زمانے میں تھا۔ مگر ان نوجوان خاتون کی یاد کو میں ہمیشہ تبرک سمجھ کر عزیز رکھوں گا۔ اگر میں ان کے اوصاف بیان کرنے میں کمی کروں تو اظہار حق کا حق ادا نہ ہوگا۔

وہ قومی کام کے انجام دینے میں دن رات ایک کر دیتی تھیں۔ جب ضرورت ہو اندھیری راتوں میں بے دھڑک اکیلی باہر چلی جاتی تھیں اور اگر کوئی ساتھ چلنے کو کہے تو خفا ہوتی تھیں۔ ہزاروں ہندوستانی جواں مرد ان سے رہنمائی کو توقع رکھتے تھے۔ ستیاگرہ کے دنوں میں جب قریب قریب سارے لیڈر جیل میں تھے وہ اکیلی اس تحریک کو چلاتی رہیں۔ ان کے ذمے ہزاروں آدمیوں کی نگرانی پیشمار خطوط کے جواب دینا اور ”انڈین اوپینین“ کو چلانا تھا مگر تھکنے کا نام نہ لیتی تھیں۔

میں مس شلیزن کی پوری تعریف لکھوں تو ایک دفتر ہو جائے مگر میں ان کے متعلق گو کھلے کی رائے لکھ کر اس باب کو ختم کرتا ہوں۔ گو کھلے میری ہر رفیق کو جانتے تھے۔ وہ ان میں سے اکثر کو پسند کرتے تھے اور اکثر کا ذکر کیا کرتے تھے۔ مگر مس شلیزن کو وہ میرے سارے ہندوستانی اور فرنگی رفیقوں پر فوقیت دیتے تھے۔ وہ کہا کرتے تھے ”میں نے مس شلیزن میں جواہر، پاکبازی اور ہمت دیکھی ہے آج تک کسی شخص میں نہیں دیکھی میرے نزدیک تمہارے رفیقوں میں سب سے زیادہ قابل قدر وہی ہیں۔“

”انڈین اوپینین“

قبل اس کے کہ میں فرنگیوں کے سابقے کا ذکر کروں مجھے دو تین اہم باتوں کی طرف اشارہ کر دینا چاہئے۔ مگر ایک فرنگی دوست کا ذکر فوراً کر دینا ضروری ہے مس ڈک کا تقرر میرے لئے کافی نہیں ہوا مجھے اور مددگاروں کی ضرورت تھی۔ مسٹر رچ کا نام اس کتاب میں پہلے بھی آچکا ہے۔ ان سے میں اچھی طرح واقف تھا۔ یہ ایک تجارتی کارخانے کے میجر تھے۔ انہوں نے میرے کہنے سے ملازمت ترک کر دی اور میرے ساتھ کام کرنے لگے ان کی بدولت میرا بوجھ بہت کچھ ہلکا ہو گیا۔

اسی زمانے میں مدن جیت جی نے میرے سامنے ایک اخبار ”انڈین اوپینین“ کے نام سے نکالنے کی تجویز پیش کی اور اس کے بارے میں میری رائے پوچھی وہ ایک مطبع پہلے سے چلا رہے تھے اس لئے میں نے اس تجویز کو پسند کیا۔ یہ اخبار 1904ء میں جاری کیا گیا اور مسکہ لال جی نظر پہلے ایڈیٹر مقرر ہوئے مگر زیادہ تر کام مجھی کو کرنا پڑتا تھا بلکہ اکثر ادارت کے فرائض بھی میں ہی انجام دیتا تھا۔ اس کے یہ معنی نہیں کہ مسکہ لال جی اخبار کو چلا نہیں سکتے تھے۔ وہ ہندوستان میں عرصے تک اخبار نویسی کر چکے تھے مگر جنوبی افریقہ کے پیچیدہ مسائل پر وہ میرے ہوتے ہوئے قلم اٹھانا نہیں چاہتے تھے۔ انہیں میری سوجھ بوجھ پر پورا بھروسہ تھا اس لئے مقالہ افتتاحیہ لکھنے کی ذمہ داری انہوں نے مجھ پر ڈال دی یہ اخبار اس وقت سے اب تک ہفتہ وار ہے۔ ابتدا میں یہ گجراتی، ہندی، تامل، انگریزی میں نکلتا تھا مگر میں نے دیکھا کہ تامل اور ہندی کے حصے محض برائے نام ہیں۔ ان کا جو مقصد تھا وہ پورا نہیں ہوتا تھا۔ اور ان کا باقی رکھنا ایک طرح کا دھوکا تھا۔ اس لئے میں نے انہیں نکال دیا۔

مجھے پہلے یہ خیال نہ تھا کہ مجھے اس اخبار میں روپیہ لگانا پڑے گا مگر تھوڑے ہی دن میں یہ بات معلوم ہو گئی کہ یہ میری مالی مدد کے بغیر نہیں چل سکتا۔ ہندوستانی اور فرنگی دونوں جانتے تھے کہ گو

انڈین اوپینین "کی ادارت میں میرا نام نہیں ہے مگر اصل میں اس کے چلانے کی ذمہ داری مجھی پر ہے۔ اگر اخبار جاری نہ ہوا ہوتا تو کوئی بات نہ تھی۔ مگر جاری ہونے کے بعد بند ہونا بہت برا تھا۔ اس میں ذلت کی ذلت تھی اور نقصان کا نقصان۔ اس لئے اس پر برابر روپیہ لگاتا رہا۔ یہاں تک کہ آخر میں میرے پاس جو کچھ بچتا تھا سب اس میں کھپ جاتا تھا مجھے یاد ہے کہ میں ایک زمانے میں محتر پونڈ ماہوار دیا کرتا تھا۔

مگر آج اتنے دنوں کے بعد بھی میرا یہی خیال ہے کہ اس اخبار نے ہماری برادری کی مفید خدمت انجام دی۔ اس کی حیثیت ابتداء سے تجارتی نہ تھی۔ جب تک یہ میرے انتظام میں رہا اس کی حالت میری زندگی کے ساتھ بدلتی رہی۔ جس طرح آج "ینگ انڈیا" اور "نوجیون" میری زندگی کا آئینہ ہیں ان دنوں "انڈین اوپینین" تھا۔ ہر ہفتہ میں اس میں اپنی واردات قلب کی داستان اپنے دردوں کی کہانی کہا کرتا تھا اور ستیاگرہ کے اصول اور عمل کے متعلق اپنے خیالات ظاہر کیا کرتا تھا۔ دس سال کے عرصے میں یعنی 1914 تک بجز اس زمانے کے جو میں نے قید میں گزارا، کبھی ایسا نہیں ہوا کہ میں نے اس میں مضمون لکھا ہو۔ مجھے یاد نہیں کہ ان مضامین میں میں نے ایک لفظ بھی بغیر سوچے سمجھے لکھا ہو یا کبھی جان بوجھ کر مبالغہ یا خوشامد کی ہو۔ سچ پوچھئے تو یہ اخبار نویسی میرے لئے ضبط نفس کی تربیت تھی اور میرے دوستوں کے لئے میرے خیالات سے باخبر رہنے کا ذریعہ۔ نقادوں کو اس پر اعتراض کا موقع بہت کم ملتا ہے۔ بلکہ میں وثوق سے کہہ سکتا ہوں کہ "انڈین اوپینین" کے لہجے نے نقادوں کو قلم روک کر لکھنے پر مجبور کر دیا۔ اگر یہ اخبار نہ ہوتا تو ستیاگرہ کبھی نہ چل سکتی۔ ناظرین اسی سے ستیاگرہ کی تحریک کی محتر کیفیت اور جنوبی افریقہ کے ہندوستانیوں کے صحیح حالات معلوم کرتے تھے۔ میرے لئے یہ انسانی فطرت کی نیرنگیوں کے مطالعے کا ذریعہ تھا کیونکہ مجھے ہمیشہ یہ بات مد نظر رہی ہے کہ ایڈیٹر اور ناظرین میں ایک گہرا اور پاک رابطہ قائم ہے۔ میرے پاس بے شمار خطوط آتے تھے جن میں لوگ اپنے دلی خیالات اور جذبات کا اظہار کرتے تھے۔ ان کا لہجہ لکھنے والوں کی مزاجی کیفیت کے اعتبار سے مختلف ہوتا تھا کسی کا دوستانہ، کسی کا نقادانہ اور کسی کا شدید مخالفانہ۔ ان خطوط کو پڑھنا، ان کے مضمون پر غور کرنا اور ان کا جواب دینا میرے لئے بہت اچھی تعلیم تھی۔ یہ خط و کتابت گویا ایک ساز تھی جس کے پردوں میں مجھے اپنی برادری کے دل کی حرکت سنائی دیتی تھی۔ اس نے مجھے اخبار نویس کی ذمہ داریوں سے پوری طرح آگاہ کر دیا اور برادری میں میرا اثر قائم کر دیا جس کی بدولت آگے چل کر ستیاگرہ کے معرکہ میں عملی آسانی، اخلاقی شان اور بے پناہ قوت پیدا ہو گئی۔

”انڈین ادپینین“ کے جاری ہونے کے بعد پہلے ہی مہینے میں مجھ پر یہ حقیقت کھل گئی کہ اخبار نویسی کا مقصد محض خدمت خلق ہے۔ اخبار بہت بڑی قوت ہے۔ مگر جس طرح پانی کے بے تھید سیلاب میں علاقے کے علاقے ڈوب جاتے ہیں اور فصلیں تباہ ہو جاتی ہیں اسی طرح اخبار نویس کے بے روک قلم سے سوائے تخریب کے کچھ حاصل نہیں ہوتا۔ لیکن یہ روک تھام اگر کسی بیرونی قوت کی طرف سے ہو تو مطلق العنانی سے بھی زیادہ خطرناک ہوتی ہے۔ اگر یہ بات صحیح ہے تو دنیا میں کون سا اخبار اس معیار پر پورا اترے گا؟ مگر کسے پڑی ہے کہ بیکار اخباروں کو روکے؟ اور پھر اس کا فیصلہ کون کر سکتا ہے؟ دنیا میں نیکی کی اور بدی کی طرح مفید اور غیر مفید چیزیں ساتھ ساتھ چلی آتی ہیں اور اسی طرح چلی جائیں گی۔ ہر انسان کو خود ہی یہ فیصلہ کرنا ہے کہ کسے لے اور کسے چھوڑے۔

قلیوں کے باڑے یا "گھیٹو"

بعض ذاتوں کو جو بڑھ کر ہماری سماجی خدمت کرتی ہیں ہم ہندوؤں نے نہ جانے کیوں "اچھوت" قرار دے رکھا ہے۔ یہ لوگ شہر یا گاؤں کے بیرونی محلوں میں رہنے پر مجبور ہیں۔ گجراتی میں یہ محلے "دھیدھا دود" کہلاتے ہیں۔ اور اس میں حقارت کی بو آتی ہے مسیحی فرنگستان میں بھی ایک زمانے میں یہودی "اچھوت" سمجھے جاتے تھے اور ان کے لئے جو محلے مخصوص تھے انہیں لوگ حقارت سے "گھیٹو" کہتے تھے۔ اسی طرح آج ہم لوگوں کی حیثیت بھی جنوبی افریقہ میں اچھوتوں کی سی ہو گئی ہے۔ دیکھیں اینڈریوز کا ایثار اور شامسٹری کا جادو ہمیں ہماری کھوئی ہوئی عزت واپس دلانے میں کہاں تک کامیاب ہوتا ہے۔

قدم زمانے میں یہودی اپنے آپ کو دنیا کی ساری قوموں کے مقابلے میں خدا کے برگزیدہ بندے سمجھتے تھے۔ جن کی پاداش میں انہیں یہ اور حد سے زیادہ سخت سزا بھگتنا پڑی۔ قریب قریب اسی طرح ہندو اپنے آپ کو "آریا" یعنی مہذب اور اپنے بعض بھائی بندوں کو "اناریا" یعنی غیر مہذب سمجھتے ہیں۔ جس کی انوکھی اور شدید مکافات میں جنوبی افریقہ میں وہ خود بھی مبتلا ہیں اور مسلمان اور پارسی بھی محض ان کے ہم وطن اور ہم رنگ ہونے کے جرم میں لپیٹ میں آگئے ہیں۔

اب ناظرین "باڑے" کے لفظ کو سمجھ گئے ہوں گے جو اس باب کے عنوان میں آیا ہے ہم لوگ جنوبی افریقہ میں حقارت سے "قلی" کہلاتے ہیں۔ ہندوستان میں "قلی" کے معنی محض جمال یا مزدور کے ہیں۔ مگر جنوبی افریقہ میں یہ حقارت کا کلمہ سمجھا جاتا ہے۔ اس کا مفہوم وہی ہے جو ہمارے یہاں "اچھوت" کا ہے۔ اور وہ محلے جو "قلیوں" کے لئے مخصوص ہیں "قلی باڑے" کہلاتے ہیں۔ جو ہانسبرگ میں بھی ایک اس طرح کا محلہ تھا۔ دوسرے مقامات پر تو ہندوستانی ان محلوں میں کرایہ دار کی حیثیت سے رہتے تھے مگر یہاں انہوں نے تناوے سال کا پنہ حاصل کر لیا تھا۔ اس محلے میں آبادی بڑھتی جاتی تھی مگر رقبہ نہیں بڑھتا تھا اور تھوڑی جگہ میں لوگ کچا کچ بھرے ہوئے تھے میونسپلٹی نے

پاخانوں کی صفائی کا تو کچھ برائے نام انتظام کر دیا تھا مگر حفظانِ صحت کی اور تدبیروں سے بالکل غافل تھی سرکوں اور روشنی کا تو بھلا ذکر ہی کیا ہے؟ جب اسے محلے والوں کی فلاح و بہبود کی پروا نہ تھی محلے کی صفائی کون کرتی؟ جو ہندوستانی یہاں رہتے تھے وہ بے چارے عام صفائی اور حفظانِ صحت کے اصولوں سے ناواقف تھے اس لئے بغیر میونسپلٹی کی نگرانی اور مدد کے کچھ نہیں کر سکتے تھے۔ اگر یہ سب راہنیں کر سوتے تو اور بات تھی۔ مگر دنیا میں کہیں بھی وہ لوگ جو اپنا وطن چھوڑ کر نوآبادیاں بساتے ہیں راہنیں کر سوتے نہیں ہوتے عموماً لوگ دولت اور کاروبار کی تلاش میں پردیس جاتے ہیں اور جنوبی افریقہ جانے والے ہندوستانیوں میں سے اکثر جاہل اور مفلس کاشتکار تھے جنہیں دوسروں کی خبر گیری اور امداد کی ضرورت تھی ان کے بعد تاجر اور تعلیم یافتہ ہندوستانی آگئے تھے مگر بہت کم۔

ایک طرف میونسپلٹی کی مجرمانہ غفلت اور دوسری طرف نوآباد ہندوستانیوں کی جہالت سے یہ محلہ نہایت گندا ہو گیا تھا۔ میونسپلٹی نے محلے کی حالت سدھارنے کے بجائے اس گندگی کو جو خود اس کی غفلت کا نتیجہ تھی حیلہ بنا کر اس محلے کو اجازت کی فکر کی اور مجلس وضع قوانین سے نوآباد ہندوستانیوں کو بے دخل کرانے کی اجازت لے لی یہ صورت حال تھی جب میں نے جوہانسبرگ میں بوددباش اختیار کی۔

ظاہر ہے کہ اس محلے کے رہنے والوں کو اپنی زمین پر ملکیت کا حق تھا اس لئے وہ ہر جانے کے مستحق تھے۔ انتقالِ اراضی کے مقدموں کی سماعت کے لئے ایک خاص عدالت قائم کی گئی۔ اگر مکان دار کو میونسپلٹی کی پیش کی ہوئی لغزینیں منظور نہ ہوں تو اسے یہ حق تھا کہ اس عدالت میں اپیل کرے اور اگر عدالت میونسپلٹی کی مقرر کی ہوئی رقم سے زیادہ کی ڈگری دے تو مقدمے کا خرچہ میونسپلٹی کو دینا پڑتا تھا۔

اکثر مکان داروں نے مجھے دکیل کیا مجھے ان مقدموں سے روپیہ کمانا منظور نہ تھا۔ اس لئے میں نے ان لوگوں سے کہا کہ میں ہر مقدمے میں صرف دس پونڈ لوں گا۔ اور جتنے مقدمے کامیاب ہوں گے ان میں عدالت سے جو خرچہ ملے گا میرا ہوگا۔ میں نے ان سے یہ بھی کہا کہ اپنے محنتانے کی آدمی رقم سے میں غریبوں کے لئے ایک ہسپتال یا اسی قسم کا کوئی اور ادارہ بنوادوں گا۔ ظاہر ہے کہ اس تجویز سے سب کو خوشی ہوئی۔

ستر مقدموں میں سے صرف ایک میں ناکامیابی ہوئی میری فیس کی اچھی عاصی رقم جمع ہو گئی۔ مگر "انڈین اوپینین" کو ہمیشہ روپے کی ضرورت رہتی تھی۔ جہاں تک مجھے یاد ہے سولہ پونڈ اسی کی نذر

ہو گئے مجھے ان مقدموں میں سخت محنت کرنا پڑی موکل مجھے ہمیشہ گھیرے رہتے تھے۔ ان میں سے اکثر بہار اور اس کے قرب و جوار کے ضلعوں کے یا جنوبی ہندوستان کے رہنے والے تھے اور ابتدا میں پابند مزدوروں کی حیثیت سے آئے تھے۔ انہوں نے اپنی شکایتوں کی چارہ جوئی کے لئے ہندوستانی تاجروں کی انجمن سے الگ جماعت قائم کی تھی۔ ان میں سے بعض صاف دل، فیاض اور عالی منش لوگ تھے۔ ان کے رہنما دو شخص تھے۔ جیرام سنگھ جی صدر تھے اور بدری جی ان کے دست راست۔ ان دونوں کا انتقال ہو چکا ہے۔ بدری جی کا اور میرا بہت ساتھ رہا اور انہوں نے ستیاگرہ میں نمایاں حصہ لیا ان دونوں صاحبوں اور بعض اور دوستوں کے توسط سے مجھ سے شمالی اور جنوبی ہندوستان کے بہت سے لوگوں سے میل جول ہو گیا۔ میں ان کا دکیل ہی نہیں بلکہ آپ کا بھائی بھی بن گیا اور ہمیشہ ان کے دکھ درد میں چاہے وہ ذاتی ہو یا ساری برادری سے تعلق رکھتا ہو، برابر شریک رہا۔

ممکن ہے بعض لوگوں کو اس سے دلچسپی ہو کہ جنوبی افریقہ کے ہندوستانی مجھے کیا کہہ کر پکارتے تھے۔ عبداللہ سیٹھ میرا نام لینے پر کسی طرح راضی نہیں ہوتے تھے۔ یہ بڑی خیر ہوئی کہ کسی نے بھی مجھے صاحب کہہ کر ذلیل نہیں کیا عبداللہ سیٹھ نے ایک بڑا پیاں لقب ڈھونڈا نکالا۔ وہ مجھے بھائی کہنے لگے۔ دوسرے بھی ان کی تقلید میں مجھے ہمیشہ بھائی کہتے رہے۔ مگر ان لوگوں کی زبان سے جو کبھی پابند مزدور رہ چکے تھے مجھے بھائی کا لقب اور بھی پیارا معلوم ہوتا تھا۔

کالا طاعون (۱)

میونسپلٹی "تلی باڑے" کے مکانوں پر قبضہ پانے کے بعد ان کے ملکینوں کو فوراً نہیں ہٹایا تھا۔ ان کو بے دخل کرنے سے پہلے ان کے لئے دوسرے مناسب گھر ڈھونڈنا تھا۔ اس میں میونسپلٹی کو بڑی دقت پیش آئی اس لئے ہندوستانیوں کو اس گندلے محلے میں رہنے دیا۔ اگر فرق ہوا تو یہ ہوا کہ ان کی حالت اور بدتر ہو گئی۔ پہلے وہ مکانوں کے مالک تھے اب میونسپلٹی کے کرائے دار بن گئے اور ان کے گرد و پیش گندگی اور بڑھ گئی جب وہ مالک تھے تو انہیں اور کچھ نہیں تو قانون کے خوف سے تھوڑی بہت صفائی رکھنا پڑتی تھی۔ مگر میونسپلٹی کو قانون کا کوئی خوف نہیں تھا۔ کرایہ داروں کی تعداد میں اضافہ ہوتا گیا اور اسی کے ساتھ غلاطت بھی بڑھتی گئی۔

ادھر ہندوستانی اس مصیبت کو رو رہے تھے۔ ادھر کالا طاعون بھی پھوٹ پڑا یہ نمونیا کا طاعون بھی کہلاتا ہے اور گلٹی کے طاعون سے کہیں زیادہ مہلک ہے۔

بڑی خیر ہوئی کہ وہاں ہندوستانیوں کے محلے میں نہیں بلکہ شہر کے باہر ایک سونے کی کان میں شروع ہوئی۔ یہاں زیادہ تر معیشتی کام کرتے تھے جن کی صفائی کے ذمہ دار ان کے فرنگی آقا تھے۔ بعض ہندوستانی مزدور بھی تھے۔ جن سے تینیس پر دبا کا اثر ہو گیا اور ایک روز شام کو یہ لوگ اپنے محلے میں آتے ہی شدید طاعون میں مبتلا ہو گئے۔ اتفاق سے مدن جیت جی جو اس زمانے میں "انڈین اوپینین" کے خریدار بنا رہے تھے اور چندہ جمع کر رہے تھے وہاں موجود تھے۔ وہ بڑے جری آدمی تھے۔ ان دبازدوں کو دیکھ کر ان کا دل بھر آیا اور انہوں نے مجھے ایک رقعہ پنسل سے لکھ کر بھیجا جس کا مضمون تھا۔ کالا طاعون ایک دم سے پھوٹ پڑا ہے۔ آپ کو فوراً آکر اس کا تدارک کرنا چاہئے۔ ورنہ یہ سمجھ لیجئے کہ اس کا انجام بڑا مہلک ہے۔ خدا کے لئے جلد آئیے۔

مدن جیت نے دلیری سے ایک خالی گھر کا قفل توڑ ڈالا اور سب مریضوں کو اس میں رکھا۔ میں

بائسکل پر بیٹھ کر ہندوستانیوں کے محلے میں گیا اور میں نے میونسپلٹی کے ہیڈ کلرک کو لکھ دیا کہ ایسی ایسی حالت تھی اس لئے ہم نے مکان پر قبضہ کر لیا ہے۔

ڈاکٹر ولیم گاڈفرے جو ہانسبرگ میں مطب کرتے تھے یہ خبر سنتے ہی مدد کے لئے دوڑے آئے اور مریضوں کا علاج اور تیمارداری کرنے لگے۔ لیکن تیسری مریض ہم تین آدمیوں سے نہیں سنبھل سکتے تھے۔

میرا یہ عقیدہ ہے اور تجربہ پر مبنی ہے کہ جب مصیبت آتی ہے تو اس کا چارہ اور چارہ خود گرجو پیدا ہو جاتے ہیں اس زمانے میں میرے دفتر میں چار ہندوستانی تھے کلیان داس جی، مانک لال جی، گنونت رائے جی دیسائی اور شخص جن کا نام مجھے یاد نہیں۔ کلیان داس کو ان کے والد نے میرے سپرد کیا تھا۔ مجھے جنوبی افریقہ میں کوئی شخص ان سے زیادہ بامروت اور دل و جان سے اطاعت کرنے والا نہیں ملا۔ خوش قسمتی سے اس وقت تک ان کی شادی نہیں ہوئی تھی اور میں ان سے بے تامل بڑے خطرے کے کام لے سکتا تھا مانک لال مجھ جو ہانسبرگ میں ملے تھے۔ جہاں تک مجھے یاد ہے ان کی بھی شادی نہیں ہوئی تھی اس لئے میں نے دل میں ٹھان لی کہ ان چاروں کو جو میرے محرر، رفیق بیٹے سبھی کچھ تھے قربان کر دوں۔ کلیان داس سے تو کچھ پوچھنے کی ضرورت ہی نہ تھی، دوسرے بھی کہنے کے ساتھ ہی آمادہ ہو گئے۔ ان کا چھوٹا سا پیارا جواب یہ تھا ”جہاں آپ رہیں گے ہم بھی رہیں گے“۔

مسٹر رچ کا بہت بڑا خاندان تھا۔ وہ تیار تھے کہ اس آگ میں کود پڑیں مگر میں نے انہیں روک دیا۔ انہیں اس ہلاکت میں کھسیٹے ہوئے میرا دل دکھتا تھا۔ اس لئے ان کے سپرد وہ کام کیا گیا جس میں خطرہ نہیں تھا۔

وہ شب بیداری اور تیمارداری کی رات تھی۔ تیمارداری میں پہلے بہت کچھ تھا۔ مگر کالے طاغون کے مریضوں کی کبھی نہیں کی تھی۔ ڈاکٹر گاڈفرے کی ہمت سے ہم سب کو بڑی تقویت ہوئی۔ تیمارداری میں کچھ ایسی زیادہ محنت نہیں کرنی پڑتی تھی۔ ہمارا کام بس اتنا تھا کہ مریضوں کو دوا پلا دیا کریں، ان کی خبر گیری کرتے رہیں، ان کے بستر صاف ستھرے رکھیں اور انہیں ملول نہ ہونے دیں۔

جس جوش اور دلیری سے نوجوان کام کرتے تھے اسے دیکھ کر مجھے بے حد خوشی ہوئی۔ ڈاکٹر گاڈفرے یا مدن جیت جی کے سے پرانے سپاہی کیا ایسی جرات دکھانا کوئی تعجب کی سی بات نہیں تھی مگر نا کردہ کار نوجوانوں کے جوش کی جتنی تعریف کی جائے کم ہے۔

جہاں تک مجھے یاد ہے سب مریضوں کی وہ رات بخیر و خوبی گزر گئی۔

مگر یہ واقعہ اتنا پر اثر اور دلچسپ ہے اور میرے لئے اتنی مذہبی اہمیت رکھتا ہے کہ مجھے کم سے کم دو باب اس کے لئے وقف کرنا پڑیں گے۔

حوالہ

1 - پھیپھڑے کا درم۔

کالا طاعون (۲)

میونسپلٹی کے ہیڈ کلرک نے میرا شکریہ ادا کیا کہ میں نے خالی مکان پر قبضہ کر لیا اور مریضوں کو اپنی نگرانی میں لے لیا۔ اس نے صاف صاف اس بات کا اعتراف کیا کہ میونسپلٹی خود اس ناگہانی حادثے کا فوری تدارک کرنے سے معذور ہے۔ مگر یہ وعدہ کیا کہ جہاں تک ممکن ہے ہم لوگوں کی مدد کرے گے۔ اسے ایک بار اس کے فرض کی طرف توجہ دلانے کی ضرورت تھی پھر اس نے مستعدی سے کام شروع کر دیا۔

دوسرے دن اس نے ایک خالی گودام میرے حوالے کر دیا اور مجھے یہ رائے دی کہ مریضوں کو وہاں منتقل کر دوں لیکن اس مکان کی صفائی کا میونسپلٹی نے کوئی انتظام نہیں کیا سارے مکان میں کوزے کرکٹ کے اتبار تھے۔ ہم نے اپنے ہاتھوں سے جھاڑ دی اور مخیر ہندوستانیوں کی امداد سے پلنگ، بستر اور دوسری چیزیں مہیا کر کے ایک عارضی ہسپتال بنایا۔ میونسپلٹی نے ایک نرس بھیج دی جو اپنے ساتھ برانڈی اور دوسری چیزیں جن کی ہسپتال میں ضرورت پڑتی تھی لیتی آئی۔ نگرانی بدستور ڈاکٹر گاڈفرے ہی کی رہی۔

نرس بڑی نیک دل عورت تھی اسے مریضوں کی خدمت کا سچا شوق تھا مگر ہم اس ڈر سے کہ کہیں اسے چھوت نہ لگ جائے اسے حتی الامکان مریضوں کے قریب نہیں جانے دیتے تھے۔

ہمیں یہ ہدایت تھی کہ مریضوں کو برانڈی بار بار دیتے رہیں۔ بلکہ نرس نے تو کہا کہ تم لوگ بھی حفظ ماتقدم کے لئے میرے طرح برانڈی پی لیا کرو۔ مگر ہم لوگ اسے ہاتھ تک نہ لگاتے تھے مجھے یہ بھی یقین نہ تھا کہ یہ مریضوں کے لئے مفید ہے۔ میں نے ڈاکٹر گاڈفرے کی اجازت سے عین مریضوں پر جو برانڈی سے بچنا چاہتے تھے مٹی کے علاج کا تجربہ کیا اور انکے سر اور سینے پر گیلی پٹیاں باندھیں۔ ان میں

سے دو بچ گئے۔ باقی بیس گودام ہی میں مر گئے۔

اس عرصے میں میونسپلٹی دوسری تدبیریں کر رہی تھی۔ جو ہاٹسبرگ سے سات میل کے فاصلے پر لگ جانے والی بیماری کا ہسپتال تھا۔ دو مریض جو بچ رہے تھے اس ہسپتال کے قریب ایک خیمے میں رکھے گئے روز نئے بیماروں کو وہاں پہنچانے کا انتظام کر دیا۔ اس طرح ہمیں اس کام سے چھٹی مل گئی۔

چند روز بعد سنا کہ نیک دل نرس طاغون میں مبتلا ہو کر چٹ پٹ مر گئی۔ اب خدا جانے وہ دو مریض کیسے بچ گئے اور ہم کیونکر محفوظ رہے۔ مگر اس تجربے سے میں مٹی کے علاج کا اور بھی قائل ہو گیا۔ اور برانڈی کے طبی فوائد کی طرف میری بد عقیدگی اور بڑھ گئی میں جانتا ہوں نہ یہ عقیدہ معقول و جوہر پر مبنی ہے اور نہ یہ بد عقیدگی۔ مگر میرے دل پر اس وقت یہی اثر پڑا اور اب تک ہے میں اسے کسی طرح مٹا نہیں سکتا۔ اس لئے میں نے یہ مناسب سمجھا کہ اس کا ذکر کر دوں۔

جب طاغون شروع ہوا ہے تو میں نے اخباروں میں ایک خط چھپوایا تھا جس میں میونسپلٹی کو اس محلے کے زمیں دار کی حیثیت سے غفلت کا ملزم بلکہ طاغون کا ذمہ دار ٹھہرایا تھا۔ اس خط کی بدولت مسٹر ہنری پولک میرے رفیق بن گئے، پادری جوزف ڈوک آنجہانی سے میری دوستی کی بنا بھی ایک حد تک یہی تھی۔

میں اوپر کے کسی باب میں کہہ چکا ہوں کہ میں نباتاتی ریستوران میں کھانا کھایا کرتا تھا۔ یہاں مسٹر البرٹ ویسٹ سے ملاقات ہو گئی۔ وہ روز شام کو ریستوران میں ملتے تھے۔ اور کھانے کے بعد میرے ساتھ ٹہلنے جایا کرتے تھے۔ وہ ایک چھوٹے سے مطبخ میں حصہ دار تھے انہوں نے اخبار میں میرا خط دبا پھوٹنے کے متعلق پڑھا اور میری تلاش میں ریستوران پہنچے۔ میں وہاں نہیں ملا تو انہیں کچھ تردد سا پیدا ہو گیا۔

میں نے اور میرے ساتھیوں نے دبا پھوٹنے کے بعد سے اپنی غذا میں کمی کر دی تھی۔ میرا عرصے سے یہ دستور تھا کہ وبا کے زمانے میں بہت ہلکی غذا استعمال کرتا تھا۔ اس لئے میں نے اس زمانے میں شام کا کھانا ترک کر دیا تھا۔ دوپہر کا کھانا بھی میں دوسرے مہمانوں کے آنے سے پہلے کھایا کرتا تھا۔ ریستوران کے مالک سے میرے مراسم تھے اور میں نے اس سے کہہ دیا تھا کہ میں طاغون کے مریضوں کی تیمارداری کر رہا ہوں اس لئے جہاں تک ہو سکے میں اپنے دوستوں سے الگ رہنا چاہتا ہوں۔

مسٹر ویسٹ نے مجھے دو تین دن ریستوران میں نہیں پایا تو ایک دن صبح تڑکے جب میں ٹہلنے کے لئے جانے کا قصد کر رہا تھا انہوں نے میرے گھر پہنچ کر دروازے پر دستک دی۔ میں نے دروازہ

کھولا تو مسٹریٹ کہنے لگے۔ ”آپ ریستوران میں نہیں ملے تو میں گھبرایا کہ کوئی حادثہ نہ گزرا ہو۔ اس لئے میں نے کہا کہ صبح تڑکے چل کر دیکھوں تاکہ آپ کے ملنے میں شبہ نہ رہے۔ میرے لائق کوئی کام ہو تو میں حاضر ہوں۔ میں مریضوں کی تیاری کے لئے تیار ہوں۔ آپ جانتے ہیں کہ میں اکیلا آدمی ہوں۔ نہ بیوی بچے ہیں اور نہ اور کوئی عزیز جس کی مجھے فکر کرنا ہو۔“

میں نے ان کا شکریہ ادا کیا اور کہا ”تیارداری کے لئے آپ کی ضرورت نہیں اگر نئے کسین نہ ہوئے تو ہم لوگ خود دو ایک روز میں فارغ ہو جائیں گے البتہ ایک کام ہے۔“

”کیسے کیسے کیا کام ہے۔“

”کیا آپ ڈربن جا کر ”انڈین اوپینین“ کی نگرانی کر سکتے ہیں؟ مدن جیت جی کو غالباً ابھی یہاں رہنا پڑے گا۔ اس لئے ڈربن میں ایک شخص کی ضرورت ہے۔ اگر آپ جاسکیں تو مجھے ادھر سے اطمینان ہو جائے۔“

”آپ جانتے ہیں کہ میرا یہاں مطیع ہے۔ غالباً میں جاسکتا ہوں۔ مگر قطعی جواب شام کو دوں گا۔ شام کو جب آپ ٹہلنے چلیں گے تو اس کے متعلق گفتگو ہوگی۔“

مجھے بڑی خوشی ہوئی۔ شام کو باتیں ہوئی اور وہ جانے پر راضی ہو گئے۔ تنخواہ کی انہیں کوئی پروا نہ تھی کیونکہ ان کا مقصد روپیہ کمانا نہیں تھا۔ پھر بھی یہ طے ہوا کہ دس 10 پونڈ ماہوار ان کی تنخواہ ہو اور اگر کچھ نفع ہو تو اس کا ایک حصہ دیا جائے۔ دوسرے ہی دن شام کی ڈاک سے مسٹریٹ روانہ ہو گئے اتنا کچھ روپیہ لوگوں پر باقی تھا۔ جس کی وصولی وہ میرے سپرد کر گئے۔ اس دن سے لے کر جب تک میں جنوبی افریقہ میں رہا وہ میرے دکھ درد کے شریک رہے۔

مسٹریٹ اوتھ (لنکن ٹائر) کے کسانوں کے خاندان سے تھے۔ انہوں نے اسکول کی معمولی تعلیم پائی تھی مگر تجربہ کے مکتب میں اپنے بل پر بہت کچھ سیکھا تھا میں نے اتنے دن کے سابقے میں دیکھا کہ وہ ایک پاکباز، پر میزگار، خدا پرست، رحم دل انگریز ہیں۔

ان کے اور ان خاندان کے مزید حالات آگے چل کر معلوم ہوں گے۔

ہندوستانی محلے میں آگ لگ گئی

مجھے اور میرے رفیقوں کو مریضوں کی تیمارداری سے تو چھٹی مل گئی مگر کالے طاغون کے سبب سے اور بہت سی خرابیاں پیدا ہو گئی تھیں۔ جن کا تدراک باقی تھا۔

میں اوپر کہہ چکا ہوں کہ میونسپلٹی ہندوستانی محلے یا ”قلی باڑے“ کی طرف سے بالکل بے پروا تھی۔ مگر شہر کے فرنگی باشندوں کی صحت کی اسے بڑی فکر تھی۔ ان کی صحت کی خاطر اس نے بہت کچھ صرف کیا تھا۔ اور اب طاغون کو دور کرنے کے لئے روپیہ پانی کی طرح بہا رہی تھی۔ گو میں نے ہندوستانیوں کے بارے میں میونسپلٹی کو لعل اور ترک فعل کے بہت سے گناہوں کا مرتکب ٹھہرایا تھا مگر فرنگی باشندوں کے ساتھ اس کی یہ خیر خواہی دیکھ کر میں تعریف کے بغیر نہ رہ سکا اور مجھ سے اس کا خیر میں جو کچھ مدد ممکن تھی دیتا رہا۔ میرا خیال ہے کہ میں ساتھ نہ دیتا تو میونسپلٹی کو بڑی دقت پیش آتی۔ اسے مسلح قوت سے کام لینا پڑتا اور وہ ہر طرح کی سختی بلا تامل کر بھی گزرتی۔

مگر ان باتوں کی ضرورت نہیں پڑی اور انکا دامن اس دھبے سے پاک رہا۔ میونسپل حکام ہندوستانیوں کے طرز عمل سے بہت خوش ہوئے اور آئیندہ کے لئے طاغون کے دفعیہ کی تدابیر اختیار کرنے میں بڑی آسانی ہو گئی۔ میں نے ہندوستانیوں سے میونسپلٹی کی ہدایت پر عمل کرانے میں اپنے پورے اثر سے کام لیا۔ ہندوستانیوں کے لئے یہ بکھیرے کرنا سہل نہ تھا۔ مگر جہاں تک مجھے یاد ہے کسی نے میرے مشورے کو قبول کرنے میں تامل نہیں کیا۔ محلے کی نگرانی کے لئے پولیس کا ایک بڑا دستہ تعینات کیا گیا۔ بغیر اجازت کے کوئی شخص آنے جانے نہیں پاتا تھا۔ مجھے اور میرے رفیقوں کو داخلے اور واپسی کے پاس مل گئے تھے۔ فیصلہ یہ ہوا تھا کہ سارے محلے والوں سے مکان خالی کر لئے جائیں اور وہ تین ہفتے تک جوہانسبرگ سے تیرہ میل کے فاصلے پر کھلے میدان میں خیموں میں رکھے جائیں۔ ظاہر ہے کہ کھالے پینے کا سامان اور دوسری ضروریات فراہم کر کے خیموں میں بسنا ذرا دیر طلب کام تھا۔ اسی لئے اس اہنڈ میں پولیس کے پہرے کی ضرورت پڑی۔

لوگ بہت ڈرے ہوئے تھے مگر میری ہر دقت کی موجودگی سے انہیں تسکین رہتی تھی۔ بہت

سے غریب لوگوں نے اپنی چھوٹی سے پونجی کو زمین میں گاڑ رکھا تھا۔ یہ روپیہ نکال کر کہیں رکھوانا تھا۔ نہ ان کا کوئی بینک تھا اور نہ وہ کسی ایسے شخص کو جانتے تھے جسے اپنا روپیہ سپرد کر سکیں اس لئے میں ان کا خزانچی بن گیا۔ میرے دفتر میں روپے کے ڈھیر لگ گئے۔ بھلا یہ کیونکہ ممکن تھا کہ میں ایسے وقت میں ان سے اس کا کوئی معاوضہ لیتا میں نے کسی نہ کسی طرح اس کام کو بھی سمیٹا۔ میرے بینک کا منیجر میرا دوست تھا۔ میں نے اس سے کہا کہ یہ روپیہ تمہارے یہاں امانت رکھوانا ہے۔ تانے اور چاندی کے اتے سکے لینے پر کوئی بینک راضی نہیں ہوتا تھا۔ پھر بھی یہ خوف تھا کہ بینک کے محرر طاعون زدہ محلے سے آگے ہوئے روپے کو ہاتھ لگانے سے انکار نہ کر دیں۔ مگر منیجر کو میری خاطر ہر طرح منظور تھی یہ طے کیا گیا کہ روپیہ بینک میں بھینچنے سے پہلے جراثیم سے پاک کر لیا جائے۔ جہاں تک مجھے یاد ہے کوئی ساٹھ ہزار پونڈ روپیہ اس طرح جمع کیا گیا۔ جن لوگوں کے پاس کافی روپیہ تھا انہیں میں نے مشورہ دیا کہ میعاد کی تحویل میں رکھوادیں اور وہ اس بات پر راضی ہو گئے۔

اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ان میں نے بعض کو بینک میں روپیہ رکھنے کی عادت پڑ گئی۔

محلے کے سب باشندے اسپیشل ٹرین سے جوہانسبرگ کے قریب کلپ اسپروٹ فارم میں پہنچا دئے گئے۔ اور ان کے لئے میونسپلٹی کی طرف سے کھانے پینے کا سامان مہیا کر دیا گیا۔ یہ خیموں کا شہر ایک فوجی پڑاؤ سا معلوم ہوتا تھا۔ جو لوگ اس طرح کی زندگی کے عادی نہیں تھے ان کے لئے یہاں کے انتظامات تعجب انگیز اور تکلیف دہ تھے مگر اصل میں انہیں کوئی تکلیف نہیں تھی۔ میں روزانہ بائیسکل پر بیٹھ کر وہاں جایا کرتا تھا۔ وہاں پہنچ کر یہی دیکھتا تھا کہ لوگ گانے بجانے ہنسنے کھیلنے میں مگن ہیں۔ تین ہفتے کھلی ہوئی رہنے سے انکی صحت کو بڑا فائدہ ہوا۔

جہاں تک مجھے یاد ہے محلہ جس دن خالی ہوا اس کے دوسرے ہی دن وہاں آگ لگ گئی میونسپلٹی نے کسی چیز کو بچانے کی ذرا بھی کوشش نہیں کی۔ انہیں دنوں میونسپلٹی نے اپنی ساری عمارت لکڑی میں جو بازار میں پڑی تھی خود آگ لگادی اور دس ہزار پونڈ کا نقصان برداشت کیا۔ اس حرکت مذہبوں کا سبب یہ تھا کہ بازار میں چند مردہ چوہے پائے گئے تھے۔

میونسپلٹی کو بہت روپیہ صرف کرنا پڑا۔ مگر اس نے طاعون کو آگے پھیلنے نہیں دیا اور خدا اور کر کے شہر کے لوگوں کو اطمینان نصیب ہوا۔

حوالہ

Jined diprait - 1

ایک کتاب کا جادو

کالے طاعون کے سبب سے میرا اثر غریب طبقے کے ہندوستانیوں میں بڑھ گیا میری وکالت خوب چمکی اور میری ذمہ داریوں میں اضافہ ہو گیا۔ بعض فرنگی حضرات سے بڑے گہرے تعلقات ہو گئے اور مجھ پر نئی اطلاعاتی پابندیاں عاید ہو گئیں۔

مسٹر پو لک سے بھی نباتاتی ریسٹوران میں ملاقات ہوئی جیسے مسٹرویسٹ سے ہوئی تھی۔ ایک دن میں اس ریسٹوران میں کھانا کھا رہا تھا کہ ایک نوجوان نے جو قریب کی میز پر بیٹھے تھے اپنا کارڈ میرے پاس بھیجا جس کا مطلب تھا کہ وہ مجھ سے ملنا چاہتے ہیں۔ میں نے انہیں اپنی میز پر بلا لیا۔ انہوں نے کہا ”میں کریٹک کاسب ایڈیٹر ہوں۔ میں نے اخباروں میں آپ کا خط طاعون کے متعلق پڑھا تو بے اختیار جی چاہا کہ آپ سے ملوں۔ شکر ہے کہ موقع مل گیا۔“

مسٹر پو لک کی اس بے لکلفی میں کچھ ایسی کشش تھی کہ میرا دل ان کی طرف کھینچنے لگا۔ ایک ہی روز میں ہم دونوں میں اچھی خاصی ملاقات ہو گئی اور یہ معلوم ہوا کہ زندگی کے اہم مسائل کے متعلق ہم دونوں کی رائے بہت کچھ ملتی جلتی ہے۔ انہیں سادہ زندگی پسند تھی۔ ان میں یہ عجیب ملکہ تھا کہ جس بات سے ان کا ذہن متاثر ہوتا تھا اسے فوراً عملی صورت میں لے آتے تھے۔ بعض تبدیلیاں جو انہوں نے اپنی زندگی میں کیں فوری بھی تھیں اور قطعی بھی۔

”انڈین اوپینین“ کا خرچ روز بروز بڑھتا جاتا تھا۔ مسٹرویسٹ کی پہلی ہی رپورٹ بڑی پریشان کن تھی۔ انہوں نے لکھا ”آپ کو قوی امید تھی کہ اس کام میں منافع ہو گا مگر میرے خیال میں اس کی کوئی توقع نہیں بلکہ مجھے تو خسارے کا خوف ہے، حساب کتاب باقاعدہ نہیں ہے۔ لوگوں پر بہت سارے پیسے باقی

ہے مگر اس کا کچھ پتہ نہیں چلتا۔ بہت کچھ کٹ چھانٹ کر کے نئے سرے سے انتظام کرنا پڑے گا مگر آپ گھبرائے نہیں میں اپنے امکان بھر اصلاح کی پوری کوشش کروں گا۔ چاہے منافع ہو یا نہ ہو میں بیٹے والا نہیں۔

ایسی صورت میں کہ فائدے کی کوئی امید نہ تھی مسٹریسٹ چاہتے تو علیحدہ ہو جاتے مجھے شکایت کا کوئی حق نہ ہوتا بلکہ وہ اتنا مجھے الزام دے سکتے تھے کہ تم نے بغیر کافی ثبوت کے یہ کہہ دیا کہ یہ نفع کا کام ہے۔ مگر انہوں نے ذرا بھی شکایت نہیں کی۔ البتہ مجھے یہ خیال ہے کہ اس واقعے سے مسٹریسٹ مجھے زود اعتقاد سمجھنے لگے۔ اور ہے بھی یہی کہ میں نے دن جیت جی کے تخمینہ کو بغیر جانچ پڑتال کے صحیح مان لیا اور مسٹریسٹ سے کہہ دیا کہ منافع کی امید ہے۔

اب مجھے اچھی طرح احساس ہو گیا ہے کہ قومی خدمت کرنے والے کو کوئی ایسی بات نہیں کہنا چاہئے جس کی اس نے اچھی طرح تحقیق نہ کر لی ہو خصوصاً حق کے پرستار کو اس معاملہ میں بڑی احتیاط کی ضرورت ہے۔ کسی دوسرے کو ایسی بات کا یقین دلانا جس پر خود پورا وثوق نہ ہو حق کا منہ چرانا ہے۔ مجھے افسوس کے ساتھ اعتراف ہے کہ باوجود اس علم کے میری زود اعتقادی کی عادت اب تک نہیں گئی اسکی وجہ یہ ہے کہ مجھے اپنے ذمے اتنا کام لے لینے کا شوق ہے جو مجھ سے سنبھل نہیں سکتا۔ میرے اس شوق کی بدولت مجھ سے زیادہ میرے رفیقوں کو تکلیف ہوتی ہے۔

مسٹریسٹ کا خط آتے ہی میں مثال روانہ ہو گیا۔ میں نے مسٹر لوک سے سارا واقعہ بیان کر دیا تھا وہ مجھے پہنچانے اسٹیشن آئے۔ انہوں نے مجھے ایک کتب رستے میں پڑھنے کے لئے دی اور کہا کہ یہ تمہیں یقیناً پسند آئے گی۔ یہ رسکن کی Units this last تھی۔

یہ کتاب اتنی دلچسپ تھی کہ جب اسے پڑھنا شروع کیا تو بے ختم کئے ہاتھ سے نہ چھوٹی اس نے مجھ پر جادو سا کر دیا۔ جو ہالبرگ سے ڈربن تک چوبیس گھنٹے کا سفر تھا گاڑی ٹام کے وقت ڈربن پہنچی وہ ساری رات مجھے جاگتے گزری۔ میں نے دل میں ٹھان لی کہ اس کتاب کے نصب العین کے مطابق اپنی زندگی بدل دوں گا۔

اس سے پہلے رسکن کی کوئی کتاب میری نظر سے نہیں گزری تھی طالب علمی کے زمانے میں میں نے درسی کتابوں کے سوا کوئی کتاب نہیں پڑھی تھی اور دنیا کے دھندے میں لگ جانے کے بعد مجھے مطالعے کے لئے بہت کم وقت ملتا تھا۔ اس لئے میرا کتابی علم بہت محدود ہے۔ مگر میں سمجھتا ہوں کہ مطالعہ کا محدود ہونا میرے حق میں برا نہیں ہوا۔ بلکہ اس سے یہ فائدہ ہوا کہ میں نے جو کچھ پڑھا وہ دماغ میں

اچھی طرح رچ بچ گیا۔ ان میں سے Units this last ایسی کتاب تھی جس کی بدولت میری زندگی میں فوری اور علمی تغیر ہو گیا۔ بعد میں میں نے اس کا ترجمہ گجراتی میں ”سرود دیا“ (رفاہ عام) کے نام سے کیا۔

مجھے رسلن کی اس جید کتاب میں اپنے بعض گہرے عقیدوں کی جھلک نظر آئی۔ اسی لئے اس نے میرے دل کو موہ لیا اور میری زندگی میں انقلاب پیدا کر دیا۔ شاعر وہ ہے جو انسان کے دل میں سوئی ہوئی نیکیوں کو جگادے شاعروں کے کلام کا اثر سب پر یکساں نہیں ہوتا کیونکہ جو ہر قابل کسی شخص میں کم ہوتا ہے کسی میں زیادہ۔

میرے نزدیک Units this last کی تعلیم کالب بات یہ تھا۔

- 1۔ ہر فرد کا بھلا اسی میں ہے جس میں سب کا بھلا ہو۔
 - 2۔ ایک حجام کے کام کی قیمت وہی ہے جو ایک دکیل کے کام کی ہے کیونکہ ہر شخص کو حق ہے جس طرح چاہے روزی کمائے۔
 - 3۔ سب سے اچھی اور پر لطف زندگی مزدور کی یعنی کسان اور کار میگر کی زندگی ہے۔
- پہلی بات میں پہلے سے جانتا تھا۔ دوسری کا بھی بہت حقیف سا احساس تھا۔ مگر تیسری کا کبھی خیال تک نہیں آیا تھا Units this last کے مطالعے سے مجھ پر یہ روشن ہو گیا کہ پہلی بات میں دوسری اور تیسری بھی شامل ہے۔ ادھر تر کا ہوا ادھر میں دل میں یہ ٹھان کر اٹھا کہ ان اصولوں پر عمل کروں گا۔

حوالہ

1 - Critic (نقار) اخبار کا نام ہے

فینکس کی بستی

میں نے سارا ماجرا مسٹریسٹ سے بیان کیا کہ Units this last کے مطالعے کا مجھ پر اثر ہوا ہے اور میری تجویز ہے کہ "انڈین اوپینین" کا دفتر ایک زراعتی فارم میں رکھا جائے۔ ہم میں سے ہر شخص اپنے ہاتھ سے کھیتی باڑی کا اور خالی وقت میں مطیع کا کام کرے اور سب کو مساوی اجرت دی جائے جو پیٹ کی ردنی اور تن کے کپڑے کو کافی ہو۔ مسٹریسٹ نے اس تجویز کو پسند کیا اور یہ قرار پایا کہ ہر شخص کو خواہ وہ کسی ملک اور کسی قوم کا ہو تین پونڈ ماہوار اجرت دی جائے گی۔

مگر یہ بڑا مشکل سوال تھا کہ دس 10 بارہ 12 آدمی جو مطیع میں کام کرتے ہیں سب کے سب ایک دور افتادہ فارم میں جا کر بسنے اور اتنی کم اجرت لینے پر راضی بھی ہونگے یا نہیں۔ اس لئے ہم نے یہ طے کیا کہ جو لوگ اس تجویز پر عمل نہ کر سکتے ہوں وہ موجودہ تنخواہ پر کام کرتے رہیں اور آہستہ آہستہ اس بستی کے مطب العین تک پہنچنے کی کوشش کریں۔

میں نے سب رفیقوں سے اس کے متعلق گفتگو کی۔ مدن جیت جی کو یہ تجویز پسند نہیں آئی۔ ان کا خیال تھا کہ یہ محض حماقت ہے اور اس کا نتیجہ یہ ہو گا کہ وہ کام جس کی خاطر انہوں نے سب کچھ دے دیا تھا پیٹھ جائے گا، سارے ملازم کام چھوڑ کر بھاگ جائے گے "انڈین اوپینین" اور مطیع دونوں بند ہو جائیں گے۔

مطیع کے ملازموں میں میرے رشتے کے بھائی چھکن لال گاندھی بھی تھے میں نے جس وقت مسٹریسٹ سے اس تجویز کا ذکر کیا وہ بھی موجود تھے۔ وہ بال بچوں والے آدمی تھے مگر انہوں نے بچپن سے میری تربیت میں رہنے اور میرے ساتھ کام کرنے کا ارادہ کر لیا تھا۔ انہیں مجھ پر پورا بھروسہ تھا۔ اس

لئے انہوں نے بغیر کسی بحث کے یہ تجویز منظور کر لی اور اس دن سے آج تک میرے ساتھ ہیں۔ گردن سوامی مشین میں شریک ہو گئے۔ دوسروں نے پوری تجویز تو منظور نہیں کی مگر اس پر راضی ہو گئے کہ میں جہاں کہیں مطبع لے جاؤں گا وہ ساتھ چلیں گے۔

جہاں تک مجھے خیال ہے ان لوگوں سے یہ بخت دپز کرنے میں مجھے دو روز سے زیادہ نہیں لگے۔ اس کے بعد میں نے فوراً اشتہار دیا کہ ایک زمین کے قطعے کی ضرورت ہے جو ڈربن کے مضافات میں کسی ریل کے اسٹیشن کے قریب واقع ہو۔ اس کے جواب میں فینیکس سے پیغام آیا میں اور مسٹرویسٹ اس زمین کو دیکھنے گئے اور ایک ہفتہ کے اندر ہم نے بیس ایکڑ کا قطعہ خرید لیا۔ اس میں ایک چھوٹا سا خوبصورت چشمہ بہتا تھا اور آم اور نارنگی کے چند درخت بھی تھے۔ اس سے ملا ہوا ایک اسی ایکڑ کا قطعہ تھا جس میں بہت سے درخت اور ایک ٹوٹا پھوٹا بنگلہ تھا۔ ہم نے اسے بھی خرید لیا۔ اس میں سب ملا کر ایک ہزار پونڈ صرف ہوئے۔

مسٹر رستم جی آنجنہانی اس قسم کے معاملات میں ہمیشہ میری مدد کیا کرتے تھے۔ انہیں یہ تجویز پسند آئی۔ انہوں نے ایک بڑے گودام کی پرانی لوہے کی چادریں میرے حوالے کر دیں اور بہت سا اور عمارت کا مالہ بھی دیا۔ ہم نے اس سلمان سے تعمیر شروع کر دی چند ہندوستانی معمار اور بڑھئی مل گئے جو میرے ساتھ جنگ بوڑ کے زمانے میں کام کر چکے تھے اور ان کی مدد سے ہم نے چھاپے خانے کے لئے ایک پختہ فٹ لمبا اور پچاس فیٹ چوڑا سا بنان ایک مہینے کے اندر تیار کر لیا۔ مسٹرویسٹ اور بعض اور لوگ بڑی جوکھ اٹھا کر ان کاریگروں کے ساتھ رہتے تھے۔ ساری زمین پر گھاس ہی گھاس تھی اور سانپوں کی اتنی کثرت تھی کہ وہاں رہنے میں جان کا خطرہ تھا۔ پہلے سب خیموں میں رہتے تھے۔ ہم لوگ ہفتے میں ایک بار اپنا سامان چھکڑوں میں بھر کر فینیکس لے جایا کرتے تھے۔ یہ جگہ ڈربن سے چودہ میل اور فینیکس اسٹیشن سے ڈھائی میل کے فاصلے پر تھی۔

"انڈین اوپینین" کا صرف ایک نمبر باہر مرکزی پریس میں چھپوانے کی ضرورت پڑی۔ اب میں نے یہ کوشش شروع کی کہ اپنے عزیزوں اور دوستوں کو ہندوستان سے روزگار کی تلاش میں میرے ساتھ آئے تھے اور مختلف قسم کے کاروبار میں لگے ہوئے تھے فینیکس لے آؤں۔ یہ لوگ روپیہ کمانے کے شوق میں آئے تھے اور انہیں اس زندگی پر آمادہ کرنا بہت مشکل تھا مگر پھر بھی چند لوگ تھوڑے دن کے بعد چھوڑ کر چلے گئے اور اپنے اپنے دھندوں میں لگ گئے۔ مگن لال گاندھی عمر بھر کے لئے اپنے کاروبار سے ہاتھ دھو کر میرے ساتھ ہو گئے اور میرے اخلاقی تجربوں میں وہ اپنی قابلیت، ایثار،

ظہور اور محنت کے لحاظ میرے سب پرانے ساتھیوں سے ممتاز رہے اور سیکاری میں تو انہوں نے بغیر کسی سے سیکھے وہ کمال پیدا کیا کہ ہم میں سے کوئی ان کا مقابلہ نہیں کر سکتا۔

اس طرح 1904ء میں فینکس کی بستی کی بنیاد پڑی اور شدید مشکلات کے باوجود اب تک ”انڈین اوپینین“ اسی بستی سے نکلتا ہے۔

مگر اس مہم کی ابتدائی مشکلوں مختلف تبدیلیوں اور ہماری امیدوں اور مایوسیوں کے بیان کے لئے ایک الگ باب کی ضرورت ہے۔

پہلی رات

فنیکس سے "انڈین اوپینین" کا پہلا نمبر نکلانے میں دانتوں پسینا آگیا۔ اگر میں نے دو باتوں کی احتیاط نہ کی ہوتی تو پہلا نمبر نہ نکل سکتا یا دیر میں نکلتا۔ مجھے چھاپے خانے میں انجن سے کام لینا پسند نہیں تھا۔ میرا تو یہ خیال تھا کہ جہاں کھیتی باڑی کا کام ہاتھ سے کیا جائے وہاں مشینوں کو بھی ہاتھ سے چلانا زیادہ مناسب حال ہوگا۔ مگر اس طرح کام چلتا نظر نہ آیا تو ہم نے ایک تیل کا انجن لگا دیا۔ پھر بھی میں نے ویسٹ سے کہا کہ ہمیں کوئی ایسا انتظام کر لینا چاہئے کہ اگر انجن اتفاقاً بند بھی ہو جائے تو مشین نہ رکیں۔ انہوں نے ایک چرخی لگائی ہاتھ سے چلائی جاسکتی تھی۔ اخبار کی تقطیع اب تک وہی تھی جو روزانہ اخباروں کی ہوتی ہے۔ مگر فنیکس کیسے دور افتادہ مقام پر اس تقطیع کی چھپائی مشکل تھی، اس لئے اس کی فل اسکیپ سائز اختیار کی گئی کہ بروقت ضرورت اخبار چھوٹی مشین پر چھاپا جاسکے۔

ابتداء میں اخبار کی اشاعت کے دن ہم سب کو رات کو دیر تک جاگنا پڑتا تھا۔ چھوٹے بڑے سب مل کر چھپے ہوئے تختوں کو موڑتے تھے اور یہ کام عموماً رات کے دس 10 اور بارہ بجے کے درمیان ختم ہوتا تھا۔

پہلی رات کبھی نہ بھولے گی۔ مشین پر فرمہ کس دیا گیا مگر انجن چلنے کا نام نہ لیتا تھا۔ ہم نے ڈربن سے ایک انجینئر بلوایا تھا کہ مشین کو جاکر چالو کر دے اس نے اور ویسٹ نے ایڑی چوٹی کا زور لگا دیا مگر انجن لس سے مس نہ ہوا۔ ہر شخص پریشان تھا۔ ویسٹ بیچارے کے چھکے چھوٹ گئے۔ وہ میرے پاس آئے تو ان کی آنکھوں میں آنسو چھلک رہے تھے۔ بھرائی ہوئی آواز میں کہنے لگے "انجن کسی طرح نہیں چلتا۔ میرے خیال میں پرچہ وقت پر نکلنے کی کوئی امید نہیں۔"

میں نے تسلی آمیز لہجہ میں کہا ”اگر یہ صورت ہے تو مجبوری ہے۔ رونے پینے سے کیا فائدہ؟ پھر بھی ہمیں اپنی جیسی کر لینا چاہئے۔ کیا اس چرخی سے کام نہیں چلے گا؟“

انہوں نے جواب دیا ”چرخی چلانے کے لئے آدمی کہاں سے آئیں گے؟ یہ اتنے آدمیوں کے بس کی بات نہیں چار چار کو باری باری سے کام کرنا پڑے گا اور ہم لوگ سب تھکے ہوئے ہیں۔“

تعمیر کا کام ہنوز ختم ہوا تھا اس لئے بڑھئی تک موجود تھی۔ سب چھاپے خانے کے سامبان میں پڑے سو رہے تھے۔ میں نے ان کی طرف اشارہ کر کے کہا ایسا کیوں نہ کریں کہ ان لوگوں سے مدد لیں اور رات بھر جاگ کر کام ختم کر ڈالیں؟ میرے خیال میں تو یہ تدبیر ضرور آزمانا چاہئے۔“

ویسٹ نے کہا ”میری ہمت نہیں پڑتی کہ ان آدمیوں کو جگاؤں اور چھاپے خانے کے آدمی سچ سچ شل ہو گئے ہیں۔“

میں نے کہا ”خیر یہ تم مجھ پر چھوڑ دو۔“

ویسٹ نے کہا ”پھر تو ممکن ہے کہ ہم کام کر لے جائیں۔“

میں نے سونے والوں کو جگایا اور ان سے مدد کی درخواست کی وہ فوراً راضی ہو گئے اصرار کرنے کی مطلق ضرورت نہیں ہوئی۔ انہوں نے کہا ”اگر ہم ایسے وقت میں کام میں نہ آئے تو پھر ہم کسی مرض کی دوا ہیں؟ آپ آرام کیجئے ہم چرخی چلاتے ہیں ہمارے لئے یہ کوئی مشکل کام نہیں۔“

”ہمارے آدمی تو پہلے ہی سے تیار تھے۔“

ویسٹ بہت خوش ہوئے اور جب ہم لوگوں نے کام شروع کیا تو جوش میں آکر ایک مناجات گانے لگے میں اس فریق میں تھا جس میں بڑھئی تھی۔ دوسرے بھی اپنی اپنی باری کام کرتے تھے۔ یہ سلسلہ صبح سات بجے تک جاری رہا ابھی بہت سا کام باقی تھا۔ اس لئے میں نے ویسٹ سے کہا کہ انجینئر کو جگا کر ان سے کہو ایک بار پھر انجن چلانے کی کوشش کریں۔ اگر اب بھی انجن چل جائے تو کام وقت پر ختم ہو سکتا ہے۔

ویسٹ نے جا کر انہیں جگایا اور فوراً انجن گھر پہنچے۔ خدا کی قدرت دیکھئے کہ ان کے ہاتھ لگاتے ہیں انجن چلنے لگا ہمارا مطیع خوشی کے نعروں سے گونجنے لگا۔

میں نے پوچھا ”یہ کیا بات ہے؟ آخر اس کا کیا سبب ہے کہ رات ہم محنت کرتے کرتے تھک گئے اور کچھ نہ ہوا اور صبح انجن خود بخود چلنے لگا جیسے کبھی بگڑا ہی نہ تھا؟“

مجھے ٹھیک یاد نہیں کہ اس کے جواب میں یہ الفاظ انجینئر نے کہے یا ویسٹ نے ”اب یہ کون کہہ

سکتا ہے کہ کیا سبب تھا۔ مشینوں کی بھی بعض اوقات یہ حالت ہوتی ہے کہ گویا ہماری طرح وہ بھی سستانا چاہتی ہیں۔"

میرے نزدیک انجن کا بند ہونا ہم سب کی آزمائش کے لئے تھا اور اس کا عین ضرورت کے وقت چلنا ہمارے خلوص اور محنت کا اجر تھا۔

اخبار وقت پر بھیج دیا گیا۔ ہم میں سے ہر ایک خوشی سے پھولا نہیں سماتا تھا۔ پہلی ہی بار وقت کی پابندی پر اس قدر زور دینے کا یہ نتیجہ ہوا کہ اخبار ہمیشہ باقاعدہ شائع ہوتا رہا اور فنیکس کے لوگوں میں اعتماد نفس کی روح پیدا ہو گئی۔ ایک زمانہ وہ آیا کہ ہم نے اپنی خوشی سے انجن کا استعمال ترک کر دیا اور ہاتھ سے کام کرنے لگے۔

میرے نزدیک یہی دن فنیکس کی اعلیٰ معراج کے تھے۔

بو لک آگے بڑھے

مجھے اس بات کا ہمیشہ افسوس رہا کہ میں نے فنیکس کی بستی بسائی مگر میرے قیام کی صورت یہی رہی کہ کبھی کبھی جا کر کچھ دن وہاں رہ آتا تھا۔ اس میں میرا ارادہ یہ تھا کہ میں آہستہ آہستہ وکالت ترک کر دوں اس بستی میں جا کر بس جاؤں محنت مزدوری سے روزی کماؤں اور فنیکس کی ترقی میں کوشش کر کے ذوق خدمت حاصل کروں مگر یہ میری قسمت میں نہ تھا مجھے اکثر تجربہ ہوا ہے کہ انسان کچھ سوچتا ہے اور خدا کچھ اور کرتا ہے۔ لیکن اسی کے ساتھ یہ دیکھا ہے کہ اگر اصلی مقصد طلب حق ہے تو خواہ انسان کی ساری تدبیریں الٹی ہو جائیں نتیجہ کبھی اس کے حق میں برا نہیں ہوتا بلکہ اکثر اس کی توقع سے بڑھ کر اچھا ہوتا ہے فنیکس میں جو غیر متوقع واقعات پیش آئے وہ ہرگز مضر نہیں تھے۔ البتہ یہ مشکل سے کہا جاسکتا ہے کہ ہم نے پہلے جو امیدیں باندھ رکھی تھیں ان سے بہتر نتیجے حاصل ہوئے۔

ہم نے چھاپے خانے کے آس پاس کی زمین کو تین تین ایکڑ کے قطعوں میں تقسیم کر دیا تاکہ ہر شخص کھیتی کر کے گزر بسر کے لائق کما لے۔ ایک قطعہ میرے حصے میں بھی آیا ان سب قطعوں میں ہمیں چار دنا چار لوہے کی نالی دار چادروں کے مکان بنانا پڑے ہم تو یہ چاہتے تھے کہ کچی خس پوش جھوپڑیاں یا ایتھوں کے چھوٹے چھوٹے مکان کسانوں کے رہنے کے لائق بنالیں مگر اس کا موقع نہ ملا۔ ان مکانوں میں خرچ بھی زیادہ ہوتا اور وقت بھی بہت لگتا اور ہم کو یہ فکر تھی کہ جتنی جلدی ہو سکے ٹھکانے سے پیٹھ کر کام شروع کر دیں۔

اخبار کے ایڈیٹر ابھی تک سکھ لال نظر تھے۔ انہوں نے نئی تجویز مستور کی تھی اور اخبار کی نگرانی ڈربن میں رہ کر کرتے تھے جہاں ہمارے دفتر کی شاخ تھی۔ گو ہم تنخواہ دار کمپوزیٹروں سے کام لیتے تھے مگر تجویز یہ تھی کہ ہم میں سے ہر شخص کمپوزنگ کا کام جو سب سے سہل مگر نہایت تکلیف دہ ہے

سیکھ لے۔ بعض لوگ پہلے سے جانتے تھے۔ جو نہیں جانتے تھے انہوں نے اب سیکھ لیا۔ میں سب سے پھڑی رہا اور مگن لال گاندھی سب سے بڑھ گئے۔ اب تک انہوں نے کبھی چھاپے خانے میں کام نہیں کیا تھا مگر تھوڑے ہی دن کی مشق میں وہ نہ صرف "کمپوزنگ" میں بلکہ چھپائی کے سارے کاموں میں برق ہو گئے تھے ان کی ترقی دیکھ کر تعجب اور خوشی ہوئی میرا ہمیشہ یہ خیال رہا کہ ان میں جتنی قابلیت ہے اس کا انہیں خود احساس نہیں۔

ابھی ہم ٹھکانے سے بیٹھے نہیں پائے تھے اور عمارتیں پوری طرح تیار نہیں ہوئی تھیں کہ مجھے اپنا نیا نشیمن چھوڑ کر جوہانسبرگ جانا پڑا کچھ ایسی صورت تھی کہ میں وہاں کے کام سے زیادہ دن بے توجہی نہیں کر سکتا تھا۔

جوہانسبرگ پہنچ کر میں نے پولک سے اپنے نئے انتظام کا ذکر کیا۔ انہیں جب یہ معلوم ہوا کہ اس کتاب نے، جو انہوں نے مجھے عاریتاً دی تھی یہ انقلاب پیدا کر دیا تو وہ بے انتہا خوش ہوئے۔ انہوں نے پوچھا کہ کیا کوئی ایسی صورت نہیں کہ میں اس تجربہ میں شریک ہو سکوں؟ "میں نے کہا" ہے کیوں نہیں آپ کا جی چاہے تو آپ نئی بستی میں چل کر ہماری برادری میں داخل ہو جائیے وہ کہنے لگے "تو پھر میں بالکل تیار ہوں۔"

ان کی ادولوا العززی نے مجھے گرویدہ کر لیا۔ انہوں نے اپنے افسر کو ایک مہینے کا نوٹس دیا کہ "کرنیک" کی ادارت سے سبک دوش کرنے جائیں اور اس مدت کے گزرنے کے بعد فنیکس پہنچ گئے۔ وہ اس قدر ملنسار تھے کہ تھوڑے ہی دنوں میں انہوں نے سب کے دل کو موہ لیا اور ہمارے خاندان میں گھل مل گئے اور سادگی تو ان کی سرشت میں تھی۔ فنیکس کی زندگی انہیں ذرا بھی غیر مانوس یا دشوار نہیں معلوم ہوئی بلکہ ایسی راس آئی جیسے بظ کو پانی۔ مگر میں انہیں زیادہ دن وہاں نہیں رکھ سکتا تھا۔ مسٹر رچ اپنی تعلیم کے لئے انگلستان جا رہے تھے اور میں اکیلا دفتر کا کام نہیں سنبھال سکتا تھا اس لئے میں نے پولک سے کہا کہ تم دفتر کے کام میں میری مدد کرو اور دکالت کا امتحان پاس کر لو۔ میرا خیال تھا کہ کچھ دن کے بعد ہم دونوں کام چھوڑ کر فنیکس میں بس جائیں گے۔ مگر اس کی کبھی نوبت نہ آئی۔ پولک اتنے بھولے آدمی تھے کہ جب انہیں کسی دوست پر اعتماد ہو جاتا تھا تو جو وہ کہتا تھا بغیر بحث کے مان لیتے تھے۔ انہوں نے فنیکس سے لکھا کہ مجھے یہ زندگی دل سے پسند ہے، یہاں سچی راحت و مسرت حاصل ہے اور میرے دل میں اس بستی کو ترقی دینے کے دلولے اور امیدیں ہیں۔ پھر بھی اگر آپ سمجھتے ہیں کہ اسے چھوڑ کر آپ کے ساتھ دفتر میں کام کرنے اور وکیل بننے سے ہمارا نصب العین جلد حاصل

ہو جائے گا تو مجھے کوئی عذر نہیں مجھے اس خط کے آنے سے بڑی خوشی ہوئی۔ پولک فنیکس سے جو ہالسرگ آئے اور انہوں نے میرے ساتھ کام کرنے کے معاہدے پر دستخط کر دیئے۔

اسی زمانے میں میں نے ایک اسکاتی تھیوسوف سے جو مجھ سے ایک ابتدائی قانونی امتحان کی کتابیں پڑھتے تھے کہا کہ تم بھی پولک کی طرح میرے ساتھ کام کرنے کا معاہدہ کر لو اور وہ راضی ہو گئے ان کا نام میک انٹائر تھا۔

غرض میری نیت تو یہ تھی کہ جس طرح جلد ممکن ہو فنیکس کے نصب العین تک پہنچوں مگر اس کے لئے جو طریقہ میں نے اختیار کیا تھا وہ مجھے منزل مقصود سے دور لے جا رہا تھا۔ اور اگر مشیت ایزدی کا دخل ہوتا تو میں اس جال میں جو میں نے سادہ زندگی کے نام سے پھیلا رکھا تھا بھنس کر رہ جاتا۔ جس طریقے سے خدا نے مجھے اور میرے نصب العین کو تباہی سے بچایا اس کا کسی کو سان گمان بھی نہیں ہو سکتا تھا۔ اس کے بیان کرنے کے لئے کئی باب چاہئیں۔

خدا حافظ حقیقی ہے

اب میرے ہندوستان واپس جانے کی کوئی امید نہیں رہی تھی۔ میں نے اپنی بیوی سے ایک سال میں لوٹنے کا وعدہ کیا تھا۔ سال ختم ہو گیا اور واپسی کی کوئی صورت نہ تھی اس لئے میں نے طے کیا کہ بیوی بچوں کو اپنے پاس بلاؤں۔

جس جہاز میں یہ لوگ جنوبی افریقہ آرہے تھے اس میں ایک دن میرا سنبھلا لاکارام داس کپتان کے ساتھ کھیل رہا تھا کہ یکایک اس کا بازو اکھڑ گیا۔ کپتان نے اس کی دیکھ بھال بہت اچھی طرح کی اور جہاز کے ڈاکٹر سے اس کا علاج کرایا مگر پری طرح فائدہ نہیں ہوا۔ اس لئے جب وہ جہاز سے اترتا تو اس پتی کے سہارے ہاتھ لٹکائے تھا۔ جہاز کے ڈاکٹر نے یہ مشورہ دیا تھا کہ گھر پہنچتے ہی کسی اچھے ڈاکٹر سے مرہم پٹی کرانا چاہئے مگر یہ وہ زمانہ تھا کہ جب مجھے منی کے علاج کی اتنی ذہن تھی کہ میں نے اپنے بعض موکلوں کو جو مجھ جیسے نیم حکیم پر عقیدہ رکھتے تھے، یہ علاج شروع کرادیا تھا میں نے اپنے دل میں سوچا کہ ام داس کے لئے کیا کرنا چاہئے؟ وہ پورے آٹھ برس کا تھا میں نے اس سے پوچھا "اپنی مرہم پٹی مجھے کرنے دو گے؟" اس نے مسکرا کر کہا "بڑی خوشی سے" اسے اس عمر میں اتنا شعور نہ تھا کہ اپنے برے بھلے کو سمجھتا مگر وہ عطائی علاج اور باقاعدہ علاج کا فرق ضرور جانتا تھا میں نے ڈرتے ڈرتے کانپتے ہاتھوں سے پٹی کھولی، زخم دھویا اور صف منی کی پلیٹیں رکھ کر بازو پر پٹی باندھ دی۔ عمل ایک مہینے تک جاری رہا۔ یہاں تک کہ زخم بھر کر سوک گیا اس درمیان میں کوئی رکاوٹ نہیں پیش آئی اور دلت بھی اس سے یادہ نہیں لگا جتنا بقول جہاز کے ڈاکٹر کے معمولی علاج میں لگتا۔

اس طرح کے تجربوں سے میرا عقیدہ گھریلو علاج پر اور بختہ ہو گیا اور اب میں زیادہ وثوق سے ان باتوں کا مشورہ دینے لگا۔ میں نے ان طریقوں کے استعمال کا دائرہ وسیع کر دیا اور منی پانی اور فاقے کے

علاج سے مختلف قسم کے زخموں میں، بخار، ضعف معدہ، اور یرکان وغیرہ میں کام لیا اور اکثر کامیاب ہوا۔ مگر اب مجھے اسناد ثوق نہیں جتنا جنوبی افریقہ میں تھا۔ بلکہ اتنے دن کی آزمائش سے یہ ثابت ہوا ہے کہ اس قسم کے تجربوں میں صریحی خطرے ہیں۔

یہاں ان تجربوں کا ذکر کرنے سے یہ غرض نہیں کہ ان کی کامیابی ظاہر کی جائے مجھے اپنے کسی تجربے کے پوری طرح کامیاب ہونے کا دعویٰ نہیں ہے۔ اور مجھ پر کیا موقوف ہے ڈاکٹر بھی اپنے تجربوں کے متعلق اس کا دعویٰ نہیں کر سکتے۔ میں تو صرف یہ دکھانا چاہتا ہوں کہ جس شخص کو نئے تجربے کرنا ہوں وہ اپنی ذات سے ابتداء کرے۔ اس سے حق کی تلاش میں آسانی ہو جاتی ہے۔ جو شخص خلوص نیت سے تجربہ کرتا ہے اسے خدا ضرر سے محفوظ رکھتا ہے۔

فرنگیوں سے میل جول پیدا کرنے کے جو تجربے میں نے کئے ان میں بھی گھریلوں علاج کے تجربوں سے کم خطرے نہیں تھے۔ صرف استنا فرق تھا کہ ان خطروں کی نوعیت دوسری تھی۔ مگر میں نے ان کی کبھی ذرا بھی پروا نہیں کی۔

میں نے پو لک کو اپنے گھر ہی میں رکھا اور ہم دونوں سگے بھائیوں کی طرح رہنے لگے۔ ان کی نسبت مسز پو لک سے کئی سال قبل ہو چکی تھی۔ مگر شادی کے لئے مناسب وقت کا انتظار تھا۔ میرا خیال ہے کہ پو لک خانہ داری کی زندگی شروع کرنے سے پہلے کچھ روپیہ جمع کرنا چاہتے تھے۔ وہ رسکن کی تعلیم کو مجھ سے بہتر سمجھتے تھے مگر اس پر فوری عمل کرنے میں ان کا مغربی ماحول حاصل تھا۔ میں نے انہیں سمجھایا ”جب دو دلوں میں ایسا اتحاد ہو جیسا تم دونوں میں ہے تو مالی مصلحتوں سے شادی کو ملتوی کرنا جائز نہیں اگر انلاس شادی میں رکاوٹ ڈالتا ہے تو اس کے یہ معنی ہوتے کہ غریب آدمی کبھی شادی کر ہی نہیں سکتے۔ اور پھر تم تو میرے ساتھ رہتے ہو روزمرہ کے خرچ کی تو فکر ہی نہیں کرنا چاہئے۔ میرے خیال میں تو تمہیں جتنی جلدی ہو سکے شادی کر لینا چاہئے۔“ میں پہلے کہہ چکا ہوں کہ مجھے پو لک سے کوئی بات دوبارہ کہنے کی ضرورت نہیں پڑتی تھی۔ انہوں نے میری دلیل تسلیم کر لی اور فوراً مسز پو لک سے جو ان دنوں انگلستان میں تھیں اس معاملے کے متعلق خط و کتابت شروع کر دی۔ مسز پو لک خوشی سے راضی ہو گئیں اور چند مہینے میں جو ہانسبرگ پہنچ گئیں۔ شادی میں کچھ خرچ کرنے کا تو سوال ہی نہ تھا۔ دلہن کے لئے نیا لباس بھی ضروری نہیں سمجھا گیا۔ ان دونوں کو عقد کے لئے مذہبی رسوم کی حاجت نہیں تھی۔ مسز پو لک عیسائی مذہب پر پیدا ہوئی تھیں اور پو لک یہودی مذہب پر۔ ان دونوں کا مغرب مذہب، مذہب اخلاق تھا۔

لگے ہاتھوں اس عقد کے متعلق ایک واقعہ بھی بیان کر دوں۔ ٹرانسوال میں اس رجسٹرار کو، جو ٹرنگیوں کی شادی کا اندراج کرتا تھا۔ کالے آدمیوں کی شادیوں کا درج رجسٹر کرنے کا اختیار نہ تھا۔ پو لک کی شادی میں دوہا کا ساتھی میں تھا۔ اس کام کے لئے فرنگی دوست بھی مل سکتے تھے مگر پو لک کو یہ کسی طرح گوارا نہ تھا۔ غرض ہم تینوں رجسٹرار کے دفتر میں گئے اور اس نے مجھ سے کہا کہ جب تم دوہا کے ساتھی ہو تو مجھے کیونکر یقین آئے کہ دوہا دلہن فرنگی ہیں۔ وہ چاہتا تھا کہ جب تک اچھی طرح تحقیق نہ کر لے اس شادی کے اندراج کو ملتوی رکھے۔ دوسرے دن اتوار تھا اور اس کے اگلے دن سال نو کی تعطیل تھی۔ بھلا ہم کیسے برداشت کر سکتے تھے کہ ٹھہری ٹھہرائی شادی اتنی سی بات کے لئے ملتوی کر دی جائے۔ مجھ سے چیف مجسٹریٹ سے بور جسٹری کے محکمہ کا فہرہ ملاقات تھی۔ اس لئے میں دوہا دلہن کو ساتھ لے کر ان کے پاس گیا۔ انہوں نے کر رجسٹرار کے نام ایک رقعہ لکھ دیا اور شادی کا باضابطہ اندراج ہو گیا۔

اب تک جو فرنگی میرے ساتھ رہتے تھے ان سے پہلے کی ملاقات تھی مگر اب ایک انگریز خاتون، جو ہمارے لئے بالکل اجنبی تھیں ہمارے خاندان میں داخل ہوئیں جہاں تک مجھے یاد ہے ان میاں بیوی سے ہم سے کبھی بگاڑ نہیں ہوا اور فرض کیجئے کہ مسز پو لک میں اور میری بیوی میں کبھی ناچاقی ہوئی بھی ہو تو ایسی باتیں تو اچھے اچھے خاندانوں میں بھی پیش آجاتی ہیں۔ ہمارا خاندان تک اس قدر مخلوط تھا کہ اس میں ہر قسم کے اور ہر مزاج کے لوگ جمع تھے۔ اور اگر غور کیجئے تو ہم جنس اور غیر جنس کا فرق محض خیالی ہے۔ ہم سب ایک ہی خاندان کے رکن ہیں۔

بہتر یہ ہے کہ اس باب میں ویسٹ کی شادی کا ذکر بھی کر دیا جائے۔ اس وقت میرے خیالات ”برہمچاریہ“ کے متعلق پختہ نہیں ہونے پائے تھے۔ اس لئے مجھے اپنے سب کنوارے دوستوں کی شادی کرانے سے بڑی دلچسپی تھی۔ کچھ دن کے بعد ویسٹ اپنے والدین سے ملنے لوٹے گئے۔ میں نے ان سے کہا کہ اگر ہو سکے تو شادی کر لینا اور اپنی بیوی کو ساتھ لیتے آنا۔ فنیکس ہمارا مشترکہ گھر تھا اور ہم سب کسان بن گئے اس لئے ہمیں شادی کا اور اس کے لازمی نتائج کا ڈر نہیں رہا تھا۔ ویسٹ نے لیسنر کی ایک نوجوان حسین خاتون سے شادی کر لی اور انہیں ساتھ لے کر لوٹے۔ ان کے خاندان والے موچی تھے اور لیسنر کے ایک کارخانے میں مزدوری کرتے تھے۔ مسز ویسٹ خود بھی کچھ دن اس کارخانے میں کام کر چکی تھی۔ میں نے انہیں حسین اس لئے کہا ہے کہ ان کے حسن سیرت نے فوراً میرے دل کو موہ لیا۔ سچ پوچھئے تو سچا حسن پاکہ امسی اور باطنی میں ہے۔ مسز ویسٹ کے ساتھ ان کی والدہ بھی آئی تھیں۔

ضعیفہ اب تک زندہ ہیں ان کی محنت، مستعدی اور جوش مزاجی پر سب کو رشک آتا ہے۔
 جس طرح میں نے فرنگی دوستوں کو شادی کی ترغیب دی۔ اسی طرح ہندوستانی دوستوں کو بھی
 اس بات پر آمادہ کیا کہ اپنے بال بچوں کو وطن واپس بلا لیں۔ فنیکس آہستہ آہستہ چھوٹا سا گاؤں بن گیا۔
 اب وہاں چند خاندان بس گئے تھے اور ان کے بال بچوں سے آبادی بڑھتی جاتی تھی۔

حوالہ

best gran - 1

گھر گھستی کی ایک جھلک

میں پہلے کہہ چکا ہوں کہ ڈربن میں میرے گھر کا خرچ بہت تھا مگر میرا میلان سادگی کی طرف ہو چلا تھا۔ جو ہانسبرگ میں رہنے کی تعلیم کے مطابق میں نے اس معاملے میں بہت سختی شروع کر دی۔ ایک بیرسٹر کے گھر میں جتنی سادگی ممکن تھی وہ میں نے اختیار کی۔ تھوڑے بہت فرنیچر کے بغیر گزارا نہیں ہو سکتا تھا۔ مکان کی صورت میں تبدیلی نہیں ہوئی۔ اپنے ہاتھ سے محنت کرنے کا شوق بڑھ گیا میں نے اپنے بچوں کو بھی اس کی تربیت دینی شروع کر دی۔

نان پاؤ خریدنا چھوڑ دیا گیا اور کوہنہ کی ہدایت کے مطابق بے خمیر کی روٹی گھر پر پکنے لگی معمولی کل کی چکی کا پسا ہوا میدہ اس کام کا نہیں تھا۔ اس لئے سادگی، صحت اور کفایت کے خیال سے یہ مناسب معلوم ہوا کہ ہم خود ہاتھ کی چکی میں آنا پیسے۔ میں نے سات پونڈ میں ایک چکی خریدی اس میں ایک لوہے کی چرخی لگی تھی جو ایک آدمی کے بس کی نہ تھی مگر دو آدمی اسے اچھی طرح چلا سکتے تھے۔ عام طور پر میں پو لک اور بچے اسے چلایا کرتے تھے۔ میری بیوی بھی کبھی کبھی ہاتھ بنا لیتی تھیں۔ اگرچہ چکی چلانے کا وقت وہی تھا جب وہ پکانا رہنا شروع کرتی تھیں۔ جب مسز پو لک آئیں تو وہ بھی ہمارے ساتھ شریک ہو گئیں۔ بچوں کو چکی چلانے میں بڑی اچھی درزش ہو جاتی تھی۔ یہ کام بلکہ کوئی کام بھی ان سے جبراً نہیں لیا جاتا تھا بلکہ ان کے لئے ایک کھیل سا تھا۔ جب جی چاہتا آکر ہاتھ لگا دیتے اور جب تھک جاتے تو چھوڑ کر بھاگ جاتے۔ مگر ان بچوں نے اور دوسروں نے جن کا میں آگے ذکر کروں گا میری مدد میں کبھی کمی نہیں کی۔ اس کے یہ معنی نہیں کہ ان میں کوئی کام چور تھا ہی نہیں مگر اکثر ایسے تھے جو جی سے کام کرتے تھے مجھے بہت کم لڑکے یاد ہیں جو کام سے جی چراتے ہوں یا تھکنے کا بہانہ کرتے ہوں۔

ہم نے ادپر کے کام کے لئے ایک نوکر رکھ لیا تھا وہ بھی عزیزوں کی طرح گھر میں رہتا تھا اور بچے کام میں اس کا ہاتھ بنایا کرتے تھے۔ میونسپلٹی کا مہتر میلا اٹھایا کرتا تھا مگر پاخانے کی صفائی ہم نوکر سے نہیں کراتے تھے بلکہ اپنے ہاتھ سے کرتے تھے۔ بچوں کے لیے بڑی اچھی تربیت ثابت ہوئی۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ میرے لڑکوں میں سے کسی کو مہتر کا کام کرنے میں عار نہیں۔ اور انہیں قدرتی طور پر حفظانِ صحت کے عام اصولوں پر عمل کرنے کی عادت پڑ گئی ہے۔ ہمارے گھر میں بہت کم یہ اتفاق ہوتا تھا کہ کوئی بیمار پڑے۔ جب کبھی ایسی صورت پیش آتی تھی تو بچے بڑے شوق سے تیمارداری کرتے تھے۔ میں نے ان کی کتابی تعلیم کی طرف سے بالکل غافل تو نہیں تھا مگر اسے اس عملی تعلیم پر قربان کرنے میں ذرا سا بھی تامل نہیں کرتا تھا اس لئے اگر میرے بچوں کو مجھ سے شکایت ہو تو ایک لحاظ سے بجا ہے۔ بعض موقعوں پر انہوں نے اس کا اظہار بھی کیا ہے اور مجھے ایک حد تک اپنے قصور کا اعتراف ہے۔ انہیں تعلیم دلانے کی خواہش میرے دل میں بھی بلکہ میں نے خود انہیں پڑھانے کی کوشش کی مگر ہمیشہ کوئی نہ کوئی چیز حائل ہو گئی اور یہ سلسلہ جاری نہ رہ سکا مجھے ان کے لئے کوئی اتالیق نہ مل سکا اس لیے میں انہیں روزانہ اپنے ساتھ دفتر لے جاتا تھا۔ یہ پانچ میل کا فاصلہ وہ آتے جاتے پیدل ہی طے کرتے تھے۔ اس سے انہیں اچھی خاصی ورزش ہو جاتی تھی۔ اور اگر کوئی اور ساتھ نہ ہو جس سے باتیں کرنا ضروری ہو تو میں بچوں کو چلتے چلتے گفتگو کے ذریعے تعلیم دینے کی کوشش کرتا تھا۔ میرے سب بچوں نے بغیر بری لال کے جو ہندوستان ہی میں رہ گیا تھا جو ہانسبرگ میں اسی طرح تعلیم پائی۔ اگر میں انہیں ایک گھنٹہ روز بھی پابندی کے ساتھ ادبی تعلیم دے سکتا تو میرے خیال میں ان کی تعلیم مکمل ہو جاتی مگر اس کا موقع نہ ملا اور ان کی ادبی تعلیم ناقص رہ گئی جس کا انہیں بھی افسوس ہے اور مجھے بھی۔ میرے بڑے بیٹے نے اکثر نچ کی گفتگو میں اور اخباروں میں شکایت ظاہر کی ہے۔ دوسرے بچوں نے کریم انفسی سے میرا قصور ناگزیر سمجھ کر معاف کر دیا۔ میں اس صورت حال سے ہرگز دل شکستہ نہیں ہوں۔ مجھے جو کچھ افسوس ہے وہ یہ ہے کہ میں نے باپ کی حیثیت سے اپنا فرض پوری طرح نہیں ادا کیا۔ لیکن میرا عذر یہ ہے کہ میں نے ان کی ادبی تعلیم کو اس چیز پر قربان کر دیا جسے میں اپنے عقیدے میں، چاہے وہ غلط ہی کیوں نہ ہو، قومی خدمت سمجھتا ہوں۔ مجھے پورا اطمینان ہے کہ میں نے ان کی سیرت کی تربیت میں کوئی دقیقہ نہیں اٹھا رکھا اور میرے نزدیک ہر بچے کے ماں باپ کا فرض ہے کہ اس کا کافی اہتمام کرے۔ اگر میرے بچوں میں باوجود میری انتہائی کوشش کے غامیاں رہ گئی ہیں تو مجھے دل سے یقین ہے کہ یہ میری تربیت کو کوتاہی کی علامت نہیں بلکہ میرے اور میری بیوی کے نقائص کی جھلک ہے۔

بچوں کو ماں باپ سے صرف صورت شکل ہی نہیں بلکہ ذہنی اور اخلاقی صفات بھی وراثت میں ملتی ہیں۔ ماحول کا بھی ایک حد تک اثر ہوتا ہے مگر اصل سرمایہ جسے لے کر بچہ زندگی میں قدم رکھتا ہے اسے اپنے آباؤ اجداد ہی سے حاصل ہوتا ہے۔ میں نے یہ بھی دیکھا ہے کہ بعض بچے موروثی برائیوں پر غالب آجاتے ہیں۔ اس کا سبب یہ ہے کہ نیکی روح کی خلقی صفت ہے۔

مجھ سے اور پولک سے اکثر اس پر بحث ہوا کرتی تھی کہ بچوں کو انگریزی پڑھانا مناسب ہے یا نہیں۔ میرا ہمیشہ سے یہ عقیدہ ہے کہ جو ہندوستانی ماں باپ کو بچپن سے انگریزی میں سوچنا اور انگریزی بولنا سکھاتے ہیں اور وہ اپنے بچوں اور اپنے ملک دونوں کے ساتھ بے وفائی کرتے ہیں۔ وہ انہیں قوم کی روحانی اور سماجی آرٹ سے محروم کر دیتے ہیں اور اس حد تک انہیں ملک کی خدمت کے ناقابل بنادیتے ہیں۔ اس عقیدے کی وجہ سے میں اپنے بچوں سے خاص کر کے ہمیشہ گجراتی میں باتیں کرتا تھا۔ پولک کو یہ بات ناپسند تھی وہ سمجھتے تھے کہ میں بچوں کی آئینہ ترقی کی جڑ کاٹ رہا ہوں وہ انتہائی محبت اور اصرار سے کہتے تھے کہ اگر لڑکے بچپن سے انگریزی جیسی عالمگیر زبان سیکھ لیں تو وہ زندگی کی دوز میں دوسروں سے آگے رہیں گے۔ ان کی دلیلوں سے میری تسکین نہیں ہوئی۔ مجھے یاد نہیں کہ میں نے انہیں اپنے طرز کی صحت کا قائل کر دیا یا وہ مجھے خود سارے اور ضدی سمجھ کر چپ ہو رہے۔ یہ بیس برس کی بات ہے اور اس عرصے میں تجربے نے میرے عقیدے کو اور بھی راسخ کر دیا۔ گو میرے لڑکوں کو مکمل ادبی تعلیم نہ ملنے سے نقصان پہنچا ہے مگر اس کی بددلت انہوں نے مادری زبان میں اور زیادہ ترقی کر لی ہے جس میں ان کا اور ان کے ملک کا سراسر فائدہ ہے کیونکہ اب وہ اپنے دیس میں پر دسی نہیں۔ انگریز دوستوں کے وسیع حلقے میں اٹھنے بیٹھنے اور ایسے ملک میں رہنے سے جہاں زیادہ تر انگریزی بولی جاتی ہے انہیں خود بخود انگریزی بولنے اور لکھنے کی خاصی مشق ہو گئی ہے۔

زولو "بغاوت"

بقلم میں جوہانسبرگ میں بس گیا تھا مگر ٹھکانے کی زندگی میرے نصیب میں نہ تھی۔ عین اس وقت میں یہ سمجھتا تھا کہ ذرا اطمینان سے بیٹھوں گا ایک ایسا واقعہ پیش آیا جس کی بالکل توقع نہ تھی۔ اخباروں سے معلوم ہوا کہ نٹال میں زولو "بغاوت" شروع ہو گئی ہے۔ مجھے زولو قوم سے کوئی غلش نہیں تھی۔ انہوں نے کبھی ہندوستانیوں کو نقصان نہیں پہنچایا تھا۔ مگر اس زمانے میں میرا یہ عقیدہ تھا کہ دولت برطانیہ دنیا کی بہبود کے لئے قائم ہے۔ میں برطانیہ کا استنساخ و فسادار تھا کہ دل میں بھی اس دولت عظمیٰ کو ضرر پہنچنے کی خواہش نہیں رکھتا تھا۔ اس لئے مجھے اس سے سروکار نہ تھا کہ بغاوت بجائے یا بے جا نٹال میں ایک ڈائریکٹرز فورس (1) تھی۔ اور اسے مزید رنگروٹوں کے بھرتی کرنے کا اختیار تھا۔ میں نے اخبار پڑھا کہ بغاوت کو فرد کرنے کے لئے اس دستے کو جمع ہونے کا حکم دیا گیا ہے۔

میں اپنے آپ کو نٹال کا شہری سمجھتا تھا۔ اس لئے میں نے گورنر کو خط لکھا کہ اگر ضرورت ہو تو میں ہندوستانیوں کی ایسوسی ایشن کو قائم کرنے کو تیار ہوں۔ انہوں نے فوراً منظوری بھیج دی۔

مجھے اپنی درخواست اس قدر جلد قبول ہو جانے کی امید تھی۔ اچھا ہوا کہ میں نے یہ خط لکھنے سے پہلے ضروری انتظام کر لیا تھا۔ میں نے طے کر لیا تھا کہ اگر میری درخواست قبول ہوئی تو جوہانسبرگ کے گھر کو چھوڑ دوں گا۔ پولک ایک چھوٹے سے مکان میں رہیں گے اور میری بیوی فنیکس چلی جائیں گی۔ وہ اس فیصلے سے بالکل میری ہم رائے تھیں مجھے یاد نہیں کہ اس قسم کے معاملوں میں انہوں نے کبھی میری راہ میں رکاوٹ ڈالی ہو۔ اس لئے جیسے ہی گورنر کا جواب آیا میں نے مالک مکان کو ایک مہینے کا معمولی کرایہ دیا اور اپنا سامان کچھ فنیکس بھجوا دیا اور کچھ پولک کے یہاں رکھوا دیا۔

میں نے ڈربن جا کر رنگرڈوں کے لئے تحریک کی۔ بہت بڑے دستے کی ضرورت نہیں تھی۔ ہم کل چوبیس آدمی تھے۔ جن میں میرے علاوہ چار گجراتی تھے اور سب جنوبی ہند کے لوگ تھے جو ابتدا میں "پابند مزدوروں" کی حیثیت سے آئے تھے ایک ہٹھان تھا جو کسی کا پابند نہیں تھا۔

چیف میڈیکل افسر نے دستور کے مطابق مجھے سرجنٹ میجر کا عارضی منصب دے دیا تاکہ میری ایک حیثیت بھی ہو جائے اور کام میں بھی آسانی ہو اور میری تجویز سے انہوں نے تین آدمیوں کو سرجنٹ اور ایک کو کارپورل بنا دیا۔ ہمیں حکومت کی طرف سے دردیاں بھی ملیں۔ ہماری کورچہ ہفتے تک لام پر رہی "بغاوت" کے مقام پر پہنچ کر میں نے دیکھا کہ "بغاوت" کے کوئی آثار نہیں پائے جاتے۔ کسی قسم کی مزاحمت نظر نہیں آتی تھی۔ یہ شورش محض اتنی بات پر "بغاوت" کہی جانے لگی کہ ایک زولو سردار نے ایک نئے ٹیکس کے ادا کرنے سے انکار کیا تھا اور جو سرجنٹ وصولی کے لئے گیا تھا اسے نیزہ مار کر ختم کر دیا تھا بہر حال مجھے زولو قوم سے دلی ہمدردی تھی اور جب صدر کیمپ پہنچ کر میں نے یہ سنا کہ ہم لوگوں کا کام زیادہ تر زولو زخمیوں کی تیمارداری کرنا ہے تو مجھے بڑی خوشی ہوئی میڈیکل افسر کو ہمارا آنا بہت غنیمت معلوم ہوا۔ انہوں نے کہا کہ گورے لوگ زولو زخمیوں کی تیمارداری دل سے نہیں کرتے۔ ان غریبوں کے زخموں میں کیرے پڑ گئے ہیں اور میری سمجھ میں نہیں آتا کہ کیا کروں۔ اس نے ہم لوگوں کے پہنچنے کو ان بے گناہوں کے لئے ایک نعمت سمجھا۔ ہمیں پٹیاں، زخم صاف کرنے کی دوائیں وغیرہ دے کر عارضی ہسپتال میں لے گئے زولو میں دیکھ کر بہت خوش ہوئے کور سے سپاہی ہسپتال کے باہر کھڑے جھگڑے کی سلاخوں سے جھانکا کرتے اور ہمیں سمجھاتے کہ ان زخمیوں کی دیکھ بھال نہ کرو۔ جب ہم ان کی باتوں پر توجہ نہ کرتے تو وہ جھلا کر زولو قیدیوں کو بری بری گالیاں دینے لگتے۔

رفتہ رفتہ ان گوروں سے مجھ سے میل جول بڑھ گیا اور انہوں نے میرے کام میں مداخلت ترک کر دی۔ کمانڈنگ افسروں میں کرنل اسپارکس اور کرنل وائلے بھی تھے جنہوں نے 1896ء میں بڑی سختی سے میری مخالفت کی تھی۔ انہیں میرے اس طرز عمل سے بڑی حیرت ہوئی اور انہوں نے خاص طور پر مجھے بلا کر میرا شکریہ ادا کیا۔ انہوں نے مجھے جنرل کمتری سے ملا یا۔ یہ لوگ پیشہ در سپاہی نہیں تھے۔ کرنل وائلے ڈربن کے ایک نامی وکیل تھے۔ کرنل اسپارکس ڈربن کے ایک مشہور گوشت کے کارخانے کے مالک تھے۔ جنرل کمتری کے نٹال میں بہت اچھے فارم تھے۔ یہ حضرات وائینٹرز تھے اور اس حیثیت سے انہوں نے فوجی تربیت اور تجربہ حاصل کیا تھا۔

جو زخمی ہماری نگرانی میں تھے وہ لڑائی میں مجروح نہیں ہوئے تھے۔ ان میں سے بعض شبہ سمجھ کر گرفتار کر لئے گئے تھے اور جنرل نے ان کو کوڑے لگوائے تھے۔ کوڑوں نے ان کے بدن میں گہرے زخم ڈال دیئے تھے اور مرہم پٹی نہ ہونے کے سبب سے زخموں میں کیزے پڑ گئے تھے سبائی و نادار زدلو تھے۔ انہیں دشمن سے ممتاز کرنے کیلئے خاص بلے دے دئے گئے تھے۔ پھر بھی گوروں نے غلطی سے ان پر بندوقیں چلا دی تھیں۔

اس کے علاوہ مجھے گوروں کے ہسپتال میں کمپونڈری بھی کرنا پڑی تھی۔ اس میں مجھے کوئی دقت نہ تھی۔ کیونکہ میں ڈاکٹر بوتھ کے چھوٹے ہسپتال میں ایک سال تک کام کر چکا تھا۔ اس سلسلے میں مجھ سے بہت سے فرنگیوں سے ملاقات ہو گئی۔ ہم لوگ ایک تیز رو دستے کے ساتھ کردئے گئے۔ اسے یہ حکم تھا کہ جس جگہ سے خطرے کی خبر آئی وہاں فوراً پہنچ جائے۔ اس میں زیادہ تر پیدل سپاہی تھے جو جلدی کے خیال سے گھوڑوں پر سفر کرتے تھے۔ جیسے ہی ہمارا کیمپ روانہ ہوتا تھا۔ ہمیں بھی ڈولیاں گندھوں پر رکھ کر پیچھے پیچھے چلنا پڑتا تھا۔ دو تین بار تو ہمیں دن میں چالیس چالیس میل چلنے کا اتفاق ہوا۔ مگر شکر ہے کہ ہم جہاں کہیں بھی جاتے تھے خلق خدا کی خدمت ہی کرتے تھے۔ ہمارا یہ کام تھا کہ جو نادار زدلو غلطی سے زخمی کردئے جائیں انہیں ڈولی میں اٹھا کر لے جائیں اور ان کی دیکھ بھال کریں۔

حوالہ

1 - رضا کاروں کا دستہ ملک کی حفاظت کے لئے

احتساب نفس

زدلو بغاوت کے سلسلے میں ہمیں نئے نئے تجربے ہوئے۔ جنگ بوڑ میں مجھے لڑائی کے خونخاک نتائج کا اتنا اندازہ نہیں ہوا تھا جتنا اس بغاوت میں ہوا یہ نام کو لڑائی تھی مگر اصل میں آدمیوں کا شمار تھا۔ یہ صرف میری ہی رائے نہیں تھی بلکہ بہت سے انگریز جن سے مجھے گفتگو کرنے کا اتفاق ہوا، یہی کہتے تھے، روز صبح اٹھ کر بے گناہوں کی جھونپڑیوں پر رائفلوں کی باڑھ چلتے ستا، جیسے شب برات میں پٹابے چھوٹتے ہوں۔ ہمارے لئے ایک عذاب تھا۔ مگر میں مجبور آہ زہر کے گھونٹ پیتا تھا۔ اس خیال سے تسکین ہو جاتی تھی کہ ہماری کور کا کام صرف زدلو زخمیوں کی خدمت کرنا ہے مجھے معلوم تھا کہ اگر ہم لوگ نہ ہوتے تو غریب زدلو کس مہر کی میں پڑے رہتے۔

لیکن اور بہت سی چیزیں تھیں جن سے غور و فکر اور مشہدہ نفس کی تحریک ہوئی تھی۔ ملک کا یہ حصہ کم کم آباد تھا۔ سیدھی سادی اور ”دھشی“ زدلو قوم کی بستیاں پہاڑیوں اور وادیوں میں دور دور پر واقع تھیں۔ جب میں زخمیوں کو لے کر یا خالی ان سنان رستوں سے جہاں ہنو کا عالم رہتا تھا گزرتا تو اکثر گہرے خیالات میں ڈوب جاتا۔

میں نے ”برہمچاریہ“ بن کے مختلف پہلوؤں پر غور کیا اور میرا عقیدہ اور بھی گہرا ہو گیا۔ میں نے اپنے رفیقوں سے اس بارے میں گفتگو کی۔ مجھے اس وقت تک احساس نہ تھا کہ ”برہمچاریہ“ معرفت نفس کے لئے کس قدر ناگزیر چیز ہے۔ مگر اتنا جانتا تھا کہ جو شخص دل و جان سے اپنے بنی نوع کی خدمت کرنا چاہتا ہے۔ اس کا کام بغیر اس کے کسی طرح نہیں چل سکتا۔ میں نے دیکھا کہ جس قسم کی خدمت میں کر رہا ہوں اس کے موقعے اکثر پیش آئیں گے۔ اور اگر میں گرمست کی زندگی میں مگن رہا تو اپنے فرض سے عہدہ برآ نہ ہو سکوں گا۔

مختصر یہ ہے کہ میں جسم اور روح دونوں کی بندگی ساتھ ساتھ نہیں کر سکتا تھا۔ مثلاً اس زمانے میں اگر میری بیوی حاملہ ہوتی تو میں اس معرکے میں شریک نہ ہو سکتا۔ ”برہمچاریہ“ کے خاندان کی خدمت کا قومی خدمت کے ساتھ جمع ہونا محال تھا۔ ”برہمچاریہ“ کے ہوتے ہوئے اس میں کوئی دشواری نہ تھی۔ اس خیالات نے مجھے قطعی عہد کرنے کے لئے پتہ چل کر دیا۔ اس عہد کے تصور سے روح کو ایک طرح کی بالیدگی محسوس ہونے لگی۔ تخیل کی بلند پروازی خدمت کی نامحدود فضا کے منظر دکھانے لگی۔

ادھر میں اس جسمانی اور ذہنی شفقت میں مبتلا تھا ادھر یہ خبر آئی کہ بغاوت کے فرد کرنے کا کام قریب قریب ختم ہو گیا اور ہم لوگ بہت جلد سبک دوش کر دئے جائیں گے۔ اس کے دو تین دن بعد سبک دوشی کا حکم بھی پہنچ گیا اور ہم سب گھر واپس آ گئے۔

کچھ عرصے کے بعد میرے نام گورنر کا خط آیا جس میں انہوں نے ایسوسی ایشن کو ر کی خدمات کا شکریہ ادا کیا تھا۔

فنیکس پہنچ کر میں نے بڑے شوق سے چھکن لال، مدن لال، ویسٹ اور دوسرے دوستوں سے برہمچاریہ کا ذکر چھیڑا۔ انہیں یہ بات پسند آئی اور انہوں نے تسلیم کر لیا کہ عہد کرنا ضروری ہے مگر اس کی مشکلات کا بھی ذکر کیا کچھ لوگوں نے ہمت کر کے اس پر عمل کرنا شروع کر دیا جن میں بعض کو کامیابی ہوئی۔

میں نے ہر چہ باد و باد کہہ کر عمر بھر کے لئے ”برہمچاریہ“ کا عہد کر لیا مجھے اعتراف ہے کہ میں اس وقت تک اس راہ کی صوبتوں سے پوری طرح واقف نہ تھا۔ آج تک مجھے اس میں دشواریاں پیش آتی ہیں۔ مگر اس کی خوبیاں بھی مجھ پر روز بروز روشن ہوتی جاتی ہیں۔ میرے نزدیک بغیر ”برہمچاریہ“ کے زندگی بے لطف ہے۔ یہ نہ ہو تو انسان حیوان بن جاتا ہے۔ بہائم اپنی فطرت کے تقاضے سے ضبط نفس پر قادر نہیں ہوتے۔ انسان کا جوہر اور انسانیت کا معیار یہی ضبط نفس ہے۔ ہماری مذہبی کتابوں میں ضبط نفس کی جتنی تعریف کی گئی ہے وہ مجھے پہلے مبالغہ آمیز معلوم ہوتی تھی مگر اب روز بروز یہ حقیقت کھلتی جاتی ہے کہ یہ تعلیم حرفِ صحیح اور تجربے پر مبنی ہے۔

میں نے دیکھا کہ ”برہمچاریہ“ جس میں عجیب و غریب قوتیں پنہاں ہیں، کچھ کھیل نہیں ہے اسے محض جسم تک محدود سمجھنا بڑی غلطی ہے۔ اس کی ابتدا بے شک جسمانی خواہشات کے ضبط سے ہوتی ہے مگر انتہا یہ نہیں ہے۔ اس کا کمال یہ ہے کہ ناپاک خواہشوں میں نہ آنے پائے سچے ”برہمچاریہ“ کو

خواب میں بھی جسمانی لذت کا خیال نہیں آتا جب تک انسان اس درجے پر نہ پہنچ جائے وہ منزل سے بہت دور ہے۔

مجھے تو جسمانی ”برہمچاریہ“ میں بھی بڑی دشواریاں پیش آئیں۔ آج میں کہہ سکتا ہوں کہ اس معاملے میں مجھے ایک حد تک اپنے اوپر بھروسہ ہے۔ مگر خیال پر پورا قابو، جو ”برہمچاریہ“ کی جان ہے اب تک حاصل نہیں ہوا۔ میری طرف سے اس ارادے یا کوشش کی کمی نہیں مگر یہ بات اب تک میری سمجھ میں نہیں آئی کہ ناپاک خواہشیں کس رخ سے دبے پاؤں آکر ٹوٹ پڑتی ہیں۔ مجھے یقین ہے کہ انسان کے پاس وہ چیز موجود ہے جس سے بری خواہشوں کا دروازہ بند ہو جاتا ہے۔ مگر اس کی تلاش ہر شخص کو اپنے طور پر کرنا ہے۔ رشتیوں اور عارفوں نے اپنی واردات قلب کے تذکرے ہماری ہدایت کے لئے چھوڑے ہیں لیکن کوئی ایسی تدبیر نہیں بتائی جو ہر موقع پر کام دے۔ اور ہر شخص کے کام آئے۔ روحانی کمال یا عصمت بغیر توفیق ایزدی کے حاصل نہیں ہو سکتی۔ اس لئے طالبان حق ہمیں ”رام نام“ جیسے متر بتائے ہیں جن میں ان کی پاک نفسی اور پاک بازی کا رنگ جھلکتا ہے۔ کامل تسلیم و رضا کے بغیر خیال پر پورا قابو حاصل ہونا محال ہے۔ ہر مذہبی صحیفہ ہی تعلیم دیتا ہے اور مجھے کامل ”برہمچاریہ“ کی کوشش میں ہر لحظہ اس کی تصدیق ہوتی ہے۔

اس جدوجہد اور کشمکش کا ذکر آئیندہ بابوں میں آئے گا۔ یہاں میں صرف یہ کہے دیتا ہوں کہ میں نے ”برہمچاریہ“ کی ابتدا کیونکر کی پہلے پہل کے جوش میں مجھے اس کی پابندی بالکل سہل معلوم ہوئی۔ سب سے پہلی تبدیلی میں نے اپنے طرز زندگی میں یہ کی کہ جس پلنگ پر میری بیوی سوتی تھیں اس پر سونا اور ان سے تنہائی میں ملنا جلنا ترک کر دیا۔

غرض جو ”برہمچاریہ“ میں 1900ء سے جبراً قبراً برت رہا تھا۔ اس پر 1906ء کے وسط میں دائمی عہد کی مہر لگ گئی۔

ستیاگرہ کا آغاز

جوہاسبرگ میں حالات کچھ ایسی صورت اختیار کر رہے تھے کہ میرا یہ تڑکیہ نفس گویا ستیاگرہ کا دیباچہ تھا۔ مجھے اب یہ احساس ہوتا ہے کہ میری زندگی کے خاص خاص واقعات جن میں سب سے اہم ”برہمچاریہ“ کا عہد تھا مجھے درپردہ اس چیز کے لئے تیار کر رہے تھے۔

ستیاگرہ کی تحریک پہلے شروع ہوئی اور یہ نام بعد میں رکھا گیا۔ جب یہ اصول دریافت ہوا تو مجھے اس کے لئے کوئی نام نہیں ملتا تھا۔ ہم لوگ گجراتی میں بھی اس کے لئے انگریزی لفظ Passive resistance (مقاومت مجہول) استعمال کرتے تھے۔ جب مجھے یورڈیوں کے ایک جلسے میں یہ معلوم ہوا کہ passive resistance کے معنی بہت محدود ہیں، یہ کمزوروں کی تلوار سمجھی جاتی ہے، اس میں نفرت کا مفہوم بھی آسکتا ہے اور تشدد کی شکل میں بھی ظاہر ہو سکتی ہے تو مجھے یہ ظاہر کرنے کی ضرورت پڑی کہ ہندوستانی تحریک ان سب چیزوں سے بڑی ہے اور اس کی ماہیت بالکل دوسری ہے ہمیں یہ محسوس ہوا کہ اس جدوجہد کا صحیح مفہوم ادا کرنے کے لئے کوئی نیا لفظ تلاش کرنا ضروری ہے۔

میں نے لاکھ کوشش کی مگر مجھے کوئی نیا نام نہیں سوچا۔ اس لئے میں نے ”انڈین اوپینین“ میں اعلان کیا کہ اس کے پڑھنے والوں میں جو شخص سب سے اچھا نام تجویز کرے گا اسے ایک چھوٹا سا انعام دیا جائے گا۔ چنانچہ مگن لال گاندھی نے ”ست ارادہ (ست حق)۔ آگرہ۔ ہبات کا لفظ وضع کیا مگر میں نے سہولت کے خیال سے اسے بدل کر ”ستیاگرہ“ کر دیا۔ اس وقت سے گجراتی میں اس تحریک کے لئے یہ لفظ استعمال ہوتا ہے۔

اس معرکے کی تاریخ اصل میں سرگزشت ہے میری بقیہ زندگی کی جو میں نے جنوبی افریقہ میں گزاری خصوصاً ان تجربوں کی جو میں نے اس عرصے میں تلاش حق میں کئے اس تاریخ کا بہت بڑا حصہ میں نے یرادو کی جیل میں لکھا اور جو کچھ باقی رہ گیا اسے رہا ہونے کے بعد پورا کر دیا۔ پہلے یہ نوجیون میں نکلتی رہی پھر کتاب کی شکل میں شائع ہو گئی۔ والچی دیسائی اس کا ترجمہ Current (1) brought میں چھاپنے کے لئے کر رہے ہیں۔ مگر میں نے یہ انتظام کیا ہے کہ انگریزی ترجمہ بہت جلد کتاب کی شکل میں شائع ہو جائے تاکہ جن لوگوں کو شوق ہو وہ میرے اہم ترین تجربوں سے، جو میں نے جنوبی افریقہ میں کئے تھے پوری طرح واقف ہو جائیں۔ جن ناظرین کی نظر سے یہ کتاب نہ گزری ہو انہیں میں مشورہ دیتا ہوں کہ یہ کتاب ضرور پڑھیں۔ میں جن واقعات کا ذکر اس میں کر چکا ہوں انہیں یہاں نہیں دہراؤں گا۔ مگر آئیندہ میں 20 اکیس 21 بابوں میں اپنی جنوبی افریقہ کی زندگی کے چند ذاتی واقعات بیان کروں گا جو اس تاریخ میں ترک کردئے گئے ہیں اور اس کے بعد اپنے ہندوستان کے تجربے لکھوں گا۔ اس لئے جو لوگ ان تجربوں کا مطالعہ صحیح تاریخی ترتیب کے ساتھ کرنا چاہیں انہیں مناسب ہے کہ جنوبی افریقہ کی ستیاگرہ کی تاریخ کو پیش نظر رکھیں۔

حوالہ

1 - اس عرصے میں یہ ترجمہ آئیس کنیشن نے "اڑپلیکین" مدراس سے History of satyagraha in south Africa کے نام سے شائع کر دیا ہے۔

غذائیات کے مزید تجربے

میری دلی خواہش تھی کہ خیال، قول اور عمل میں ”برہمچاریہ“ برتوں میں یہ بھی چاہتا تھا کہ اپنے وقت کا زیادہ سے زیادہ حصہ ”ستیگرہ“ کی جدوجہد میں صرف کروں اور اس تیاری کے لئے ضبط نفس بہت ضروری تھا۔ اس لئے مجھے غذا کے معاملے میں اور تبدیلیاں کرنا پڑیں اور مزید احتیاط سے کام لینا پڑا۔ اس سے پہلے جتنی تبدیلیاں ہوئیں وہ زیادہ تر صحت کے خیال سے ہوئی تھیں مگر اب جو تجربے کئے جانے والے تھے ان میں مذہبی مقصد مد نظر تھا۔

اب میری زندگی میں فاقہ اور غذا کی احتیاط نے خاص اہمیت حاصل کر لی۔ انسان کے دل میں اکثر ہوائے نفس اور زبان کی چٹ کا چولی دامن کا ساتھ ہوتا ہے۔ یہی صورت میرے ساتھ بھی تھی مجھے اپنی شہوانی خواہش اور اپنے ذائقے پر قابو پانے میں بڑی بڑی دشواریاں پیش آئیں اور اب بھی میں یہ دعویٰ نہیں کر سکتا کہ میں نے ان دونوں چیزوں کو بالکل مغلوب کر لیا ہے۔ میں اپنے نزدیک بہت زیادہ کھاتا ہوں۔ میرے دوست سمجھتے ہیں کہ میں ضبط نفس سے کام لیتا ہوں لیکن میرا خیال نہیں ہے۔ اگر میں اتنی احتیاط بھی نہ کرتا تو میری زندگی جانوروں سے بدتر ہوتی اور اب تک ٹھکانے لگ چکا ہوتا۔ بہر حال چونکہ مجھے اپنے نقائص اچھی طرح معلوم ہیں میں نے ان سے نجات پانے کی کوشش کی اور اسی کی برکت ہے کہ میں جسم کو اتنے دن گھسیلتا رہا اور تھوڑا بہت کام بھی کر لے گیا۔

مجھے اپنی کمزوری کا احساس تو تھا ہی اتفاق سے کچھ ہم خیال بھی مل گئے اور میں نے یہ معمول کر لیا کہ اکادشی کا دن صرف پھل یا خشک میوہ کھاتا تھا یا بالکل فاقہ کرتا تھا۔ جنم اسٹھی اور دوسری تعطیلوں میں بھی یہی التزام تھا۔

میں نے میوے پر بسر کرنے کی عادت ڈالنا شروع کی مگر ضبط نفس کے اعتبار سے مجھے غلے اور میوے میں کوئی فرق نہیں معلوم ہوا۔ میوہ خوری میں غذا کی مقدار تو کم ہو گئی مگر ذائقے کی لذت اتنی ہی

رہی بلکہ عادت پڑنے کے بعد اور بڑھ گئی۔ تہوار کے دن فاقہ کرنا یا صرف ایک وقت کھانا زیادہ مفید معلوم ہوا۔ اس لئے میں نے اسی کو اختیار کیا۔ اور اگر کفارے وغیرہ کا موقع آتا تھا تو بھی میں فاقہ ہی کرتا تھا۔

مگر اس میں بھی میں نے دیکھا کہ جسم کی رطوبت کم ہو جانے کے سب سے کھانے میں زیادہ مزا آنے لگا اور بھوک بڑھ گئی۔ مجھ پر یہ راز کھل گیا کہ فاقے سے ضبط نفس اور لذت نفس دونوں کا کام لیا جاسکتا ہے۔ خود میرے اور دوسرے لوگوں کے تجربے اس حیرت انگیز کی شہادت دیتے ہیں۔ اس میں شک نہیں کہ میں اپنا جسم بھی بنانا چاہتا تھا۔ مگر اس وقت تو مجھے زیادہ تر ذائقے کو قابو میں لانے کی فکر تھی۔ اس لئے میں برابر غذائیں بدتارہا اور اس کے ساتھ ساتھ مقدار میں بھی کمی کرتا رہا۔ مگر ذائقہ بلا بکر میرے پیچھے پڑ گیا تھا۔ جب میں ایک چیز کو چھوڑ کر دوسری کو اختیار کرتا تھا تو اس میں اور زیادہ مزا آتا تھا۔

ان تجربوں میں میرے کئی ساتھی تھے جن میں ہرمان کیلین باخ خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ میں نے ”جنوبی افریقہ کی ستیاگرہ کی تاریخ“ میں ان کا مفصل ذکر کیا ہے اسے یہاں دہرانے کی ضرورت نہیں، مسز کیلین باخ فاقوں میں اور غذا کے تجربوں میں ہمیشہ میرا ساتھ دیتے تھے۔ ستیاگرہ کے شب کے زمانے میں انہیں کے گھر پر رہتا تھا۔ ہم دونوں اپنی غذا کی تبدیلیوں کے بارے میں گفتگو کیا کرتے اور نئی غذاؤں کے تصور سے زیادہ خوش ہوتے تھے۔ ان دنوں یہ باتیں دل کو بھلی لگتی تھیں اور ان میں کوئی تباہت نظر نہیں آتی تھی مگر تجربے سے معلوم ہوا کہ غذا کے معاملے میں ذائقہ پر زور دینا بڑی غلطی ہے۔ غذا کا مقصد کام و ذہن کی لذت نہیں بلکہ جسم کی بقا ہے۔ اگر ہمارے کلی جو اس ہمیشہ جسم کی اور جسم کے واسطے سے روح کی خدمت میں مصروف رہیں تو ان کی مخصوص لذت باقی نہیں رہتی اور وہ منشاء جس کے لئے فطرت نے انہیں خلق کیا ہے پورا ہو جاتا ہے۔

فطرت سے ہم آہنگی حاصل کرنے کے لئے جتنے تجربے اور قربانیاں کی جائیں کم ہیں۔ مگر افسوس ہے کہ آج کل ایسی گٹکا بہتی ہے ہمیں ذرا شرم نہیں آتی کہ ہم جسم فانی کو سنوارنے اور اس کی زندگی چند لمحہ بڑھانے کے لئے ہزاروں جانوں کا خون کرتے ہیں جس کا نتیجہ ہماری جسمانی اور روحانی ہلاکت ہے۔ ایک بیماری کو دور کرنے کے لئے ہم سیکڑوں نئی بیماریاں مول لیتے ہیں۔ حسی لذت کا لطف اٹھانے کی فکر میں ایک دن لطف اٹھانے کی صلاحیت ہی کھو بیٹھتے ہیں۔ یہ تماشے روزمرہ ہماری آنکھوں کے سامنے ہوتے ہیں لیکن جو دیکھنا نہ چاہے اس سے بڑھ کر اندھا کوئی نہیں۔ غذائیاتی تجربوں کا مقصد اور اصول بتانے کے بعد اب میں ان تجربوں کو کسی قدر تفصیل سے بیان کروں گا۔

کستوری بانی کی ہمت

میری بیوی اپنی زندگی میں تین بار اتنی سخت بیمار ہوئیں کہ مرتے مرتے بچیں ہر بار انہیں گھریلو دواؤں سے فائدہ ہوا۔ پہلا موقع وہ تھا جب ستیاگرہ شروع ہو چکا تھا یا ہونے والا تھا۔ ان پر مرض کا سخت حملہ ہوا۔ خون نکلنے سے بہت سے کمزور ہو گئیں۔ ایک ڈاکٹر دوست نے اپریشن کی رائے دی جس پر وہ کچھ تامل کے بعد راضی ہو گئیں۔ وہ بہت کمزور ہوگی تھیں اس لئے ڈاکٹر کو بے کلوروفارم سنگھائے اپریشن کرنا پڑا۔ اپریشن تو کامیاب ہوا مگر انہیں بڑی سخت اذیت ہوئی۔ انہوں نے ان تکلیفوں کو جس استقلال سے برداشت کیا اسے دیکھ کر حیرت ہوتی تھی۔ ڈاکٹر اور اس کی بیوی نے، جو تیماردار تھیں، ان کی بڑی خدمت کی۔ یہ ڈر بن کا ذکر ہے۔ ڈاکٹر نے مجھے جو ہانسبرگ جانے کی اجازت دے دی اور کہا کہ آپ مریضہ کی طرف سے بالکل اندیشہ نہ کیجئے۔

مگر چند روز میں میرے پاس یہ خط پہنچا کہ کستوری بانی کی حالت اور خراب ہو گئی ہے وہ بستر پر اٹھ کر بیٹھ نہیں سکیں اور ایک بار بے ہوش بھی ہو گئی تھیں۔ ڈاکٹر کو یہ بتا دیا تھا کہ وہ مریضہ کو بغیر میری اجازت کے شراب یا گوشت نہیں دے سکتا۔ اس لئے اس نے مجھے جو ہانسبرگ میں ٹیلیفون کیا اور گائے کے گوشت کی سٹخنی دینے کی اجازت مانگی۔ میں نے جواب دیا کہ ”میں اس کی اجازت نہیں دے سکتا۔ اگر میری بیوی اس قابل ہوں کہ اپنی رائے ظاہر کر سکیں تو ان سے پوچھئے انہیں اختیار ہے جیسے چاہیں کریں“ ڈاکٹر نے جواب دیا ”میں اس معاملہ میں مریضہ سے ہرگز رائے نہیں لوں گا۔ آپ کو خود یہاں آنا چاہئے۔ اگر آپ مجھے یہ آزادی نہیں دیتے کہ جو غذا چاہوں تجویز کروں تو میں آپ کی بیوی کی زندگی کا ذمہ دار نہیں“

میں اسی دن ڈربن پہنچا اور ڈاکٹر سے ملا۔ انہوں نے سہولت سے مجھے یہ افسوسناک خبر سنائی "میں تمہیں ٹیلیفون کرنے سے پہلے ہی مسز گاندھی کو سنبھالنے دے چکا ہوں۔"

میں نے کہا "ڈاکٹر صاحب میرے خود ایک تو یہ دغلابازی ہوئی۔"

اس نے بہت استقلال سے جواب دیا "مریض کے لئے دوا یا غذا تجویز کرنے میں دغلابازی کا کوئی سوال ہی نہیں بلکہ ہمیں تو اگر مریضوں کی جان بچانے کے لئے انہیں یا ان کے رشتے داروں کو دھوکا دینا پڑے تو ہم اسے نیکی سمجھتے ہیں۔"

مجھے بہت دکھ ہو مگر میں نے ضبط سے کام لیا ڈاکٹر بڑا اچھا آدمی تھا اور میرا دست تھا۔ اس نے اور اس کی بیوی نے مجھ پر بڑا احسان کیا تھا لیکن مجھ میں اس کے طبی اخلاق کو برداشت کرنے کی تاب نہ تھی۔

"ڈاکٹر صاحب اب یہ بتائیے کہ آئیندہ آپ کیا صورت اختیار کریں گے۔ مجھے اپنی بیوی کی موت گوارا ہے مگر انہیں گوشت دینا گوارا نہیں۔ ہاں اگر وہ خود چاہیں تو اور بات ہے۔"

آپ کو اپنا فلسفہ مبارک، میں نے تو آپ سے کہہ دیا کہ جب تک آپ کی بیوی میرے علاج میں ہیں مجھے یہ اختیار ہونا چاہئے کہ انہیں جو جی چاہے دوں۔ اگر آپ کو یہ منظور نہیں تو مجھے نہایت افسوس کے ساتھ کہنا پڑے گا کہ آپ انہیں یہاں سے لے جائیے۔ میں انہیں اپنے گھر میں دم توڑتے نہیں دیکھ سکتا۔"

"کیا آپ کا یہ منشاء ہے کہ میں انہیں فوراً لے جاؤں؟"

میں یہ کب کہتا ہوں کہ آپ انہیں لے جائیے، میں تو علاج میں پوری آزادی چاہتا ہوں۔ آپ اس پر راضی ہیں تو میں اور میری بیوی دونوں ان کی خدمت کرنے میں کوئی دھمیکہ نہ اٹھار کھیں گے۔ آپ اطمینان سے اپنے کام پر جائیے مطلق اندیشہ نہ کیجئے لیکن اگر یہ سیدھی بات آپ کی سمجھ میں نہیں آتی تو گویا آپ خود مجھے مجبور کر رہے ہیں کہ آپ کی بیوی کے علاج سے دست بردار ہو جاؤں۔"

مجھے خیال ہے کہ میرا کام میرے ساتھ تھا۔ وہ میری رائے سے بالکل متفق تھا۔ کہ اس کی ماں کو سنبھالنے نہ دی جائے۔ اس کے بعد میں نے خود کستوری بائی سے گفتگو کی۔ سچ پوچھئے تو وہ اتنی کمزور تھیں کہ انہیں اس معاملے میں زحمت دینا مناسب نہ تھا۔ لیکن میں نے اسے اپنا ناگوار فرض سمجھا اور دل کڑا کر کے انہیں اپنی اور ڈاکٹر کی گفتگو سنائی۔ انہوں نے عزم اور استقلال کے ساتھ جواب دیا "میں سنبھالنے نہیں چوں گی دنیا میں انسان کا جنم بار بار نصیب نہیں ہوتا، مجھے آپ کی گود میں مرجانا قبول ہے مگر

اپنے جسم کو ان ناپاک چیزوں سے آلودہ کرنا قبول نہیں۔"

میں نے انہیں بہت سمجھایا کہ اس معاملے میں میری تقلید آپ پر لازم نہیں اور بہت سے ہندو دوستوں کی مثالیں دیں جو گوشت اور شراب دوا کے طور پر استعمال کرنے میں کوئی مضائقہ نہیں سمجھتے۔ مگر ان کے قدم کو لغزش نہ ہوئی۔ انہوں نے کہا۔

"نہیں صاحب۔ خدا کے لئے مجھے اسی دم یہاں سے لے چلے۔"

مجھے بے حد خوش ہوئی۔ کچھ دیر پس و پیش کرنے کے بعد میں نے انہیں لے جانے کا فیصلہ کر لیا۔ میں نے ڈاکٹر کو اپنی بیوی کے ارادے سے مطلع کیا۔ وہ غصے میں چلا اٹھے "اس بے دردی کی کوئی انتہا ہے؟ اس بے چاری کی تو یہ حالت ہے اور آپ نے ان سے اس معاملے کا ذکر کر دیا۔ آپ کو شرم بھی نہیں آئی۔ میں آپ سے کہے دیتا ہوں آپ کی بیوی میں ہرگز یہ طاقت نہیں کہ سفر کر سکیں۔ وہ ذرا سی حرکت بھی برداشت نہیں کر سکتیں۔ کوئی تعجب نہیں کہ رستے ہی میں ان کا خاتمہ ہو جائے۔ آپ اب بھی اس پر مصر ہیں تو آپ کو اختیار ہے۔ اگر آپ انہیں سختی دینے پر راضی نہیں ہوتے تو ایک دن بھی انہیں اپنے یہاں نہیں رکھ سکتا۔ میں اس خطرے کی ذمہ داری اپنے سر کیسے لے لوں؟"

اس لئے ہم نے یہ فیصلہ کر لیا کہ مریضہ کو لے کر فوراً روانہ ہو جائیں۔ اس وقت بوندیں پڑ رہی تھیں اور اسٹیشن کسی قدر دور تھا۔ ہمیں ڈربن سے فنیکس اسٹیشن تک ریل میں جانا تھا اور وہاں سے ہماری بستی سڑک کے رستے سے ڈھائی میل تھی۔ اس میں شک نہیں کہ میں بڑے خطرے کا کام کر رہا تھا مگر میں خدا کے بھروسے پر چل کھڑا ہوا میں نے ایک شخص کو پہلے سے فنیکس روانہ کر دیا اور ویسٹ کو کہلا بھیجا کہ ایک گرم دودھ کی بوتل، ایک پانی کی بوتل، ایک بیار ڈولی اور چھ آدمی اسے اٹھانے کے لئے لے کر اسٹیشن پہنچ جائیں۔ پھر ہم لوگ مریضہ کو اس خطرناک حالت میں ایک رکشہ میں بٹھا کر لے چلے کہ سب سے پہلی گاڑی سے فنیکس روانہ ہو جائیں۔

مجھے کستوری بانی کی دلہہ ہی کرنے کی کوئی ضرورت نہیں پڑی بلکہ الٹی وہ مجھے تسکین دیتی رہیں "میں اچھی طرح پہنچ جاؤں گی۔ آپ بالکل نہ گھبرائیے۔"

انہیں مدت سے غذا نہیں ملی تھی اس لئے ان میں ہڈی چمڑے کے سوا کچھ نہیں رہا تھا۔ اسٹیشن کا پلیٹ فارم بہت بڑا تھا اور رکشہ اندر لے جانے کی اجازت نہ تھی۔ اس لئے گاڑی تک پہنچنے کے لئے کچھ دور پیدل چلنا تھا۔ میں نے مریضہ کو گود میں اٹھا کر ریل کے ڈبے میں پہنچایا۔ فنیکس کے اسٹیشن سے ہم انہیں بیار ڈولی میں لے گئے اور گھر پہنچ کر پانی کا علاج شروع ہوا۔ جس سے ان کے بدن میں رفتہ

رفتہ تھوڑی بہت طاقت آئی۔

فنیکس پہنچنے کے دوسرے دن ہمارے یہاں ایک سوامی جی آئے انہوں نے سنا تھا کہ ہم نے کس عزم و استقلال سے ڈاکٹر کا مشورہ رد کر دیا اور وہ بزرگانہ شفقت سے ہمیں سمجھانے کے لئے آئے تھے۔ جہاں تک مجھے یاد ہے اس وقت میرا منجھلا لڑکا منی لال اور منجھلا رام داس بھی موجود تھا۔ سوامی جی نے اپدیش دیا کہ دھرم کی رو سے گوشت کھانے میں کوئی ہرج نہیں اور منو کے اقوال سند میں پیش کئے مجھے ان کا میری بیوی کے سامنے یہ بحث چھیڑنا ناگوار ہوا لیکن میں احتلا تا خاموش رہا۔ میں منو سمرتی کے ان مقامات سے واقف تھا لیکن میرے عقیدے پر ان کا کوئی اثر نہیں پڑ سکتا تھا اول تو مجھے معلوم تھا کہ بعض لوگ ان عبارتوں کو الجھاتی سمجھتے ہیں دوسرے جو میرے خیالات نباتاتی مشرب کے متعلق تھے۔ وہ مذہبی کتابوں کے پابند نہ تھے۔ کستوری بانی کا عقیدہ بھی بڑا راسخ تھا، وہ مذہبی کتابوں کے سمجھنے سے معذور تھیں مگر ان کے لئے وہ دھرم جو باپ دادا کے وقت سے چلا آتا تھا، کافی تھا۔ بچے بھی اپنے باپ کا کلمہ پڑھتے تھے۔ اس لئے ان میں سامی جی کے اپدیش کا کوئی اثر نہیں ہوا۔ کستوری بانی نے یہ کہہ کر بحث کا خاتمہ کر دیا "سوامی جی آپ کچھ بھی کہیں مجھے تو سخی پی کر اچھا ہونا قبول نہیں۔ خدا کے لئے آپ مجھے حق نے کیجئے۔ آپ کا جی چاہے تو میرے شوہر اور بچوں سے بحث کیجئے۔ مجھے جو فیصلہ کرنا تھا میں کر چکی۔"

گھر کے اندر ستیا گرہ

مجھے جیل جانے کا اتفاق پہلے پہل 1908ء میں ہوا۔ میں نے دیکھا کہ قیدیوں کے لئے جو ضابطے بنائے گئے ہیں ان میں سے بعض ایسے ہیں کہ ہر ”برہمچاری“ یعنی ضبط نفس کے طالب کو اپنی خوشی سے اختیار کرنا چاہیں مثلاً یہ کہ شام کا کھانا غروب آفتاب سے پہلے کھالیا جائے۔ ہندوستانی اور افریقی قیدیوں کو چائے اور کافی کی مانعت تھی۔ کھانے میں وہ چاہیں تو اوپر سے نمک ڈال سکتے تھے۔ مگر محض ذائقے کی خاطر انہیں کوئی چیز نہیں دی جاتی تھی۔ میں نے جیل کے میڈیکل افسر سے درخواست کی کہ ہمیں گرم مسالہ وغیرہ دیا جائے اور نمک کھانا پکتے میں پڑ جایا کرے۔ اس نے جواب دیا ”آپ لوگ یہاں ذائقے کا لطف اٹھانے کے لئے نہیں آئے ہیں، صحت کے اعتبار سے گرم مسالے کی کوئی ضرورت نہیں اور نمک چاہے پکتے میں ڈالا جائے یا اوپر سے ایک ہی بات ہے۔“

آگے چل کر بڑی مشکلوں سے یہ بندشیں کچھ کم ہوئیں مگر اصل میں یہ دونوں قاعدے صحت کے لئے بہت مفید تھے۔ جو سختیاں کسی بیرونی قوت کی طرف سے عائد کی جائیں ان کی پابندی میں بہت کم کامیابی ہوتی ہے لیکن اگر انہیں کو انسان اپنے اوپر خود عائد کرے تو ان دونوں قاعدوں کی پابندی اپنے اوپر لازم کر لی۔ جہاں تک ممکن تھا میں چائے کے استعمال سے پرہیز کرتا تھا اور شام کا کھانا سورج ڈوبنے سے پہلے کھالیتا تھا۔ اب ان دونوں باتوں کی پابندی میں مطلق دقت نہیں ہوتی۔

مگر ایک دقت ایسا آیا کہ مجھے نمک بالکل ترک کر دینا پڑا اور یہ صورت متواتر دس سال تک باقی رہی۔ میں نے نباتاتی مشرب کی بعض کتابوں میں پڑھا تھا کہ نمک غذا کا کوئی جز نہیں ہے بلکہ بے نمک کی غذا صحت کے لئے بہتر ہے۔ میں نے اس سے یہ نتیجہ اخذ کیا کہ برہمچاری کے لئے بھی بے نمک کی غذا مفید ہے۔ میں نے یہ بھی پڑھا تھا کہ جو لوگ کمزور ہیں انہیں ہر قسم کی دال سے پرہیز کرنا چاہئے اور یہ

بات سمجھ میں بھی آتی تھی۔ مجھے دال کا بہت شوق تھا۔

اتفاق سے کستوری بائی کچھ دن کے افاقے کے بعد پھر گر گئیں اور خون پھر آنے لگا۔ محض پانی کے علاج سے کام چلتا نظر نہیں آتا تھا۔ انہیں میری تدبیروں پر عقیدہ نہیں تھا مگر انہوں نے اس پر عمل کرنے میں کبھی عذر نہیں کیا اور بیرونی علاج کی خواہش ظاہر نہیں کی۔ جب میری کوئی تدبیر نہیں چلی تو میں نے ان سے بڑی منت سے کہا کہ نمک اور دال کھانا چھوڑ دیجئے۔ میں نے انہیں بہت کچھ سمجھایا اور بڑی بڑی دلیلیں پیش کیں مگر وہ کسی طرح نہ مانیں آخر انہوں نے مجھ سے کہا کہ اگر آپ کو ان چیزوں کی ممانعت کی جاتی تو آپ سے بھی نہ چھوٹ سکتیں مجھے اس بات سے تکلیف ہوئی مگر اسی کے ساتھ یہ خوشی تھی کہ مجھے اپنی محبت کے اظہار کا موقع مل گیا میں نے ان سے کہا ”آپ کا خیال غلط ہے۔ اگر ڈاکٹر مجھے مشورہ دیتا کہ ان چیزوں کو یا کسی اور چیز کو چھوڑ دو تو میں بے تامل چھوڑ دیتا۔ اچھیوں کسی کہ میں بغیر طبی مشورے کے خود ہی نمک اور دال ایک سال کے لے چھوڑتا ہوں چاہے آپ چھوڑیں یا نہ چھوڑیں۔“

ان کے دل پر بڑا دھچکا لگا اور وہ کہ بھری آواز میں چلا انھیں ”خدا کے لئے میری خطا معاف کیجئے، میں آپ کی طبیعت سے واقف ہوں اس لئے مجھے مناسب نہ تھا کہ آپ کو یوں غصہ دلائی۔ میں وعدہ کرتی ہوں کہ ان چیزوں کو چھوڑ دوں گی مگر آپ اللہ اپنا عہد واپس لے لیجئے۔ یہ مجھ سے نہیں دیکھا جائے گا۔“ آپ کے لئے ان چیزوں کا ترک کرنا بہت مفید ہے مجھے پورا یقین ہے کہ آپ کی صحت پر اس کا بہت اچھا اثر پڑے گا۔ رہا میں سو میں ایک ایسے عہد کو جو میں نے سمجھ بوجھ کر کیا ہے واپس نہیں لے سکتا اور اس میں میری بھلائی بھی ہے۔ کیونکہ ضبط نفس، خواہ کسی نیت سے کیا جائے انسان کے لئے ہمیشہ مفید ہوتا ہے۔ اس لئے آپ مجھے میرے حال پر چھوڑ دیجئے میرے لئے یہ عہد اطلاق امتحان کا کام دے گا اور آپ کو بھی میرے سبب سے بہار رہے گا۔

وہ میری طرف سے مایوس ہو گئیں۔ انہوں نے کہا ”آپ بڑے ضدی ہیں کوئی سرٹیک کر مر جائے مگر آپ نہ مانیں گے“ اور رورو کر اپنے دل کی بھرا اس نکالی۔ میں اس واقعے کو ستیارہ کی ایک مثال سمجھتا ہوں اور یہ ان باتوں میں سے ہے جنہیں یاد کر کے مجھے بڑی خوشی ہوتی ہے۔

اس کے بعد کستوری بائی کی طبیعت روز بروز سنہلنے لگی۔ اب خدا جانے یہ دال اور مسالے کی ترک اور غذا اور تہہ بیلوں کا کرشمہ تھا۔ یاد دوسری چیزوں میں زیادہ احتیاط کرنے کا اثر تھا یا اس بہیدگی کی

برکت تھی جو مریضہ کی طبیعت کو اس عہد سے حاصل ہوئی مگر یہ واقعہ ہے کہ انہیں بہت جلد صحت ہونے لگی۔ خون بالکل بند ہو گیا اور میری شہرت عطائی کی حیثیت سے بہت بڑھ گئی۔

مجھے بھی اس نئے ترک لذات سے فائدہ ہوا۔ میں نے جو چیزیں چھوڑی تھیں ان کی کبھی خواہش نہیں ہوئی۔ ایک سال بت کی بت میں گزر گیا اور مجھے اپنے تو اس پر پہلے سے زیادہ قابو حاصل ہو گیا۔ اس تجربے سے ضبط نفس کا رجحان اور بڑھ گیا اور میں نے ان چیزوں کو ہندوستان آنے کے بہت دن بعد تک استعمال نہیں کیا۔ اس عرصے میں صرف ایک بار 1914ء میں لندن کے قیام کے زمانے میں ان دونوں چیزوں کے استعمال کا اتفاق ہوا۔ یہ میں آگے چل کر بیان کروں گا کہ یہ کون سا موقع تھا اور ہندوستان پہنچنے کے بعد میں نے ان دونوں کا استعمال کیوں شروع کر دیا؟

میں نے جنوبی افریقہ میں بے نمک اور بے دال کی غذا کا تجربہ اپنے بہت سے رفیقوں پر کیا اور اس میں بڑی کامیابی ہوئی۔ طبی نقطہ نظر سے ممکن ہے اس غذا کے متعلق اختلاف ہو مگر اخلاقی اعتبار سے مجھے پورا یقین ہے کہ ہر طرح کے ضبط نفس سے روح کو فائدہ پہنچتا ہے۔ جس طرح ضبط نفس کرنے والے کی زندگی عیش پرست کی زندگی سے مختلف ہوتی ہے اسی طرح ان دونوں کی غذا بھی مختلف ہونا چاہئے۔ ”برہمچاریہ“ کے طالب اکثر وہ عادی ہیں اختیار کر کے جو عیش پرستوں کے لئے موزوں ہیں اپنا کام بگاڑ لیتے ہیں۔

ضبط نفس کی کوشش

میں پچھلے باب میں کہہ چکا ہوں کہ کستوری بانی کی بیماری کے سلسلے میں مجھے اپنی غذا میں کچھ تبدیلیاں کرنا پڑیں۔ اس کے بعد ”برہمچاریہ“ کی خاطر مزید تبدیلیاں ہوئیں۔

سب سے پہلے میں نے دودھ کا استعمال چھوڑا یہ نکتہ مجھے رائے چندر بھائی نے بتایا تھا کہ وہ دودھ سے شہوانی جذبے کو تسکین ہوتی ہے نباتاتی مشرب کی کتابیں پڑھنے سے اس خیال کو اور تقویت ہوئی لیکن جب تک میں نے ”برہمچاریہ“ کا عہد نہیں کیا تھا دودھ ترک کرنے کی ہمت نہیں پڑتی تھی۔ مجھ پر بہت دن سے یہ بات روشن ہو گئی تھی کہ دودھ جسم کی پرورش کے لئے ضروری نہیں لیکن اس کا ترک کرنا سہل نہ تھا۔ اب مجھے ضبط نفس کی خاطر دودھ ترک کرنے کی ضرورت روز بروز زیادہ محسوس ہو رہی تھی۔ اس زمانے میں کچھ رسالے کلکتے کے چھپے ہوئے میری نظر سے گزرے جن میں یہ دکھایا گیا تھا کہ گائے بھینس پالنے والے ان بے زبان جانوروں پر کتنا ظلم کرتے ہیں ان کے مطالعہ کا مجھ پر بہت اثر ہوا میں نے مسز کیلن باخ سے اس معاملے کی متعلق گفتگو کی۔

اگرچہ میں نے مسز کیلن باخ کا حال ”جنوبی افریقہ کے ستیاگرہ کی تاریخ“ میں تفصیل کے ساتھ لکھا ہے اور اس کتاب میں بھی جابجا ان کا نام لیا ہے پھر بھی یہ مناسب معلوم ہوتا ہے کہ یہاں اس کا تھوڑا سا ذکر کروں ان سے میری ملاقات محض اتفاق سے ہو گئی۔ وہ خان صاحب کے دوست تھے۔ خان صاحب کو ان کے دل کی گہرائی میں فکر آخرت کی جھلک نظر آئی۔ اس لئے انہوں نے ان کا تعارف مجھ سے کرا دیا۔

جب میں ان سے ملا تو ان کی عشرت پسندی اور پر تکلف زندگی دیکھ کر مجھے بڑی حیرت ہوئی لیکن پہلی ہی ملاقات میں انہوں نے مجھ سے کرید کرید کر مذہب کے متعلق بہت سی باتیں پوچھیں۔ اسی ضمن

میں گوتم بدھ کے ترک تعلق کا بھی ذکر آیا۔ رفتہ رفتہ ہم دونوں میں بڑی گہری دوستی ہو گئی۔ یہاں تک کہ ہمارے خیالات بالکل ایک سے ہو گئے اور ان کے دل میں یہ بات پیٹھ گئی کہ انہیں بھی اپنی زندگی میں وہی تبدیلیاں کرنا چاہئے جو میں نے کی تھیں۔

اس وقت تک ان کی شادی نہیں ہوئی تھی اس پر بھی وہ مکان کے کرائے کے علاوہ اپنی ذات پر بارہ سو روپے خرچ کرتے تھے۔ اب انہوں نے اتنی سادگی اختیار کر لی کہ ان کا خرچ صرف ایک سو بیس روپیہ رہ گیا۔ میں جو ہانسبرگ سے اپنا گھر بار تو اٹھا ہی چکا تھا۔ اس لئے جیل سے رہا ہو کر آیا تو انہیں کے ساتھ رہنے لگا ہم دونوں غاصی جفاکشی کی زندگی بسر کرتے تھے۔

اسی زمانے میں مجھ سے ان سے دودھ کے بارے میں گفتگو ہوا کرتی تھی۔ ایک دن انہوں نے مجھ سے کہا ”ہم آپ ہمیشہ دودھ کے مضر اثرات کا ذکر کیا کرتے ہیں آخر اسے چھوڑ ہی کیوں نہ دیں؟ یقیناً یہ ایسی ضروری چیز نہیں ہے کہ اس کے بغیر کام نہ چلے ان کے منہ سے یہ بات سن کر مجھے تعجب بھی ہوا اور خوشی بھی ہوئی۔ میں نے بڑی گرجوشی سے یہ تجویز قبول کی اور ہم دونوں نے اسی وقت دودھ ترک کر دینے کا عہد کر لیا یہ واقعہ 1912ء میں ٹالسٹائی فارم میں پیش آیا۔

مگر مجھے محض دودھ ترک کر دینے سے تسکین نہیں ہوئی۔ اس کے تھوڑے ہی دن کے بعد میں نے یہ فیصلہ کیا کہ صرف پھل اور خشک میوے کھایا کروں گا۔ اور وہ بھی ایسے تھے جو سب میں سستے ہوں۔ ہماری آرزو تھی کہ غریب سے غریب لوگ جیسی زندگی بسر کرتے ہیں ویسی ہم بھی کریں۔ اس غذا میں آسانی بھی بہت تھی پکانے کا جھگڑا ہی نہیں رہا کچھ مونگ پھلی کیلے کھجوریں، لیو، زیتون کا تیل یہ ہماری معمولی غذا تھی۔

یہاں میں ”برہمچاریہ“ کے طالبوں کو ایک ضروری بات سے آگاہ کر دینا چاہتا ہوں۔ اگرچہ میرے نزدیک غذا کا ”برہمچاریہ“ سے بہت گہرا تعلق ہے لیکن اصل چیز دل ہے جو شخص جان بوجھ کر ناپاک خیالات دل میں رکھتا ہے اس کا تزکیہ نفس فانی سے نہیں ہو سکتا۔ غذا کی تبدیلیوں کا اس پر کوئی اثر نہیں پڑتا۔ دل کی عیاشی کا علاج سوائے اس کے کچھ نہیں کہ انسان سختی سے اپنے نفس کا احتساب کر لے اور خدا کے سامنے عاجزی سے سر جھکا دے۔ اگر اس کی توفیق شامل حال ہوئی تو نجات ممکن ہے مگر دل و دماغ میں اور جسم میں بڑا گہرا تعلق ہے اور لذت پرستوں کا دل ہمیشہ عیش و عشرت کی ہوس میں بہلا رہتا ہے۔ اس لذت کو کم کرنے کے لئے غذا کی احتیاط اور فاقہ ضروری ہے۔ لذت پرست دل خواں پر حکومت کرنے کی جگہ ان کا محکوم بن جاتا ہے۔ اس لئے جسم کو ہمیشہ پاک صاف متحرک غذا کی

اور کبھی کبھی فائقے کی ضرورت ہوتی ہے۔

وہ لوگ بھی غلطی پر ہیں جو غذا کی پابندیوں اور فائقے کو بالکل بیکار جانتے ہیں اور وہ بھی جو اسی کو سب کچھ سمجھے ہیں۔ مجھے تجربے سے معلوم ہوا ہے کہ جن لوگوں کے دل میں ضبط نفس کی لگن ہوتی ہے انہیں غذا کی پابندیوں اور فائقے سے بڑی مدد ملتی ہے۔ بلکہ سچ تو یہ ہے کہ بغیر ان چیزوں کے دل سے شہوانی خیالات کسی طرح دور نہیں ہوتے۔

فاقہ

جن دنوں میں نے دودھ اور دال کو ترک کر کے خشک و ترمیوہ کھانے کا تجربہ شروع کیا اسی زمانے میں ضبط نفس کے لئے فاقے بھی کرنے لگا۔ اس میں بھی مسٹر کیلن باخ میرے ساتھ شریک تھے میں اس سے پہلے بھی کبھی کبھی فاقہ کرتا تھا مگر محض صحت کے خیال سے یہ بات مجھے ایک دوست سے معلوم ہوئی کہ فاقہ ضبط نفس کے لئے بھی ضروری ہے۔

چونکہ میں دیشنو خاندان میں پیدا ہوا تھا اور میری ماں کو طرح طرح کے کٹھن عہد کرنے کی عادت تھی اس لئے میں جب تک ہندوستان میں رہا۔ اکاوشی اور دوسرے تہواروں میں برت رکھتا تھا۔ مگر یہ محض والدین کی تقلید اور انہیں خوش کرنے کی کوشش تھی۔

اس زمانے میں نہ مجھے فاقے کی خوبیاں معلوم تھیں اور نہ اس پر عقیدہ تھا لیکن جن دوست کا میں نے ذکر کیا ہے انہیں فاقے سے فائدہ پہنچتے دیکھا تو میں نے بھی اکاوشی کے دن برت رکھنا شروع کر دیا کہ اس سے ”برہمچاریہ“ کا عہد نبھانے میں مدد ملے گی۔ عموماً ہندو لوگ برت میں پھل اور دودھ کا استعمال جائز سمجھتے ہیں مگر ایسے برت (1) تو میں روز ہی رکھتا تھا اس لئے اب میں پورا فاقہ کرنے لگا۔ یعنی صرف پانی پیتا تھا کچھ کھانا نہ تھا۔

جب میں نے یہ تجربہ شروع کیا تو اتفاق سے ہندوؤں کے سادوں اور مسلمانوں کے رمضان کے ساتھ ہو گیا۔ گاندھی خاندان، دیشنو سماج اور شو سماج دونوں کے تہوار مناتا تھا اور دیشنو مندر اور شوالے دونوں میں پوجا کرتا تھا۔ خاندان کے بعض افراد سادوں کے پورے مہینے میں ”پراوشہ“ رکھتے تھے۔ میں نے یہ طے کیا کہ میں بھی یہی کروں گا۔

یہ تجربے اس زمانے میں کئے گئے جب میں اور مسٹر کیلن باخ اور چند ستیاگرھی خاندان اپنے

بچوں سمیت نائلسٹی فارم میں رہتے تھے۔ ان بچوں کے لئے ہم نے ایک مدرسہ قائم کیا تھا۔ ان میں چار پانچ مسلمان لڑکے بھی تھے۔ میں انہیں اس کا شوق دلاتا تھا کہ اپنے مذہبی فرائض ادا کرتے رہیں اور اس طرح میں ان کی ہر طرح مدد کرتا تھا۔ خصوصاً نماز کے لئے میری بڑی تاکید کی تھی۔ چند پارسی اور عیسائی لڑکے بھی تھے۔ انہیں بھی میں ان کے مذہبی رسوم کی پابندی پر راغب کرنا اپنا فرض سمجھتا تھا۔

اس لئے میں نے رمضان میں مسلمان لڑکوں سے روزے رکھوائے۔ میں تو خود "پرادوشہ" کا ارادہ ہی کر چکا تھا۔ ہندو، پارسی، عیسائی لڑکوں کو بھی میں نے ساتھ دینے پر آمادہ کر لیا۔ میں نے انہیں سمجھایا کہ ایسے عمل میں جو ضبط نفس کی خاطر کیا جائے دوسرے کے ساتھ شرکت کرنا ہمیشہ اچھا ہوتا ہے۔ فارم کے رہنے والوں میں سے بہتوں کو میری تجویز پسند آئی۔ ہندو اور پارسی لڑکے ہر ذرا ذرا سی بات میں مسلمان لڑکوں کی تقلید نہیں کرتے تھے اور نہ اس کی ضرورت تھی مسلمان لڑکے روزہ افطار کرنے کے لئے غروب آفتاب کے منتظر رہتے تھے مگر دوسرے کچھ پہلے سے کھاپنی لیتے تھے تاکہ اپنے مسلمان دوستوں کو اچھے اچھے کھانے پکا کر کھلا سکیں سحری میں بھی اور لڑکے مسلمان لڑکوں کے ساتھ شریک نہیں ہوتے تھے اور ان کی طرح پانی ترک کرتے تھے۔

ان تجربوں کا نتیجہ یہ ہوا کہ لڑکوں کو روزے کی خوبیوں کا احساس ہو گیا اور ان میں فتنہ رفتہ برادرانہ غلوں اور محبت کی روح سرایت کر گئی۔

ہم سب لوگ جو نائلسٹی کے فارم میں رہتے تھے اس کی وجہ سچ پوچھے تو یہ تھی کہ سب لوگوں کو میرے احساسات کی رعایت منظور تھی جس کا میں تہہ دل سے شکر گزار ہوں مسلمان لڑکوں کو رمضان میں گوشت نہ ملنے سے یقیناً تکلیف ہوتی ہوگی مگر انہوں نے کبھی اس کا اظہار نہیں کیا وہ بڑے شوق سے دال ترکاری کھاتے تھے اور ہندو لڑکے انہیں اکثر مزے مزے کی چیزیں جو فارم کی سادہ زندگی کے مناسب حال ہوتی تھیں۔ پکا کر کھلا یا کرتے تھے۔

میں نے سچ میں یہ ذکر خاص کر کے چھیڑا ہے۔ کیونکہ ان واقعات کو جن کی یاد میرے لئے بڑی خوش گوار ہے کہیں اور بیان کرنے کا موقع نہ تھا۔ اس ضمن میں میری یہ خصوصیت بھی ظاہر ہو گئی ہے کہ مجھے جو بات اچھی معلوم ہوتی ہے اس میں اپنے رفیقوں کو بھی شریک کر لیتا ہوں۔ ان لوگوں کو فاتحہ کی عادت نہ تھی مگر "پرادوشہ" اور رمضان کے روزوں کی بدولت انہیں یہ محسوس ہو گیا کہ فاتحہ ضبط نفس کے لئے کس قدر مفید ہے۔

اس طرح فارم میں خود بخود ضبط نفس کی فضا پیدا ہو گئی۔ رفتہ رفتہ فارم کے اور رہنے والے بھی

ہمارے ساتھ ادھورے پور پورے فاقے کرنے لگے جو ان کے لئے یقیناً سراسر مفید تھے۔ میں وثوق کے ساتھ نہیں کہہ سکتا کہ اس طرح کے ترک لذات سے ان کے دل پر کہاں تک اثر ہوا اور انہیں جو اس پر قابو پانے میں کس حد تک کامیابی ہوئی۔ البتہ اپنی نسبت مجھے یقین ہے کہ اس سے بے حد جسمانی اور اخلاقی فائدہ پہنچا۔ اس سے میرا یہ مطلب نہیں کہ فاقہ اور اس قسم کی اور ریاضتوں کا اثر سب پر یکساں ہوتا ہے۔

فاقہ حیوانی جذبات کو دبانے میں صرف اسی صورت میں مفید ہے جب یہ ضبط نفس کی خاطر کیا جائے۔ میرے بعض دوستوں کا تو یہ تجربہ ہے کہ فاقے کے بعد حیوانی جذبات اور بھوک اٹھے اور ذائقے کی قوت اور تیز ہو گئی۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ اگر فاقے کے ساتھ ضبط نفس کا خیال نہ رکھا جائے تو اس سے بالکل کام نہیں چلتا۔ یہ محض خام خیالی ہے کہ اکیلا فاقہ ضبط نفس میں مدد دیتا ہے۔ یہ مضمون جگود گیتا کے دوسرے باب کے مشہور اشلوک میں بہت خوبی سے ادا کیا گیا ہے۔

جو شخص صرف ظاہری لذتوں کو ترک کرتا ہے۔

اس کے دل سے مخصوص چیزوں کا خیال دور ہو جاتا ہے۔

آرزو کی غلش نہیں جاتی تو یہ کھٹک بھی نہیں رہتی

غرض فاقہ اور اس قسم کی دوسری ریاضتیں محض ضبط نفس کا ذریعہ ہیں اور بجائے خود کافی نہیں۔ اگر جسمانی فاقے کے ساتھ ساتھ ضبط نفس کا فاقہ نہ ہو تو اس کا انجام ریا کاری اور ہلاکت ہے۔

حوالہ

1- صبح سے شام تک کا برت۔

معلم کی حیثیت سے

یہ ملحوظ خاطر رہے کہ میں ان بابوں میں ان باتوں کو بیان کر رہا ہوں جن کا ذکر ”جنوبی افریقہ کے ستیاگرہ کی تاریخ میں نہیں آیا یا آیا ہے تو محض سرسری طور پر اس سے پچھلے بابوں کا سلسلہ سمجھ میں آجائے گا۔

جب ہمارے فارم کے رہنے والوں کی تعداد بڑھنے لگی تو اس کی ضرورت پڑی کہ ان کے لڑکے لڑکیوں کی تعلیم کا کوئی انتظام کیا جائے۔ ان میں ہندوستانی پارسی، عیسائی لڑکے تھے۔ اور چند ہندو لڑکیاں تھیں۔ ان کے لئے خاص معلم رکھنا ممکن بھی نہ تھا اور میں نے اسے ضروری بھی نہیں سمجھا۔ مشکل یہ تھی کہ قابل ہندوستانی معلم بہت کم تھے اور ان میں سے کسی کو کم تنخواہ پر جوہانسبرگ سے اکیس میل دور جا کر رہنا مستکور نہیں تھا۔ ادھر ہم لوگوں کے یہاں روپے کا توڑا تھا۔ میرے خیال میں باہر سے معلم بلانے کی کوئی ضرورت نہیں تھی۔ میں مردوجہ طریقہ تعلیم کا قائل نہیں تھا اور چاہتا تھا کہ تجربے اور مشاہدے سے صحیح معلوم کروں یہ مجھے یقین تھا کہ کامل نظام معاشرت میں بچوں کو سچی تعلیم والدین ہی سے مل سکتی ہے اور اس صورت میں بیرونی امداد جتنی کم لی جائے اچھا ہے مثال کا فارم ایک خاندان کی حیثیت رکھتا تھا جس میں میں بمنزلہ باپ کے تھا۔ اس لئے یہ مناسب معلوم ہوا کہ جہاں تک ہو سکے بچوں کی تعلیم و تربیت کی ذمہ داری مجھ پر ہے۔

اس میں شک نہیں کہ تجویز بھی ناقص سے خالی نہیں تھی۔ میرا اور ان سب لڑکے لڑکیوں کا بچپن سے ساتھ نہیں رہا تھا۔ ان کی تربیت جداگانہ حالات اور مختلف ماحول میں ہوئی تھی اور ان کے مذہبی عقائد بھی مختلف تھے سوال یہ تھا کہ ایسی صورت میں افسر خاندان بن کر ان بچوں کی تعلیم کا فرض کماحقہ

کیونکر ادا کر سکتا ہوں۔

مگر میں تعلیم میں تہذیب نفس اور تعمیر سیرت کو سب سے مقدم سمجھتا تھا اور مجھے یہ اطمینان تھا کہ اخلاقی تربیت سب بچوں کو خواہ وہ کسی عمر اور کسی خاندان کے ہوں یکساں دی جاسکتی ہے۔ اس لئے میں نے یہ فیصلہ کیا کہ میں دن رات ان بچوں کے ساتھ رہوں گا اور پدرانہ شفقت سے ان کی تربیت کی نگرانی کروں گا۔ میرے نزدیک تعمیر سیرت تعلیم کی بنیاد ہے اس لئے مجھے یقین تھا کہ اگر بنیاد اچھی پڑگئی تو اور سب باتیں یہ بچے خود بخود یاد دستوں کی مدد سے سیکھ لیں گے۔

پھر بھی مجھے یہ احساس تھا کہ اس کے علاوہ کتابی تعلیم بھی ضروری ہے اس لئے میں نے مسٹر کیلین باخ اور پراگ جی دیسائی کی مدد سے درس کا سلسلہ شروع کر دیا جسٹانی تربیت کی طرف سے بھی میں غافل نہیں تھا۔ ان بچوں کی روزمرہ کے کام میں کافی ورزش ہو جاتی تھی ہمارے فارم میں نوکر تو تھے نہیں اس لئے باورجی سے لے کر مہتر تک کا کام بھی کافی تھا۔ مسٹر کیلین باخ کو باغبانی کا بہت شوق تھا اور انہوں نے ایک سرکاری ماڈل گارڈن میں اس کا تجربہ حاصل کیا تھا۔ سوائے ان لوگوں کے جو باورجی خانے میں کام کرتے تھے اور سب چھوٹے بڑوں کے لئے کچھ دیر باغبانی کا کام کرنا لازمی تھا۔ اس کا بہت بڑا حصہ بچے انجام دیتے تھے۔ وہی گڑھے کھودتے، لکڑی کاٹتے، بوجھ اٹھاتے ان میں انہیں اچھی خاصی ورزش ہو جاتی۔ یہ کام انہیں دل سے پسند تھا اس لئے عموماً کسی اور ورزش یا کھیل کی ضرورت نہیں پڑتی تھی ان میں سے بعض اور کبھی کبھی سب بیماری کے بہانے سے کبھی کبھی کام سے جی بھی چراتے تھے بعض اوقات میں ان کی حرکتوں سے چشم پوشی کرتا تھا مگر اکثر سختی سے پیش آتا تھا وہ اس سختی کو پسند نہیں کرتے ہوں گے مگر مجھے یاد نہیں کہ انہوں نے کبھی مزاحمت کی ہو۔ جب ایسی ضرورت پیش آتی تو میں انہیں دیلیوں سے سمجھاتا کہ کام کو ٹاننا اچھا نہیں۔ وہ قائل ہو جاتے مگر تھوڑی دیر کے لئے دم بھر میں پھر کام چھوڑ کر بھاگ جاتے اور کھیلنے لگتے بہر حال کسی نہ کسی طرح کام چلتا رہا اور ان کے جسم ایسے بن گئے کہ دیکھنے کے قابل تھے فارم میں بیماری کا نام تک نہ تھا۔ مگر اس میں سچ پوچھے تو آب و ہوا کی فوری اور کھانے پینے کے اوقات کی پابندی کو بھی بہت دخل تھا۔

اسی سلسلے میں پیسے کی تعلیم کا بھی ذکر کر دوں۔ ہمارا ارادہ تھا کہ ہر لڑکے کو کوئی نہ کوئی مفید دستکاری سکھائیں۔ اسی غرض سے مسٹر کیلین باخ ایک ٹریسٹ خانگاہ میں جا کر جو تانبنا سیکھ آئے میں نے ان سے یہ ہنر سیکھا اور جو لوگ سیکھنا چاہتے تھے انہیں سکھایا مسٹر کیلین باخ تھوڑی بہت بخاری بھی جانتے تھے اور ہماری ایک اور رفیق اس کے ماہر تھے۔ اس لئے ایک چھوٹا بخاری کا کلاس بھی

کھول دیا گیا۔ کھانا پکانا قریب قریب سب لڑکوں کو آتا تھا۔

یہ سب چیزیں ان کے لئے نئی تھیں انہیں سان گمان بھی نہ تھا کہ ایک دن انہیں یہ سیکھنا پڑیں گی۔ کیونکہ جنوبی افریقہ میں بچوں کو صرف لکھنا پڑھنا اور حساب کتاب سکھایا جاتا تھا۔

ٹالسٹائے فارم میں ہم نے یہ قاعدہ مقرر کر دیا تھا کہ معلم جو کام خود نہ کرتے ہوں لڑکوں سے نہ کرائیں۔ جب کبھی لڑکوں کو کوئی کام دیا جاتا تھا تو ہمیشہ کوئی معلم ان کے ساتھ رہتا اور ان کا ہاتھ بناتا۔ اس لئے انہیں جو کچھ سکھایا جاتا خوشی سے سیکھتے

کتابی تعلیم اور تعمیر سیرت کا ذکر آئیندہ بابوں میں آئے گا۔

ادبی تعلیم

چھلے باب میں یہ دکھایا جا چکا ہے کہ ہم نے نالسٹائی فارم میں جسمانی تربیت کا اور اسی ضمن میں پیشے کی تعلیم کا کیا انتظام کیا تھا۔ اگرچہ میں اس انتظام سے پوری طرح مطمئن نہ تھا مگر پھر بھی کہا جاسکتا ہے کہ اس میں کم و بیش کامیابی ہوئی۔

مگر ادبی تعلیم کا معاملہ اس سے مشکل تھا۔ نہ تو میرے پاس ضروری سامان تھا نہ مجھے زبانیں اچھی طرح آتی تھیں اور نہ اتنی فرصت تھی کہ ان کا سب داخواہ مطالعہ کر سکوں۔ دن بھر جسمانی مشقت کرنے کے بعد میں شام کو تھک کر چور ہو جاتا تھا اور مجھے آرام کی ضرورت ہوتی تھی۔ عین اس وقت لڑکے میرے پاس پڑھنے کے لئے آتے تھے پڑھانے کے لئے انسان کو تازہ دم ہونا چاہئے۔ یہاں اسی کے لئے بڑی کوشش کرنا پڑتی تھی کہ آنکھیں کھلی رہیں نیند نہ آجائے۔ صبح کا وقت فارم کے اور گھر کے کام میں صرف ہوتا تھا اور اسکول کی پڑھائی دوپہر کے کھانے کے بعد شروع ہو تھی اور کوئی مناسب وقت تھا ہی نہیں۔

اس تعلیم کے لئے تین گھنٹے سے زیادہ وقت نہیں رکھا جاسکتا تھا۔ ہندی، تامل، گجراتی، اردو، یہ سب زبانیں پڑھائی جاتی تھیں اور ہر لڑکے کو کل تعلیم اس کی مادری زبان کے ذریعے سے دی جاتی تھی۔ انگریزی تھوڑی سی تاریخ، جغرافیہ اور حساب بھی سب کے لئے لازمی تھا۔ گجراتی ہندو لڑکوں کو کسی قدر سنسکرت سیکھنا پڑتی تھی۔

میں تامل اور اردو پڑھا تھا تامل میں نے جو کچھ سیکھی سفر اور جیل میں سیکھی تھی۔ میری ساری کائنات پوپ کی مشہور کتاب ”معلم تامل“ تھی اور اردو رسم الخط میں نے ایک سفر میں تھوڑا بہت سیکھا تھا اور زبان میں میری معلومات ان عربی فارسی الفاظ تک محدود تھی جو مسلمان دوستوں کی صحبت

میں سنے تھے۔ سنسکرت میں اس سے زیادہ نہیں جانتا تھا جتنی ہائی اسکول میں پڑھی تھی بلکہ گجراتی کا بھی یہی حال تھا۔

میری ساری پونجی یہ تھی اور اسی سے مجھے کام چلانا تھا۔ میرے رفیق مجھ سے بھی زیادہ۔ مایہ تھے۔ لیکن مجھے اپنے ملک کی زبانوں سے محبت تھی اور اپنی معلمانہ صلاحیت پر اعتماد تھا۔ پھر میرے شاگردوں کی جہالت اور اس سے بھی بڑھ کر ان کی خطا پوشی میرے کام آئی۔

جو تامل لڑکے ہمارے اسکول میں تھے ان سب کی پیدائش جنوبی افریقہ کی تھی اس لئے وہ اپنی زبان بہت کم جانتے تھے اور رسم الخط سے تو بالکل واقف نہ تھے۔ اس لئے میں انہیں تامل رسم الخط اور صرف و نحو کی ابتدائی باتیں سکھاتا تھا۔ اس میں کوئی دقت نہیں ہوتی تھی میرے شاگرد یہ جانتے تھے کہ تامل بولنے میں ان کا مقابلہ نہیں کر سکتا اور جب کبھی ایسے تامل لوگ جو انگریزی نہیں جانتے تھے مجھ سے ملنے آتے تو لڑکے ترجمانی کرتے تھے مگر میرا کام بڑے مزے میں چلتا تھا کیونکہ میں نے ان سے کبھی اپنی جہالت چھپانے کی کوشش نہیں کی اور ہر چیز میں بھی جیسے تھا ویسا ہی میں اپنے آپ کو ان کے سامنے پیش کرتا تھا۔ اس لئے باوجود اس کے کہ میں تامل زبان میں بالکل کورا تھا وہ ہمیشہ مجھ سے محبت اور ادب سے پیش آتے رہے۔ مسلمان لڑکوں کو اردو پڑھانا اس سے زیادہ سہل تھا وہ اردو رسم الخط جانتے تھے۔ میرا کام بس اتنا تھا کہ انہیں پڑھنے کا دھوکا دلا تا رہوں اور ان کا خط درست کر دیا کروں۔

ان میں سے اکثر لڑکے اسکول میں داخل ہونے سے پہلے بالکل ان پڑھ تھے۔ مگر مجھے تجربے سے معلوم ہوا کہ انہیں بیٹھ کر پڑھانے کی کچھ ایسی ضرورت نہیں۔ صرف ان کی کاہلی کی عادت چھڑانا اور ان کے کام کی نگرانی رکھنا کافی ہے۔ میں اسی پر اکتفا کرتا تھا اس لئے مختلف عمر کے لڑکے ایک ہی درجے میں بیٹھ کر اپنا اپنا سبق پڑھتے تھے اور بغیر کسی دقت کے کام چلتا تھا۔

آج کل تعلیم میں درسی کتابوں پر اتنا زور دیا جاتا ہے کہ مجھے تو ان کی کبھی ضرورت نہیں پڑی۔ جو تھوڑی بہت کتابیں موجود تھیں ان سے بھی میں نے بہت کام لیا مجھے لڑکوں پر کتابوں کا انبار لادنے کی کوئی وجہ نہیں معلوم ہوئی۔ میرا ہمیشہ سے یہ خیال ہے کہ طالب علم کے لئے بہترین درسی کتاب اس کا استاد ہے۔ میرے استادوں نے مجھے کتابوں سے جو کچھ پڑھایا اس میں سے مجھے بہت کم یاد ہے ہر کتاب کے باہر جو باتیں بتائیں وہ آج تک دل پر نقش ہیں۔

بچے کانوں سے سن کر جتنا سیکھتے ہیں اور جتنی آسانی سے سیکھتے ہیں، پڑھ کر نہیں سیکھ سکتے۔ مجھے یاد نہیں کہ میں نے ان لڑکوں کو کوئی کتاب اول سے آخر تک پڑھائی ہو۔ مگر مختلف کتابوں کے مطالعے

سے جو باتیں میرے دل میں بیٹھ گئی تھیں وہ میں انہیں اپنی زبان میں سمجھا دیتا تھا اور مجھے یقین ہے کہ وہ انہیں اب تک یاد ہوں گی۔ کتابوں کو پڑھ کر یاد رکھنا ان کے لئے مشکل تھا لیکن جو کچھ میں انہیں زبانی بتاتا تھا وہ آسانی سے ان کے ذہن نشین ہو جاتا تھا اور جب پوچھو فر فر سنا دیتے تھے۔ پڑھنا ان کے لئے بڑا کٹھن کام تھا مگر میری گفتگو سننے میں انہیں لطف آتا تھا بشرطیکہ میرا انداز بیان دلچسپ ہو اور وہ میری گفتگو کی تحریک سے جو سوالات کرتے تھے اس سے مجھے اندازہ ہوتا تھا کہ ان میں کہاں تک سمجھنے کی قوت ہے۔

روحانی تربیت

ان بچوں کی روحانی تربیت کا مسئلہ ان کی جسمانی اور ذہنی تربیت سے کہیں زیادہ دشوار تھا میں نے اس معاملے میں مذہبی کتابوں سے بہت کم مدد لی۔ میں اس کا ضرور قائل تھا کہ ہر طالب علم کو اپنے مذہب کے بنیادی اصول جاننا چاہئے اور اپنی مقدس کتابوں سے واقف ہونا چاہئے اور جہاں تک ممکن تھا میں نے اس تعلیم کا انتظام بھی کر دیا تھا۔ مگر یہ تعلیم میرے نزدیک ذہنی تربیت میں داخل تھی ٹالسٹائی فارم کے لوگوں کی تعلیم کا بار اپنے سر لینے سے پہلے مجھے اس حقیقت کا احساس ہو گیا تھا کہ روحانی تربیت ایک جداگانہ چیز ہے۔ روح کی تربیت کے معنی ہیں انسان کی سیرت کی تعمیر اور اسے اس قابل بنادینا کہ خدا کی معرفت اور اپنے نفس کی معرفت حاصل کر سکے۔ میرا خیال تھا کہ یہ روحانی تربیت تعلیم کا اہم عنصر ہے اور بغیر اس کے بیکار بلکہ مضر ہے۔

میں نے اکثر یہ بے بنیاد عقیدہ سنا ہے کہ معرفت نفس صرف زندگی کی چھوٹی منزل یعنی ”سنیاس“ میں قدم رکھنے کے بعد ہی حاصل ہو سکتی ہے مگر ہر شخص جانتا ہے کہ جو لوگ اس بے بہا تجربے کی تلاش زندگی کے آخری دور پر اٹھار کھتے ہیں انہیں معرفت نفس نصیب نہیں ہوتی بلکہ انکے بڑھاپا بچپن کی بگڑی ہوئی تصویر بن جاتا ہے اور ان کا وجود زمین پر بار ہو جاتا ہے مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ میں اپنی منگھسی کے زمانے یعنی 12-1911 میں بھی یہی خیالات رکھتا تھا اگرچہ شاید میں اس وقت انہیں ان الفاظ میں ظاہر کرتا۔

اب سوال یہ تھا کہ یہ روحانی تربیت کس طریقے سے کی جائے۔ میں بچوں کو لہجن اور مناجات یاد کراتا تھا اور انہیں اخلاق آموز کتابیں پڑھ کر سناتا تھا۔ مگر اس سے میری تسکین انہیں ہوئی تھی جب میں بچوں میں گھل مل گیا تو مجھے معلوم ہوا کہ روحانی تربیت کتابوں سے نہیں ہو سکتی۔ جیسے جسمانی تربیت

کے لئے جسم کی ورزش اور ذہنی تربیت کے لئے ذہن کی ورزش ضروری ہے اسی طرح روحانی تربیت کے لئے روح کی ورزش ناگزیر ہے اور روح کی پرورش کا دار و مدار معلم کی زندگی اور سیرت پر ہے معلم کو بچوں کے سامنے اور ان کے پیچھے ہر وقت اس کا لحاظ رکھنا چاہئے کہ کوئی نامناسب فعل اس سے سرزد نہ ہو۔

چاہے معلم شاگردوں سے کتنے ہی فاصلے پر ہو مگر اس کے طرز زندگی کا اثر ان کی روحانی نشوونما پر پڑتا ہے۔ اگر میں خود جھوٹ بولوں اور اپنے شاگردوں کو سچ بولنے کی تلقین کروں تو ظاہر ہے کوئی اثر نہ ہو گا۔ بزدل معلم کبھی اپنے شاگردوں کو بہادر نہیں بنا سکتا نفس پرست استاد انہیں ہرگز ضبط نفس نہیں سکھا سکتا۔ اس لئے میں نے یہ سوچا کہ مجھے ان لڑکوں اور لڑکیوں کے سامنے جو میری تربیت میں ہیں اپنی زندگی کو اسوہ حسنہ بنا کر پیش کرنا چاہئے۔ گویا یہ بچے میرے استاد تھے اور میں ان کی خاطر نیکی اور عفت کی زندگی بسر کرتا تھا سچ پوچھئے تو میں ٹالسٹائی فارم میں ضبط نفس میں جو اہتمام کرتا تھا وہ زیادہ تر انہیں کے سبب سے تھا۔

ان میں سے ایک وحشی سرکش جھوٹا اور جھگڑالو تھا۔ ایک بار اس نے بڑا فساد برپا کیا۔ میں آپے سے باہر ہو گیا۔ میں اپنے شاگردوں کو کبھی سزا نہیں دیتا تھا مگر اس مرتبہ مجھے غصہ آ گیا میں نے اسے سمجھانے کی کوشش کی مگر وہ مجھے خاطر میں نہ لایا۔ آخر میں نے رول اٹھایا اور اس کے بازو پر مارا میں اس وقت سارے بدن سے کانپ رہا تھا اور میرے خیال میں اسے بھی اس کا احساس تھا وہ رونے لگا اور اس نے اپنے قصور کی معافی چاہی اس کے رونے کا سبب چوٹ کی تکلیف نہیں تھی وہ سترہ برس کا مضبوط لڑکا تھا اگر چاہتا تو مجھ پر ہاتھ اٹھاتا مگر اس نے دیکھا کہ مجھے بالکل مجبور ہو کر ایسی سخت سزا دینی پڑی اور اس سے مجھے خود سخت اذیت ہوئی۔ اس نے اس کے دل پر اثر کیا۔ اس واقعے کے بعد اس نے کبھی میری نافرمانی نہیں کی۔ مگر مجھے اس تشدد پر آج تک ندامت ہے میں سمجھتا ہوں کہ میں نے اس روز اس لڑکے کے سامنے اپنی روحانیت کا نہیں بلکہ اپنی ہمیت کا اظہار کیا۔

میں جسمانی سزا کا ہمیشہ سے مخالف ہوں جہاں تک مجھے یاد ہے میں نے اپنے لڑکوں میں سے ایک کو صرف ایک بار مارا ہے۔ اس لئے میں آج تک فیصلہ نہ کر سکا کہ اس کا محرک غصہ اور سزا دینے کی خواہش تھی۔ اگر یہ محض میری بے بسی کا اظہار ہوتا تو میں اسے جائز سمجھتا لیکن میری نیت خالص نہیں تھی۔

اس واقعے سے مجھے عبرت ہوئی اور میں نے طالب علموں کی تادیب کا اس سے بہتر طریقہ اختیار

کیا میں نہیں کہہ سکتا کہ یہ طریقہ اس موقع پر جس کا میں نے ذکر کیا ہے ہے کہاں تک کامیاب ہوتا۔ وہ لڑکا اس واقعے کو بھول بھال گیا اور اس کی سبب میں کوئی خاص اصلاح نہیں ہوئی مگر میرے دل میں معلمی کے فرائض کا احساس بڑھ گیا۔

اس کے بعد بھی لڑکوں نے شرار میں کہیں لیکن میں نے کبھی حیوانی سزا سے کام نہیں لیا غرض ان لڑکوں اور لڑکیوں کی روحانی تربیت کی کوشش میں مجھ پر روز بروز یہ حقیقت روشن ہوتی گئی کہ روح میں بڑی قوت ہے۔

پھولوں میں کانٹے

ٹالسٹائے فارم کے قیام کے زمانے میں مسٹر کیلن باخ نے مجھے ایک مسئلے کی طرف توجہ دلائی جو اس سے پہلے کبھی میرے ذہن میں نہیں آیا تھا۔ میں پہلے کہہ چکا ہوں کہ فارم میں چند لڑکے بد اور سرکش تھے ان میں سے بعض ادارہ بھی تھے۔ میرے تینوں لڑکے اور دوسرے بچے جن کی تربیت انہیں کی طرح ہوئی تھی ان بڑے لڑکوں کی صحبت میں رہتے تھے۔ مسٹر کیلن باخ کو یہ بات ناگوار تھی مگر انہیں جو کچھ فکر تھی میرے لڑکوں کی تھی۔

ایک دن انہوں نے صاف صاف مجھ سے کہہ دیا ”مجھے یہ بات پسند نہیں کہ آپ اپنے بچوں کو بڑے لڑکوں سے ملنے دیتے ہیں اس کا نتیجہ یہ ہو گا کہ بری صحبت میں پڑ کر وہ بھی بگڑ جائیں گے۔“ مجھے یاد نہیں اس سوال پر مجھے کچھ غور کرنے کی ضرورت ہوئی یا نہیں مگر اپنا جواب یاد ہے۔

”مجھے اپنے لڑکوں اور ان ادارہ لڑکوں میں تمیز کرنے کا کیا حق ہے۔ میں دونوں کی تربیت کا ذمہ دار ہوں۔ یہ لڑکے بھی میرے بلانے سے آئے ہیں۔ اگر میں انہیں کچھ دے کر رخصت کر دوں تو وہ فوراً جو ہانسبرگ پہنچ کر اپنی پرانی حرکتیں شروع کر دیں گے۔ وہ خود ادارہ ان کے والدین یہ سمجھتے ہوں گے ان کا یہاں رہنا مجھ پر بڑا احسان ہے۔ اور یہ ایک حد تک صحیح بھی ہے کم سے کم اتنا تو آپ بھی مانیں گے کہ انہیں یہاں بہت تکلیف اٹھانا پڑتی ہے میرا اس معاملے میں جو فرض ہے وہ ظاہر ہے میں انہیں یہاں رکھنے پر مجبور ہوں۔ اور میرے لڑکوں کو ان کی صحبت میں رہنا پڑے گا۔ کیا آپ چاہتے ہیں کہ میں اپنے لڑکوں کے دل میں بھی سے یہ خیال پیدا کر دوں کہ وہ دوسروں سے برتر ہیں۔ یہ برتری کا زعم انہیں گمراہ کر دے گا۔ دوسرے لڑکوں کے ساتھ مل جل کر رہنا ان کے لئے بڑی اچھی تربیت ہے وہ خود بخود نیکی

اور بدی میں تمیز کرنے لگیں گے ہم یہ کیوں نہ سمجھیں کہ اگر واقعی ان میں نیکی کی صلاحیت ہے تو اس کا اثر ان کے ساتھیوں پر بھی پڑے گا؟ بہر حال میں تو انہیں یہیں رکھوں گا۔ اگر اس میں کوئی خطرہ ہے تو ہمیں اس کے لئے تیار رہنا چاہئے۔“

مسٹر کیلن باخ اس سے مطمئن نہیں ہوئے مگر چپ ہو گئے۔

میرے خیال میں نتیجہ برا نہیں ہوا میرے بچوں کو اس تجربے سے کوئی نقصان نہیں پہنچا بلکہ کچھ فائدہ ہی ہوا۔ اگر ان کے دل میں برتری کے احساس کا کچھ شائبہ تھا تو وہ دور ہو گیا اور انہیں ہر قسم کے لڑکوں میں مل جل کر رہنے کی عادت ہو گئی۔ وہ آگ میں تپ کر اور مضبوط ہو گئے۔

اس طرح کے متعدد تجربوں سے مجھ پر یہ بات ثابت ہو گئی اگر اچھے لڑکے برے لڑکوں کے ساتھ تعلیم پائیں اور ان کی صحبت میں رہیں تو انہیں کوئی نقصان نہیں پہنچے گا بشرطیکہ یہ تجربہ بہت احتیاط سے ان کے والدین اور ان کے سرپرستوں کی نگرانی میں کیا جائے۔

یہ کوئی ضروری بات نہیں کہ جو بچے بسم اللہ کے گنبد میں پرورش پاتے ہیں وہ ہر قسم کی ترضیوں اور برے اثروں سے محفوظ رہیں۔ ہاں یہ سچ ہے کہ جب مختلف قسم کی تربیت پائے ہوئے بچے ساتھ رکھے جائیں تو والدین اور معلموں کے لئے بڑے امتحان کا وقت ہوتا ہے۔ انہیں ہر وقت چوکس رہنا پڑتا ہے۔

فاقہ کفارے کی حیثیت سے

مجھے روز بروز یہ احساس ہوتا گیا کہ لاکوں اور لاکھوں کی تربیت کس قدر مشکل چیز ہے میں نے دیکھا کہ اگر میں صحیح معنوں میں ان کا معلم اور سرپرست بنتا چاہتا ہوں تو مجھ پر لازم ہے کہ ان کے دل میں جگہ کروں ان کے دکھ سکھ میں شریک رہوں، ان کی مشکلوں کو حل کروں اور ان کے اٹھتے جوش اور آرزوؤں کو راہ پر لگاؤں۔

جس زمانے میں بعض ستیاگری جیل سے رہا ہوئے ہیں نالسنائے فارم قریب قریب دیران تھا۔ چند لوگ جو رہ گئے تھے وہ فنیکس کے تھے اس لئے میں انہیں لے کر فنیکس چلا گیا۔ یہاں مجھے بڑی سخت آزمائش کا سامنا ہوا۔

ان دنوں میں کبھی جوہانسبرگ میں رہتا تھا اور کبھی فنیکس میں۔ ایک بار مجھے جوہانسبرگ میں یہ اطلاع ملی کہ فنیکس آشرم کے دو شخص فعل شنیع کے مرتکب ہوئے۔ اگر میں یہ سنتا کہ یہ ستیاگرہ کی تحریک پیٹھ گئی تو مجھے اتنا صدمہ نہ ہوتا مگر اس خبر سے مجھ پر بجلی سی گر گئی۔ میں اسی دن ریل سے فنیکس روانہ ہو گیا۔ مسٹر کیلن باخ باصرار میرے ساتھ ہو گئے۔ انہوں نے میری حالت دیکھ لی تھی انہیں کسی طرح گوارا نہ ہوا کہ مجھے تنہا جانے دیں خصوصاً اس لئے کہ اتفاق سے یہ خبر جس نے میرا دل ہلا دیا وہی لائے تھے۔

رستے میں میں نے یہ طے کر لیا کہ میرا کیا فرض ہے مجھے یہ احساس تھا کہ سرپرست یا معلم ایک حد تک ان لوگوں کی لغزشوں کا ذمہ دار ہے جو اس کی زیر نگرانی یا زیر تربیت ہیں اس لئے اس واقعہ کی ذمہ داری صرفاً مجھ پر عائد ہوتی تھی۔ میری بیوی نے مجھے پہلے سے اس خطرے سے آگاہ کر دیا تھا۔ لیکن میں نے اپنی سادہ دلی سے ان کی باتوں پر توجہ نہیں کی۔

میں نے سوچا کہ جن لوگوں سے یہ حرکت سرزد ہوئی ہے انہیں اپنے قصور اور میرے صدمہ کا پورا اندازہ اسی دقت ہو گا جب میں ان کے گناہ کا کفارہ ادا کروں اس لئے میں نے عہد کر لیا کہ سات دن فاقہ کروں گا اور اس کے بعد ساڑھے چار مہینے تک صرف ایک دقت کھانا کھاؤں گا۔ مسٹر کیلن باخ نے لاکھ کوشش کی کہ مجھے اس ارادہ سے باز رکھیں مگر ان کی ایک نہ چلی آخر انہوں نے مان لیا کہ یہ کفارہ بجا ہے اور اس پر اصرار کرنے لگے کہ میں بھی اس میں شریک ہوں گا۔ میں ان کی اس سچی محبت کو کیوں کر روکتا؟

اس فیصلے پر میرا دل ہلکا ہو گیا اس خطا کا ارتکاب کرنے والوں کی طرف سے جو غصہ میرے دل میں تھا وہ دور ہو گیا اور مجھے ان کی حالت پر ترس آنے لگا۔ غرض جب میں فنیکس پہنچا تو میری طبیعت کو بہت کچھ سکون ہو گیا تھا۔ میں نے اس معاملے کی مزید تحقیقات کی اور جو تفصیلی باتیں معلوم کرنا چاہتا تھا وہ معلوم کر لیں۔

میرے فاقے سے سب کو دکھ ہوا مگر آشرم کی فضا پاک صاف ہو گئی ہر شخص کو محسوس ہو گیا کہ گناہ کس قدر ہولناک چیز ہے۔ مجھ میں اور بچوں میں جو رشتہ محبت تھا وہ اور استوار ہو گیا۔

کچھ دن کے بعد اسی واقعے کے سلسلے میں ایک اور شاخ پھوٹی جس کے سبب سے مجھے چودہ دن کا فاقہ کرنا پڑا۔ اس کا اثر میری توقع سے بھی زیادہ ہوا۔

ان واقعات کے بیان کرنے سے میرا یہ مطلب نہیں کہ جب کبھی شاگرد سے کوئی لغزش ہو جائے تو استاد کا فرض ہے کہ فاقہ کرے۔ مگر میرے خیال میں بعض موقعوں پر اس انتہائی تدبیر کی ضرورت پڑتی ہے۔ البتہ اس کے لئے یہ شرط ہے کہ خلوص نیت اور روحانی صلاحیت موجود ہو۔ اگر استاد اور شاگرد میں سچی محبت نہیں ہے۔ اگر استاد کی لغزش سے روحانی اذیت نہیں پہنچی ہے، اگر شاگرد کے دل میں استاد کا احترام نہیں تو فاقہ بے جا ہے بلکہ اس سے ضرر کا اندیشہ ہے۔ غرض ایسی صورتوں میں خواہ فاقہ مناسب ہو یا نہ ہو اس میں کوئی شبہ نہیں کہ استاد اپنے شاگردوں کی خطاؤں کا ذمہ دار ہے۔

پہلا کفارہ ہم لوگوں کے لئے دشوار نہ تھا۔ میں بدستور اپنا سارا کام کرتا رہا۔ حالانکہ فاقہ توڑنے کے بعد جتنے دن میں صرف ایک دقت کھانا کھاتا رہا۔ میری غذا پھلوں کے سوا کچھ نہ تھی۔ البتہ دوسرے فاقے کے آخری دن مجھ پر سخت گزرے مجھے اس دقت تک ”رام نام“ کی برکت کا پورا اندازہ نہ تھا اس لئے میں تکلیفیں سہنے میں کسی قدر کچا تھا۔ اس کے علاوہ میں فاقے کے گردوں سے خصوصاً اس صول سے ناواقف تھا کہ پانی خوب پینا چاہئے چاہے اس سے کتنی ہی متلی کیوں نہ ہو کچھ یہ بھی تھا کہ

پہلا فاقہ آسانی سے گزرنے کی وجہ سے میں بے پرواہ سا ہو گیا تھا۔ چنانچہ پہلے فاقے میں میں روزانہ کوہمنے کی ہدایت کے مطابق غسل کرتا تھا۔ چنانچہ پہلے فاقے میں میں نے دو تین دن کے بعد یہ معمول ترک کر دیا اور پانی بھی بہت کم پیا۔ کیونکہ اس سے منہ کا مزہ میٹھا ہو جاتا تھا۔ اور متلی ہونے لگتی تھی۔ میرے حلق میں کانٹے پڑ گئے اور آخر میں میری آواز بہت نحیف ہو گئی۔ اس پر بھی میں نے اپنے لکھنے کا کام اس طرح کرتا رہا کہ میں بولتا جاتا تھا اور کوئی دوسرا لکھتا جاتا تھا اس کے علاوہ روز رمان اور دوسری کتابیں پڑھوا کر سنتا تھا اور ضروری معاملوں کے متعلق گفتگو کرنے اور مشورے دینے سے معذور نہ تھا۔

گو کھلے سے ملنے کے لئے سفر

جنوبی افریقہ کی اور بہت سی باتیں مجھے یاد ہیں اگر مجبوراً ان کا ذکر چھوڑتا ہوں۔

1914ء میں جب ستیاگرہ کی جدوجہد ختم ہو گئی تو گو کھلے کا حکم پہنچا کہ لندن ہوتے ہوئے

ہندوستان آجؤ اس لئے میں کستور بانی اور کیلن باخ کو ساتھ لے کر انگلستان روانہ ہو گیا۔

ستیاگرہ کے زمانے میں میں نے تیسرے درجے میں سفر کرنا شروع کر دیا تھا، اس لئے اس سفر میں

بھی میں نے میرے ہی درجے کا ٹکٹ لیا لیکن اس لائن کے جہازوں کا تیسرا درجہ ہندوستان کے ساحلی

(1) جہازوں اور ریلوں کے تھرڈ کلاس سے کہیں بہتر تھا۔ ہندوستان کے جہازوں میں سونا تو الگ رہا

بیٹھنے ہی کے لئے کافی جگہ نہیں ملتی۔ اور صفائی کا تو نام بھی نہیں ہوتا۔ یہ خلاف اس کے لندن کے

سفر میں تیسرے درجے میں بہت کافی جگہ تھی اور صفائی کا معقول انتظام تھا۔ کمپنی نے ہمارے لئے

خاص طور پر آرائش کا سامان مہیا کر دیا تھا۔ اور چونکہ ہم لوگ سوائے میوے کے کچھ نہیں کھاتے تھے

اس لئے اسلیوارڈ کو ہدایت کر دی گئی تھی کہ ہمیں پھل اور اخروٹ وغیرہ دیا کرے۔ تیسرے درجے

کے مسافروں کو یہ چیزوں عموماً نہیں ملتی تھیں ان رعایتوں کی بدولت ہم نے جہاز پر اٹھارہ دن بڑے

آرام سے گزارے۔

سفر کے دوران میں بعض ایسے واقعات پیش آئے جو قابل ذکر ہیں مسٹر کیلن باخ کو دور بین کا

بہت شوق تھا۔ اور ان کے پاس دو ایک گیمیتی دور بینیں تھیں۔ ہم دونوں میں ان کے متعلق پر زور

بحث رہتی تھی۔ میں انہیں یہ سمجھانے کی کوشش کرتا تھا کہ ایسی چیز رکھنا سادگی کے نصب العین کے

خلاف ہے۔ ایک دن ہم اپنے کہیں کے روشن دان کے قریب کھڑے یہی بحث کر رہے تھے کہ بات

بڑھ گئی اور میں نے کہا "ان دور بینوں کے سبب سے ہم دونوں میں روز نزع رہتی ہے۔ اس سے تو

بہتر ہے کہ انہیں اٹھا کر سمندر میں پھینک دیں۔ کہ یہ قصہ ہی ختم ہو جائے۔

کیلین باخ بولے ”ضرور پھینک دیجئے۔ یہی کمبخت فساد کی جڑ ہیں۔“

میں نے کہا ”دیکھو پھر میں پھینکتا ہوں۔“

انہوں نے بے تامل جواب دیا ”میں سچ کہتا ہوں پھینک دیجئے۔“

ان کا یہ کہنا تھا میں نے ددربین اٹھا کر سمندر کے حوالے کیں۔ یہ سات پونڈ میں خریدی گئی تھیں

مگر ان کی اصل قدر و قیمت یہ تھی کہ مسٹر کیلین باخ ان پر جان دیتے تھے۔ مگر ان کے تلف ہونے کا انہیں مطلق رنج نہیں ہوا۔

میرے اور مسٹر کیلین باخ کے مابین جو محبت کے معاملے پیش آتے تھے یہ ان کی ایک ادنیٰ سی مثال ہے ہم دونوں ہر روز اس مکتب میں نئے سبق سیکھتے تھے۔ کیونکہ دونوں حق کی راہ پر چلنے کی کوشش کر رہے تھے۔ اس سفر میں غصہ خود غرضی، نفرت وغیرہ خود بخود درخصت ہو جاتی ہے۔ ورنہ حق کی منزل تک پہنچانا ممکن ہے۔

جو شخص جذبات سے متاثر ہو جاتا ہے وہ چاہے کتنا ہی نیک نیت اور سچا ہو حق کا جلوہ نہیں دیکھ سکتا۔ تلاش حق کی سعی بھی مشکور ہوتی ہے کہ محبت اور نفرت، رنج و راحت کی دوئی سے چھٹکارا مل جائے۔

میرے فاقے کو تھوڑے ہی دن ہونے تھے کہ مجھے یہ سفر کرنا پڑا۔ میری قوت ابھی اچھی طرح عود نہیں کر پائی تھی۔ میں جہاز کے عرشے پر مبتلا کرتا تھا کہ تھوڑی سی ورزش ہو جائے۔ اور جو کچھ کھاتا ہوں اسے ہضم کر لوں۔ مگر یہ ورزش بھی میرے لئے زیادہ تھی۔ اور اس سے میری پنڈلیوں میں درد ہونے لگتا تھا۔ لندن پہنچتے پہنچتے میری حالت اور ابتر ہو گئی وہاں ڈاکٹر جیوراج مہتا سے ملاقات ہوئی۔ میں نے ان سے اپنے فاقے کا حال اور اس کے بعد کی کیفیت بیان کی۔ انہوں نے کہا ”اگر آپ کچھ دن کامل آرام نہیں کریں گے تو اندیشہ ہے کہ آپ کے پیر ہمیشہ کے لئے بیکار ہو جائیں گے۔“

اس وقت مجھے معلوم ہوا کہ جو شخص طویل فاقہ کر چکا ہو اسے کھوئی ہوتی طاقت حاصل کرنے میں جلدی نہیں کرنا چاہئے۔ اور کھانے کی حرص کو رد کرنا چاہئے۔ فاقہ توڑنے میں فاقہ کرنے سے بھی زیادہ احتیاط اور ضبط نفس کی ضرورت ہے۔

مدیر امیں ہم نے سنا کہ کوئی دن میں بہت بڑی جنگ چھڑنے والی ہے۔ بحیرہ انگلستان میں داخل ہوئے تو خبر ملی کہ لڑائی سچ سچ شروع ہو گئی۔ وہاں ہمارے جہاز کو کچھ دیر ٹھہرنا پڑا۔ جہاد کو تحت بحری بم

کے جال میں سے جو سارے بکیرے میں پھینلا ہوا تھا، نکال کر لے جانا سہل نہ تھا۔ ستمبر میں پہنچتے پہنچتے ہمیں دو دن لگ گئے۔ لڑائی کا اعلان 4 اگست کو ہوا تھا۔ ہم 6 اگست کو لندن میں داخل ہوئے۔

حوالہ

Coastal boats - 1

جنگ عظیم میں میرا حصہ

انگلستان پہنچ کر معلوم ہوا کہ گو کھلے، جو علاج کے لئے پیرس گئے تھے۔ آمدورفت کا سلسلہ بند ہو جانے کے سبب وہیں رہ گئے ہیں اور یہ نہیں کہا جاسکتا کہ کب تک لوٹیں گے۔ میں بھی ان سے ملنے ہندوستان نہیں جانا چاہتا تھا مگر ان کی واپسی کا کچھ ٹھیک معلوم نہیں تھا۔

مجھے یہ فکر تھی کہ اتنے دن تک کیا کروں؟ جنگ کے سلسلے میں میرا کیا فرض ہے؟ سہراب جی ادا جانا جو ستیاگرہ میں شریک رہے تھے اور میرے ساتھ جیل گئے تھے اس زمانے میں لندن میں بیرسنری کی تعلیم حاصل کر رہے تھے۔ وہ بڑے پکے ستیاگرھی تھے اس لئے لوگوں نے انہیں قانون پڑھنے بھیجا تھا کہ جب لوٹ کر آئیں تو میری جگہ کام کریں۔ ان کے ساتھ اور ان ہی کے توسط سے میں ڈاکٹر جیوراج جی مہتا اور دوسرے حضرات سے جو لندن میں تعلیم پا رہے تھے ملا اور میں نے ان سے اس معاملے میں مشورہ لیا۔ ان کی رائے سے ایک جلسہ ان سب ہندوستانیوں کا جو برطانیہ عظمیٰ اور آئرستان میں مقیم تھے، منعقد کیا گیا میں نے اس جلسے کے سامنے اپنے خیالات پیش کئے۔

میری رائے تھی کہ جتنے ہندوستانی انگلستان میں مقیم ہیں سب کو اپنی بساط کے مطابق جنگ میں حصہ لینا چاہئے جس طرح انگریز طالب علموں نے اپنی خدمات فوج کے لئے پیش کی ہیں ہندوستانیوں کو بھی کرنا چاہئے۔ اس پر بہت سے اعتراض کئے گئے بعض لوگوں نے کہا کہ ہندوستانیوں اور انگریزوں میں زمین و آسمان کا فرق ہے۔ ہم غلام ہیں وہ آقا ہیں جب آقا پر برا وقت پڑے تو غلام کیوں ساتھ دے؟ اسے تو اس موقع سے فائدہ اٹھا کر اپنی آزادی کی فکر کرنا چاہئے۔ اس وقت اس دلیل سے میری تسکین نہیں ہوئی۔ میں جانتا تھا کہ ہندوستانیوں اور انگریزوں میں فرق ہے مگر میری نظر میں ہندوستانیوں

کی حالت اتنی بری نہیں تھی کہ غلامی کمی جائے۔ ان دنوں میرا یہ خیال تھا کہ قصور جو کچھ ہے وہ انگریز حکام کا انفرادی حیثیت سے ہے۔ برطانوی نظام حکومت کا قصور نہیں ہے۔ اگر ہم انگریزوں کی مدد اور ان کے اتحاد عمل سے اپنی حالت سدھارنا چاہتے ہیں تو ہمارا فرض ہے کہ ضرورت کے وقت ان کے کام آئیں۔ ان کی حکومت میں خرابیاں ضرور ہیں مگر اتنی ہیں کہ ناقابل برداشت ہوں۔ اب مجھے برطانوی نظام پر اعتماد نہیں رہا اس لئے میں حکومت کے ساتھ اتحاد عمل نہیں کرنا چاہتا۔ مگر یہ حضرات اسی زمانے سے نظام حکومت اور حکام دونوں سے بدظن تھے۔ بظاہر ہے کہ ایسی صورت میں وہ ان کا ساتھ کیونکر دے سکتے تھے۔

جو لوگ میری رائے کے مخالف تھے ان کا قول تھا کہ ہندوستانیوں کے مطالبات پر زور دینے کا یہی وقت ہے۔

میں یہ کہتا تھا کہ ہمیں انگلستان کی مصیبت سے فائدہ نہیں اٹھانا چاہئے بلکہ شرافت اور دور اندیشی کا تقاضا ہے کہ جنگ کے اختتام تک ہم اپنے مطالبات ملتوی رکھیں۔ فرض میں اپنی رائے پر قائم رہا۔ اور میں نے کہا کہ جس کا جی چاہے وہ اپنا نام رضا کاروں میں لکھوادے۔ مجھے اچھی خاصی کامیابی ہوئی اور تقریباً ہر صوبے اور مذہب کے نامندے رضا کار بن گئے۔

میں نے لارڈ کریو کو خط لکھا جس میں ان سب واقعات کا ذکر کیا اور کہا کہ اگر ہماری خدمات کا قبول کیا جانا اس شرط پر منحصر ہو کہ پہلے ہم ایمبولینس (1) کا کام سیکھیں تو ہم اس کے لئے بھی تیار ہیں۔ لارڈ کریو نے کچھ تامل کے بعد ہماری خدمات قبول کر لیں اور ہمارا شکریہ ادا کیا کہ ہم ایسے نازک وقت میں سلطنت کی مدد کرنا چاہتے ہیں۔

رضاکاروں نے زخمیوں کی مرہم پٹی کا کام مشہور و معروف ڈاکٹر کنشلی کی نگرانی میں سیکھنا شروع کر دیا۔ صرف چھ ہفتے کی تعلیم تھی۔ مگر اس میں فرسٹ ایڈ کا پورا کورس آجاتا تھا۔

ہماری جماعت میں اسی (80) آدمی تھے۔ چھ ہفتے کے بعد ہمارا امتحان ہوا جس میں ایک شخص کے سوا سب کے سب کامیاب ہوئے۔ اب حکومت نے ہمیں فوجی قواعد وغیرہ سکھانے کا انتظام کیا۔ کرنل بیکر ہمارے نگران مقرر ہوئے۔

لندن کی حالت اس زمانے میں دیکھنے کے لائق تھی۔ شہر میں ذرا بھی انتشار نہ تھا۔ سب لوگ اپنی اپنی بساط کے مطابق مدد کرنے میں مصروف تھے۔ جتنے مضبوط جوان تھے وہ تو فوجی قواعد سیکھ ہی رہے تھے مگر ضعیف اور بیمار لوگ یہاں تک کہ عورتیں بھی بیکار نہ تھیں۔ انہوں نے سپاہیوں کی وردیاں

اور زخمیوں کی پٹیاں تیار کرنے کا کام اپنے ذمے لے لیا تھا۔

ایک خواتین کے کلب نے جو نسیم کہلاتا ہے فوجی وردیاں بہت بڑی تعداد میں سلوانے کا بیڑا اٹھایا تھا۔ مسز سردجینی نائڈو اس کلب کی ممبر تھیں اور بڑے خلوص اور جوش سے کام کر رہی تھی۔ اسی زمانے میں مجھے ان سے پہلی مرتبہ ملنے کا اتفاق ہوا۔ انہوں نے میرے سامنے بولتے ہوئے کپڑوں کا ڈھیر لگا دیا اور کہا کہ انہیں سلوا کر لاؤ میں نے بڑی خوشی سے یہ خدمت قبول کی۔ اور فرسٹ ایڈ کی تعلیم کے زمانے میں دوستوں کی مدد سے جتنے کپڑے سل سکے سلوا کر انہیں دئے۔

حوالہ

1 - Ambulance مقتولوں کو اٹھا کر لانے اور زخمیوں کی خدمت کا کام۔

روحانی کشمکش

جیسے ہی یہ خبر جنوبی افریقہ پہنچی کہ میں نے چند اور ہندوستانیوں نے اپنی خدمات جنگ کے لئے پیش کی ہیں میرے پاس دو تار آئے ان میں سے ایک مسز پو لک کا تھا انہوں نے پوچھا تھا کہ کیا آپ کا یہ فعل "اہمسا" کے عقیدے کے منافی نہیں ہے؟

مجھے پہلے سے خیال تھا کہ یہ اعتراض ہو گا کیونکہ میں نے اپنی کتاب "ہند سوراہ" میں جنگ کے مسئلے پر بحث کی تھی اور جنوبی افریقہ میں بارہا اپنے دوستوں سے اس کے متعلق گفتگو کر چکا تھا۔ ہم سب کا خیال تھا کہ جنگ اخلاقاً ناجائز ہے جب میں نے ان لوگوں پر جنہوں نے مجھ پر حملہ کیا تھا مقدمہ نہیں چلایا تو میرے دوستوں کو یہ توقع کیونکر ہو سکتی تھی کہ میں جنگ میں شریک ہو جاؤں گا خصوصاً ایسی حالت میں کہ میں یہ بھی نہیں جانتا تھا کہ فریقین میں سے حق پر کون ہے۔ میرے دوستوں کو معلوم تھا کہ میں جنگ بوڑ میں شریک رہ چکا ہوں مگر وہ سمجھتے تھے کہ اس کے بعد میرے خیالات بدل گئے ہیں۔

بات یہ ہے کہ جن وجوہ سے میں جنگ بوڑ میں شامل ہوا تھا انہیں کی بنا پر میں نے اس بار بھی فیصلہ کیا۔ اس میں مجھے ذرا بھی شبہ نہیں کہ جنگ میں شریک ہونا "اہمسا" کے منافی ہے مگر انسان کو ہر موقع پر اپنا صحیح فرض نہیں سوچتا۔ حق کے طالب کو اکثر اندھیرے میں ٹٹول کر چلنا پڑتا ہے۔

"اہمسا" ایک عالمگیر اصول ہے جس میں تشدد کی صورت میں جائز نہیں ہم بے بس خاک کے پتے ہر طرف سے "اہمسا" کے شعلوں میں گھرے ہوئے ہیں یہ قول کہ جاندار جانداروں ہی کو کھا کر جیتے ہیں گہری حقیقت پر مبنی ہے۔ انسان جان بوجھ کر یا بے جانے بوجھے "اہمسا" کے بغیر ایک لحظہ بھی زندہ نہیں رہ سکتا۔ اٹھتے بیٹھتے کھاتے پیتے، چلتے پھرتے، ہر وقت اس کے ہاتھ سے کوئی نہ کوئی جان چاہے وہ کتنی ہی حقیر کیوں نہ ہو (ضرور تلف ہوتی ہے۔ اس لئے "اہمسا" کا طالب اگر اتنا کر سکے کہ اپنے ہر فعل

میں خدا ترسی کو مد نظر رکھے جہاں تک ممکن ہو چھوٹے سے چھوٹے جاندار کی جان لینے سے پرہیز کرے بلکہ اسے دوسروں کے ہاتھ سے بچائے، غرض ہمیشہ "اہمسا" کی زنجیروں کو توڑنے کے لئے ہاتھ پیر مارتا رہے تو سمجھنا چاہئے کہ وہ اپنے عقیدے میں پکا ہے۔ اس کے دل میں روز بروز ضبط نفس اور خدا ترسی بڑھتی جائے گی۔ مگر ظاہری "اہمسا" سے کامل نجات سے کبھی نہیں ہو سکتی۔

اس کے علاوہ "اہمسا" کی بنیاد اس عقیدے پر ہے کہ سب جاندار کامل روحانی اتحاد رکھتے ہیں اور اس کی خطا کا اثر سب پر پڑتا ہے۔ اس لئے کوئی شخص "اہمسا" سے پاک نہیں ہو سکتا جب تک وہ انسانی سماج کا رکن ہے۔ وہ اس "اہمسا" میں شریک ہونے پر مجبور ہے جس پر سماج کی زندگی کا دار و مدار ہے۔ جب دو قوموں میں لڑائی ہو تو "اہمسا" کے طالب کا فرض ہے کہ وہ لڑائی کو روکے۔ مگر جو شخص یہ فرض ادا نہیں کر سکتا جو لڑائی کو روکنے کی قوت نہیں رکھتا۔ جس میں لڑائی روکنے کی قابلیت نہیں ہے۔ وہ لڑائی میں شریک ہو کر بھی دل و جان سے یہ کوشش کر سکتا ہے کہ اپنی قوم کو بلکہ ساری دنیا کو لڑائی سے نجات دے۔

مجھے یہ امید تھی کہ میں برطانوی سلطنت کے ذریعہ سے اپنی اور اپنی قوم کی حیثیت بڑھا سکوں گا۔ میں سوچتا تھا کہ جب تک میں انگلستان میں ہوں برطانوی بیرسٹر کی حفاظت سے فائدہ اٹھا رہا ہوں اور اس مسلح قوت سے فائدہ اٹھانا گویا اس تشدد میں شریک ہونا ہے جو اس کے ہاتھ سے عمل میں آسکتا ہے۔ اس لئے اگر میں سلطنت برطانیہ سے تعلق قائم رکھنا۔ اور اس کے زیر سایہ رہنا چاہتا ہوں۔ تو مجھے ان تین طریقوں میں سے ایک اختیار کرنا چاہئے۔ یا تو میں کھلم کھلا لڑائی کی مخالفت کروں اور ستیاگرہ کے اصول کے مطابق سلطنت برطانیہ سے اس وقت تک ترک موالات کروں جب تک وہ اپنی فوجی پالیسی نہ بدل دے، اس کے قابل اعتراض قوانین کی خلاف ورزی کر کے جیل چلا جاؤں، یا لڑائی میں سلطنت کا ساتھ دے کر لڑائی کو روکنے کی قابلیت اور قوت حاصل کروں۔ میں جانتا تھا کہ ابھی تک مجھ میں یہ قابلیت اور قوت نہیں ہے۔ اس لئے مجھے سوائے لڑائی میں شامل ہونے کے اور کوئی صورت نظر نہیں آئی۔

میرے نزدیک "اہمسا" کے نقطہ نظر سے سپاہیوں میں جو لڑتے ہیں۔ اور ان لوگوں میں جو فوج کے ساتھ رہ کر دوسری خدمات انجام دیتے ہیں کوئی فرق نہیں جو شخص ڈاکوؤں کے جتھے کے ساتھ شریک ہو کر بار برادری میں مدد دیتا ہے یا جب وہ لڑنے جاتے ہیں تو ان کے گھروں پر پہرہ دیتا ہے یا جب وہ زخمی ہوتے ہیں تو ان کی مرہم پٹی کرتا ہے تو وہ بھی ان ڈاکوؤں کی طرح ذکیستی کا مجرم ہے اسی طرح وہ لوگ بھی جو لڑائی میں محض زخمیوں کی خدمت کرتے ہیں لڑائی کے جرم سے بری نہیں ہو سکتے۔

پولک کا خط پہنچنے سے پہلے میں یہ سب باتیں سوچ چکا تھا۔ جب یہ تار آیا تو میں نے کئی دوستوں سے اس مسئلے پر گفتگو کی اور آخر میں یہی طے کیا کہ میرا فرض ہے کہ اپنی خدمات جنگ کے لئے پیش کروں۔ آج بھی مجھے ان دلیلوں میں کوئی کمزوری نظر نہیں آتی اور اس کا لحاظ رکھتے ہوئے کہ اس زمانے میں میری رائے سلطنت برطانیہ کے متعلق اچھی تھی مجھے اپنے اس فعل پر افسوس نہیں ہے۔

مگر میں اس وقت بھی اپنے دوستوں کو اس کا قائل نہ کر سکا کہ میرا طرز عمل صحیح ہے۔ یہ مسئلہ بڑا نازک ہے اور اس میں اختلاف رائے کی بہت کچھ گنجائش ہے۔ اسی لئے میں نے اپنے خیالات کو جہاں تک ممکن ہے وضاحت کے ساتھ ان لوگوں کے سامنے پیش کر دیا ہے جو ”اہمسا“ پر عقیدہ رکھتے ہیں اور زندگی کے ہر شعبے میں اسے برتتے کی کوشش کرتے ہیں۔ حق کے طالب کو کوئی کام رسمی خیالات سے متاثر نہیں ہو کر نا نہیں چاہئے۔ مگر اسی کے ساتھ اس کا فرض ہے کہ اپنی بات کی سچ نہ کرے اور جب اسے اپنی غلطی محسوس ہو تو بے تامل سب کے سامنے اس کا اعتراف کر لے اور اس کی تلافی کی کوشش کرے۔

چھوٹی سی ستیاگرہ

گو میں اپنا فرض سمجھ کر لڑائی میں شریک ہوا تھا مگر کچھ ایسا اتفاق ہوا کہ میں اس میں ذاتی طور پر حصہ نہ لے سکا بلکہ مجھے اس نازک موقع پر ایک چھوٹی سی ستیاگرہ کرنا پڑی۔

میں پہلے کہہ چکا ہوں کہ جب ہم لوگ امتحان پاس کر چکے اور ہمارے نام رضا کاروں میں درج ہو گئے تو ایک افسر ہماری تعلیم کے لئے مقرر کیا گیا۔ ہم سب یہ سمجھتے تھے کہ ہم صرف قواعد وغیرہ میں اس کے ماتحت رہیں گے اور سب معاملات کی نگرانی میرے سپرد ہوگی اور کمانیر کو جو کچھ کور سے کہنا ہوگا میرے توسط سے کہے گا۔ مگر اس نے پہلے ہی دن ہمارے اس خیال خام کو دور کر دیا۔

مسٹر سہراب جی ادا جانی بڑے ہوشیار آدمی تھے۔ انہوں نے مجھ سے پہلے ہی کہہ دیا تھا کہ ”اس شخص سے خبردار رہئے گا۔ اس کے انداز سے معلوم ہوتا ہے کہ ہم پر حکومت جتنا چاہتا ہے ہم سے اس کی تابعداری ہرگز نہ ہوگی۔ ہم اسے اپنا معلم ضرور سمجھتے ہیں مگر یہ کل کے چھوکرے تک جنہیں اس نے ہمارے سکھانے کے لئے رکھا ہے ہمارے افسر بنتے ہیں۔“

یہ نوجوان جنہوں کا اس نے ذکر کیا آکسفورڈ کے طالب علم تھے جو ہمیں قواعد سکھانے آئے تھے۔ انہیں ہمارے کمانیر نے سیکشن افسر مقرر کیا تھا۔

میں نے بھی کمانیر کے محکمانہ انداز کو محسوس کیا تھا۔ مگر میں نے سہراب جی کو مطمئن کرنے کی کوشش کی مگر بھلا وہ کب مانتے تھے۔

انہوں نے مسکرا کر کہا کہ ”آپ تو ہر شخص پر اعتبار کر لیتے ہیں یہ لوگ باتیں بنا کر آپ کو دھوکا دیتے رہیں گے اور جب آپ خدا خدا کر کے ان کی پالوں کو سمجھیں گے تو ستیاگرہ پر کمر باندھ لیں گے“

نتیجہ یہ ہو گا کہ آپ بھی برباد ہوں گے اور ہم کو بھی برباد کریں گے۔

میں نے جواب دیا ”آپ لوگ میرا ساتھ دے کر سوائے بربادی کے اور کیا توقع کر سکتے ہیں۔ ستیاگرہی تو دھوکا کھانے کے لئے ہی پیدا ہوا ہے۔ کمانیر ہمیں شوق سے دھوکا دے ہیں آپ سے بارہا کہہ چکا ہوں کہ جو شخص دوسروں کو دھوکا دیتا ہے وہ ایک دن خود دھوکا کھاتا ہے۔“

سہراب جی نے ایک قہقہہ لگایا اور کہنے لگے ”اچھا تو پھر آپ دھوکا کھاتے رہئے کسی دن ستیاگرہ میں آپ کا خاتمہ ہو جائے گا اور آپ کے ساتھ ہم جیسے غریبوں کی بھی جاں جائے گی۔“

یہاں مجھے مس ہمسلی ہاب ہاوس آنجہانی کے وہ الفاظ یاد آئے جو انہوں نے مجھے ترک موالات کے متعلق لکھے تھے ”کوئی تعجب نہیں کہ ایک دن آپ کو حق کے لئے سولی پر چڑھنا پڑے۔ خدا آپ کو راہ راست پر رکھے اور آپ کا حامی اور مددگار رہے۔“

مجھ سے اور سہراب جی سے یہ باتیں کمانیر کے تقرر کے بعد ہی ہوئی تھیں چند روز میں ہمارے اور اس کے تعلقات بہت کشیدہ ہو گئے۔ میرے جسم میں چودہ دن کے فائقے کے بعد ابھی اچھی طرح طاقت نہیں آنے پائی تھی کہ میں قواعد میں شریک ہونے لگا۔ جس کے لئے مجھے اکثر گھر سے دو میل پیدل جانا پڑتا تھا۔ اس سے میری پسلی میں درم ہو آیا اور میں چلنے پھرنے سے معذور ہو گیا۔ اسی حالت میں مجھے ہفتے کے آخر میں کیمپ میں جان پڑتا تھا۔ اور لوگ تو وہیں رہ جاتے تھے لیکن میں گھروٹ آتا تھا اسی کیمپ میں ایک ایسا واقعہ پیش آیا کہ ستیاگرہ کی ضرورت پڑی۔

کمانیر کا حکم حد سے بڑھنے لگا۔ اس نے ہم سے صاف صاف کہہ دیا کہ میں کل معاملات میں چاہے وہ فوجی ہوں یا غیر فوجی افسر ہوں۔ اور اس زغم میں اس نے بیجا سختی شروع کر دی۔ سہراب جی میرے پاس دوڑے ہوئے آئے انہیں اس سخت گیری کی برداشت نہ تھی۔ انہوں نے کہا ہمارے پاس جو حکم آئے وہ آپ کے سوسط سے آنا چاہئے ابھی تو ہم ٹریننگ کیمپ ہی میں ہیں جب ہمیں ابھی سے ایسے مہمل حکم دئے جاتے ہیں تو آگے چل کر نہ جانے کیا ہو جو چھو کرے ہمیں قواعد سیکھانے آئے ہیں ان کو ہم پر ہر بات میں ترجیح دی جاتی ہے۔ کمانیر سے دو دو باتیں ہو جانا چاہئیں اس طرح سے ہرگز کام نہیں چلے گا۔ ہندوستانی طالب علم وغیرہ جو ہماری کور میں ہیں ایسے مہمل احکام کی پابندی نہیں کر سکتے ہم یہ کام اپنی خودداری قائم رکھنے کے لئے کر رہے ہیں یہ کیسے ممکن ہے کہ رہی اسی عزت بھی کھو دیں۔“

میں نے کمانیر کو ان شکایتوں کی طرف توجہ دلائی اس نے لکھا کہ یہ شکایتیں باضابطہ تحریر کے ذریعے سے پیش ہونا چاہئیں۔ آپ شکایت کرنے والوں کو ہدایت کر دیجئے کہ وہ ایک درخواست لکھ کر

اپنے نئے سیکشن افسروں کو دے دی۔ وہ معلموں کے توسط سے میرے پاس بھیج دیں گے۔
میں نے جواب دیا کہ مجھے افسری کا دعویٰ نہیں فوجی ضابطے کے لحاظ سے میں ایک معمولی سپاہی
ہوں۔ میں صرف اتنا چاہتا ہوں کہ دانشور کور کے صدر کی حیثیت سے مجھے غیر سرکاری طور پر اس کی
نامندگی کا حق دیا جائے اسی کے ساتھ میں نے کل شکایتیں تفصیل سے لکھ دیں میں نے کور کی طرف
سے اس بات پر ناراضگی کا اظہار کیا کہ نئے سیکشن افسر بغیر اس کی رائے کے مقرر کر دئے گئے ہیں۔ اور
یہ درخواست کی کہ یہ افسر معزول کر دئے جائیں اور نئے افسر کور کے انتخاب اور کمانیر کی منظوری سے
مقرر ہوں۔

کمانیر کو یہ تجویز پسند نہیں آئی۔ اس نے لکھا کور کو سکشن افسروں کے انتخاب کا حق دینا فوجی
ضابطے کے خلاف ہے اور جو افسر مقرر ہو چکے ہیں۔ ان کے معزول کرنے سے بڑی بدری ہوگی۔
اس پر ہم لوگوں نے ایک کمیٹی کی جس میں یہ طے ہوا کہ ہمیں کمیپ سے واپس آجانا چاہئے۔ میں
نے سب کو بتا دیا کہ اس ستیاگرہ کا نتیجہ بہت خطرناک ہوگا۔ مگر اکثر ممبروں کی یہی رائے ہوئی کہ جب
ہم موجودہ سیکشن افسر معزول نہ کئے جائیں اور کور کو اپنے افسر خود منتخب کرنے کا موقعہ نہ دیا جائے ہم
لوگوں کو نہ قواعد میں شریک ہونا چاہئے اور نہ کمیپ میں جانا چاہئے۔

جب یہ فیصلہ ہوا تو میں نے کمانیر کو خط لکھا کہ مجھے آپ کے جواب سے جس میں آپ نے میری
تجویز کی مخالفت کی ہے سخت مایوسی ہوئی۔ میں نے اسے یقین دلایا کہ مجھے افسری کا شوق نہیں ہے۔ بلکہ
میں خدمت کرنا چاہتا ہوں۔ مثال کے طور پر میں نے یہ واقعہ بیان کیا کہ جنگ بوئر کے زمانے میں میں
نے جنوبی افریقہ کی ہندوستانی ایسبوسینس کور میں کوئی عہدہ قبول نہیں کیا تھا۔ مگر کور کے کمانیر کرنل
گیلوے ہر کام میں مجھ سے مشورہ لیتے تھے تاکہ کور کا شمار معلوم ہو جائے۔ اس لئے ان کے اور ہماری
کور کے تعلقات میں کبھی کشیدگی پیدا نہیں ہوئی اس خط کے ساتھ میں نے کمیٹی کے رزلوشن کی
ایک نقل بھی بھیج دی۔

کمانیر پر اس کا کوئی اثر نہیں ہوا اس کے خیال میں یہ کمیٹی اور یہ تجویز بالکل بے ضابطہ تھی۔
اس پر میں نے وزیر ہند کو ان سب واقعات کی اطلاع دی۔ اور رزلوشن کی نقل بھیجی انہوں نے
جواب دیا کہ جنوبی افریقہ کا معاملہ اور تھا یہاں قواعد کی رو سے سکشن افسروں کا تقرر کمانیر کے اختیار میں
ہے۔ مگر آپ اطمینان رکھئے کہ آئندہ جب کبھی ان افسروں کے تقرر کا موقعہ آئے گا تو کمانیر آپ کی
تجویز کا لحاظ رکھے گا۔

اس کے بعد مجھ سے اور ان سے عرصے تک خط و کتابت ہوتی رہی۔ مگر میں اس افسوسناک قصے کو طول نہیں دینا چاہتا۔ مختصر یہ ہے کہ مجھے اس معاملے میں وہی تجربہ ہوا جو ہمیں ہندوستان میں روزمرہ ہوتا رہتا ہے۔ کمانیر نے کچھ ڈرا دھمکا کر اور کچھ حکمت عملی سے کام لے کر ہماری کور میں پھوٹ ڈال دی۔ رزدیویشن کی تائید کرنے والوں میں سے کچھ لوگ کمانیر کی باتوں میں آکر اپنے قول سے پھر گئے۔ اسی زمانے میں نیٹلے کے اسپتال میں یکا یک بہت سے زخمی آگئے۔ اور ہماری کور ان کی خدمت کے لئے مقرر ہوئی کچھ لوگوں کو کمانیر نے سمجھا بجا کر وہاں بھیج دیا۔ مگر اکثر نے صاف انکار کر دیا۔ میں نقل و حرکت سے معذور تھا مگر مجھ میں اور کور کے لوگوں میں نامہ و پیام جاری تھا۔ ان دنوں مسٹر رابرٹس نائب وزیر ہند اکثر مجھے دیکھنے آیا کرتے تھے۔ ان کا اصرار تھا کہ اپنے دوستوں کو راضی کر کے نیٹلے بھیج دو۔ انہوں نے یہ صورت تجویز کی کہ یہ لوگ اپنی علیحدہ کور بنالیں۔ نیٹلے میں یہ لوگ وہیں کے کمانیر کے ماتحت ہوں گے۔ اس میں ان کی بھی سبکی نہیں حکومت بھی خوش ہوگی اور بہت سے زخمیوں کی خدمت بھی ہو جائے گی۔ یہ تجویز مجھے اور میرے رفیقوں کو پسند آئی اور وہ سب نیٹلے چلے گئے۔ صرف میں دل پر پتھر رکھے اپنے بستر پر پڑا رہا۔

گو کھلے کی رواداری

میں پہلے کہہ چکا ہوں کہ انگلستان پہنچ کر میں پسلی کے درد (ذات الجنب) میں مبتلا ہو گیا تھا میرے پہنچنے کے تھوڑے دن بعد گو کھلے لندن واپس آ گئے۔ ہم دونوں میں زیادہ تر لڑائی کے متعلق گفتگو ہوا کرتی تھی۔ کیلن باخ کو جرمنی کا جغرافیہ ازبر تھا اور انہوں نے یورپ کے دوسرے ملکوں میں بھی بہت سفر کیا تھا۔ اس لئے وہ ہمیں نقشہ میں وہ مقامات دکھایا کرتے تھے جو لڑائی کے سلسلے میں اہمیت رکھتے تھے۔

جب میرے مرض نے شدت پکڑی تو یہ بھی روز مرہ کی گفتگو کا موضع بن گیا میرے غذائیاتی تجربے اس زمانے میں بھی جاری تھے۔ میری غذا مونگ پھلی کچھے اور پکے کیلے میٹھے لیمو، زیتون کے تیل و سیٹی بینگن اور انگور وغیرہ پر مشتمل تھی دودھ، اناج اور وال کو میں نے بالکل ترک کر دیا تھا۔ ڈاکٹر جیو جی مہتا میرے معالج تھے۔ ان کا اصرار تھا کہ اناج اور دودھ استعمال کرو مگر میں کسی طرح راضی نہیں ہوتا تھا۔ یہ بات کہیں گو کھلے نے سن پائی۔ وہ میرے میوہ خوری کے اصول کے قائل نہیں تھے۔ انہوں نے اس پر زور دیا کہ جو کچھ ڈاکٹر تجویز کرے وہ استعمال کرو۔

گو کھلے کی بات نانا میرے لئے سہل نہ تھا۔ جب وہ کسی طرح نہ مانے تو میں نے ان سے غور کرنے کے لئے چوبیس گھنٹے کی مہلت مانگی جب میں اور کیلن باخ رات کو گھر لوٹے تو ہم دونوں میں اس مسئلے پر بحث ہوئی۔ وہ اس تجربے میں میرا ساتھ دے رہے تھے۔

وہ خود اسے پسند کرتے تھے۔ مگر مجھے انہوں نے یہی رائے دی کہ اگر یہ تجربہ آپ کی صحت کے لئے مضر ہے اسے ترک کر دینا چاہئے اب مجھے خود اپنے ضمیر سے مشورہ کر کے فیصلہ کرنا تھا۔

میں رات بھر جاگ کر اس مسئلے پر غور کرتا رہا۔ تجربے کے ترک کرنے کے یہ معنی تھے کہ میں غذا کے متعلق اپنے اصول بدل دوں حالانکہ مجھے ان میں کوئی خرابی نظر نہیں آتی تھی اصل میں سوال یہ تھا کہ مجھے گو کھلے کے محبت بھرے اصرار سے کہاں تک متاثر ہونا چاہیے۔ اور اپنی صحت کی خاطر اپنے تجربے میں تبدیلی کرنا چاہیے۔ آخر میں نے یہ فیصلہ کیا کہ میرے تجربے کا جو پہلو خاص مذہبی ہے اس پر مجھے بہر حال قائم رہنا چاہئے البتہ جہاں دوسری مصلحتیں شامل ہیں وہاں ڈاکٹر کی رائے پر عمل کر سکتا ہوں۔ دودھ میں نے زیادہ تر مذہبی جذبات کی بنا پر ترک کیا تھا۔ یہ عہد کرتے وقت میری آنکھوں میں اس ظلم کی تصویر پھر رہی تھی جو کلکتے کے گوالے ایک ایک قطرہ دودھ نچوڑنے کے لئے گائے بھینسوں پر کرتے ہیں۔ اس کے علاوہ میرا یہ خیال تھا کہ جس طرح گوشت انسانی قدرتی غذا نہیں ہے اسی طرح دودھ بھی نہیں ہے۔ اس لئے صبح کو میں یہ طے کر کے اٹھا کہ دودھ ترک کرنے کے عہد پر قائم رہوں گا۔ اس فیصلے سے میری طبیعت کو یکسوئی ہو گئی میں گو کھلے کے پاس جاتے ہوئے ڈرتا تھا۔ مگر مجھے یہ امید تھی کہ وہ میرے فیصلے کی وقعت کریں گے۔

شام کو میں اور کیلین باخ گو کھلے سے ملنے نیشنل لبرل کلب گئے مجھے دیکھتے ہیں انہوں نے پوچھا۔ ”کہو تم نے کیا فیصلہ کیا۔ ڈاکٹر کی رائے پر عمل کرو گے؟“ میں نے استغلاں کے انداز سے مگر نرم لہجے میں کہا۔ ”میں اور سب باتیں مانتے کو تیار ہوں مگر ایک چیز کے متعلق اپنی رائے نہیں بدل سکتا۔ واللہ آپ اس بارے میں مجھ سے اصرار نہ کیجئے۔ میں گوشت، دودھ اور وہ کوئی چیز جو دودھ سے بنتی ہے استعمال نہیں کروں گا۔ مگر ان چیزوں کو ترک کرنے سے میری جن بھی جاتی ہے تو مجھے متکور ہے۔“

گو کھلے نے کہا۔ ”کیا یہ تمہارا قطعی فیصلہ ہے؟“ میں نے جواب دیا۔ ”جی ہاں میں اس معاملے میں بالکل مجبور ہوں۔ مجھے معلوم ہے کہ آپ کو میرے اس فیصلے سے رنج ہوگا مگر امید ہے کہ آپ درگزر کریں گے۔“

گو کھلے کو کسی قدر ملال ضرور ہوا۔ مگر انہوں نے انتہائی محبت سے کہا مجھے تمہارا فیصلہ پسند نہیں آیا میری سمجھ میں نہیں آتا کہ اس میں مذہب کی بات ہے؟ مگر اب میں تم سے اصرار نہیں کروں گا۔“ پھر ڈاکٹر جیوراج مہتا سے مخاطب ہو کر کہنے لگے۔

”مہربانی کر کے اب انہیں نہ ستائیے۔ انہوں نے اپنے اوپر جو عیدیں عائد کر لی ہیں ان کا لحاظ رکھ کر غذا تجویز کر دیجئے“

ڈاکٹر صاحب میرے فیصلے سے بہت جڑ بڑ ہوئے مگر پچارے مجبور تھے کیا کرتے انہوں نے پتلی
 مونگ پھلی کی دل تجویز کی اور کہا کہ اس میں ہینگ ڈال لیا کر دو۔ اس پر میں راضی ہو گیا۔ دو تین دن میں
 نے اسے استعمال کیا۔ مگر میرا درد بڑھ گیا۔ اس لئے میں نے پھر اپنی پرانی غذا شروع کر دی۔
 ، ڈاکٹر صاحب خارجی تدابیر سے کام لیتے رہے جن سے درد میں کچھ تخفیف ہو جاتی تھی مگر میں
 نے جو امیدیں لگا رکھی تھیں ان کی وجہ سے ان کے ہاتھ پیر بندھے ہوئے تھے۔
 اس عرصے میں گو کھلے وطن چلے گئے۔ لندن کے اکتوبر کے کہر سے ان کی طبیعت اکتا گئی تھی۔

پسلی کے ورم کا علاج

پسلی کا ورم کسی طرح دور نہیں ہوتا تھا اس لئے مجھے کسی قدر اندیشہ پیدا ہو گیا۔ مگر میں جانتا تھا کہ داخلی تدبیروں سے فائدہ نہیں ہو سکتا بلکہ غذا میں تبدیلی اور اس کے ساتھ خارجی علاج ہونا چاہیے۔ میں نے نباتاتی مشرب کے مشہور و معروف حامی ڈاکٹر ایلنسن سے رجوع کیا جو محض غذا کی تبدیلی سے علاج کیا کرتے تھے۔ ان کے علاج سے میں بالکل اچھا ہو گیا میں نے ان سے کہا کہ میں دودھ کے ترک کا عہد کر چکا ہوں۔ انہوں نے مجھے دلاسا دیا اور کہا ”آپ کو دودھ کی کوئی ضرورت نہیں بلکہ میں تو یہ چاہتا ہوں کہ کچھ دن تک آپ کسی قسم کی چکنائی استعمال نہ کریں۔“ انہوں نے میرے لئے جو غذا تجویز کی وہ روکھی روٹی کے کچے چقندر مولی، پیاز وغیرہ مختلف قسم کے ساگ اور تازہ پھل خصوصاً نارنگی پر مشتمل تھی۔ ترکاریوں کو پکانے کی اجازت نہیں تھی لیکن اگر چبانے میں دھت ہو تو پیس کر کھا سکتا تھا۔ میں نے تین دن تک یہ غذا استعمال کی لیکن کچی ترکاریاں مجھے موافق نہیں آئیں میرا جسم اتنا کمزور تھا کہ یہ تجربہ جیسا چاہیے تھا نہیں کر سکا۔ کچی ترکاریاں کھاتے میں ڈرتا تھا۔

ڈاکٹر ایلنسن نے یہ بھی کہا کہ اپنے کمرے کی کھڑکیاں ہر وقت کھلی رکھو نیم گرم پانی میں نہایا کرد جسم کے جس حصے میں ورم ہے وہاں تیل کی مالش کیا کرو اور پندرہ منٹ سے لے کر تیس منٹ تک کھلی ہوا میں ٹہلا کرو۔ مجھے یہ سب تجویزیں پسند آئیں۔

میرے کمرے میں فرانسیسی طرز کی کھڑکیاں تھیں اگر پانی برسے وقت یہ پوری کھلی رہیں تو کمرے میں بو چھار آتی تھی۔ ان کے اوپر جو روشندان تھے وہ کھل نہیں سکتے تھے۔ اس لئے میں نے روشندانوں کے شیشے تو دادیئے تاکہ تازہ ہوا آسکے اور کھڑکیاں اتنی کھول دیں کہ بو چھار نہ آئے۔ ان تدبیروں سے میری طبیعت کسی قدر سنبھل گئی مگر پوری صحت نہیں ہوئی۔

بیڈی سیلیا رابرٹس کبھی کبھی مجھے دیکھنے آیا کرتی تھیں۔ ہم دونوں میں دوستی ہو گئی انہوں نے مجھے بہت سمجھایا کہ دودھ کا استعمال شروع کر دو مگر میں جب کسی طرح نہ مانا تو انہیں یہ فکر ہوئی کہ دودھ کا کوئی بدل تلاش کریں۔ کسی نے انہیں ”مانڈ ملک“ (1) بتا دیا اور ناداقفیت کی بنا پر کہہ دیا کہ اس میں دودھ بالکل نہیں ہوتا۔ بلکہ یہ ایک کیمیادی مرکب ہے جس میں دودھ کی کل خاصیتیں موجود ہیں۔ بیڈی سیلیا میرے مذہبی جذبات کا بہت خیال رکھتی تھیں۔ اس لئے مجھے ان کی بات پر پورا اعتبار تھا۔ میں نے اس سفوف کو پانی میں گھول کر پیا تو اس میں بالکل دودھ کامزاتھا۔ اب مجھے شیشی کا لیبل پڑھنے کا خیال آیا۔ معلوم ہوا کہ یہ دودھ ہی کامرکب ہے۔ اس لئے میں نے پھر کبھی نہیں پیا۔

میں نے بیڈی سیلیا کو اس کی خبر کی اور کہلا بھیجا کہ جو ہوا سو ہوا آپ اس کا کچھ خیال نہ کیجئے۔ وہ بیچاری معذرت کرنے دوڑی آئیں اور کہنے لگیں کہ میرے دوست نے لیبل نہیں پڑھا تھا۔ میں نے کہا آپ بالکل تشویش نہ کیجئے۔ مجھے اس کا مطلق ملال نہیں بلکہ آپ سے ندامت ہے کہ آپ اتنی زحمت اٹھا کر یہ شیشی لائیں اور میں اسے کام میں نہیں لاسکتا۔ میں نے انہیں یقین دلایا کہ ناداقفیت کی بنا پر دودھ استعمال کر لینے میں میرے نزدیک کوئی گناہ نہیں۔

بیڈی سیلیا رابرٹس کی ہمدردی اور محبت کے بہت سے واقعات ہیں جن کی یاد میرے دل کو عزیز ہے مگر میں مجبوراً ان کا ذکر چھوڑتا ہوں۔ مجھے اور بہت سے دوست یاد آرہے ہیں جنہوں نے مصیبت اور مایوسی میں میری دستگیری کی جو دل نورایمان سے منور ہے۔ اسے ان کے پردے میں رحمت ایزدی کا جلوہ نظر آتا ہے جن کی بددلت رنج و الم کی تلخی میں حلاوت پیدا ہو جاتی ہے۔

ڈاکٹر ایلسن مجھے دوسری بار دیکھنے آئے تو انہوں نے پرہیز کی سختیاں کم کر دیں۔ انہوں نے کہا کہ تم مونگ پھلی اور زیتون کا تیل استعمال کر سکتے ہو اور کچی پاجی چاہے تو پکے ہوئے ساگ ترکاری چاول کے ساتھ کھا سکتے ہو۔ یہ تبدیلیاں خوشگوار تھیں مگر ان سے بھی مرض کا ازالہ نہیں ہوا۔ ابھی تیمار داری میں بڑی احتیاط کی ضرورت تھی اور زیادہ تر دولت بستر پر لیٹے لیٹے گزارنا پڑتا تھا۔

ڈاکٹر ہتاکبھی کبھی میری عیادت کو آتے تھے اور کہا کرتے تھے کہ آپ اب بھی میری بات مان لیجئے تو میں ذمہ لیتا ہوں کہ آپ کو اچھا کر دوں گا۔

اس اشارے میں ایک دن مسٹر رابرٹس مجھے دیکھنے آئے اور انہوں نے بڑے اصرار سے کہا کہ ”آپ وطن چلے جائے۔“ اس حالت میں آپ نٹیلے جانا ناممکن ہے ادھر سردی چمکنے کے دن آرہے ہیں۔ میری تو یہی صلاح ہے کہ آپ ہندوستان چلے جائے۔ پوری صحت آپ کو دیں جا کر ہو سکتی ہے۔ اگر

س وقت تک لڑائی جاری رہی تو وہاں بھی آپ کو سلطنت کی مدد کے بہت سے موقعے ملیں گے اور اب بھی آپ نے جو کچھ کیا ہے اسے میں کم نہیں سمجھتا۔
میں نے ان کا مشورہ قبول کر لیا اور ہندوستان جانے کی تیاریاں کرنے لگا۔

حوالہ

Malted Milk دودھ اور آب جو کا مرکب - 1

وطن کو واپسی

مسٹر کیلن باخ میرے ساتھ ہندوستان جانے کے ارادے سے آئے تھے۔ لندن میں وہ میرے ساتھ ہی رہتے تھے اور ہم دونوں ایک ہی جہاز میں روانہ ہونے والے تھے مگر جرمن نسل کو لوگوں کی نگرانی اس قدر سختی سے کی جا رہی تھی کہ انہیں پاسپورٹ (پروانہ راہداری) ملنا بہت مشکل نظر آتا تھا۔ میں نے اس معاملہ میں کوئی کوشش اٹھا نہیں رکھی۔ مسٹر رابرٹس انہیں پاسپورٹ دلانے جانے کے حامی تھے اور انہوں نے اس کے متعلق دائرہ کے متعلق کو تار دیا مگر لارڈ ہارڈنگ نے صاف جواب دے دیا ”مجھے افسوس ہے حکومت ہند ایسے خطرے میں پڑنے کے لئے تیار نہیں۔“ ہم سب لوگوں نے سمجھ لیا کہ اب کوشش کرنا بیکار ہے۔

مجھ پر کیلن باخ کی جدائی بہت شان گزری اور انہیں مجھ سے بھی زیادہ صدمہ ہوا۔ اگر وہ ہندوستان آتے تو آج میرے ساتھ کسان اور جولاہے کی سیدھی سادی زندگی کا لطف اٹھا رہے ہوتے۔ وہ آج کل جنوبی افریقہ میں پہلے کی طرح ماہر تعمیرات کی زندگی بسر کر رہے ہیں اور ان کا کام خوب چل رہا ہے۔ ہم تیسرے درجے کا ٹکٹ لینا چاہتے تھے مگر پی ایئر لائن کے جہازوں میں تیسرا درجہ تھا ہی نہیں۔ اس لئے مجبوراً دوسرے درجے میں سفر کرنا پڑا۔

ہم جنوبی افریقہ سے جو خشک میوہ لائے تھے وہ ہم نے ساتھ رکھ لیا کیونکہ جہاز پر تازے پھل تو ملتے تھے مگر خشک میوہ نہیں ملتا تھا۔

ڈاکٹر جیوراج مہتا نے میری پسلیوں پر ”میڈس پلاسٹر“ کی پٹی باندھ دی تھی اور یہ تاکید کر دی تھی کہ بحر قلم پہنچنے سے پہلے اسے نہ کھولنا۔ ڈون تک تو میں نے یہ تکلیف سہی مگر اس کے بعد برداشت نہ ہو سکی۔ بڑی مشکل سے میں نے پٹی چھرائی اور اچھی طرح نہانا شروع کیا۔

زیادہ تر میں تازے پھل اور خشک میوہ خصوصاً اخروٹ، مونگ پھلی وغیرہ کھاتا تھا۔ میری طبیعت روز بروز سنبھلتی جاتی تھی اور نہر سویز پہنچتے پہنچتے تقریباً پوری صحت ہو گئی۔ اب کمزوری کے سوا اور کوئی شکایت نہیں تھی۔ اس لئے میں رفتہ رفتہ ورزش بڑھاتا گیا۔ میرے خیال میں اس افاقہ کا سبب زیادہ تر منطقہ معتدلہ کی صحت بخش ہوا تھی۔ خدا جانے پرانے تجربے کی بنا پر جو خیال جم گیا تھا اس کا اثر تھا یا کوئی اور وجہ تھی کہ مجھے جہاز کے انگریز اور ہندوستانی مسافروں میں اس سے بھی زیادہ مفصل نظر آیا جو میں نے جنوبی افریقہ سے آتے ہوئے دیکھا تھا۔ میری چند انگریزوں سے بات چیت ہوئی مگر محض سرسری اور رسمی۔ جس بے تکلفی سے جنوبی افریقہ کے جہازوں پر گفتگو ہوتی تھی اس کا یہاں نام بھی نہ تھا۔ میرے خیال میں اس کا سبب یہ تھا کہ انگریز کو شعوری یا غیر شعوری طور پر ہمیشہ یہ احساس رہتا ہے کہ میں حاکم قوم کا فرد ہوں اور ہندوستانی کے دل میں یہ کھٹک رہتی ہے کہ میں محکوم قوم سے تعلق رکھتا ہوں۔

میری طبیعت اس فضا میں الجھتی تھی۔ جی چاہتا تھا کہ کسی طرح جلدی گھر پہنچوں۔ عدن میں آکر تھوڑا بہت وطن کا لطف آنے لگا۔ عدن والوں سے ہم سے اچھی طرح راہ درسم تھی۔ کیونکہ ڈربن میں مسٹر کیٹیاد کاؤس جی ڈشتا اور ان کی بیوی سے ہمارا میل جول رہ چکا تھا۔ چند روز میں ہم بمبئی پہنچ گئے۔ دس سال کی جلا وطنی کے بعد وطن کی صورت دیکھ کر اتنی خوشی ہوئی کہ دل ہی جانتا ہے۔

گو کھلے باوجود اپنی صحت کی خرابی کے مجھ سے ملنے بمبئی آئے تھے۔ ان کی تحریک سے یہاں میرا استقبال کیا گیا۔ میں دل میں یہ امید لئے ہوئے آیا تھا کہ ان کا دامن تھام لوں گا تو میرا بوجھ ہلکا ہو جائے گا مگر تقدیر کو کچھ اور منظور تھا۔

وکالت کے زمانے کی چند قابل ذکر باتیں

ہندوستان آنے کے بعد مجھ پر جو کچھ گزری اس کا ذکر کرنے سے پہلے یہ ضروری معلوم ہوتا ہے کہ جنوبی افریقہ کے چند تجربے جنہیں میں نے خاص کر کے چھوڑ دیا تھا بیان کر دوں۔ میرے بعض وکیل دوستوں نے مجھ سے فرمائش کی ہے کہ اپنی وکالت کے زمانے کی قابل ذکر باتیں لکھوں۔ ان کی تعداد اتنی ہے کہ اگر میں لکھنے پر آؤں تو ایک مستقل کتاب بن جائے اور میں کہیں سے کہیں پہنچ جاؤں۔ اس لئے میں چند ایسے واقعات کے ذکر پر اکتفا کرتا ہوں جو تلاش حق سے متعلق ہیں۔

غالباً میں پہلے کہہ چکا ہوں کہ میں نے اپنے پیشے میں کبھی جھوٹ بولنا گوارا نہیں کیا اور میری وکالت زیادہ ترقوی معاملات کے لئے وقف تھی۔ جس کا معاوضہ میں صرف اتنا لیتا تھا کہ جو کچھ مجھے اپنے پاس سے خرچ کرنا پڑا ہے وہ نکل آئے اور کبھی کبھی اسے بھی چھوڑ دیتا تھا۔ میرے خیال میں تو میری وکالت کے متعلق اس سے زیادہ کچھ کہنے کی ضرورت نہیں مگر دوستوں کا اصرار ہے کہ کچھ اور لکھوں۔ وہ سمجھتے ہیں کہ اگر میں ان موقعوں کا کچھ تھوڑا سا ذکر بھی کر دوں جہاں میں نے حق کی راہ میں استقلال دکھایا ہے تو دکیوں کے لئے فائدے سے غلی نہ ہو گا۔

بچپن میں میں نے سنا تھا کہ وکالت میں بے جھوٹ بولے کام نہیں چل سکتا۔ مگر میں نے اس کی کوئی پروا نہیں کی کیونکہ مجھے کچھ جھوٹ بول کر دولت یا عزت کمانا تو تھا ہی نہیں۔

جنوبی افریقہ میں میرے لئے امتحان کے بہت سے موقعے آئے اکثر مجھے یہ علم ہوتا تھا کہ فریق مخالف کے وکیلوں نے گواہوں کو سلکھایا پڑھایا ہے اور اگر میں بھی اپنے موکل یا اس کے گواہوں کو جھوٹ بولنے دوں تو مقدمہ جیت جاؤں گا مگر میں نے اسے کبھی جائز نہیں رکھا۔ صرف ایک بار ایک

مقدمہ جیتنے کے بعد مجھے یہ شبہ ہوا کہ میرے موکل نے مجھے دھوکہ دیا۔ میں اپنے دل میں ہمیشہ یہ دعا مانگا کرتا تھا کہ اگر میرا موکل حق پر نہ ہو تو میں مقدمہ ہار جاؤں۔ فیس مقرر کرتے وقت میں نے کبھی یہ شرط نہیں کی کہ اگر مقدمے میں کامیابی ہوئی تو زیادہ لوں گا۔ میرے موکل چاہے ہاریں یا جیتیں میں اپنی مقررہ فیس سے کم یا زیادہ نہیں لیتا تھا۔

میں ہر نئے موکل کو پہلے ہی جتادیتا تھا کہ مجھ سے جھوٹے مقدمے میں پیروی کرنے کی یا گواہوں کو سکھانے کی توقع نہ رکھو۔ جب اس بات کی شہرت ہو گئی تو میرے پاس جھوٹے مقدمے ہی آنا بند ہو گئے۔ بعض موکل یہ کرتے تھے کہ بچے مقدمے میرے پاس لاتے تھے اور جھوٹے مقدمے دوسروں کے پاس لے جاتے تھے۔

ایک موقع میرے لئے بڑی سخت آزمائش کا تھا۔ ایک موکل جس سے مجھے بہت سا کام ملا کرتا تھا میرے پاس ایک مقدمہ لایا جو بہت دن سے چل رہا تھا۔ یہ بھی کھاتے کا معاملہ تھا اور اس میں بڑی پیچیدگیاں تھیں۔ عدالت نے چند قابل محاسبوں کو منج مقرر کیا۔ انہوں نے میرے موکل کے حق میں فیصلہ کیا۔ لیکن ان کے حساب میں ایک غلطی رہ گئی یعنی ایک رقم جو خرچ کے خانے میں لکھی جانا چاہیے تھی آمدنی کے خانے میں لکھ دی گئی۔ رقم تو چھوٹی سی تھی مگر یہ غلطی بڑی فاش تھی فریق مخالف نے محاسبوں کے فیصلے کی اپیل دوسری وجوہ کی بنا پر کیا تھا۔ اس غلطی کا اسے علم نہ تھا۔ اس مقدمے کی اصل پیروی ایک دوسرے وکیل کر رہے تھے میں ان کا مددگار تھا۔ جب انہیں اس غلطی کا علم ہوا تو انہوں نے کہا ہمیں کیا پڑی ہے کہ اس کو ظاہر کرتے پھر اس خیال کے آدمی تھے کہ وکیل کو کسی ایسی بات کا اعتراف نہ کرنا چاہیے جو اس کے موکل کے خلاف پڑتی ہو۔ میں نے کہا کہ ہمیں یہ غلطی ظاہر کر دینا چاہیے۔

وکیل صاحب کہنے لگے ”اس صورت میں بڑا اندیشہ ہے کہیں عدالت پچوں کے فیصلے کو منسوخ نہ کر دے۔ کوئی وکیل جس کا دماغ صحیح ہے اپنے موکل کے مقدمے کو ایسے خطرے میں نہ ڈالے گا۔ مجھ سے تو یہ ہرگز نہیں ہو گا۔ اگر پھر نئے سرے سے کارروائی شروع ہوئی تو نہ جانے ہمارے موکل کو کتنی زیر باری ہو اور مقدمے کا کیا نتیجہ ہو؟“

یہ باتیں موکل کی موجودگی میں ہو رہی تھیں۔

میں نے کہا ”میرے خیال میں تو ہمیں اور ہمارے موکل کو یہ خطرہ برداشت کرنا چاہیے۔ یہ کونسی یقینی بات ہے کہ اگر ہم اس غلطی کو ظاہر نہ کریں تو عدالت پچوں کے فیصلے کو بحال رکھے گی اور فرض

کیجئے کہ ہمارے موکل کو نقصان بھی پہنچے تو کیا ہرج ہے؟“
 وکیل صاحب بولے ”مگر آثر اس کی ضرورت کیا ہے کہ ہم خواہ مخواہ اس غلطی کو ظاہر کر کے
 مقدمہ کمزور کر دیں؟“

میں نے عرض کیا آپ یہ کیسے کہہ سکتے ہیں کہ عدالت کی نظر اس غلطی پر نہ پڑے گی یا فریق مخالف
 کو اس کا پتہ نہ چلے گا؟“

انہوں نے اس قلیل وقار کو ختم کرنے کے لئے کہا ”تو پھر آپ ہی جا کر مقدمے میں بحث کیجئے۔
 میں آپ کی شرط ہرگز منظور نہیں کر سکتا۔“

میں نے عاجزی سے کہا ”اگر موکل کی خواہش ہو تو میں بحث کرنے کے لئے تیار ہوں۔ لیکن اسی
 شرط پر کہ غلطی کا اظہار کر دیا جائے۔ ورنہ مجھ سے اس مقدمے سے کوئی سروکار نہیں۔“

یہ کہہ کر میں نے موکل کی طرف دیکھا۔ وہ کچھ دیر شش دہخ میں رہا۔ وہ جانتا تھا کہ یہ مقدمہ میرا
 سمجھا ہوا ہے۔ اسے مجھ پر پورا اعتبار تھا اور میری طبیعت سے اچھی طرح واقف تھا۔ آخر اس نے کہا۔
 ”اچھی بات ہے آپ بحث کیجئے اور غلطی کا اظہار کر دیجئے۔ اگر تقدیر میں ہارنا لکھا ہے تو یہ ہی سہی۔
 سچے کا ساتھی خدا ہے۔“

مجھے بڑی خوشی ہوئی وکیل صاحب نے مجھے پھر سمجھایا اور میری ضد پر افسوس کیا۔ مگر اسی کے
 ساتھ انہوں نے مجھے مبارکباد بھی دی۔

عدالت میں جو کچھ گزری اس کا حال آئندہ باب میں ہو گا۔

چالبازی؟

مجھے پورا یقین تھا کہ میری رائے صحیح ہے۔ البتہ اس کا بڑا کھٹکا تھا کہ مقدمے کی پیردی جیسی چاہیے مجھ سے نہ ہو سکے گی۔ عدالت عالیہ کے سامنے ایسے پیچیدہ مقدمے میں بحث کرتے میرا دل ڈرتا تھا۔ جب میں ججوں کے سامنے گیا تو خوف سے کانپ رہا تھا۔

جیسے ہی میں نے حساب کی غلطی کا ذکر کیا ایک جج بول اٹھے۔ ”کیوں مسٹر گاندھی کیا یہ چالبازی نہیں ہے؟“

یہ سن کر مجھے ایک آگ لگ گئی۔ ایسے بے بنیاد الزام کو برداشت کرنا میری طاقت سے باہر تھا۔ میں نے دل میں سوچا کہ جب جج پہلے ہی سے بد ظن ہے تو ایسے پیچیدہ مقدمے میں کامیابی کی کیا امید ہو سکتی ہے مگر میں نے ضبط سے کام لے کر کہا۔ ”مجھے تعجب ہے کہ حضور والا نے پوری بات سنے بغیر مجھ پر چالبازی کا الزام لگا دیا۔“

جج نے کہا ”الزام کیسا میں نے تو ایک سوال پوچھا ہے۔“

”میرے نزدیک تو یہ سوال الزام سے کم نہیں۔ میں حضور والا سے درخواست کرتا ہوں کہ مجھے اپنی تقریر پوری کر لینے دیجئے اس کے بعد اگر میرا قصور ثابت ہو تو مجھے ملامت کیجئے۔“

”مجھے افسوس ہے کہ میں نے آپ کا قطع کلام کیا۔ آج جو کہہ رہے تھے کہئے۔“

میرے پاس صفائی کا پورا ثبوت تھا۔ اچھا ہوا کہ جج نے بحث چھیڑ دی اس کی وجہ سے عدالت شروع ہی سے میری تقریر کی طرف متوجہ ہو گئی۔ میں نے اس موقع سے فائدہ اٹھا کر معاملے کو بہت تفصیل سے سمجھایا سب ججوں نے میری بات کو غور سے سنا اور انہیں یقین آ گیا کہ بچوں سے نادانستہ غلطی ہو گئی۔ اس لئے انہوں نے یہ مناسب نہیں سمجھا کہ فیصلے کو سرے سے سنو خ کر کے بچوں کی

ساری محنت پر پانی پھیر دیں۔

فریق مخالف کے وکیل یہ سمجھے بیٹھے تھے کہ غلطی کے ظاہر ہو جانے کے بعد زیادہ ضرورت نہ بحث کی رہے گی۔ مگر ججوں کو تو یقین ہو گیا تھا کہ غلطی محض اتفاقی ہے اور آسانی سے صحیح کی جاسکتی ہے۔ اس لئے انہوں نے ان کی تقریر پر توجہ نہ کی۔ وکیل نے بہت زور لگایا کہ فیصلے کو غلط ٹھہرائیں مگر جج نے ابتدا میں شبہ کا اظہار کیا تھا۔ وہ اب کھلم کھلا میری طرفداری کرنے لگا۔

اس نے پوچھا۔ ”اگر مسٹر گاندھی خود غلطی کا اعتراف نہ کر لیتے تو آپ کیا کرتے؟ آپ کی نظر اس غلطی پر کیوں نہیں پڑی؟“

وکیل نے جواب دیا ”ہم نے اپنی طرف سے جو محاسب مقرر کیا تھا اس سے بڑھ کر ایماندار اور قابل آدمی ہمیں نہیں مل سکتا تھا۔ جب وہ اس غلطی کو نہ پکڑ سکا تو ہم کیا کر سکتے تھے؟“

جج نے کہا ”عدالت کے نزدیک آپ اپنے مقدمے کو اچھی طرح سمجھتے ہیں۔ اگر آپ سوائے اس غلطی کے جو بڑے سے بڑے محاسب سے بھی ممکن ہے اور کوئی پہلو اپنے موافق نہیں نکال سکتے تو کیا عدالت کے لئے یہ مناسب ہے کہ ایک ذرا سی غلطی کے لئے فریقین کو مزید مقدمہ بازی کی زیرباری برداشت کرنے دے؟ جب اس غلطی کی تصحیح آسانی سے ہو سکتی ہے تو دوبارہ تحقیقات کا حکم کیوں دیا جائے؟“

غرض عدالت نے وکیل کا اعتراض تسلیم نہیں کیا اور یا تو خود غلطی کی تصحیح کر کے بچوں کا فیصلہ برقرار رکھایا انہیں ہدایت کی کہ اسے درست کر دیں مجھے ٹھیک یاد نہیں کہ کیا صورت ہوئی۔ مجھے اس سے بیحد مسرت ہوئی میرا موکل اور اس کے دوسرے وکیل بھی بہت خوش ہوئے میرا یہ عقیدہ اور بختہ ہو گیا کہ دیانتداری کے ساتھ وکالت کرنا ناممکن نہیں ہے۔

مگر یہ یاد رہے کہ وکالت کے پیشے میں سچائی برتے سے بھی اس کی بنیادی خرابیاں دور نہیں ہو سکتیں۔

موکل رفیق بن گئے

نشال اور ٹرانسوال کی وکالت میں یہ فرق تھا کہ نشال میں وکیل اور بیرسٹر مقدمے کو ترتیب بھی دے سکتے تھے اور پیروی بھی کر سکتے تھے۔ مگر ٹرانسوال میں بمبئی کی طرح یہ دونوں پیشے الگ کر دیئے گئے تھے۔ مقدمہ کی ترتیب کا کام اٹرنی (1) کرتے تھے۔ اور پیروی ایڈوکیٹ (2) بیرسٹر کو اختیار تھا کہ چاہے اٹرنی کا پیشہ اختیار کرے چاہے ایڈوکیٹ کا۔ میں نشال کی مجلس وکلاء میں ایڈوکیٹ کی حیثیت سے داخل ہوا تھا۔ مگر ٹرانسوال آکر میں نے اٹرنی کا کام شروع کیا۔ کیونکہ ایڈوکیٹ کی حیثیت سے مجھے ہندوستانیوں سے براہ راست ملنے کا موقع نہ ملتا اور جنوبی افریقہ کے یورپی اٹرنی مجھے مقدمے بھی نہ دیتے۔

مگر ٹرانسوال میں بھی اٹرنی مجسٹریٹوں کی عدالت میں پیروی کرنے کے مجاز تھے۔ ایک بار جوہانسبرگ میں ایک مجسٹریٹ کی عدالت میں پیروی کرتے ہوئے مجھے یہ پتہ چل گیا کہ میرے موکل نے مجھے دھوکا دیا جرح میں وہ بالکل اکھڑ گیا۔ اس لئے میں نے بغیر کسی بحث کے مجسٹریٹ سے درخواست کی کہ میرے موکل کے خلاف فیصلہ کر دیا جائے۔ فریق مخالف کا وکیل حیرت میں رہ گیا اور مجسٹریٹ بہت خوش ہوا۔ میں نے اپنے موکل کو بہت ملامت کی کہ تم جھوٹا مقدمہ میرے پاس کیوں لائے؟ اس نے اپنی خطا کا اقرار کیا اور میرے خیال میں وہ مجھ سے اس بات پر ناراض نہیں ہوا کہ میں نے اس کے خلاف فیصلہ کر دیا۔ بہر حال میرے اس طرز عمل سے میری وکالت کو نقصان نہیں پہنچا بلکہ میرے کام میں بڑی آسانی ہو گئی۔ ہم پیشہ لوگوں میں میری ساکھ قائم ہو گئی اور باوجود نسل کے تعصب کے ان میں سے بعض میرے دوست بن گئے۔

میرا یہ بھی معمول تھا کہ اپنی جہالت کو اپنے موکلوں یا اپنے ہم چشموں سے کبھی نہیں چھپاتا تھا۔ جب کبھی کوئی مقدمہ میری سمجھ میں نہیں آتا تھا تو میں موکل کو یہ مشورہ دیتا تھا کہ کسی دوسرے وکیل کے پاس جائے اگر وہ مجھی کو وکیل کرنے پر مصر ہوتا تھا۔ تو میں اس کی اجازت سے کسی بڑے وکیل کو شریک کر لیتا تھا۔ اس طرز عمل کی بدولت میرے موکلوں کو مجھ سے بڑی محبت ہو گئی اور وہ مجھ پر بے حد اعتبار کرنے لگے۔ جب کسی بڑے وکیل سے مشورہ کرنے کی ضرورت ہوتی تھی تو وہ خوشی سے اس کی نہیں ادا کرتے تھے۔

میں پہلے کہہ چکا ہوں کہ جنوبی افریقہ میں وکالت کرنے میں میرا اصل مقصد قومی خدمت کرنا تھا اس کے لئے بھی لوگوں کی نظر میں اپنا اعتبار قائم کرنا بہت ضروری تھا۔ ہندوستانیوں کی کہیم انٹنسی کی انتہا ہے کہ میں جو کام نہیں لے کر کرتا تھا اسے بھی وہ قومی خدمت سمجھتے تھے اور جب میں نے انہیں یہ رائے دی کہ اپنے حقوق کی خاطر جیل جاؤ تو وہ زیادہ تر میری محبت میں اور میرے اعتبار پر خوشی سے راضی ہو گئے۔

ان سطروں کو لکھتے وقت میرا دل ایسے بہت سے واقعات کی یاد کے مزے لے رہا ہے۔ میرے سینکڑوں موکل قومی خدمت میں میرے دست و بازو بن گئے اور ان کی بدولت وہ کاتے جو میری راہ میں تھے پھول ہو گئے۔

میں نے ایک موکل کو کیونکر بچایا

اس کتاب کے پڑھنے والے پارسی رستم جی کے نام سے واقف ہو گئے ہوں گے وہ ان لوگوں میں سے تھے جو میرے موکل بھی تھے اور رفیق بھی بلکہ رفیق پہلے تھے اور موکل بعد میں بنے انہیں مجھ پر اتنا اعتبار ہو گیا کہ خانگی معاملات میں بھی میرے مشورے پر عمل کرنے لگے یہاں تک کہ دوا علاج میں بھی مجھ سے مدد لینے لگے۔ گو ہم دونوں کی طرز زندگی میں بہت فرق تھا مگر وہ بے تامل میری عطائی تدبیروں پر عمل کرتے تھے۔

ایک بار بچارے بڑی مصیبت میں پھنس گئے۔ عموماً وہ اپنے معاملات کا ذکر مجھ سے کر دیتے تھے مگر ایک بات انہوں نے چھپا رکھی تھی۔ وہ ہمیں اور کلکتے سے بہت سامان منگواتے تھے اور اکثر چنگلی سے بچا کر نکال لاتے تھے۔ چنگلی کے بہت سے افران کے دوست تھے۔ اس لئے کسی کو ان پر شبہ نہیں ہوتا تھا۔

مگر بقول گجراتی شاعر آکھو کے ”کچو پارو کھا دو آن تپو دن چھے چوری نو دھن“ یعنی پارہ کی طرح چوری بھی نہیں دیتی۔ ایک دن رستم جی پھنس گئے وہ دوڑے ہوئے میرے پاس آئے اور رو کر کہنے لگے۔ ”بھائی، میں نے تمہیں بڑا دھوکا دیا۔ آج میری چوری پکڑی گئی۔ میں مال چنگلی سے بچا کر لایا کرتا تھا۔ اب ہمید کھل گیا۔ مجھ جیل جانا پڑے گا۔ بائے میں تباہ ہو گیا۔ میرے بھائی، مجھے بچائیے۔ میں نے آپ سے کبھی کوئی بات نہیں چھپائی۔ مگر ان بیوپار کے ہتھکنڈوں کا کیا ذکر کرتا۔ کاش! میں نے آپ سے کہہ دیا ہوتا۔“

میں نے انہیں دلاسا دیا اور کہا ”آپ کا بچنا یا نہ بچنا خدا کے ہاتھ ہے رہا میرا اصول آپ جانتے ہیں میں آپ کو بچانے کی کوشش اسی صورت میں کر سکتا ہوں۔ کہ آپ حکام کے سامنے اپنے جرم کا اقرار کر

لیں۔"

یہ سن کر ان کا رنگ فق ہو گیا۔ انہوں نے پوچھا۔ "مگر میں نے آپ کے سامنے تو اقرار کر لیا، کیا یہ کافی نہیں ہے؟"

میں نے نرمی سے جواب دیا "آپ نے سرکار کی چوری کی ہے میری نہیں کی۔ پھر میرے سامنے اقرار کرنے سے کیا فائدہ؟"

رستم جی بولے۔ "آپ جو کچھ کہیں گے وہی کروں گا۔ مگر میرے پرانے وکیل مسٹر۔۔۔۔۔ سے بھی تو سچہ لیجئے۔ وہ بھی تو اپنے دوست ہیں۔"

دریافت کرنے سے معلوم ہوا کہ یہ سلسلہ عرصے سے جاری تھا مگر جو مال پکڑا گیا وہ تھوٹا ہی سا ہے۔ ہم دونوں وکیل کے پاس گئے۔ انہوں نے کاغذات کو دیکھ کر کہا "مقدمہ جوری کے سامنے پیش ہو گا اور مثال کی جوری سے یہ توقع نہیں کہ کسی ہندوستانی کو بری کر دے مگر پھر بھی اپنی سی کرنی چاہیئے۔"

میں ان وکیل صاحب سے اچھی طرح واقف نہیں تھا۔ پارسی رستم جی نے ان کی بات کاٹ کر کہا۔ "میں آپ کا شکریہ ادا کرتا ہوں۔ مگر میں اس مقدمے کو مسٹر گاندھی کے سپرد کرنا چاہتا ہوں۔ یہ میرے معاملات سے اچھی طرح واقف ہیں۔ جب ضرورت ہوگی یہ آپ سے مشورہ لے لیں گے۔"

وہاں سے اٹھ کر ہم دونوں رستم جی کی دوکان پر پہنچے۔ اب میں نے انہی اپنی رائے بتائی۔ "میرے خیال میں مقدمے کو عدالت تک نہیں جانے دینا چاہیئے۔ مقدمہ چلانا یا نہ چلانا جنگی کے افسر کے اختیار میں ہے اور وہ اٹرنی جنرل سے رائے لے گا۔ میں ان دونوں کے پاس چلتا ہوں۔ میری رائے میں وہ جو کچھ جرمانہ کریں۔ آپ دے دیجئے۔ غالباً وہ اس پر راضی ہو جائیں گے اگر نہ ہوئے تو آپ جیل جانے کو تیار رہیئے میرا تو یہ عقیدہ ہے کہ جیل جانے میں اس قدر شرم اور ذلت نہیں جتنی جرم کے ارتکاب میں ہے۔ شرم کی جو بات تھی وہ تو ہو چکی۔ اب جیل جانے کو آپ ایک طرح کا کفارہ سمجھئے۔ مگر اصلی کفارہ یہ ہے کہ آپ آئندہ کے لئے اس حرکت سے توبہ کیجئے۔"

پارسی رستم جی کو یہ باتیں ناگوار ہوئی ہوں گی۔ وہ بڑے بہادر آدمی تھے مگر اس وقت ان کی ہمت نے جواب دے دیا تھا۔ ان کی عزت، آبرو خطرے میں تھی۔ وہ دل میں کہتے ہوں گے۔ "یہ عمارت جو میں نے بڑی محنت سے کھدی کی ہے مسمار ہو کر پیٹھ گئی تو میں کہیں کا نہ رہوں گا۔"

انہوں نے کہا۔ "میں نے تو سب کچھ آپ پر ہی چھوڑ دیا ہے۔ آپ جو مناسب سمجھئے کیجئے۔"

میں نے اپنی ساری شیوا زبانی اس معاملے میں صرف کر دی۔ چنگی کے افسر کے پاس جا کر میں نے اس سے سارا واقعہ صاف صاف بیان کر دیا۔ میں نے کہا کہ آپ سارے ہی کھاتے دیکھ لیجئے اور جو جرمانہ مناسب سمجھئے لے لیجئے۔ رستم جی کی حالت رحم کے قابل ہے۔ بیچارے اپنے قصور پر بے حد نادم ہیں۔

اس نے کہا۔ ”مجھے یہ بوڑھا پارسی بہت پسند ہے۔ مجھے افسوس ہے کہ اس نے ایسی حماقت کی۔ مگر آپ جانتے ہیں کہ میرا فرض اس معاملے میں کیا ہے۔ میں اڑنی جنرل سے رائے لینے پر مجبور ہوں۔ آپ ان کو سمجھانے کی کوشش کیجئے۔“

میں نے کہا ”اگر آپ معاملے کو عدالت تک نہ جانے دیں تو بڑا احسان ہو گا۔“ ان سے یہ وعدہ لے کر میں اڑنی جنرل سے ملا۔ انہیں میری صاف گوئی پسند آئی اور یہ یقین ہو گیا کہ میں نے ان سے کوئی بات نہیں چھپائی۔

مجھے یاد نہیں کہ یہی معاملہ تھا یا کوئی اور تھا۔ جس میں انہوں نے میری صاف گوئی اور اصرار سے مجبور ہو کر کہا تھا۔ ”معلوم ہوتا ہے کہ آپ کبھی اپنی بات منوائے بغیر نہیں رہتے۔“ رستم جی والے مقدمے میں سمجھوتا ہو گیا۔ انہوں نے جتنے محصول کی چوری کا اقرار کیا تھا اس کا دوچند جرمانہ انہیں ادا کرنا پڑا۔

رستم جی نے سارا واقعہ لکھ کر ایک چوکھے میں لگایا اور اپنے دفتر میں لٹکا دیا کہ ان کے دارثوں اور دوسرے تاجروں کو عبرت ہو۔

رستم جی کے دوستوں نے مجھ سے کہا کہ آپ ان کی اس عارضی ندامت سے دھوکا نہ کھائیے۔ میں نے ان سے ذکر کیا تو کہنے لگے۔ ”آپ کو دھوکا دے کر میں جاؤں گا کہاں؟“

حصہ پنجم

پہلا تجربہ

ہم وطن پہنچے تو فینکس والے وہاں پہلے سے موجود تھے۔ میرا قصد ان سے پہلے پہنچنے کا تھا مگر جب میں انگلستان میں لڑائی کے بلکیزے میں پڑ گیا۔ اور میرا واپسی کا کچھ ٹھیک نہ رہا تو مجھے یہ فکر پیدا ہوئی کہ ہندوستان میں ان لوگوں کے قیام کا کیا انتظام ہو گا۔ میں چاہتا تھا کہ جہاں تک ہو سکے یہ سب رہیں اور وہی پرانی زندگی بسر کریں۔ میری نظر میں کوئی ایسا شرم نہیں تھا جہاں یہ رہ سکیں اس لئے میں نے انہیں تار دے دیا کہ مسز اینڈریوز سے مل کر ان کی رائے پر عمل کریں۔

چنانچہ پہلے یہ لوگ کانگری کے گرد کل میں گئے۔ جہاں سوامی شر دھاند نے انہیں اپنے بچوں کی طرح رکھا اس کے بعد شانتی نکتین کے آشرم میں نگر اور ان کے رفیقوں کے سایہ عاطفت میں رہے۔ دونوں جگہ رہ کر انہوں نے جو تجربہ حاصل کیا وہ میرے لئے اور ان کے لئے بہت مفید ثابت ہوا۔ میں اینڈریوز سے کہا کرتا تھا کہ آپ کی تثلیث مہاکوی نگر پر نسل سوشیل رور اور شر دھاند جی پر مشتمل ہے۔ جنوبی افریقہ میں ہمیشہ ان تینوں کی تعریف کیا کرتے تھے۔ ان کی باتیں اب تک میرے دل پر نقش ہیں اور ان کی یاد بہت خوشگوار ہے۔

شانتی نکتین میں اینڈریوز نے فینکس والوں کو سوشیل رور کے سپرد کر دیا۔ پر نسل رور کا کوئی آشرم نہیں تھا ایک گھر تھا جو انہوں نے فینکس کے خاندان کو دے دیا۔

شانتی نکتین والے ان سے اس طرح گھل مل گئے کہ ان کے دل سے فینکس کی یاد جاتی رہی۔ مجھے بھئی پوچھ کر معلوم ہوا کہ فینکس والے شانتی نکتین میں ہیں، مجھے یہ بے تابی تھی کہ گو کھلے کی زیارت کرنے کے بعد جتنی جلدی ہو سکے ان سے جا ملوں۔ بھئی میں میرے استقبال میں اس قدر اہتمام ہوا کہ مجھے چھوٹی سی ستیہ گرہ کرنا پڑی۔

مسٹر جہانگیر پیٹ کے گھر پر جو پارٹی مجھے دی گئی اس میں میری ہمت نہ پڑی کہ گجراتی میں تقریر کروں۔ اس عالی شان محل میں میرا جیسا شخص، جس کی زندگی کا اکثر حصہ پابند مزدوروں کی صحبت میں گزرا تھا بالکل گنوار معلوم ہوتا تھا۔ میں ان دنوں کاٹھیاداری انگرکھا پہنتا تھا اور پگڑی اور دھوتی باندھتا تھا۔ اس وضع میں میں آج کل کے مقابلے میں زیادہ مہذب نظر آتا تھا لیکن مسٹر پیٹ کے محل کی شان و شوکت میں کیسے کھپ سکتا تھا۔ بہر حال میں نے سرفیروز شاہ ہتسا کا سہارا لے کر کسی طرح کام چلایا۔

اس کے بعد گجراتیوں کے جلسے میں جانا پڑا۔ یہ جلسہ آتا تل تر ویدی آنجہانی کے اہتمام میں کیا گیا تھا۔ میں نے اس کا پروگرام پہلے سے معلوم کر لیا تھا۔ مسٹر جناح جو گجراتی ہیں وہاں موجود تھے۔ مگر یہ یاد نہیں کہ وہ جلسے کے صدر تھے یا اس کے ترجمان، انہوں نے انگریزی میں ایک اعلیٰ درجے کی چھوٹی سی تقریر کی۔ جہاں تک مجھے یاد ہے اکثر تقریریں انگریزی میں ہوئیں۔ جب میری باری آئی تو میں نے گجراتی میں حاضرین کا شکریہ ادا کیا۔ میں نے کہا کہ میں گجراتی اور ہندوستانی کو انگریزی پر ترجیح دیتا ہوں اور عاجزی کے ساتھ اس بات کی شکایت کرتا ہوں کہ گجراتیوں کے مجمعے میں تقریریں انگریزی میں کی گئیں۔ یہ بات میں نے ڈرتے ڈرتے کہی تھی کہ کہیں ایک نئے آدمی کا جو مدت تک جلا وطن رہنے کے بعد گھر لوٹا ہے۔ عام رواج پر اعتراض کرنا عطف تہذیب نہ سمجھا جائے۔ مگر مجھے بڑی خوشی ہوئی کہ لوگوں نے میرے اعتراض کو چپ چاپ سن لیا۔

اس سے میری ہمت بندھ گئی اور میرے دل میں یہ امید پیدا ہو گئی کہ مجھے اپنے انوکھے خیالات اپنے ہموطنوں کے سامنے پیش کرنے میں کوئی دقت نہیں ہوگی۔

چند دن بمبئی ٹھہر کر، میں ان پہلے تجربوں کے نشے میں سرشار، گھوکھلے سے ملنے پوناروانہ ہو

گیا۔

گو کھلے کے ساتھ پونا میں

جیسے ہی میں بمبئی میں داخل ہوا گو کھلے کا پیغام پہنچا کہ گورنر تم سے ملنا چاہتے ہیں پونا آنے سے پہلے ان سے مل لو چنانچہ میں بڑا کسی یسینی کی خدمت میں حاضر ہوا پہلے ادھر ادھر کی باتیں ہوتی رہیں اس کے بعد انہوں نے فرمایا۔

”میں آپ سے ایک بات کا وعدہ لینا چاہتا ہوں وہ یہ ہے کہ آپ جب کبھی کوئی ایسی تجویز سوچیں جس کا تعلق گورنمنٹ سے ہو تو مجھ سے ضرور مل لیا کریں۔“

میں نے جواب دیا۔ ”مجھے یہ وعدہ کرنے میں کوئی تامل نہیں۔ میں ستیا گرہی ہوں۔ میرا تو یہ اصول ہی ہے کہ اپنے مخالفوں کے خیالات کو سمجھنے کی کوشش کروں اور ان میں جو باتیں مجھے معقول نظر آئیں ان لوں جنوبی افریقہ میں میں نے ہمیشہ اس کی پابندی کی اور یہاں بھی کروں گا۔“

لارڈ ولننگٹن نے میرا شکریہ ادا کیا اور کہا کہ ”آپ کا جب جی چاہے میرے پاس چلے آیا کیجئے۔ آپ دیکھ لیں گے کہ میری گورنمنٹ جان بوجھ کر برائی نہیں کرنا چاہتی۔“

میں نے اس کے جواب میں عرض کیا۔ ”اسی عقیدے کی بدولت میری ہمت بندھی ہوئی ہے۔“ اس کے بعد میں پونا گیا۔ ان مبارک دنوں کے بہت سے واقعات مجھے یاد ہیں۔ مگر ان سب کو یہاں بیان نہیں کر سکتا۔ گو کھلے اور انجمن خدام ہند کے ممبروں نے مجھے محبت کی دولت سے مالا مال کر دیا۔ جہاں تک مجھے یاد ہے گو کھلے نے کل ممبروں کو مجھ سے ملانے کے لئے بلایا تھا میں نے ان سے ہر قسم کے موضوع پر آزادی سے گفتگو کی۔

گو کھلے دل سے چاہتے تھے کہ میں انجمن کا ممبر بن جاؤں اور میری بھی یہی آرزو تھی مگر ممبروں کا یہ خیال تھا کہ میرے اور ان کے نصب العین اور طریق کار میں بہت فرق ہے۔ اس لئے میرا انجمن میں شامل ہونا مناسب نہیں۔

گو کھلے کو میرے متعلق یقین تھا کہ گو میں اپنے اصول کا سختی سے پابند ہوں مگر ان لوگوں سے، جن کا عقیدہ میرے عقیدے سے مختلف ہو، رواداری برت سکتا ہوں۔

انہوں نے مجھ سے کہا۔ ”مشکل یہ ہے کہ انجمن کے ممبروں کو ابھی تک یہ اندازہ نہیں ہوا کہ تمہاری طبیعت میں سازگاری کی کتنی صلاحیت ہے۔ یہ لوگ اپنے اصول کے پکے ہیں اور اپنی رائے میں آزاد ہیں مجھے امید ہے کہ یہ تمہیں ممبر بنانے پر راضی ہو جائیں گے۔ لیکن اگر نہ بھی ہوں تو تم یہ ہرگز نہ سمجھنا کہ ان کے دل میں تمہاری وقعت اور محبت نہیں۔ انہیں زیادہ تامل اسی لئے ہے کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ اختلاف رائے کی وجہ سے تمہارا احترام ان کی نظر میں کم ہو جائے مگر چاہے تم باضابطہ ممبر بنائے جاؤ یا نہ بنائے جاؤ میں تو تمہیں ممبر سمجھوں گا۔“

میں نے ان سے کہا کہ میرا ارادہ ہے خواہ میں انجمن میں داخل کیا جاؤں یا نہ کیا جاؤں دونوں صورتوں میں اپنا ایک الگ آشرم گجرات کے کسی حصے میں قائم کروں۔ کیونکہ میں گجراتی ہوں اور مجھے اسی میں آسانی ہے کہ گجرات کی خدمت کے ذریعے سے ہندوستان کی خدمت کروں۔

گو کھلے کو یہ تجویز پسند آئی۔ انہوں نے کہا ”تم آشرم ضرور قائم کروں۔ انجمن کے ممبروں سے تم سے کوئی سمجھوتہ ہو یا نہ ہو، میں تمہارے آشرم کو اپنا آشرم سمجھوں گا اور اس کا کل خرچ دوں گا۔“

میں خوشی سے پھولا نہ سمایا۔ میرے لئے اس سے بڑھ کر اور کیا ہو سکتا تھا کہ چندہ جمع کرنے کی ذمہ داری سے آزاد رہوں اور مجھے یہ اطمینان رہے کہ سب کچھ مجھی کو نہیں کرنا ہے بلکہ ایک رہنما موجود ہے جو مشکلوں میں میری مدد کرے گا۔ گو کھلے کے اس وعدے سے میرے دل سے بڑا بوجھ ہٹ گیا۔

انہوں نے ڈاکٹر دیو آنجہانی کو بلا کر حکم دیا کہ انجمن کے کھاتے میں ان کا حساب کھول دیا جائے اور انہیں آشرم کے اور قومی کاموں کے لئے بچتے روپے کی ضرورت ہو دے دیا جائے۔“

اب میں نے ثنائی نکلیتین جانے کی تیاری کی۔ میری روانگی سے ایک دن پہلے گو کھلے نے اپنے خاص دوستوں کی چائے کی دعوت کی۔ میرے خیال سے انہوں نے میری پسند کی چیز یعنی خشک اور تر میوہ منگوا یا۔ یہ پارٹی ان کے کمرے سے چند ہی قدم کے فاصلے پر ہوئی مگر ان میں وہاں تک جانے کی طاقت نہیں تھی پھر بھی میری محبت انہیں وہاں تک کھینچ لائی۔ آنے کو تو وہ آگئے مگر اتنی تکان ہوئی کہ انہیں غش آگیا اور لوگ انہیں اٹھا کر لے گئے۔ یہ غشی کے دورے انہیں اکثر ہوا کرتے تھے۔ اس لئے جب انہیں ہوش آیا تو انہوں نے کہلا بھیجا کہ پارٹی میں دیر نہ کی جائے۔

یہ پارٹی چند دوستوں کا مجمع تھا جو انجمن کے مہمان خانے کے سامنے زیر آسمان بیٹھے گپ شپ کر

رہے تھے اور بچ بچ میں مونگ پھلی کھجوریں اور موسمی پھل کھاتے جاتے تھے۔
مگر یہ غشی کا دورہ میری زندگی میں ایک بڑے انقلاب کا پیش خیمہ تھا۔

حوالہ

Servants of India Society - 1

کیا یہ دھمکی تھی؟

پونا سے میں راجکوٹ اور پور بندر گیا جہاں مجھے اپنی بھانج اور دوسرے عزیزوں سے ملنا تھا۔ جنوبی افریقہ کے ستیاگرہ کے زمانے میں میں نے اپنی وضع ”پابند مزدوروں“ کی سی بنالی بھی اور انگلستان میں بھی گھر کے اندر یہی کپڑے پہنتا تھا۔ بمبئی میں جہاز سے اترنے سے پہلے میں نے کانٹیا داری لباس پہن لیا تھا۔ یعنی کرتا، انگرکھا، دھوتی، پگڑی اور گلے میں آزاد دپٹہ۔ یہ سب چیزیں سوڈیشی تھیں مگر چونکہ مجھے بمبئی سے تیسرے درجے میں سفر کرنا تھا اس لئے میں نے انگرکھے اور دپٹے کو خیر باد کہی اور پگڑی کی جگہ ایک آٹھ، دس آنے کی کشمیری ٹوپی سر پر رکھ لی۔ اس وضع میں جو شخص مجھے دیکھتا وہ غریب آدمی سمجھتا۔

اس زمانے میں طاغون پھیلا ہوا تھا اور ویرام گام یا دودھوان میں تیسرے درجے کے مسافروں کا ڈاکٹر معائنہ کیا جاتا تھا مجھے خفیف سی حرارت تھی۔ انسپکٹرنے یہ دیکھ کر میرا نام لکھ لیا اور مجھ سے کہا کہ تم راجکوٹ کے میڈیکل افسر کے پاس حاضر ہو جانا۔

شاید کسی شخص نے یہ اطلاع دے دی تھی کہ میں دودھوان اسٹیشن سے گزروں گا کیونکہ موتی لال درزی جو وہاں کے مشہور قومی کارکن تھے مجھ سے ملنے اسٹیشن پہنچے۔ انہوں نے ویرام گام کے حالات سنائے کہ وہاں ریل کے مسافروں کو کیسی کیسی تکلیفیں اٹھانا پڑتی ہیں، میری طبیعت بخار کے سبب سے باہیں کرنے کو نہیں چاہتی تھی۔ اس لئے میں نے گفتگو کو مختصر کرنے کے خیال سے پوچھا۔ ”تم لوگ جیل جانے کو تیار ہو؟“ میں سمجھتا تھا کہ موتی لال ان جلد باز جوانوں میں سے ہیں جو بے سمجھے بوجھے جو جی میں آتا ہے کہہ ڈالتے ہیں مگر یہ بات نہیں تھی انہوں نے استقلال کے لہجے میں جواب دیا۔

”بیشک ہم تیار ہیں بشرطیکہ آپ ہماری رہنمائی کریں۔ ہم کانٹیا داڑیوں کا آپ پر جتنا حق ہے کسی کا نہیں اس وقت ہم آپ کو روکنا نہیں چاہتے۔ مگر آپ یہ وعدہ کر لیجئے کہ واپسی میں یہاں ضرور

ٹھہریں گے۔ آپ ہمارے یہاں کے نوجوانوں کا جوش اور ان کا کام دیکھ کر بہت خوش ہوں گے اور آپ جو حکم دیں گے اس کی فوراً تعمیل ہوگی۔“

موتی لال نے میرے دل میں جگہ کر لی۔ ان کے ساتھی نے ان کی تعریف میں کہا۔ ”میرے دوست ہیں تو درزی مگر اپنے فن میں اس قدر ماہر ہیں کہ ایک گھنٹہ روز کام کر کے پندرہ روپیہ مہینہ کما لیتے ہیں جو ان کے خرچ کے لئے کافی ہے اور باقی دولت قومی خدمت میں صرف کرتے ہیں۔ ہم پڑھے لکھے لوگ انہیں اپنا رہنما سمجھتے ہیں۔ ان کا خلوص اور ایثار دیکھ کر ہمیں اپنے اوپر شرم آتی ہے۔“

آگے چل کر میرا موتی لال سے بہت سابقہ رہا اور مجھے معلوم ہو گیا کہ اس تعریف میں ذرا بھی مبالغہ نہیں تھا۔ انہوں نے یہ معمول کر لیا کہ ہمارے نئے آشرم میں ہر مہینے چند روز کے لئے آتے تھے۔ ہم لوگوں کے کپڑے سینے تھے اور ہمیں درزی کا کام سکھاتے تھے۔

وہ ہمیشہ دیرام گام کے حالات سنایا کرتے تھے اور مسافروں کی تکلیفوں کا ذکر کیا کرتے تھے۔ یہ صدمہ ان سے کسی طرح برداشت نہیں ہوتا تھا۔ کچھ دن کے بعد وہ دفعتاً بیمار پڑے اور عین جوانی میں دنیا سے رخصت ہو گئے۔ ددھوان کی قومی زندگی کو ان کی وفات سے بڑا نقصان پہنچا۔

غرض میں راجکوٹ پہنچ گیا اور دوسرے دن صبح کو میڈیکل افسر کے پاس حاضر ہوا وہاں لوگ مجھ سے واقف نہیں تھے۔ ڈاکٹر صاحب بہت شرمندہ ہوئے اور انہی انسپکٹر پر بڑا غصہ آیا ان کی یہ ننگی بیجا تھی کیونکہ انسپکٹر نے تو اپنا فرض ادا کیا تھا۔ وہ مجھے نہیں جانتا تھا اور اگر جانتا بھی ہوتا تو اسے یہی کرنا چاہیے تھا۔ میڈیکل افسر نے بڑے اصرار سے مجھے دوبارہ اس کے پاس جانے سے روکا اور ایک دوسرے انسپکٹر کو میرے گھر پر بھیج دیا۔

ایسے موقعوں پر تیسرے درجے کے مسافروں کا طبی معائنہ حفظانِ صحت کے لحاظ سے ضروری ہے۔ اگر بڑے آدمی تیسرے درجے میں سفر کریں تو انہیں خود بخود ان تمام ضابطوں کی پابندی کرنا چاہیے جو غریبوں کے لئے مقرر ہیں اور سرکاری ملازموں کو غریب اور امیر میں فرق نہیں کرنا چاہیے۔ مگر میرا تجربہ یہ ہے کہ سرکاری ملازم تیسرے درجے کے مسافروں کو اپنا ہم جنس نہیں بلکہ بھیر، بکری سمجھتے ہیں۔ وہ ان کے ساتھ حقارت سے گفتگو کرتے ہیں اور انہیں یہ برداشت نہیں کہ کوئی ان کی بات کا جواب دے یا ان سے بحث کرے بیچارے مسافر نوکروں کی طرح ان کی اطاعت کرتے ہیں اور یہ بے تکلف انہیں مار پیٹتے ہیں ان سے ڈرا دھمکا کر روپیہ اینٹھتے ہیں اور انہیں ٹکٹ تک رلا کر دیتے ہیں۔ چاہے ان کی گاڑی کیوں نہ چھوٹ جائے۔ یہ سب باتیں میں نے اپنی آنکھ سے دیکھی ہیں۔ ان کی اصلاح کی

صرف یہی صورت ہے کہ چند تعلیم یافتہ اور دولت مند لوگ غریبوں کی وضع اختیار کر کے تیسرے درجے میں سفر کیا کریں اگر ان کے ساتھ غریبوں کے مقابلے میں کوئی رعایت کی جائے تو قبول نہ کریں اور جس تکلیف، بد سلوکی، بے انصافی کا دور کرنا ممکن ہو اسے چپ چاپ سہنے کے بجائے اس کے خلاف احتجاج کریں۔

میں کانٹھیا دار میں جہاں کہیں گیا میں نے یہی شکایت سنی کہ ویرام کام میں جنگی والے مسافروں کو بہت دق کرتے ہیں اس لئے میں نے یہ مناسب سمجھا کہ لارڈ ونگٹن کی فرمائش سے فائدہ اٹھاؤں۔ اس مسئلے کے متعلق جتنا مواد مل سکا میں نے جمع کیا اور اس کو غور سے پڑھا جب مجھے یقین ہو گیا کہ لوگوں کی شکایتیں بجا ہیں تو میں نے حکومت بمبئی سے خط و کتابت شروع کی۔ میں لارڈ ونگٹن کے پرائیویٹ سیکرٹری سے ملا اور خود ہزا کسلینسی کی خدمت میں بھی حاضر ہوا۔ موصوف نے ہمدردی کا اظہار کیا۔ لیکن اس معاملے میں اپنی مجبوری ظاہر کر کے دہلی کے حکام کو ذمہ دار ٹھہرایا۔ انہوں نے کہا۔ ”اگر ہمارے اختیار کی بات ہوتی تو ہم کب کے اس چوکی کو اٹھا چکے ہوتے آپ حکومت ہند سے درخواست کیجئے۔“ میں نے حکومت ہند کو لکھا لیکن سوائے خط کی رسید کے کوئی جواب نہیں ملا۔ بہت دنوں بعد جب مجھے لارڈ چیمفورڈ سے ملنے کا اتفاق ہوا تب جا کر شنائی ہوئی میں نے ان سے سارے واقعات بیان کئے تو انہیں بڑی حیرت ہوئی۔ انہیں اس معاملے کی خبر تک نہیں کی گئی تھی انہوں نے میری گفتگو بہت غور سے سنی فوراً ٹیلیفون کر کے ویرام کام کے کاغذات منگوائے اور مجھ سے وعدہ کیا کہ اگر جنگی کا محکمہ کوئی معقول وجوہ پیش نہ کر سکا تو اس جنگی کو منسوخ کر دیں گے چند روز کے بعد میں نے اخباروں میں پڑھا کہ ویرام کام کی جنگی کی چوکی اٹھادی گئی۔

اس واقعے کو میں نے ہندوستان میں ستیاگرہ کا آغاز سمجھا۔ کیونکہ جب میں گورنر بمبئی کے سیکرٹری سے ملا تھا تو انہوں نے اس بات پر ناپسندیدگی کا اظہار کیا تھا کہ میں نے اپنی بگسیرا (1) کی تقریر میں ستیاگرہ کا ذکر کیا۔

انہوں نے پوچھا تھا ”کیا یہ دھمکی نہیں ہے؟ کیا آپ کے خیال میں ایک بااقتدار حکومت ان دھمکیوں سے دب جائے گی؟“

میں نے اس کے جواب میں کہا تھا یہ دھمکی نہیں ہے یہ عوام کو سیاسی تعلیم دینے کا ایک طریقہ ہے۔ میرا فرض ہے کہ ملک کے سامنے وہ تمام جائز تدبیریں پیش کر دوں جن سے رعایا اپنی شکایاتوں کو دور کر سکتی ہے جو قوم اپنے حقوق حاصل کرنا چاہتی ہے اسے آزادی کے کل طریقے معلوم ہونا چاہئیں

عموماً ایسی صورتوں میں مجبور ہو کر تشدد سے کام لینا پڑتا ہے۔ مگر ستیاگرہ ایسا حربہ ہے جسے تشدد سے کوئی سروکار نہیں میں لوگوں کو یہ بتانا اپنا دھرم سمجھتا ہوں کہ اس حربے کو کیسے اور کس حد تک استعمال کرنا چاہیے۔ میں جانتا ہوں کہ برطانوی حکومت بڑا اختیار رکھتی ہے مگر مجھے یہ بھی یقین ہے کہ ستیاگرہ میں بہت بڑی قوت ہے۔

اس پر مدبر سیکرٹری نے شبہ کے انداز میں سر ہلا کر کہا تھا۔ "خیر، یہ بھی دیکھ لیں گے۔"

حوالہ

1 - کانٹھیادار کا ایک مقام

شانتی نکیتن

راجکوٹ سے میں شانتی نکیتن گیا وہاں کے استاد اور طالب علم مجھ سے بڑی محبت سے پیش آئے۔ میرے استقبال میں جو سلمان کیا گیا۔ وہ آراکش، سادگی اور خلوص کا خوشنما مجموعہ تھا یہاں مجھے اپنی عمر میں پہلی بار کا صاحب کلیکر سے ملنے کا اتفاق ہوا۔

میں اس وقت یہ نہیں جانتا تھا کہ کلیکر کا لقب کا صاحب کیوں ہے، آگے چل کر معلوم ہوا کہ میرے دوست کیشوراد جی دیشپانڈے نے جو انگلستان میں میرے ساتھ تھے بڑودے میں گنگا ناتھ دوپالا کے نام سے ایک اسکول قائم کیا تھا اور وہ چاہتے تھے کہ سب استاد، شاگرد ایک خاندان کے لوگوں کی طرح مل جل کر رہیں۔ اس لئے انہوں نے استادوں کے لقب رشتوں کے نام پر رکھے تھے۔ کلیکر اس اسکول میں پڑھایا کرتے تھے۔ اس لئے یہ کا صاحب (بچا جان) کہلانے لگے۔ پھڈ کے کا لقب ”لما“ (ماموں جان) اور ہری شرما کا ”انا“ (بھائی جان) تھا اور استاد بھی اسی طرح کے ناموں سے پکارے جاتے تھے۔ مثلاً اندانند جو کا صاحب کے دوست تھے ”سواری“ اور ہنوردھن جو ”لما“ کے دوست تھے ”آپا“ کہلاتے تھے۔ یہ سب لوگ آگے چل کر یکے بعد دیگرے میرے رفیق بن گئے۔ خود دیشپانڈے جی ”صاحب“ کہے جاتے تھے۔ جب یہ اسکول ٹوٹ گیا تو خاندان کے لوگ منتشر ہو گئے۔ مگر انہوں نے اپنے لقب اور آپس کے روحانی رشتے بدستور قائم رکھے۔

کا صاحب مختلف تعلیمی اداروں کا تجربہ حاصل کرنے کے لئے سفر کر رہے تھے۔ جس زمانے میں میں شانتی نکیتن گیا۔ اتفاق سے وہیں موجود تھے اور ان کے ساتھ ان کی برادری کے اور شخص چنٹامن شاستری بھی تھے۔ یہ دونوں وہاں سنسکرت پڑھاتے تھے۔

فینکس والے شانتی نکیتن میں ایک علیحدہ مکان میں رکھے گئے تھے۔ ان کے سرگرد گمن لال گاندھی یہاں بھی سختی کے ساتھ فینکس آشرم کے ضابطوں کی پابندی کراتے تھے۔ میں نے دیکھا کہ انہوں نے اپنی محبت، قابلیت اور متعدی کاسکھ سارے شانتی نکیتن پر بٹھا دیا ہے۔

وہاں اینڈریوز بھی تھے اور پیرسن بھی۔ بنگالی استادوں میں سے ہمارا زیادہ میل جول جگداند بابو، نیپال بابو، سنتوش بابو، کھتی موہن بابو، ناگن بابو، شاردا بابو اور کالی بابو سے تھا۔

میں حسب معمول بہت جلد یہاں کے استادوں اور طالب علموں میں گھل مل گیا اور میں نے ان سے اپنا کام آپ کرنے کے مسئلے پر بحث چھیڑ دی۔ میں نے استادوں سے کہا کہ اگر آپ اور آپ کے شاگرد اپنا کھانا تنخواہ دار باورچیوں سے نہ پکوائیں بلکہ خود پکائیں تو آپ لڑکوں کی جسمانی اور اخلاقی صحت کے نقطہ نظر سے باورچی خانے کی نگرانی کر سکیں گے اور لڑکوں کو اپنی مدد آپ کرنے کی تربیت ملے گی۔ ان میں سے دوا ایک نے شبہہ کے انداز میں سر ہلایا۔ بعض نے اس تجویز کو بہت پسند کیا۔ لڑکوں نے بڑے جوش و خروش سے اس کی تائید کی کیونکہ ان کو تو نئی باتوں کا شوق ہوتا ہی ہے۔ غرض ہم نے یہ تجربہ شروع کر دیا۔ میں نے ہاکوی ٹگور سے درخواست کی کہ آپ بھی اس معاملے میں رائے دیجئے۔ تو انہوں نے فرمایا اگر استاد راضی ہوں تو مجھے کوئی عذر نہیں۔ لڑکوں سے انہوں نے کہا۔ ”یہی چیز سوراج کی کنجی ہے۔“

پیرسن سے اس تجربے کو کامیاب بنانے کے لئے بڑی محنت کی انہیں اس میں بھد جوش اور انہماک تھا۔ استادوں اور شاگردوں کے چھوٹے چھوٹے حلقے بنائے گئے اور ان میں سارا کام تقسیم کر دیا گیا۔ کچھ لوگ ترکاری پھیلتے تھے۔ کچھ غلہ بینتے اور پھٹکتے تھے۔ ناگن بابو اور ان کے ساتھیوں نے باورچی خانے وغیرہ کی صفائی کا ذمہ لیا۔ انہیں ہاتھ میں پھاوڑا لے کر کام کرتے دیکھ کر بڑی خوشی ہوتی تھی۔ لیکن ہوا سو لڑکوں اور ان کے استادوں کو جسمانی محنت کا عادی بنانا سہل نہ تھا۔ روز جھگڑے ہوا کرتے تھے۔ بعض لوگ تھوڑے ہی دن میں تھک گئے۔ مگر پیرسن ہمت ہارنے والے اسامی نہ تھے۔ جب دیکھے کشادہ روی سے کوئی نہ کوئی کام کرتے نظر آتے تھے۔ بڑے برتنوں کا مانجنا انہوں نے اپنے ذمے رکھا تھا۔ جب برتن مانجے جاتے تو چند طالب علم پیٹھ کر ستار بجاتے کہ مانجنے والوں کو یہ کٹمن کام کھلنے نہ پائے غرض سب اپنے اپنے کام میں منہمک رہتے تھے اور شانتی نکیتن شہد کی مکھیوں کا چمٹا بن گیا تھا۔

ایسے کاموں کا سلسلہ جب شروع ہوتا ہے تو اس میں نئی نئی شاپیں نکل آتی ہیں۔ فینکس والے

بھی اپنا کھانا خود پکاتے تھے مگر ان کی غذا بالکل سادہ تھی۔ مسالہ نام کو بھی نہیں پڑتا تھا۔ چاول، دال، ترکاری، گیبوں کا آٹا سب چیزیں ملا جلا کر بھپ کے چولہے میں پکائی جاتی تھیں۔ شانتی نکیتن کے بعض لڑکوں نے بھی بھلی غذا میں اصلاح کرنے کے لئے اس قسم کا کھانا پکانا شروع کیا۔ وہ ایک استاد اور چند لڑکے مل کر یہ تجربہ کرتے تھے۔

یہ کارخانہ زیادہ دن نہ چل سکا۔ مگر میرے خیال میں اس تھوڑے عرصے میں شانتی نکیتن کو کچھ نہ کچھ فائدہ ہی پہنچا۔ استادوں کو جو تجربے ہوئے وہ بیکار نہیں کہے جاسکتے۔

میرا ارادہ تھا کہ ابھی کچھ دن شانتی نکیتن میں ٹھہروں مگر تقدیر کو کچھ اور ہی مستور تھا۔ مجھے یہاں آئے ایک ہفتہ بھی نہیں ہوا تھا کہ پونا سے تار آیا کہ گو کھلے کا انتقال ہو گیا۔ سارے شانتی نکیتن پر اداسی چھا گئی سب لوگ میرے پاس تعزیت کے لئے آئے۔ آشرم کے مندر میں ماتمی جلسہ کیا گیا۔ بڑا دلدوز منظر تھا۔ میں اسی دن اپنی بیوی اور مگن لال کو ساتھ لے کر پونا چلا گیا اور لوگ شانتی نکیتن میں رہے۔ اینڈریوز مجھے پہچانے بروڈان تک آئے۔ انہوں نے اشنائے گفتگو میں مجھ سے پوچھا۔ ”کیا آپ کے خیال میں کبھی ہندوستان میں بھی ستیاگرہ کا دمت آئے گا؟ اور اگر آئے گا تو کب آئے گا؟“ میں نے کہا۔ ”اس کا جواب مشکل ہے۔ ایک سال تک میں کچھ نہیں کر سکتا۔ گو کھلے نے مجھ سے وعدہ لے لیا تھا۔ کہ ایک سال تک ہندوستان میں تجربہ حاصل کرنے کے لئے سفر کروں گا اور اس عرصے میں قومی معاملات پر کوئی رائے ظاہر نہیں کروں گا۔ بلکہ میں ایک سال گزرنے کے بعد ہی اپنی رائے کے اظہار میں جلدی نہیں کرنا چاہتا میرے خیال میں ابھی پانچ برس ستیاگرہ کا امکان نہیں۔“

اسی سلسلے میں یہ بھی کہہ دوں کہ گو کھلے میری کتاب ”ہند سوراہ“ کے بعض خیالات پر ہنسنا کرتے تھے اور یہ کہا کرتے تھے۔ ”ایک سال ہندوستان میں رہنے کے بعد تمہارے خیالات خود بخود راہ پر آجائیں گے۔“

تیسرے درجے کے مسافروں کی مصیبت

برودان میں ہمیں اس مصیبت کا سامنا ہوا جو تیسرے درجے کے مسافروں کو ٹکٹ لینے تک میں بھگتنا پڑتی ہے جب میں نے ٹکٹ مانگا تو جواب ملا۔ ”تیسرے درجے کے ٹکٹ گاڑی آنے سے اتنے پہلے نہیں ملتے“ میں اسٹیشن ماسٹر کے پاس گیا۔ اول تو اسے ڈھونڈھنے ہی میں بڑی مشکل ہوئی خدا خدا کر کے ملا تو اس نے بھی وہی جواب دیا۔ ٹکٹ گھر کی گھر کی کھلتے ہیں میں وہاں پہنچا۔ مگر مسافروں کی وہ ریل پیل تھی کہ ٹکٹ لینا سہل نہ تھا۔ ”بس کی لائٹھی اس کی ہمیں“ کا معاملہ تھا۔ ہٹے کئے لوگ جنہیں دوسروں کا مطلق خیال نہ تھا مجھے دھکیل کر ٹکٹ لے لیتے تھے۔ پہلے گروہ میں جتے لوگ تھے ان سب کے بعد مجھے ٹکٹ ملا۔

اب گاڑی آئی اس میں گھس پیٹھ کر بیٹھنا ٹکٹ لینے سے بھی زیادہ دشوار تھا اندر کے اور باہر کے مسافروں میں خوب گالی گلوچ، دھکم دھکا ہو رہی تھی۔ ہم کئی بار دوڑتے ہوئے اس سرے سے اس سرے تک گئے مگر سب کو یہی جواب ملا۔ ”یہاں باطل جگہ نہیں ہے“ میں نے گاڑی سے کہا۔ اس نے جواب دیا جہاں جگہ ملے بیٹھ جاؤ ورنہ دوسری گاڑی سے چلے جانا۔“

میں نے ادب سے کہا مجھے بڑا ضروری کام ہے۔ مگر اے گمبیری بت سننے کی فرصت نہ تھی۔ میرے ہاتھ پیر پھول گئے۔ میں نے مگن لال سے کہا۔ جہاں ہو سکے بیٹھ جاؤ اور میں اپنی بیوی کو لے کر ڈیوڑھے درجے میں بیٹھ گیا۔ گاڑی نے ہمیں بیٹھتے دیکھ لیا تھا۔ اسنول کے اسٹیشن پر وہ زائد کرایہ وصول کرنے پہنچا۔ میں نے اس سے کہا۔

”آپ کا فرض تھا کہ ہمیں جگہ دیتے۔ ہمیں کہیں جگہ نہیں ملی۔ اس لئے اس درجے میں بیٹھ گئے۔ اگر آپ ہمیں تیسرے درجے میں بیٹھا سکیں تو ہم خوشی سے چلنے کو تیار ہیں۔“

اس نے جواب دیا۔ ”بس زیادہ بحث کی ضرورت نہیں۔ میں تمہیں تیسرے درجے میں جگہ نہیں دے سکتا۔ کرایہ دینا ہے تو دو درجہ گاڑی سے اتر جاؤ۔“

مجھے کسی نہ کسی طرح پونا پہنچنا تھا۔ اس لئے میں گاڑی سے لڑنے کے لئے تیار نہیں تھا میں نے چپ چاپ پونا تک کا زائد کرایہ دے دیا مگر یہ بے انصافی مجھے بہت ناگوار ہوئی۔

صبح کو ہم مظفرائے پہنچے۔ مگن لال گھس پیٹھ کر تیسرے درجے میں بیٹھ گئے تھے۔ میں بھی اسی میں چلا گیا۔ میں نے ٹکٹ ایگزامینر سے اس بات کا سرٹیفکیٹ مانگا کہ میں مظفرائے سے تیسرے درجے میں بیٹھا ہوں۔ اس نے انکار کر دیا۔ بعد میں میں نے ریل کے اعلیٰ افسر کو درخواست دی۔ وہاں سے جواب ملا۔ ”ہم بغیر سرٹیفکیٹ کے زائد کرایہ واپس نہیں دیا کرتے مگر آپ کے ساتھ خاص رعایت کی جاتی ہے۔ تاہم بروڈان سے مظفرائے تک کا زائد کرایہ واپس نہیں ہو سکتا۔“

اس کے بعد مجھے تیسرے درجے کے سفر کے ایسے تجربے ہوئے کہ اگر لکھنے پر آؤں تو ایک مستقل کتاب ہو جائے مگر یہاں میں جا بجا سرسری طور پر ایک آدھ واقعہ بیان کرنے پر اکتفا کروں گا مجھے اس کا افسوس ہے اور ہمیشہ رہے گا کہ جہانی کمزوری کے سبب سے مجھے تیسرے درجے میں سفر کرنا چھوڑنا پڑا۔

اس میں شک نہیں کہ تیسرے درجے کے مسافروں کی تکلیفوں کا بڑا سبب ریل کے ملازموں کی بیجا سختی ہے۔ مگر خود مسافروں کی بد تمیزی غلاظت، خود غرضی اور جہالت بھی کچھ کم قابل الزام نہیں۔ افسوس تو یہ ہے کہ اکثر انہیں اپنی برائیوں کا احساس تک نہیں ہوتا۔ وہ سمجھتے ہیں کہ ہم جو کچھ کرتے ہیں یہی کرنا چاہیے۔ اس کی اصلی وجہ ہے کہ ”تعلیم یافتہ لوگ ان کی اصلاح کی طرف بالکل توجہ نہیں کرتے۔ غرض ہم جھکے ماندے کلیان پہنچے۔ میں نے اور مگن لال نے اسٹیشن کے میسے سے پانی لے کر اٹھان کیا میں اپنی بیوی کے نہانے کا بندوبست کر رہا تھا کہ ”انجن خدام ہند“ کے رکن کول جی نے ہمیں دیکھ لیا۔ انہوں نے کہا کہ ان خاتون کو دوسرے درجے کے غسل خانے میں نہالینے دیجئے۔ میں جانتا تھا کہ میری بیوی کو اس غسل خانے کے استعمال کا کوئی حق نہیں۔ مگر میں نے اس وقت اس بے عنوانی سے چشم پوشی کی مجھے اعتراف ہے کہ یہ بات حق کے طالب کے لئے مناسب نہیں ہے۔ میری بیوی کو یہ خواہش نہیں تھی کہ اس غسل خانے میں نہالیں۔ مگر میرے دل میں بیوی کی محبت حق کی محبت پر غالب آگئی۔ اپنا شد میں لکھا ہے کہ حق کا رخ زیبا ”مایا“ کے سنہرے لہنگے میں پوشیدہ ہے۔

محبت کی کش مکش

پونا پہنچ کر "شرادھ" کی رسم سے فراغت کرنے کے بعد یہ مسئلہ چھڑ گیا کہ انجمن کا مستقبل کیا ہو گا اور مجھے اس میں شریک ہونا چاہیے یا نہیں میرے لئے یہ مسئلہ بہت نازک تھا۔ جب تک گو کھلے زندہ تھے مجھے انجمن کا رکن بننے کی ضرورت ہی نہیں تھی۔ میری رہنمائی کے لئے ان کی ذات کافی تھی۔ ہندوستانی سیاست کے تلامذہ خیز سمندر میں سفر کرنے کے لئے مجھے ایک ناخدا کی ضرورت تھی اور گو کھلے کا دامن تھام لینے سے یہ مشکل حل ہو گئی تھی۔ ان کی وفات کے بعد میں بیکس و تہارہ گیا اور اب میں نے اپنا فرض سمجھا کہ انجمن کا رکن بن جاؤں۔ میرا خیال تھا کہ گو کھلے کی روح اس بات سے خوش ہوگی۔ اس لئے میں نے بے تامل داخلے کی کوشش شروع کر دی۔

اس موقع پر انجمن کے اکثر ممبر یونانیوں میں موجود تھے۔ میں نے ان سے مل کر اس مسئلے کو چھیڑا اور ان کے دل میں میری طرف سے جو شبہ تھے انہیں دور کرنے کی کوشش کی۔ مگر میں نے دیکھا کہ ان میں اختلاف رائے ہے۔ ایک فریق میرے داخلے کے موافق تھا اور دوسرا بہت سختی سے مخالفت کر رہا تھا مجھے معلوم تھا کہ دونوں کو مجھ سے مسادی محبت ہے مگر وہ انجمن کے مفاد کو مقدم سمجھتے تھے۔

اس لئے ہمارے مشورہ میں کبھی تلخ کلامی کی نوبت نہیں آتی تھی۔ بلکہ محض اصولی بحث ہوا کرتی تھی۔ جو لوگ میرے داخلے کے مخالف تھے ان کا یہ قول تھا کہ بہت سے اہم معاملات میں میری اور ان کی رائے میں زمین آسمان کا فرق ہے اس لئے میرے ممبر ہونے سے انجمن کے بنیادی مقاصد کو نقصان پہنچنے کا خوف ہے۔ ظاہر ہے کہ وہ اسے کیونکر برداشت کر سکتے تھے۔ بڑی طول طویل بننے کے بعد بھی کوئی فیصلہ نہیں ہو سکا۔ یہ طے پایا کہ اس مسئلے پر پھر کبھی غور کیا جائے گا۔

وہاں سے واپس آنے کے بعد میں عجب کشمکش میں پڑ گیا۔ میں دل میں سوچتا تھا کہ اگر میرا انتخاب

کثرت رائے سے ہو تو مجھے ممبری قبول کرنا چاہیے یا نہیں؟ کیا یہ گو کھلے سے بیوفائی نہ ہوگی؟ آخر مجھ پر یہ بات کھل گئی کہ جب میرے متعلق ممبروں میں اس قدر شدید اختلاف رائے ہے تو میرے لئے یہی مناسب ہے کہ داخلے کی درخواست واپس لے لوں اور فریق مخالف کو اس ناگوار صورت حال سے نجات دوں مجھے انجمن اور گو کھلے سے جو محبت تھی اس کا تقاضا یہی نظر آیا یہ بات دفعتاً میرے ذہن میں آئی اور میں نے فوراً سٹری جی کو لکھا کہ انجمن کا ملتوی شدہ جلسہ کرنے کی ضرورت نہیں۔ جو لوگ میرے داخلے کے مخالف تھے انہوں نے میرے اس فیصلے کی بہت تعریف کی۔ اس کے سبب سے ان کی مشکل آسان ہو گئی اور ان میں اور مجھ میں دوستی کا رابطہ اور استوار ہو گیا۔ سچ پوچھئے تو اس درخواست کے واپس لینے سے میں انجمن کا ممبر بن گیا۔

تجربے سے ثابت ہو گیا کہ میرا انجمن کا باضابطہ ممبر نہ بننا بہت اچھا ہوا اور جو لوگ میرے داخلے کے مخالف تھے۔ ان کی رائے بالکل صحیح تھی۔ میرے اور ان کے خیالات میں جو اصولی اختلاف تھا وہ اب پوری طرح نمایاں ہو گیا ہے۔ مگر اس اختلاف کو تسلیم کر لینے سے ہماری باہمی دوستی پر کوئی اثر نہیں پڑا۔ ہم میں برادرانہ تعلقات بدستور قائم ہیں۔ اور میں اکثر جا کر پونا میں انجمن کے مستقر کی زیارت کرتا ہوں۔

یہ سچ ہے کہ میں انجمن کا باضابطہ ممبر نہیں بنا۔ مگر روحانی حیثیت سے میں اپنے آپ کو اس کارکن سمجھتا ہوں۔ یہ باطنی رشتہ ظاہری رشتے سے بدرجہا زیادہ قابل قدر ہے۔ ظاہری رشتہ بغیر باطنی اتحاد کے جمد بے روح کی مانند ہے۔

کسبہ کا میلا

میں ڈاکٹر مہتا سے ملنے رنگون جا رہا تھا۔ رہ میں کلکتے میں بابو بھوپندر ناتھ باسو کے گھر ٹھہرا۔ یہاں مجھے بنگالیوں کی مہمان نوازی کا پورا اندازہ ہوا۔ ان دنوں میں سوائے میوے کے کچھ نہیں کھاتا تھا۔ اس لئے کلکتے میں جتنے خشک اور ترمیوے مل سکتے تھے سب میری خاطر مہیا کئے گئے۔ گھر کی عورتیں رات رات بھر جاگ کر میوہ چھیلتی تھیں۔ بڑے اہتمام سے سارے میوے ہندوستانی طریقے سے چھیل کر اور تراش کر میرے سامنے رکھے جاتے تھے۔ میرے ساتھیوں کے لئے جن میں میرا لاکارام داس بھی تھا۔ طرح طرح کے مزیدار کھانے پکتے تھے۔ میرے دل پر اس خاندان کی محبت اور مہمان نوازی کا بہت اثر ہوا۔ مجھے یہ گوارا نہ تھا کہ دو تین مہمانوں کی خاطر مدارات میں سارا گھر مصروف رہے۔ مگر ان تکلفات سے بچنے کی کوئی صورت نظر نہ آتی تھی۔

رنگون جاتے وقت میں نے عرشے پر سفر کیا۔ باسو بابو کے یہاں تو ہم لوگوں کو یہ حکایت تھی کہ حد سے زیادہ خاطر ہوتی ہے مگر جہاز پر معاملہ بالکل برعکس تھا۔ بے توجہی کا یہ حال تھا کہ ہم لوگ روزمرہ کی ضروریات سے بھی محروم تھے۔ غسل خانہ اس قدر میلا تھا کہ قدم رکھنے کو جی نہیں چاہتا تھا اور پانوں میں تو غلاظت کے انبار لگے تھے۔ وہاں جاتے ہوئے گویا موت کے دلدل میں سے گزرنا پڑتا تھا۔

اس کا برداشت کرنا انسان کی طاقت سے باہر تھا۔ میں نے چیف افسر سے حکایت کی مگر کچھ شنوائی نہ ہوئی۔ اس مکروہ منظر میں جو کچھ کمی تھی وہ مسافروں کی بد تمیزی نے پوری کر دی۔ یہ لوگ جہاں بیٹھتے تھے۔ وہیں تھوک دیتے اور بے تکلف بچا کچا کھانا اور پان کا اگال پھینک دیا کرتے۔ شور اس قدر مچاتے کہ کان پڑی آواز سنائی نہ دیتی ہر شخص کو فکر تھی کہ بہت سی جگہ پر قبضہ کرے۔ ان کے احباب

نے ان سے بھی زیادہ جگہ گھیر رکھی تھی۔ دو دن اسی عذاب میں گزرے۔
رنگون پہنچ کر میں نے کمپنی کے ایجنٹ کو خط لکھا۔ اس کا اور ڈاکٹر مہتا کی کوششوں کا یہ اثر ہوا کہ
وایسی میں اتنی ناقابل برداشت تکلیف نہیں ہوئی۔

رنگون میں بھی میرے میزبان کو میری غذا کی پابندیوں کے سبب سے بڑی زحمت اٹھانا پڑی۔ میں
ڈاکٹر مہتا کے گھر کو اپنا گھر سمجھتا تھا اس لئے میں نے انہیں زیادہ تکلف نہیں کرنے دیا۔ پھر بھی چونکہ
میں نے اپنے کھانے کے لئے میوؤں کی قسمیں محدود نہیں کی تھیں۔ خود میرے ذائقے اور میری نظر کو
ہوس تھی کہ طرح طرح کی چیزیں ہوں کھانے کے اوقات مقرر نہیں تھے میں پہنچتا تھا کہ شام کا کھانا
اندھیرا ہونے سے پہلے کھایا کروں۔ مگر عموماً رات کے آٹھ بج جاتے تھے۔

اس سال یعنی 1915 میں ہردوار میں کسبہ کامیلا تھا جو بارہ سال کے بعد ہوا کرتا ہے مجھے میلا
دیکھنے کا شوق نہیں تھا مگر میں گرد کل میں مہاتما منشی رام جی کے درشن کرنا چاہتا تھا۔ انجمن خدام ہند نے
میلا کے انتظام کے لئے رضا کاروں کا ایک بڑا دستہ بھیجا تھا پنڈت ہردے ناتھ کنز داس اس دستے
کے سردار تھے اور ڈاکٹر دیو آنجہانی اس کے طبی افسر تھے۔ مجھ سے فرمائش کی گئی تھی کہ ان کی مدد کے
لئے فنیکس والوں کو بھیجوں اور مگن لال گاندھی انہیں لے کر وہاں پہنچ چکے تھے۔ رنگون سے لوٹ کر
میں بھی ان سے آ ملا۔

کلکتے سے ہردوار تک ریل کے سفر میں بے حد تکلیف ہوئی۔ بعض جگہ ڈبوں میں روشنی تک نہ
تھی نہ ہار سپور سے ہم لوگ مال گاڑیوں میں اور مویشی کے ڈبوں میں بھر دیئے گئے ان میں پھت نہیں
تھی دوپہر کو ایک تو سورج کی گرمی دوسرے لوہے کے فرش کی تپش نے ہمیں بھون ڈالا۔ لوگوں کا یہ
حال تھا کہ اس مصیبت کے سفر میں پیاس سے تڑپتے تھے لیکن اگر کسی اسٹیشن پر ”مسلمان“ پانی ملتا تھا
تو نہیں پیتے تھے اور ”ہندو“ پانی کے انتظار میں رہتے تھے۔ یہ یاد رہے کہ یہی ہندو جب بیمار ہوتے ہیں
تو ڈاکٹر کی تجویز سے بے تکلف اور بے پوچھے کچے شراب یا گائے کے گوشت کی تختی چڑھا جاتے ہیں
اور مسلمان یا عیسائی کمپونڈر کے ہاتھ کا پانی پی لیتے ہیں۔

ثانٹی نکیتن کے قیام سے ہمیں اس بات کا اندازہ ہو گیا تھا کہ ہمیں ہندوستان میں زیادہ تر
فاکروب کا کام کرنا پڑے گا۔ ہردوار میں رضا کاروں کے قیام کے لئے ایک دھرم شالے میں خیمے
نصب کر دیئے گئے تھے اور ڈاکٹر دیو نے رفع حاجت کے لئے کچھ گڑھے کھدوا دیئے تھے۔ ان کی صفائی
تخواہ دار ہنگی کرتے تھے۔ یہ کام ہم فنیکس والوں کے کرنے کا تھا۔ ہم نے کہا کہ ہم غلاظت پر راکھ ڈال

دیا کریں گے اور خود صفائی کی نگرانی کریں گے ڈاکٹر دیو نے بڑی خوشی سے منظور کر لیا۔ یہ بات کہی تو میں نے تھی مگر اسے پورا مگن لال گاندھی نے کیا میرا کام تو زیادہ تر یہی تھا کہ خیمے میں بیٹھا "درشن" دیا کروں اور ان جاتریوں سے جو سینکڑوں کی تعداد میں میرے پاس آتے تھے مذہبی بحثیں کیا کروں۔ یہ "درشن" کے بھوکے "گھاٹ" تک میرا پہچانا نہیں چھوڑتے تھے یہاں تک کہ کھانے کے وقت بھی پہنچ جاتے تھے۔ غرض ہر دروار میں مجھے معلوم ہوا کہ جنوبی افریقہ میں جو ناچیز خدمات میں نے انجام دی ہیں ان کا اثر سارے ہندوستان میں کس قدر گہرا ہے۔

مگر میری یہ حالت ایسی نہیں تھی کہ کسی کو اس پر رشک آئے۔ میری جان پر دو طرفہ عذاب تھا جہاں مجھے کوئی پہچانتا نہیں تھا مثلاً ریل کے سفر میں وہاں مجھے اپنے کروڑوں بھائیوں کی طرح سختیاں جمیلنی پڑتی تھیں اور جہاں ایسے لوگوں کا مجمع تھا جو میری شہرت سن چکے تھے وہاں "درشن" کی مصیبت تھی۔ میری سمجھ میں نہیں آتا کہ ان دونوں میں سے کون سی حالت زیادہ قابل افسوس تھی۔ البتہ اتنا جانتا ہوں کہ درشن والوں کی اندھی محبت پر مجھے بارہا غصہ آ گیا ہے اور اکثر اس سے دلی صدمہ پہنچا ہے مگر سفر میں باوجود سخت تکلیفوں کے کبھی طیش نہیں آیا بلکہ روح کو اور تقویت ہوئی۔

ان دنوں میرے جسم میں طاقت تھی اور میں دور دور تک چکر لگایا کرتا تھا یہ بہت اچھا تھا کہ لوگ عام طور پر مجھے پہچانتے نہیں تھے۔ اس لئے سڑکوں پر اتنی ہلچل نہیں ہوتی تھی کہ گزرنا مشکل ہو جائے۔ اس طرح چل پھر کر میں نے جاتریوں کو اچھی طرح دیکھا بھلا۔ مجھے ان میں بے حسی ریا کاری اور بد تمیزی زیادہ نظر آئی اور دینداری بہت کم "سادھو" نڈی دل کی طرح چھائے ہوئے تھے اور ان کی حالت دیکھ کر ایسا معلوم ہوتا تھا کہ یہ عیش و عشرت کے لئے پیدا کئے گئے ہیں۔

یہاں میں نے ایک گائے دیکھی جس کے پانچ پیر تھے مجھے بڑی حیرت ہوئی مگر واقف کار لوگوں نے مجھے اس کا بھید بتا دیا۔ یہ بیچاری سنگدل انسانوں کی حرص و طمع کا شکار تھی۔ یہ پانچواں پیر اصل میں ایک زندہ بچھڑے کے جسم سے کاٹ کر اس غریب کے کندھے پر کھال چیر کر لگا دیا گیا تھا۔ اس دوہرے ظلم سے جاہلوں کو ٹھگنے کا یہ ذریعہ ہاتھ آیا تھا۔ یہ پاپی جانتے تھے کہ ہندو پانچ پیر کی گائے دیکھنے کے شوق میں دوڑ آئیں گے اور اس زندہ بچھڑے پر حسب حیثیت چڑھاوا چڑھائے گا۔

اب میلے کا دن قریب آ گیا۔ میں ہر دروار جاترا کی نیت سے نہیں گیا تھا میرا یہ اصول نہیں کہ خدا کو زیارت گاہوں میں ڈھونڈتا پھروں لیکن یہ سترہ لاکھ آدمی جو وہاں جمع تھے سب کے سب ریا کاری یا محض تماشے کے شائق نہیں تھے۔ مجھے یقین تھا کہ ان میں بہت سے ایسے بھی ہیں جو ثواب حاصل کرنے اور

گناہوں سے پاک ہونے کی خاطر آئے ہیں اس کا اندازہ بہت مشکل ہے کہ اس طرح کی عقیدت سے کس حد تک روحانی فیض حاصل ہوتا ہے۔

میں رات بھر اسی ادھیڑ بن میں کروٹیں بدلتا رہا۔ میں سوچتا تھا کہ اس ریاکاری کی فضا میں بعض بچے دیندار بھی ہیں۔ یہ تو خدا کی عدالت میں بے گناہ ٹھہریں گے۔ اگر ہر دوڑ کی جاترا بجائے خود گناہ ہے تو مجھے چاہیے کہ کھلم کھلا اس کی مخالفت کروں اور کبوتہ کے دن ہر دوڑ سے چلا جاؤں۔ اگر ایسا نہیں ہے تب بھی مجھے اس پاپ کے کنارے میں جو یہاں پھیلا ہوا ہے کسی قسم کی ریاضت کر کے تڑکیہ نفس کو ڈالنا چاہیے۔ میرے دل میں یہ خیال آنا قدرتی بات تھی۔ میری زندگی کی بنیاد ہی ضبط نفس اور ریاضت پر ہے مجھے یہ بھی یاد آ گیا کہ میں نے کلکتے اور رنگون میں اپنے میزبانوں کو بے حد زحمت دی تھی۔ اس لئے میں نے یہ فیصلہ کیا کہ جو پھل وغیرہ میں کھاتا ہوں اس کی قسمیں محدود کر دوں اور شام کا کھانا سورج ڈوبنے سے پہلے ہی کھایا کروں۔ مجھے یقین تھا کہ اگر میں ایسا نہ کروں گا تو آئندہ بھی میرے میزبانوں کو اسی طرح زحمت ہوا کرے گی۔ اور میں بجائے ان کی خدمت کرنے کے ان سے خدمت لیا کروں گا۔ اس لئے میں نے عہد کر لیا کہ جب تک ہندوستان میں ہوں کبھی چوبیس گھنٹے کے اندر پانچ چیزوں سے زیادہ نہیں کھاؤں گا اور اندھیرا ہو جانے کے بعد کچھ نہ کھایا کروں گا۔ مجھے اچھی طرح معلوم تھا کہ اس میں بڑی مشکلیں پیش آئیں گی۔ مگر میں چاہتا تھا کہ یہ عہد ایسا ہو جس میں نفس لئیم کو بہانے ڈھونڈھنے کی گنجائش نہ رہے۔ میں نے اس پر غور کیا کہ اگر بیماری کے زمانے میں دو پانچ چیزوں میں سے ایک شمار کی ہمارے اور ڈاکٹر جو خاص غذا تجویز کرے اسے بھی گن کیا جائے تو کیسے کام چلے گا۔ مگر آخر میں یہی فیصلہ کیا کہ چاہے جو کچھ بھی ہو کھانے پینے کی کل تعداد پانچ سے زیادہ نہ ہونے پائے۔

ان دونوں باتوں کا عہد کئے آج تیرہ سال ہو گئے۔ میرے لئے یہ بڑا سخت امتحان تھا مگر اس کی بدولت میری زندگی میں چند سال بڑھ گئے اور میں بہت سی بیماریوں سے محفوظ رہا۔

لکشمین جھولا

گرد کل جا کر ہاتمانشی رام جلیے پلین کو دیکھنے سے طبیعت کو بڑا سکون ہوا۔ کہاں ہر دوار کا شور و غل اور کہاں گرد کل کی خاموشی! مجھے فوراً یہ خوش گوار فرق محسوس ہوا۔

ہاتمانجھ سے بڑی محبت سے پیش آئے۔ برہمچاریوں نے دل کھول کر خاطر مدارات کی۔ یہاں مجھے پہلی بار اچاریہ رام دیوجی سے ملنے کا اتفاق ہوا۔ مجھے پہلی ہی نظر میں اندازہ ہو گیا کہ ان کی شخصیت میں بڑی قوت ہے۔ ہم دونوں میں بہت سے معاملات میں اختلاف رائے تھا مگر بہت جلد آپس میں دوستی ہو گئی۔

مجھ سے اچاریہ رام دیوجی اور گرد کل کے دوسرے پروفیسروں سے بڑی بحث ہوا کرتی تھی کہ گرد کل میں دستکاری کی تعلیم کی ضرورت ہے یا نہیں جب جانے کا وقت آیا تو مجھے یہاں سے رخصت ہونے کا بہت قلق ہوا۔

میں نے "لکشمین جھولے" (1) کی بڑی تعریف سنی تھی۔ یہ برش کش کے قریب ہے۔ بہت سے دوستوں نے اصرار کیا کہ ہر دوار سے رخصت ہونے سے پہلے اس پل کو ضرور دیکھ لو۔ میں اس جا تراپر پیدل جانا چاہتا تھا اس لئے بیچ میں ایک منزل کر کے دوسرے دن وہاں پہنچا۔

برش کش میں بہت سے سنیا سی مجھ سے ملنے آئے۔ ان میں سے ایک مجھ سے مل کر بہت خوش ہوئے۔ فنیکس والوں کی جماعت وہاں موجود تھی انہیں دیکھ کر سوامی جی نے بہت سے سوالات کئے۔

میری ان سے کئی بار مذہب کے متعلق باتیں ہوئیں۔ انہیں یہ معلوم ہو گیا کہ میرا مذہب ہی احساس بہت گہرا ہے۔ میں گنگا سے نہا کر ننگے سر صرف ایک دھوتی باندھے واپس آ رہا تھا انہوں نے دیکھا کہ میرے سر پر چوٹی اور گلے میں جینیو نہیں ہے تو انہیں بہت رنج ہوا اور وہ کہنے لگے۔

"مجھے بڑا دک ہے کہ تم ایسے پکے ہندو ہو کہ نہ چوٹی رکھتے ہو نہ جینیو باندھتے ہو۔ یہی دونوں ہندو

دھرم کی ظاہری علامتیں ہیں اور کسی ہندو کو ان سے خالی نہ ہونا چاہیے۔“

میں نے ان دونوں چیزوں کو ایک وجہ سے چھوڑا تھا۔ مناسب ہے کہ یہ قصہ بیان کروں۔ جب میں دس برس کا چھوڑا تھا تو برہمنوں کے لڑکوں کو گلے میں جتیو ڈالے اور ان میں بندھی کنجیاں کھنکھناتے دیکھ کر مجھے بڑا رشک آتا تھا اور میرا جی چاہتا تھا کہ میں بھی ایسا ہی کروں۔ اس زمانے میں کاٹھیاوار کے ویش خاندانوں میں جتیو پہننے کا رواج عام نہ تھا مگر یہ تحر یک نئی نئی اٹھی تھی کہ برہمن، چھتری اور ویش کے لئے اس کا بہت لازمی کر دیا جائے۔ چنانچہ گاندھی خاندان کے کئی شخص گلے میں جتیو ڈالتے تھے۔ کچھ دن بعد جو برہمن ہم دو تین لڑکوں کو رام رکٹا سکھایا کرتا تھا، اس نے ہمیں جتیو پہنائے اور اگرچہ مجھے کنجیوں کا کوئی کام نہیں پڑتا تھا مگر میں نے خواہ مخواہ ایک گچھالے کر اپنے جتیو میں باندھ ہی لیا۔ آگے چل کر یہ تا کاٹھ گیا۔ یاد نہیں کہ مجھے اس کا کچھ زیادہ افسوس ہوا یا نہیں۔ مگر یہ یقینی ہے کہ میں نے دوبارہ جتیو نہیں پہنا۔

جب میں بڑا ہو گیا تو ہندوستان میں اور جنوبی افریقہ میں بارہا یہ کوشش کی گئی کہ میں اس مقدس رشتے کو گلے میں ڈال لوں مگر میں نے قبول نہ کیا۔ میں دل میں کہتا تھا کہ اگر شودر لوگ اسے نہیں پہن سکتے تو دوسری ذاتوں کو اس کے پہننے کا کیا حق ہے؟ اور یوں بھی ایک فضول رسم کو اختیار کرنے کی کوئی وجہ نہیں معلوم ہوئی۔ میں اس میں کوئی عیب نہیں سمجھتا تھا مگر یہ کہتا تھا کہ آخر مجھے اس کے پہننے کی ضرورت کیا ہے؟

دشنو ہونے کی حیثیت سے میں گلے میں کنٹھی پہنتا تھا اور سر پر چوٹی رکھتا تھا کیونکہ میرے بزرگ اسے ضروری سمجھتے تھے۔ انگلستان جاتے وقت میں نے چوٹی کٹوا دی کہ کہیں ایسا نہ ہو لوگ مجھے ننگے سر دیکھ کر میرا مذاق اڑائیں اور انگریز مجھے وحشی سمجھیں اس زمانے میں اس سے ڈرتا تھا میری اس بزدلی کی انتہا یہ ہے کہ جنوبی افریقہ میں میں نے چھکن لال کو جو مذہبی فرض سمجھ کر چوٹی رکھتے تھے اس پر مجبور کیا کہ اسے کٹوا دیں۔ مجھے یہ خوف تھا کہ یہ ان کی قومی خدمت کی راہ میں حامل ہوگی اس لئے میں نے اس کا کوئی لحاظ نہیں کیا کہ انہیں صدمہ ہوگا۔

غرض میں نے یہ سارا حال سوامی جی سے صاف صاف بیان کر دیا اور کہا کہ ”میں جتیو نہیں پہنوں گا“ کیونکہ جب کروڑوں آدمی اس کے بغیر ہندو رہ سکتے ہیں تو مجھے اس کی کون سی ضرورت ہے؟ اس کے علاوہ یہ مقدس رشتہ روحانی تجدید اور اصلاح کی علامت ہے اور یہ ظاہر کرتا ہے کہ پہننے والا برتر اور پاکیزہ تر زندگی بسر کرنے کی کوشش کر رہا ہے۔ میرے خیال میں آج کل ہندوستان کی اور ہندو دھرم کی

جو حالت ہے اس کے لحاظ سے ہندوؤں کو اس معنی خیز علامت کے استعمال کا کوئی حق نہیں یہ حق اس وقت حاصل ہو گا جب ہندو دھرم چھوٹ چھات کے عقیدے سے پاک ہو جائے۔ اس میں ادنیٰ اور اعلیٰ کا فرق نہ رہے اور دوسری برائیاں اور ریاکاریاں جو اس میں داخل ہو گئی ہیں دور ہو جائیں۔ اس لئے میری طبیعت جیسیو پہنے سے کراحت کرتی ہے۔ مگر آپ چوٹی کے تعلق جو فرماتے ہیں میں اس پر غور کروں گا۔ میں نے پہلے چوٹی رکھی تھی۔ مگر جھوٹی شرم کے سبب سے کٹوا دی اس لئے میں سمجھتا ہوں کہ مجھے پھر سے رکھ لینا چاہیے۔ میں اپنے رفیقوں سے اس بارے میں مشورہ کروں گا۔

سوامی جی کو میری رائے جیسیو کے بارے میں پسند نہیں آئی۔ میں نے جو دلیلیں اس کے ترک کرنے کی بتائیں سوامی جی کے نزدیک انہیں سے اس کے پہننے کی تائید ہوتی تھی مگر میں آج تک اسی خیال پر قائم ہوں جو میں نے ہرش کشیش میں ظاہر کیا تھا۔ یہ سچ ہے کہ جب تک دنیا میں مختلف مذہب موجود ہیں ان میں سے ہر ایک کو کسی ظاہری علامت کی ضرورت ہے جو اسے دوسرے مذہبوں سے ممتاز کرے لیکن جب لوگ اس کی پرستش کرنے لگیں اور اس کے ذریعہ سے اپنے مذہب کی فوجیت جتائیں تو اس کا ترک کر دینا ہی بہتر ہے۔ میرے نزدیک آج کل جیسیو سے ہندو دھرم کی روحانی ترقی نہیں ہو سکتی اس لئے مجھے اس سے کوئی دلچسپی نہیں۔

البتہ چوٹی میں نے بزدلی سے کٹوائی تھی اس لئے دوستوں سے مشورہ کرنے کے بعد میں نے اسے رکھنے کا فیصلہ کر لیا۔

مگر میں تو لکشمین جھولے کا ذکر کر رہا تھا۔ ہرش کشیش اور لکشمین جھولے کے آس پاس کے قدرتی مناظر نے میرے دل کو موہ لیا۔ میں نے دیکھا کہ ہمارے بزرگ حسن فطرت کا کیسا پاکیزہ ذوق رکھتے تھے اور کتنے عاقبت اندیش تھے کہ انہوں نے فطرت کے خوشامقار کو مذہبی حیثیت بخشی اور میرا دل ان بزرگوں کی عقیدت سے معمور ہو گیا۔

لیکن لوگوں نے ان حسین مناظر کی جوگت بنا رکھی ہے انہیں دیکھ کر مجھے بزارنج ہوا۔ ہر دوار کی طرح ہرش کشیش میں بھی لوگوں نے سڑکوں پر اور گٹا کے خوشامقاروں پر گندگی پھیلا رکھی تھی۔ لوگوں کو عام شاپراہوں پر اور دریا کے کنارے رفع حاجت کرتے دیکھنا میرے لئے بڑا دل خراش منظر تھا۔

خود لکشمین جھولے کو جا کر دیکھا تو لوہے کا معمولی آدازاں پل تھا۔ لوگوں سے معلوم ہوا کہ پہلے یہاں رسیوں کا خوب صورت پل بندھا ہوا تھا۔ ایک تعمیر مارواڑی کے جی میں یہ سما گئی کہ رسیوں کے پل کو توڑ کر لوہے کا پل بنانا چاہیے۔ چنانچہ اس نے بہت کچھ خرچ کر کے یہ پل بنوادیا اور اس کی

کنجیاں حکومت کے حوالے کر دیں۔ میں نے رسیوں کا پل تو دیکھا نہیں اس لئے اس کے متعلق کوئی رائے ظاہر نہیں کر سکتا البتہ اتنا کہہ سکتا ہوں کہ لوہے کا پل یہاں بالکل بے تکا معلوم ہوتا ہے اور اس لئے اس خوش نامتقر کی خوب صورتی کو غارت کر دیا ہے اور جاتیوں کے پل کی کنجیاں حکومت کو دے دینا مجھے اس وقت بھی جب میں سرکار کا وفادار تھا بہت برا معلوم ہوا۔

پل کو عبور کر کے سور کا شرم پہنچا۔ یہ ایک چھوٹی سی بد نام بستی ہے۔ جس میں لوہے کی چادروں کے چند سائبان بنے ہوئے ہیں۔ مجھ سے کہا گیا کہ یہ سادھکوں (طالبان معرفت) کی کنجیاں ہیں۔ اس وقت تو یہ خالی نظر آتی تھیں بڑی عمارت میں چند لوگ تھے جنہیں دیکھ کر میرے دل پر کچھ اچھا اثر نہیں پڑا۔

مگر ہردوار کے حجر بے میرے لئے بڑے قیمتی ثابت ہوئے۔ ان سے مجھے یہ فیصلہ کرنے میں بڑی مدد ملی کہ مجھے کہاں رہنا چاہیئے۔

حوالہ

1 - سرکار کے پل کا نام

آشرم کی بنا

یہ میرا ذریعہ دون کا دوسرا سفر تھا۔

ستیاگرہ آشرم 25 مئی 1915ء کو قائم ہوا۔ شردھانند جی چاہتے تھے کہ میں ہر دوار میں سکونت اختیار کر لوں کلکتے کے بعض احباب نے میرے لئے دو یا نا تم دھام تجویز کیا تھا اور دوستوں کا اصرار تھا کہ راجکوٹ میں رہو۔ مگر احمد آباد سے گزرتے وقت وہاں کے لوگ پیچھے پڑ گئے کہ۔ یہیں بس جاؤ اور انہوں نے ہم لوگوں کے لئے ایک مکان اور آشرم کے کل مصارف دینے کا وعدہ کیا۔

میں احمد آباد ہی کو ترجیح دیتا تھا۔ میں سوچتا تھا کہ گجرات میرا وطن ہے۔ یہاں رہ کر گجراتی زبان کے ذریعہ سے میں ملک کی بڑی خدمت کر سکتا ہوں۔ پھر یہ بھی خیال تھا کہ احمد آباد پارچہ بانی کا قدم مرکز ہے۔ یہاں چرخہ کا کام بہت اچھا چلے گا اور گجرات کا صدر مقام ہونے کے سبب سے۔ یہاں مالی امداد بھی دوسری جگہ سے زیادہ ملے گی۔

احمد آباد کے دوستوں سے منجملہ اور باتوں کے اچھوتوں کے مسئلے پر بھی گفتگو ہوئی۔ میں نے کہا کہ اگر مجھے کوئی ایسا اچھوت ملے گا جو ہر لحاظ سے بھلا آدمی ہو تو میں سے فوراً آشرم میں داخل کر لوں گا۔ ایک ویشنو دوست نے خود پسندی کے انداز میں کہا "ایسے اچھوت آپ کو مل چکے۔"

آخر میں میں نے یہی فیصلہ کیا کہ آشرم احمد آباد میں قائم کروں۔ مکان کے معاملے میں احمد آباد کے ایک بیرسٹر جیون لال جی ڈیسائی سے بڑی مدد ملی۔ انہوں نے ہمیں کو چرب میں اپنا بنگلہ کرائے پر دے دیا۔

سب سے پہلا سوال یہ تھا کہ آشرم کا نام کیا ہو۔ میں نے اپنے دوستوں سے اس بارے میں مشورہ کیا۔ کئی نام تجویز کئے گئے جن میں "سویا آشرم" (دارالخدمت) اور پتودن (دارالریاضت) بھی تھے۔

مجھے ”سیواشرم“ پسند آیا لیکن اس سے یہ ظاہر نہیں ہوتا تھا کہ خدمت کا طریقہ کیا ہو گا۔ پتودن کے لفظ میں دعوت اور ادا کی جھلک تھی۔ ہمیں ریاضت دل سے پسند تھی مگر مرتاض ہونے کا دعویٰ نہیں کر سکتے تھے۔ میں نے سوچا کہ ہم حق کے پرستار ہیں اور ہمارا کام حق کی تلاش اور حق کی پیروی ہے۔ ہمارے پیش نظریہ ہے کہ ستیاگرہ کی تحریک کو جو جنوبی افریقہ میں آزمائی جا چکی ہے ہندوستان میں چلا کر دیکھیں اس لئے ہمیں اپنے آشرم کا نام ستیاگرہ آشرم رکھنا چاہیے۔ جس سے ہمارے مقصد اور طرز عمل دونوں کا اظہار ہوتا ہے۔ میرے دوستوں کی بھی یہی رائے ہوئی اس لئے یہی نام رکھا گیا۔

اب آشرم کے لئے ایک دستور العمل کی ضرورت تھی۔ اس کا مسودہ تیار ہوا اور دوستوں کے پاس اظہار رائے کے لئے بھیجا گیا۔ جتنی رائیں آئیں ان میں سے مجھے نہ گرد اس بنرجی کی رائے اب تک یاد ہے۔ انہوں نے سب قواعد ضوابط کو پسند کیا اور یہ تجویز پیش کی کہ آشرم والوں سے علاوہ اور باتوں کے کسر نفس کا عہد لیا جائے۔ کیونکہ آج کل کے نوجوانوں میں اس کی بڑی کمی ہے مجھے بھی اس کمی کا احساس تھا۔ لیکن میرا خیال تھا کہ کسر نفس کا عہد لیا جائے تو وہ کسر نفس نہیں رہتا۔ کسر نفس ترک خودی کا نام ہے اور ترک خودی دراصل مولنا (نجات) ہے۔ یہ کوئی عمل نہیں ہے بلکہ وہ مقدر ہے جس کے لئے اور اہماں لئے جاتے ہیں۔ اگر خدمت یا نجات کا طالب کسر نفس سے محروم ہے تو اس کی طلب جھوٹی ہے۔ بغیر کسر نفس کی خدمت خود غرضی بن جاتی ہے۔

ان دنوں ہماری جماعت میں تیرہ تاملی تھے۔ پانچ نوجوان تاملی جنوبی افریقہ سے ہمارے ساتھ آئے تھے اور باقی آٹھ ہندوستان کے مختلف حصوں سے آکر شامل ہو گئے تھے۔ سب ملا کر ہم پچیس نفوس تھے جن میں چند عورتیں بھی تھیں۔

یہ تھی آشرم کی ابتداء۔ ہم سب اکٹھا کھانا کھاتے تھے اور عزیزوں کی طرح مل جل کر رہتے تھے۔

مشکلے نیست کہ آساں نہ شودی

ابھی آشرم کو قائم ہوئے چند مہینے ہوئے تھے کہ ہمیں ایک بڑا سخت امتحان پیش آیا۔ میرے پاس امرت لال ٹھکر کا خط آیا جس کا مضمون یہ تھا ”اچھتوں کا ایک غریب اور دیانت دار خاندان آپ کے آشرم میں آنا چاہتا ہے۔ کیا آپ اسے آشرم میں داخل کرنے کو تیار ہیں؟“

مجھے ذرا تردد ہوا۔ میرے وہم و گمان میں بھی نہ تھا کہ اتنی جلدی اچھوتوں کا خاندان کا خاندان ٹھکر باپا جیسے شخص کی سفارش لے کر آشرم میں داخل ہونے کے لئے آئے گا۔ میں نے اپنے رفیقوں کو یہ خط پڑھ کر سنایا۔ انہوں نے اس تجویز کو دل سے پسند کیا۔

میں نے امرت لال جی کو لکھا کہ ہم ان لوگوں کو داخل کرنے کے لئے تیار ہیں بشرطیکہ انہیں آشرم کے ضابطوں کی پابندی میں کوئی عذر نہ ہو۔

یہ خاندان تین نفوس پر مشتمل تھا۔ دودا بھائی۔ ان کی بیوی دانی بین اور ان کی بچی لکشمی جوان دنوں گھنٹیوں چلتی تھی۔ دودا بھائی بمبئی میں معلم تھے۔ ان تینوں نے ضابطوں کی پابندی مستور کر لی اور یہ آشرم میں داخل کر لئے گئے۔

ان کے داخلے سے آشرم کے سرپرستوں میں کھلسلی پڑ گئی۔ پہلی مشکل پیش آئی کہ بچکے کا کنواں مالک کی نگرانی میں تھا۔ ان کے نوکر نے ہمیں پانی بھرنے سے روکا۔ ہمارے ڈول کے چھینٹوں سے اسے اپنے چرس کے ناپاک ہو جانے کا اندیشہ تھا۔ اس لئے وہ ہمیں گالیاں دیتا تھا اور دودا بھائی کو دق کرتا تھا۔ میں نے سب لوگوں سے کہا کہ گالیاں سنو۔ سب کچھ سہو مگر پانی ضرور بھرو۔ اس شخص نے جب یہ دیکھا کہ یہ لوگ چپ چاپ سن لیتے ہیں تو اسے شرم آئی اور اس نے ہمیں ستانا چھوڑ دیا۔

مگر ہمیں جو مالی امداد ملتی تھی بند ہو گئی۔ جس دوست نے کہا تھا کہ اچھوتوں میں کوئی شخص آشرم

میں داخل ہونے کے قابل نہیں مل سکتا ہے کیا معلوم تھا کہ ایسے لوگ نکل آئیں گے۔
 ادھر لدا بند ہوئی اور ادھر یہ انہیں سنتے میں آئیں کہ ہم لوگ ذات باہر کر دیے جائیں گے۔ میں
 نے اپنے رفیقوں سے کہا کہ اگر ایسا ہوا تو ہم احمد آباد چھوڑ کر نہیں جائیں گے بلکہ اچھوتوں کے محلے میں
 اٹھ جائیں گے اور محنت مزدوری کر کے پیٹ پالیں گے۔
 یہاں تک نوبت پہنچی کہ ایک دن مگن لال گاندھی نے مجھے اطلاع دی "ہمارا سرمایہ ختم ہو گیا
 لگے مہینے کے لئے کچھ نہیں ہے۔"

میں نے اطمینان سے جواب دیا "تو ہم اچھوتوں کے محلے میں اٹھ چلیں گے۔"
 اس معاملہ میں یہ میرا پہلا امتحان نہیں تھا جب کبھی ایسا موقع آیا خدا نے عین دقت پر میری مدد
 کی۔ میری اور مگن لال کی گفتگو کو تھوڑے ہی دن گزرے تھے کہ ایک روز صبح کو ایک بچے نے آکر
 کہا کہ ایک سیٹھ موڑ میں بیٹھ کر آئے ہیں اور آپ سے ملنا چاہتے ہیں۔ میں ان کو لینے کے لئے گیا۔
 انہوں نے مجھ سے پوچھا کہ "میں آشرم کی مدد کروں تو آپ قبول کریں گے؟"
 میں نے کہا "بڑی خوشی سے، سچ پوچھئے تو میں آج کل بالکل غلی ہاتھ ہوں۔"
 سیٹھ بولے "میں کل اسی دقت یہاں آؤں۔ کیا آپ یہاں ہوں گے؟"
 میں نے کہا "جی ہاں۔" سیٹھ چلے گئے۔

دوسرے دن ٹھیک اسی دقت موڑ ہمارے گھر کے سامنے رکی۔ بچوں نے مجھے آکر خبر کر دی۔
 سیٹھ اندر نہیں آئے بلکہ انہوں نے مجھے باہر بلا لیا۔ انہوں نے تیرہ ہزار روپے کے نوٹ میرے ہاتھ میں
 دیے اور رخصت ہو گئے۔

یہ مدد بالکل غلاف توقع تھی اور اس کے ملنے کا طریقہ بھی نیا تھا۔ یہ سیٹھ اس سے پہلے کبھی آشرم
 میں نہیں آئے تھے اور جہاں تک مجھے یاد ہے ان سے صرف ایک بار ملا تھا۔ انہوں نے کچھ نہ دیکھا بھلا
 نہ پوچھا گچھا۔ بس روپیہ دیا اور چل دیئے۔ ایسا تجربہ مجھے کبھی نہیں ہوا تھا۔ اس مدد کے مل جانے سے ہم
 نے اچھوتوں کے محلے میں اٹھ جانے کا خیال ترک کر دیا۔ اب ہمیں ایک سال کے لئے اطمینان ہو گیا۔
 مگر اچھوتوں کے آنے سے خود آشرم کے اندر غلغلا برپا تھا۔ گو جنوبی افریقہ میں اچھوت میرے
 گھر آکر رہا کرتے تھے اور میرے ساتھ کھاتے پیتے تھے۔ مگر میری بیوی کو اور دوسری عورتوں کو
 اچھوتوں کا آشرم میں رکھا جانا پسند نہیں آیا۔ میں نے بھانپ لیا کہ یہ لوگ دہلی بین کے ساتھ مخالفت یا کم
 سے کم بے رخی کا برتاؤ کرتی ہیں۔ مالی مشکلات سے مجھے ذرا بھی پریشانی نہیں ہوئی تھی مگر گھر کے اندر یہ

حالت دیکھنا مجھ پر بہت شاق تھا۔ دانی بین ایک معمولی عورت تھی۔ دادا بھائی کی تعلیم کچھ زیادہ نہ تھی مگر سمجھ اچھی تھی مجھے ان کا صبر بہت پسند آیا۔ کبھی کبھی انہیں غصہ آجاتا تھا مگر عموماً تحمل سے کام لیتے تھے۔ میں نے انہیں سمجھایا کہ چھوٹی چھوٹی باتوں میں حقارت اور دل آزاری کا برتاؤ ہو تو چپ چاپ سہم لینا چاہیے انہوں نے اسے مان لیا اور اپنی بیوی کو بھی اس پر آمادہ کر لیا۔

اس خاندان کا داخلہ آشرم والوں کے لئے بڑا مفید سبق تھا۔ ہم نے شروع ہی سے اس بات کا اعلان کر دیا کہ آشرم میں چھوت چھات کا جھگڑا نہیں رہے گا۔ اس لئے ہمارے سرپرستوں کو کوئی غلط فہمی نہیں رہی اور ہمیں اس معاملے میں بڑی آسانی ہو گئی۔ اس کے بعد بھی آشرم کی مدد زیادہ تر راسخ الاعتقاد ہندوؤں نے کی۔ جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ چھوت کے عقیدے کی بنیادیں ہل گئی ہیں۔ اس کے اور بھی بہت سے ثبوت ہیں مگر یہی کیا کم ہے کہ پکے ہندوؤں کو ایک ایسے آشرم کی مدد کرنے میں جہاں ہم لوگ اچھوتوں کے ساتھ کھانا کھاتے ہیں ذرا بھی باک نہیں۔

اس سلسلہ میں اور بہت سی باتیں ہیں جو تلاش حق کی داستان سے تعلق رکھتی ہیں مگر افسوس ہے کہ میں انہیں نظر انداز کرنے پر مجبور ہوں۔ آئندہ بابوں میں بھی یہی کوتاہ قلمی نظر آئے گی مجھے بہت سی اہم تفصیلات ترک کرنا پڑیں گی کیونکہ اس ڈرامے کے اکثر اشخاص ابھی زندہ ہیں اور ایسے معاملوں میں جو ان کی ذات سے تعلق رکھتے ہیں بغیر اجازت کے ان کا نام لینا مناسب نہیں معلوم ہوتا اور ان سے اجازت لینا یا دو حصے جن میں ان کا ذکر ہے ان کے پاس نظر ثانی کے لئے بھیجنا بڑا بکھیرا ہے۔ پھر یہ طریقہ اس آپ بیتی کے لئے مناسب بھی نہیں۔ اس لئے مجھے اندیشہ ہے کہ بقیہ داستان میں جو میرے خیال میں طالبان حق کے لئے بے حد اہمیت رکھتی ہے بہت کچھ کتر بیونت کرنا پڑے گی۔ پھر بھی انشاء اللہ میں ترک سوالات کے زمانے تک کے خاص خاص واقعات بیان کروں گا۔

”پابند مزدوری“ کی موقوفی

ہم تھوڑی دیر کے لئے آشرم سے جے ابتدا ہی میں اندرونی اور بیرونی طوفان کا مقابلہ کرنا پڑا رخصت ہوتے ہیں اور ایک معاملے کا ذکر کرتے ہیں جس کی طرف مجھے توجہ کرنا پڑی۔

”پابند مزدور“ وہ کہلاتے تھے جو ہندوستان سے ترک وطن کر کے پانچ سال کی مزدوری کے معاہدے پر جنوبی افریقہ جاتے تھے۔ 1914ء کے اسٹس، گاندھی معاہدے کی رو سے نسال میں داخل ہونے والے ”پابند مزدوروں“ کو تین پونڈ کانیکس معاف کر دیا تھا۔ لیکن ہندوستان سے مزدوروں کے جانے کے مسئلہ پر ابھی غور کرنا باقی تھا۔

مارچ 1916ء میں پنڈت مدن موہن مالوی جی نے مرکزی مجلس وضع قوانین میں پابند مزدوری کو منسوخ کرنے کی تحریک پیش کی۔ اس تحریک کو قبول کرتے ہوئے لارڈ ہارڈنگ نے اعلان کیا کہ گورنمنٹ برطانیہ نے وعدہ کیا ہے کہ یہ طریقہ کچھ عرصہ کے بعد موقوف کر دیا جائے گا۔ مگر میرا یہ خیال تھا کہ ہندوستان کو ایسے غیر معین وعدے سے مطمئن نہ ہونا چاہیے بلکہ فوری منسوخی کے لئے جدوجہد کرنا چاہیے۔ یہ محض ہمارے ملک کی غفلت تھی کہ وہ اس جبر کو برداشت کرتا رہا۔ میں سمجھتا تھا کہ اگر اب بھی سارے ملک میں اس کے خلاف احتجاج کا شور بلند ہو تو کامیابی یقینی ہے۔ میں نے چند لیڈروں سے ملاقات کی۔ اخبارات میں مضمون لکھے اور یہ اندازہ کر لیا کہ عام رائے سختی کے ساتھ اس کی فوری منسوخی کی حمایت میں ہے۔ اب یہ سوال تھا کہ کیا یہ ایسی چیز ہے جس کے لئے ستیاگرہ کی جائے۔ مجھے ستیاگرہ کے ضروری ہونے میں کوئی شبہ نہیں تھا۔ مگر یہ سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ اس کا طریقہ کیا ہو۔

اس اثناء میں دائسرا نے نے صاف صاف کہہ دیا کہ ”کچھ عرصہ کے بعد منسوخی“ کے معنی ہیں

”اتنے دن کے بعد کہ آجروں کو کوئی دوسرا انتظام کرنے کی مہلت مل جائے۔“

فروری 1917ء میں پنڈت مالوی جی نے پابند مزدوری کی فوری سنوٹی کے لئے ایک مسودہ پیش کرنے کی اجازت مانگی۔ لارڈ ہمسفورڈ نے اجازت دینے سے انکار کر دیا۔ اب وہ وقت آ گیا کہ میں سارے ہندوستان میں احتجاج کا شور برپا کرانے کے لئے دورہ کروں۔

مگر میں نے مناسب سمجھا کہ پہلے وائسرائے سے مل لوں۔ میں نے ان سے ملاقات کی درخواست کی جو فوراً منظور ہو گئی۔ مسٹر مینی (جو اب سر جان سینٹی کہلاتے ہیں ان کے) پرائیویٹ سیکرٹری تھے۔ مجھے ان سے اکثر ملنے جلنے کا اتفاق ہوا ہے۔ لارڈ ہمسفورڈ سے جو گفتگو ہوئی وہ قابل اطمینان تھی۔ انہوں نے کوئی صحیح بات تو نہیں کہی مگر یہ کہا کہ میں مدد کروں گا۔

میں نے اپنا دورہ بمبئی سے شروع کیا۔ مسٹر جہانگیر پیٹھ نے اسپیریل سٹریٹس ایسوسی ایشن (انجمن شہریان سلطنت برطانیہ) کی طرف سے جلسہ کرانے کا وعدہ کیا۔ پہلے انجمن کی مجلس انتظامیہ کا جلسہ ہوا کہ جلسہ عام میں پیش کرنے کے لئے ریزولوشن ترتیب دے۔ اجلاس میں ڈاکٹر اسٹینپل ریڈ، لالو بھائی سانداس (جو اب سر ہو گئے ہیں) نترنجن جی اور مسٹر پیٹھ موجود تھے۔ بحث اس بات پر تھی کہ حکومت کو سنوٹی کے لئے کتنا وقت دیا جائے۔ تین تجویزیں پیش تھی۔ ایک میں ”جلد سے جلد“ دوسری میں ”31 جولائی تک“ اور تیسری میں ”فوری“ سنوٹی کا مطالبہ تھا۔ میں چاہتا تھا کوئی تاریخ مقرر کر دی جائے تاکہ اگر حکومت اس وقت تک ہماری درخواست پوری نہ کرے تو ہم اپنے آئندہ طرز عمل کے متعلق فیصلہ کر سکیں۔ لالو بھائی ”فوری سنوٹی“ کے حامی تھے۔ ان کے نزدیک اکتیس جولائی تک کی مہلت زیادہ تھی۔ میں نے کہا کہ لوگ فوری کا مفہوم نہیں سمجھیں گے اگر ہم ان سے کچھ عملی کام کرانا چاہتے ہیں تو تاریخ کی صراحت کر دینا چاہیے ”فوری“ کی تاویل ہر فریق اپنے طور پر کر سکتا ہے مگر 31 جولائی“ میں کسی طرح کے شبہ کی گنجائش نہیں اگر اس وقت تک کوئی کارروائی نہ ہوئی تو ہم اور تدبیریں اختیار کر سکیں گے۔ ڈاکٹر ریڈ کی سمجھ میں یہ بات آگئی اور آخر میں لالو بھائی نے بھی اس سے اتفاق کیا۔ ہم نے یہی طے کیا کہ حکومت سے مطالبہ کیا جائے کہ 31 جولائی تک سنوٹی کا اعلان کر دے۔ جلسہ عام میں اس مضمون کا ریزولوشن پاس ہو گیا اور سارے ہندوستان میں اس کی تائید میں جلسے کئے گئے۔

مسز جی پیٹھ نے انتہائی سرگرمی اور مستعدی سے کام لے کر خواتین کا ایک وفد ترتیب دیا اور اسے وائسرائے کی خدمت میں لے گئیں۔ بمبئی سے جو خواتین گئی تھیں ان میں سے مجھے بیڈی ٹاٹا اور دلشاد بیگم صاحبہ کے نام یاد ہیں۔ یہ وفد بہت کامیاب رہا۔ وائسرائے نے ہمت افزا جواب دیا۔

میں نے کراچی، کلکتہ اور بہت سے اور شہروں کا دورہ کیا۔ ہر مقام پر شاندار جلسے ہوئے اور بے انتہا جوش کا اظہار کیا گیا۔ مجھے اس تحریک کو شروع کرتے وقت اتنی کامیابی کی توقع نہ تھی۔

ان دنوں میں تہا سفر کرتا تھا اس لئے مجھے بڑے دل چسپ تجربے ہوا کرتے تھے۔ خفیہ پولیس والے ہمیشہ میرے پیچھے لگے رہتے تھے۔ مگر میری بات چینی ہوئی نہیں تھی اس لئے نہ وہ مجھے ستاتے تھے اور نہ میں ان سے تعرض کرتا تھا خوش قسمتی سے اس وقت تک میرے نام کے ساتھ ”مہاتما“ کا دم چھلا نہیں لگا تھا۔ اگر بعض مقامات پر جہاں لوگ مجھ سے واقف تھے اس لقب کے نعرے لگائے جاتے تھے۔

ایک بار خفیہ پولیس والوں نے مجھے کئی اسٹیشنوں پر آکر پریشان کیا۔ میرا نام پوچھتے اور ٹکٹ کا نمبر لکھتے تھے۔ ظاہر ہے کہ میں بڑی خوشی سے ان کے سوالوں کا جواب دیتا رہا میرے ہمسفر مجھے یہ سمجھتے تھے کہ یہ کوئی سادھو یا فقیر ہے۔ انہیں یہ دیکھ کر کہ خفیہ پولیس والے مجھے ہراسنیشن پر دق کرتے ہیں، غصہ آگیا اور انہوں نے ان لوگوں کو خوب ڈانٹا۔ انہوں نے کہا ”اس غریب سادھو کو ناحق کیوں ستاتے ہو“ اور مجھ سے کہنے لگے ”تم ہرگز ان بد معاشوں کو ٹکٹ نہ دکھاؤ۔“

میں نے نرمی سے کہا ”ٹکٹ دکھانے میں میرا کیا حرج ہے؟ یہ بیچارے اپنا فرض ادا کر رہے ہیں، مسافروں کو اس سے اطمینان نہیں ہوا۔“ انہوں نے مجھ سے اور زیادہ ہمدردی کا اظہار کیا اور آپس میں کہنے لگے کہ کیسا اندھیر ہے کہ لوگ بے گناہوں کو خواہ مخواہ پریشان کرتے ہیں۔

مجھے خفیہ پولیس والوں کے سبب سے کوئی تکلیف نہیں تھی۔ البتہ تیسرے درجے کے سفر میں بڑی مصیبتیں اٹھانا پڑتی تھیں۔ سب سے زیادہ تلخ تجربہ مجھے لاہور سے دہلی تک کے سفر میں ہوا۔ میں کراچی سے کلکتے جا رہا تھا اور لاہور میں گاڑی بدلتا تھا۔ دہلی کی گاڑی میں مجھے کسی طرح جگہ نہیں ملتی تھی۔ گاڑی کچا کچ بھری ہوئی تھی اور جو لوگ اندر گھسنا چاہتے تھے انہیں دھینکا مشتی کرنا پڑتی تھی۔ جن ڈبوں کے دروازے بند تھے ان میں لوگ کھڑکیوں سے چڑھ جاتے تھے۔ مجھے جلسے کی تاریخ پر کلکتے پہنچنا تھا اور اس گاڑی سے نہ جاؤں تو دولت پر نہیں پہنچ سکتا تھا۔ میں جگہ ملنے سے قریب قریب مایوس ہو گیا تھا لوگ مجھے کہیں دھنسنے نہیں دیتے تھے۔ ایک کلی نے میری یہ حالت دیکھ کر مجھ سے کہا ”مجھے بارہ آنہ دو تو میں جگہ دلوادوں۔“ میں نے کہا ”اچھا اگر مجھے بٹھاد دو تو میں بارہ آنے دے دوں گا“ نوجوان کلی گاڑی گاڑی پھر کر مسافروں کی غاشد کرنے لگا مگر وہاں کون سنا تھا۔ گاڑی چھوٹنے دہلی تھی کہ ایک ڈبے کے مسافروں نے کہا جگہ تو یہاں بالکل نہیں مگر تم سے ہو سکے تو اسے اندر ڈھکیں دو۔ کھڑے

کھڑے چلا جائے گا، قلی نے مجھ سے پوچھا میں فوراً راضی ہو گیا اور اس نے مجھے اٹھا کر کھڑکی سے ڈھکیں دیا۔ اس طرح قلی نے مجھے جگہ دلوائی اور اپنے بارہ آنے کھڑے کر لئے۔

یہ رات میرے لئے بڑی مصیبت کی رات تھی۔ دوسرے مسافروں نے گھس پیٹھ کر بیٹھنے کی جگہ نکال لی۔ میں دو گھنٹے تک ادپر کی سچ کی زنجیر تھامے کھڑا رہا۔ اس پر بھی چند مسافر مجھے چین نہیں لینے دیتے تھے وہ کہتے تھے ”بیٹھ کیوں نہیں جاتا؟“ میں نے عذر کیا کہ بیٹھنے کی جگہ نہیں ہے مگر انہیں اس سے اطمینان نہیں ہوا۔ وہ ادپر کی سچ پر مزے میں پیر پھیلائے لیٹے تھے مگر میرا کھڑا رہنا بھی انہیں ناگوار تھا۔ وہ مجھے برابر ڈانٹتے رہے اور میں نرمی سے جواب دیتا رہا۔ آخر وہ بھی نرم پڑ گئے۔ چند لوگوں نے میرا نام پوچھا۔ جب میں نے نام بتایا تو وہ بہت شرمندہ ہوئے۔ انہوں نے مجھ سے معذرت کی اور سمٹ سمٹا کر میرے لئے بیٹھنے کی جگہ نکالی اس طرح مجھے صبر کا پھل ملا۔ میں تھک کر چور ہو گیا تھا اور مجھے چکر آرہے تھے۔ خدا نے عین وقت پر میری مدد کی۔

غرض کسی نہ کسی طرح میں دہلی اور وہاں سے کلکتے پہنچا۔ وہاں میں مہاراجہ قاسم بازار کا مہمان تھا جو جلسے کی صدارت کرنے والے تھے۔ کراچی کی طرح یہاں بھی بیحد جوش کا اظہار کیا گیا۔ جلسے میں کئی انگریز بھی شریک تھے۔

31 جولائی سے پہلے حکومت نے اعلان کر دیا کہ ہندوستان سے پابند مزدوروں کا بھیجنابند کیا جاتا

ہے۔

1894 میں میں نے پابند مزدوری کے خلاف احتجاج کرنے کے لئے پہلی درخواست لکھی تھی اور مجھے اسی زمانے میں پوری امید تھی۔ یہ طلسم جسے سر۔ وہنٹر ”نیم غلامی“ کہتے تھے کسی نہ کسی دن ٹوٹ کر رہے گا۔

اس تحریک میں جو 1894 میں شروع ہوئی تھی بہت سے لوگوں نے مدد دی۔ لیکن میں تو یہی کہوں گا کہ ستیاگرہ کا امکان نہ ہوتا تو اس طلسم کا خاتمہ اتنی جلدی ہرگز نہیں ہو سکتا تھا۔

جو لوگ اس تحریک کی مزید تفصیلات معلوم کرنا چاہتے ہوں وہ میری کتاب ”جنوبی افریقہ کی ستیاگرہ کی تاریخ“ کا مطالعہ کریں۔

نیل کا دھبا

چمپارن راجہ جنک کالک ہے۔ جس طرح وہاں آم کے باغوں کی کثرت ہے اسی طرح 1917ء تک نیل کی کاشت پھیلی ہوئی تھی، چمپارن کے کاشتکار اس کے پابند تھے کہ اپنی زمین کے بیس حصوں میں سے تین میں زمیندار کے لئے نیل کی کاشت کریں۔ یہ نظام ”تن گھتیا“ کہلاتا تھا۔ ”گتھ“ ایک ایکڑ کے بیسویں حصے کو کہتے ہیں۔

سچ پوچھئے تو مجھے اس وقت تک یہ بھی نہیں معلوم تھا کہ چمپارن کہاں ہے بلکہ میں نے اس کا نام تک نہیں سنا تھا مجھے مطلقاً خبر نہ تھی کہ نیل کی کاشت کیسے ہوتے ہیں میں نے نیل کے بورے ضرور دیکھے تھے مگر یہ نہیں جانتا تھا کہ یہ چمپارن میں ہزاروں کاشتکاروں پر ظلم کر کے تیار کئے گئے ہیں۔

راجگمار شکل ایک کاشتکار تھے جنہوں نے خود اس شکنجے کی اذیت سہی تھی اور ان کے دل میں یہ جوش تھا کہ اپنے ہزاروں بھائیوں کے دامن سے، جو ان کی طرح تکلیفیں اٹھا رہے ہیں، یہ نیل کا دھبا چھڑائیں۔

میں 1916ء کی کانگریس میں لکھنؤ گیا تھا وہاں راجگمار شکل نے مجھے آن پکڑا اور مجھ سے اصرار کرنے لگے کہ چمپارن چلو۔ انہوں نے کہا ”دکیل باجو آپ کو ہمارے دکھ درد کا سارا حال بتائیں گے“ یہ دکیل باجو پر جکشور پرشاد جی تھے جو بہار میں قومی کاموں کے روح رواں ہیں اور جن کی رفاقت کا فخر مجھے چمپارن میں ہوا۔ راجگمار شکل انہیں میرے خیمے میں لے آئے۔ وہ سیاہ لپکے کی اچکن اور پتلون پہنے تھے پہلی ملاقات میں مجھ پر باجو صاحب کا کچھ اچھا اثر نہیں پڑا۔ میں سمجھا کہ یہ کوئی دکیل ہیں جو بھولے بھالے

کاشتکاروں کو پھانس کر اپنا کام تکانا چاہتے ہیں۔ انہوں نے چمپارن کے حالات سنائے اور میں نے حسب معمول یہ جواب دیا۔ ”میں جب تک سارے حالات خود نہ دیکھ لوں کوئی رائے نہیں دے سکتا۔ آپ کانگریس میں ریزولوشن ضرور پیش کیجئے مگر مجھے تو مہربانی کر کے ابھی چھوڑ ہی دیجئے، ظاہر ہے کہ راجکمار شکل کانگریس سے بھی مدد چاہتے تھے۔ بابو راجکمار پرشاد نے اہل چمپارن سے ہمدردی کا ریزولوشن پیش کیا اور وہ اتفاق رائے سے پاس کیا گیا۔

راجکمار شکل کو اس سے خوشی ہوئی مگر ان کا پورا اطمینان نہیں ہوا۔ وہ چاہتے تھے کہ میں خود چمپارن جاؤں اور کسانوں کی مصیبت دیکھوں۔ میں نے ان سے وعدہ کیا کہ میں اپنے دورے کے سلسلے میں دو ایک دن چمپارن میں بھی آکر ٹھہروں گا۔ انہوں نے کہا۔ ایک ہی دن کافی ہے آپ اپنی آنکھ سے دیکھ لیں گے کہ کیا حال ہے۔

لکھنؤ سے میں کانپور گیا۔ راجکمار شکل میرے ساتھ ساتھ وہاں بھی پہنچے۔ انہوں نے بڑے اصرار سے کہا ”چمپارن یہاں سے نزدیک ہے۔ مہربانی کر کے ایک دن کے لئے چلے چلئے۔“

میں نے کہا ”اس وقت تو معاف کیجئے مگر میں وعدہ کرتا ہوں کہ ضرور آؤں گا“ وہاں سے میں آشرم آیا۔ دھن کے پکے راجکمار وہاں بھی پہنچے۔ انہوں نے کہا ”مہربانی کر کے آپ کوئی تاریخ مقرر کر دیجئے،“ میں نے جواب دیا ”مجھے ناں تاریخ کو کلکتے جانا ہے آپ وہاں مجھ سے ملنے گا اور مجھے ساتھ لے چلئے گا، مجھے کچھ خبر نہ تھی کہ کہاں جانا ہے، کیا دیکھنا ہے اور کیا کرنا ہے۔“

میں کلکتے میں پن بابو کے گھر پہنچا تو دیکھا کہ راجکمار پہلے سے براج رہے ہیں۔ غرض اس بے پڑھے لکھے، بھولے بھالے مگر دھن کے پکے کسان نے مجھے گرفتار کر ہی لیا۔

1917ء کے شروع میں ہم کلکتے سے چمپارن روانہ ہوئے ہم دونوں کی وضع ایک سی تھی، دونوں دیہاتی معلوم ہوتے تھے۔ مجھے یہ بھی معلوم نہیں تھا کہ کونسی گاڑی میں جانا ہے۔ انہوں نے مجھے لے جا کر ایک گاڑی میں اپنے ساتھ بٹھالیا اور صبح کو ہم دونوں پتہ پہنچ گئے۔ مجھے پتہ جانے کا یہ پہلا اتفاق تھا۔ میرا کوئی دوست یا ملاقاتی وہاں نہیں تھا جس کے یہاں جا کر ٹھہر سکتا۔ میں سمجھتا تھا کہ راجکمار شکل معمولی کسان ہیں تو کیا ہوا پتہ میں کچھ لوگوں سے ان کی جان پہچان ضرور ہوگی۔ راہ میں مجھے ان کی طبیعت کا کچھ تھوڑا بہت اندازہ ہوا اور پتہ پہنچ کر جو کچھ غلط فہمی تھی دور ہو گئی۔ پچارے بالکل سادہ لوح تھے۔ جن دکیوں کو وہ اپنا دوست سمجھتے تھے وہ ان غریب سے لوگوں کا سا برتاؤ کرتے تھے۔ کہاں دکیل صاحب اور کسان موکل کہاں راجہ بھوج اور کہاں گنکا تیلی۔

راجکمار مجھے راجندر بابو کے گھر لے گئے وہ پوری یا کسی اور جگہ گئے ہوئے تھے بھگتے میں دو تین نوکر تھے جنہوں نے ہماری بات تک نہیں پوچھی۔ میرے پاس تھوڑا بہت کھانے کا سامان موجود تھا۔ مجھے کچوروں کی ضرورت تھی جو میرے دوست نے بازار سے لادیں۔

بہار میں چھوٹ پھلت کا بڑا زور تھا۔ راجندر بابو کے نوکر اس کے روادار نہیں تھے کہ جس وقت وہ کنویں کے پاس موجود ہوں میں پانی بھردوں۔ انہیں میری ذات معلوم نہیں تھی اس لئے احتیاط کرتے تھے کہ کہیں میرے ڈول کے چھینٹے ان کے جسم کو ناپاک نہ کر دیں مجھے قضاے حاجت کی ضرورت ہوئی، راجکمار نے مجھے اندر کا پاخانہ بتایا مگر ایک نوکر نے فوراً باہر کے پاخانے کی طرف اشارہ کیا میں ان باتوں کا عادی تھا اس لئے مجھے نہ تعجب ہوا اور نہ برا معلوم ہوا یہ لوگ اپنے خیال میں اپنا فرض ادا کر رہے تھے اور راجندر بابو کی منشاء کے مطابق عمل کر رہے تھے۔

ان دلچسپ تجربوں سے جہاں مجھے راجکمار شکل کی سادہ لوحی کا اندازہ ہوا وہاں میرے دل میں ان کی عزت بڑھ گئی مگر یہ میں نے سمجھ لیا کہ ان کی رہنمائی سے کام نہیں چلے گا اب مجھے معاملہ اپنے ہاتھ میں لینا چاہیے۔

بہاریوں کی شرافت اور نیک دلی۔

مجھ سے اور مولانا مظہر الحق سے اس زمانے کی ملاقات تھی جب وہ لندن میں بیرسٹری کی تعلیم حاصل کر رہے تھے اس کے بعد 1915ء میں جس سال وہ مسلم لیگ کے صدر تھے، بمبئی کی کانگریس میں انہوں نے اس ملاقات کی تجدید کی اور مجھے دعوت دی کہ جب پتہ آڈ تو میرے گھر ٹھہرنا۔ اس وقت مجھے وہ دعوت یاد آئی اور میں نے انہیں ایک رقعہ بھیجا جس میں یہ بھی لکھ دیا کہ میں چمپارن جانے کی غرض سے یہاں آیا ہوں وہ فوراً اپنی موٹر کار میں پہنچے اور بڑا اصرار کرنے لگے کہ میرے یہاں چل کر ٹھہرو۔ میں نے ان کا شکریہ ادا کیا اور ان سے یہ درخواست کی کہ مجھے سب سے پہلی گاڑی میں جو چمپارن جاتی ہو بٹھادیں کیونکہ میرے جیسے اجنبی کو ریل کے ٹائم ٹیبل سے کچھ پتہ نہیں چل سکتا تھا۔ انہوں نے راجکمار شمل سے گفتگو کرنے کے بعد یہ تجویز کی کہ پہلے مظفر پور جاؤ۔ شام کو انہوں نے مجھے مظفر پور کی گاڑی سے روانہ کر دیا۔

پرنسپل کرپلانی اس زمانے میں مظفر پور میں تھے۔ میں جب حیدر آباد (سندھ) گیا تھا اس وقت سے ان سے ملاقات تھی۔ ڈاکٹر چھونت رام نے مجھ سے ان کے ایثار اور ان کی سادگی کی تعریف کی تھی اور اپنے آشرم کا ذکر کرتے ہوئے کہا تھا کہ اس کے مصارف کا انتظام پردفیمر کرپلانی ہی نے کیا ہے وہ پہلے مظفر پور کے گورنمنٹ کالج میں پردفیمر تھے مگر میرے پہنچنے سے کچھ دن پہلے اس عہدے سے استعفیٰ دے چکے تھے میں نے انہیں تار کے ذریعہ سے اپنے آنے کی اطلاع دے دی تھی اور باوجودیکہ گاڑی آدمی رات کو پہنچی وہ طالب علموں کی فوج کی فوج ساتھ لئے اسٹیشن پر موجود تھے۔ ان کا خود کوئی مکان نہیں تھا بلکہ وہ پردفیمر ملکائی کے یہاں رہتے تھے اس لئے مجھے بھی اصل میں انہیں کا مہمان ہونا پڑا۔ اس زمانے میں ایک گورنمنٹ کالج کے پردفیمر کامیرے جیسے شخص کو اپنے یہاں ٹھہرانا غیر معمولی

بات تھی۔

پروفیسر کرپلانی نے مجھے بہار کی خصوصاً تربہٹ کی کمشنری کی حالت زار بتائی جس سے مجھے اندازہ ہوا کہ میرا کام کس قدر مشکل ہے ان سے بہار کے لوگوں سے بہت میل جول تھا انہوں نے ان لوگوں پر میرے آنے کی غرض ظاہر کی۔ صبح کو چند دکیل مجھ سے ملنے آئے۔ ان میں سے رام زمی پرشاد جی کا نام مجھے اب تک یاد ہے کیونکہ ان کے جوش اور خلوص کا میرے دل پر بہت اثر ہوا انہوں نے کہا ”آپ جو کام کرنے کے لئے آئے ہیں وہ یہاں (یعنی پروفیسر تیلکانی کے گھر) رہ کر نہیں کر سکتے۔ آپ ہم لوگوں میں کسی کے یہاں اٹھ چلئے۔ گیا بابو یہاں کے مشہور دکیل ہیں۔ میں آپ کو ان کی طرف سے دعوت دینے آیا ہوں کہ ان کے یہاں قیام کیجئے۔ سچ پوچھئے تو ہم گورنمنٹ سے ڈرتے ہیں مگر ہم سے جو کچھ مدد ہو سکے گی کریں گے۔ راجکمار شکل نے آپ سے جو باتیں بیان کی ہیں ان میں سے اکثر صحیح ہیں، افسوس ہے کہ ہمارے لیڈر بابو برج کشور اور بابو راجندر پرشاد یہاں موجود نہیں ہیں ان دونوں کو تار دے دیئے ہیں مجھے امید ہے کہ دو جلد یہاں پہنچ جائیں گے اور ان سے آپ کو یقیناً ہر طرح کی معلومات بہم پہنچے گی اور بہت کچھ مدد ملے گی۔ اپنا تو اب گیا بابو کے یہاں تشریف لے چلئے۔

یہ ایسی درخواست تھی جسے میں رد نہیں کر سکتا تھا۔ پھر بھی مجھے تھوڑا سا تامل تھا کہ کہیں گیا بابو کو میری وجہ سے نقصان نہ پہنچ جائے مگر انہوں نے مجھے اطمینان دلایا اور میں ان کے یہاں اٹھ گیا۔ وہ ان کے خاندان والے میرے ساتھ بڑی محبت سے پیش آئے۔

اس عرصے میں برج کشور بابو درہمٹگا سے اور راجندر بابو پوری سے آگئے۔ اب کی برج کشور بابو مجھے اور ہی زنگ میں نظر آئے یہ وہ بابو برج کشور پرشاد نہیں تھے جو مجھے لکھنؤ میں نیلے تھے ان کی منکسر مزاجی، سادگی، نیکی اور حسن عقیدت نے جو بہاریوں کے حصے کی چیزیں ہیں، میرے دل کو روحانی مسرت سے مالا مال کر دیا مجھے یہ دیکھ کر حیرت اور خوشی ہوئی کہ بہار کے دکیل ان کی بڑی عزت کرتے تھے۔

تھوڑے ہی دن میں میرے اور اس حلقہ احباب کے درمیان محبت اور دوستی کا رشتہ استوار ہو گیا۔ بابو برج کشور نے مجھے سارے واقعات سمجھائے ان کے پاس غریب کسانوں کے مقدمے رہا کرتے تھے۔ اس وقت بھی دو مقدموں کی کارروائی جاری تھی جب وہ ان مقدموں میں کامیاب ہوتے تو اپنے دل میں یہ سمجھتے کہ میں غریبوں کی مدد کر رہا ہوں حالانکہ وہ ان بیچاروں سے نفیس برابر وصول کرتے تھے۔ دکیلوں کے دل میں یہ بات بیٹھ گئی ہے کہ اگر ہم نفیس نہ لیں تو ہمارا خرچ نہیں چلے گا اور ہم غریبوں کی مدد نہیں کر سکیں گے بنگال اور بہار کے دکیلوں کی نفیس کی شرح سن کر میرے ہوش اڑ گئے مجھ سے لوگوں

نے کہا ”ہم نے فلاں شخص سے اپنے مقدمے میں رائے لی تھی اسے دس ہزار روپے دیئے“ ہزاروں سے کم کی بات چیت نہ تھی۔

میں نے ان لوگوں کو دوستانہ ملامت کی۔ یہ جھڑکیاں انہیں ناگوار نہیں ہوئیں میں نے کہا ”ان سب واقعات کو سننے کے بعد میری یہ رائے ہے کہ ہمیں مقدمے بازی نہیں کرنی چاہیے اس سے کوئی فائدہ نہیں۔ جب کسانوں پر یہ ظلم ہوتے ہیں اور ان کے دلوں میں خوف بیٹھا ہوا ہے تو عدالتیں بیکار ہیں۔ ان کی مدد کا صرف یہی طریقہ ہے کہ ان کے دل سے خوف دور کر دیا جائے۔ جب تک بہار میں تنگتھیا کا خاتمہ نہ ہو جائے ہمیں چین نہ لینا چاہیے میرا قصد یہاں دو دن ٹھہرنے کا تھا مگر اب معلوم ہوتا ہے کہ عجب نہیں اس کام میں دو سال لگ جائیں۔ میں تیار ہوں کہ جب تک ضرورت ہو یہاں ٹھہروں۔ میں نے سمجھ لیا ہے کہ مجھے کیا کرنا چاہیے مگر آپ لوگوں کی مدد کی ضرورت ہے۔

میں نے دیکھا کہ برجکشور بابو بڑی سمجھ بوجھ کے آدمی ہیں انہوں نے سنجیدگی سے کہا ”ہم سے جہاں تک بنے گا مدد کریں گے مگر یہ تو فرمائیے کہ آپ کو کس قسم کی مدد کی ضرورت ہوگی۔“
یہ باتیں آدھی رات تک ہوتی رہیں۔

میں نے کہا ”مجھے آپ کی قانونی معلومات کی ضرورت نہیں پڑے گی۔ مجھے صرف محرر اور ترجمان چاہیے۔ ممکن ہے کہ جیل خانے جانے کی نوبت آئے۔ خوشی تو مجھے جب ہوگی کہ آپ اس میں بھی میرا ساتھ دیں مگر میں آپ کو مجبور نہیں کروں گا۔ آپ کا یہی ایثار کیا کم ہے کہ آپ محرری کا کام کریں اور غیر معین مدت کے لئے اپنے پیسے کو ترک کر دیں۔ مجھے یہاں کی بندی سمجھنے میں دلت ہوتی ہے اور گیتھی یا اردو کے کاغذات تو پڑھ ہی نہیں سکتا آپ کو ان کا ترجمہ میرے لئے کرنا ہو گا ہم میں اتنی استطاعت نہیں کہ اس کا معاوضہ دیں۔ یہ سارا کام خدمت اور ایثار کی نیت سے مفت ہونا چاہیے۔“

برجکشور بابو میرا مطالبہ سمجھ گئے انہوں نے باری باری سے مجھ سے اور اپنے رفیقوں سے جرح شروع کی۔ مجھ سے انہوں نے اس قسم کے سوالات کئے۔ آپ کو کتنے دن تک ہماری خدمات کی ضرورت ہے اور کتنے آدمی چاہیے؟ کیا یہ ممکن ہے کہ ہم لوگ باری باری سے کام کرکیں؟ ”وکیلوں سے انہوں نے پوچھا“ آپ لوگوں میں سے کون کون کام کرنے کے لئے تیار ہیں اور کتنے دن کر سکتے ہیں؟“

اس ساری بحث کے بعد ان لوگوں نے مجھ سے کہا۔ ”ہم میں سے فلاں فلاں شخص آپ کی مدد کے لئے تیار ہیں۔ کچھ لوگ ایسے ہیں کہ جب تک ضرورت ہو حاضر رہیں گے جیل جانے پر آمادہ ہونا ہمارے لئے بالکل نئی چیز ہے۔ ہم کوشش کریں گے کہ ہم میں اتنی ہمت پیدا ہو جائے۔“

چودھواں باب

”اہمسا“ کا نظارہ

میرا مقصد یہ تھا کہ چمپارن کے کسانوں کی حالت کا مطالعہ کروں اور یہ معلوم کروں کہ انہیں نیل کی کوٹھی والوں سے کیا کیا شکایتیں ہیں۔ اس کے لئے ہزاروں کاشتکاروں سے ملنے کی ضرورت تھی مگر یہ تحقیقات شروع کرنے سے پہلے میں نے کوٹھی والوں کے خیالات سے واقف ہونا اور اس قسمت کے کمشنر سے ملنا ضروری سمجھا چنانچہ میں نے کوٹھی والوں کی انجمن کے سیکرٹری اور ترمٹ کمشنر سے ملاقات کی درخواست کی جسے دونوں نے منظور کر لیا۔

انجمن کے سیکرٹری نے مجھ سے صاف صاف کہا کہ تم باہر کے آدمی ہو تمہیں کوٹھی والوں اور ان کے کاشتکاروں کے باہمی معاملات میں دخل دینے کا کوئی حق نہیں پھر بھی اگر تم کچھ شکایتیں پیش کرنا چاہتے ہو تو تحریر کے ذریعے سے پیش کر دو میں نے نرمی سے جواب دیا کہ میں اپنے آپ کو باہر کا آدمی نہیں سمجھتا اور جب کسان خود چاہتے ہیں کہ میں ان کے حالات کی تحقیقات کروں تو مجھے اس کا پورا حق ہے۔

کمشنر صاحب سے ملا تو وہ ہوا کے گھوڑے پر سوار تھے۔ انہوں نے مجھے بہت دھمکایا اور کہا تم فوراً ترمٹ سے چلے جاؤ۔

میں نے اپنے رفیقوں سے یہ سب واقعات بیان کئے۔ میں نے کہا کہ غالباً گورنمنٹ مجھے آگے جانے سے روک دے گی اور ممکن ہے کہ مجھے خلاف توقع ابھی سے جیل جانا پڑے جب مجھے گرفتار ہی ہونا ہے تو مناسب یہ ہے کہ میری گرفتاری موتمہاری میں بلکہ اگر ممکن ہو تو بیٹیا میں ہو۔ اس لئے مجھے جلد سے جلد ان میں سے کسی مقام پر پہنچ جانا چاہیے۔

چمپارن تربت کی قسمت کا ایک ضلع ہے اور اس کا صدر مقام موتہاری ہے۔ راجکمار شکل کا گھر بیٹیا کے قریب تھا اور اس نواح میں نیل کے کاشتکاروں کی حالت اور مقامات سے بھی بدتر تھی۔ راجکمار شکل چاہتے تھے کہ میں ان لوگوں سے ملوں اور مجھے بھی اس کی بہت خواہش تھی۔

چنانچہ میں اپنے رفیقوں کے ساتھ موتہاری روانہ ہو گیا۔ وہاں ہم بابو گورکھ پرشاد کے مہمان بنے اور ان کا گھر سرائے بن گیا۔ اس میں اتنے آدمیوں کی گنجائش بڑی مشکل سے نکلی۔ اسی دن ہم نے یہ سنا کہ موتہاری سے پانچ میل کے فاصلے پر ایک گاؤں میں کسی کاشتکار سے بدسلوکی کی گئی ہے۔ یہ سنا کہ میں دوسرے دن صبح کو بابو دھرنی دھر پرشاد کے ساتھ جا کر اس کاشتکار سے ملوں، چنانچہ ہم دونوں ہاتھی پر بیٹھ کر چلے۔ چمپارن میں ہاتھیوں کی وہی کثرت ہے جو گجرات میں بیل گاڑیوں کی۔ ابھی ہم آدمی دور بھی نہیں گئے تھے کہ ایک شخص سپرنٹنڈنٹ پولیس کا پیام لایا کہ ”صاحب نے آپ کو سلام بولا ہے۔“ میں ان کا مطلب سمجھ گیا۔ دھرنی بابو کو تو میں نے اس گاؤں کی طرف بھیج دیا اور میں کرائے کی گاڑی میں بیٹھ گیا جو سپرنٹنڈنٹ کا آدمی لایا تھا۔ اس نے مجھے مجسٹریٹ کا حکم دکھایا کہ چمپارن سے فوراً چلے جاؤ اور مجھے میری قیام گاہ پر پہنچا دیا۔ اس نے مجھ سے اطلاع دینی کے تصدیق پائی میں نے لکھ دیا کہ میں اس حکم کی تعمیل نہیں کروں گا اور جب تک میری تحقیقات ختم نہ ہو جائے گی میں چمپارن سے نہیں جاؤں گا۔ اس پر میرے پاس سمن پہنچا کہ کل تمہیں عدالت میں حلف درزی کی جواب دہی کرنا ہوگی۔

میں نے رات بھر جاگ کر خطوط لکھے اور بریکشور بابو کو ضروری ہدایتیں دیں۔ اس حکم اور سمن کے آنے کی خبر شہر بھر میں پھیل گئی اور لوگوں نے مجھ سے کہا کہ موتہاری میں اس روز ایسے منظر دیکھنے میں آئے جو پہلے کبھی نہیں دیکھے گئے تھے گورکھ بابو کے مکان پر اور عدالت میں لوگوں کے ٹھٹ لگے ہوئے تھے۔ یہ بڑا اچھا ہوا کہ میں نے اپنا کام رات ہی کو ختم کر لیا تھا ورنہ یہ مجمع کچھ نہ کرنے دیتا۔ میرے رفیقوں نے اس موقع پر بڑا کام کیا۔ انہوں نے اس مجمع کو جو میرے پیچھے سب کہیں پہنچتا تھا قابو میں رکھا اور اس کی تنظیم اور ترتیب کرتے رہے۔

یہاں کے حکام یعنی کلکٹر اور سپرنٹنڈنٹ سے مجھ سے ایک طرح کی دوستی ہو گئی۔ میں قانوناً ان کے احکام کی اطلاع دینی سے انکار کرنے کا مجاز تھا مگر میں نے خوشی سے اطلاع دینی اور ان لوگوں کے ساتھ انتہائی تہذیب کا برتاؤ کیا۔ ان پر یہ ثابت ہو گیا کہ مجھے ان سے ذاتی مخالفت نہیں بلکہ میں صرف ان کے احکام کے خلاف سول نافرمانی کر رہا ہوں۔ اس سے انہیں بہت اطمینان ہو گیا اور انہوں نے مجھ پر

سختی کرنے کی بجائے مجمع کی تنظیم میں میرا اور میرے ساتھیوں کا ہاتھ بٹایا۔ مگر یہ اس بات کا چشم دید ثبوت تھا کہ اس وقت ان کا رعب اٹھ گیا ہے۔ لوگوں نے کچھ دیر کے لئے سزا کا خوف دل سے نکال کر اپنے نئے دوست کی محبت کے آگے سر تسلیم خم کر دیا تھا۔

یہ یاد رہے کہ چمپارن میں کوئی شخص مجھے نہیں جانتا تھا۔ کسانوں نے میرا نام تک نہیں سنا تھا۔ چمپارن گنگا کے شمالی کنارے سے دور بہالیہ کے دامن میں نیپال کی سرحد کے قریب واقع ہے۔ اس وقت تک یہاں کے لوگ ہندوستان کے بقیہ حصوں کے حالات سے بالکل بے خبر تھے۔ کانگریس کا نام ان کے کانوں تک ضرور پہنچا تھا مگر ہمیں شریک ہونا تو دور کنار وہ اس کا ذکر کرتے ڈرتے تھے۔ مگر اب کانگریس کا ہاتھ ان کے دیس تک پہنچ گیا تھا اور اس کے ممبر وہاں جا پہنچے تھے اگرچہ اس معاملے میں کانگریس کا نام نہ تھا مگر کام اسی کا تھا۔

میں نے اپنے دوستوں کے مشورے سے یہ طے کیا تھا کہ ہم جو کچھ کریں اپنی طرف سے کریں کانگریس کا نام نہ آئے۔ ہمیں نام سے غرض نہ تھی، بلکہ کام سے تھی۔ جوہر سے زیادہ واسطہ تھا عرض سے نہ تھا۔ بات یہ تھی کانگریس کے نام سے گورنمنٹ اور اس کے دلی نعمت نیل کی کوٹھی والے بھڑکتے تھے۔ ان کے ذہن میں کانگریس کا مفہوم تھا وکیلوں کی کج بحثیاں، قانونی داؤ پچ سے قانون کو پچھاڑنا، ہم کے گولے، انارکسنوں کے جرائم، حکمت عملی اور ریاکاری۔ ہم ان کے دل سے اس خیال کو دور کرنا چاہتے تھے۔ اس لئے ہم نے یہ فیصلہ کیا تھا کہ کانگریس کو پچ میں نہ لائیں اور کسانوں سے اس کا ذکر تک نہ کریں۔ ہم سمجھتے تھے کہ اگر ان لوگوں میں کانگریس کی اصلی روح پیدا ہو جائے تو یہی بہت کافی ہے۔

اس لئے ہمارے آنے سے پہلے کانگریس کی طرف سے، خفیہ یا اعلانیہ طور پر، کوئی سفیر لوگوں کو تیار کرنے کے لئے نہیں بھیجا گیا تھا۔ بیچارے راجکمار شکل ہزاروں کسانوں تک نہیں پہنچ سکتے تھے۔ اس نواح میں اب تک کسی طرح کا سیاسی کام نہیں کیا گیا تھا۔ بیچارے کسانوں کو یہ بھی نہیں معلوم تھا کہ چمپارن کے باہر بھی دنیا آباد ہے۔ اس کے باوجود انہوں نے مجھے ہاتھوں ہاتھ لیا گویا میں ان کا برسوں کا دوست تھا۔ اگر میں یہ کہوں تو مبالغہ نہ ہو کہ ان کسانوں کے سابقہ میں مجھے خدا کا نور، اہمسا اور حق کا جلوہ نظر آ گیا۔

جب میں دل میں سوچتا ہوں کہ مجھے کس استحقاق کی بنا پر یہ دولت نصیب ہوئی تو سوائے اس محبت کے جو مجھے اپنے ہم جنسوں سے ہے اور کوئی چیز نظر نہیں آتی اور یہ محبت خود "اہمسا" کے

عقیدے کا نتیجہ ہے جو میرے دل پر اس طرح نقش ہے کہ مٹ نہیں سکتا۔
 وہ دن میری زندگی میں یاد رہے گا۔ میرے لئے اور چمپارن کے کسانوں کے لئے وہ دن عید سے
 کم نہیں تھا۔

قانون کے مطابق میرے مقدمے کی تحقیقات درپیش تھی مگر سچ پوچھئے تو حکومت کا امتحان ہو رہا
 تھا۔ کمشنر نے جو جال میرے لئے پھیلایا تھا اس میں خود حکومت پھنس گئی۔

مقدمہ واپس لے لیا گیا

مقدمے کی کارروائی شروع ہوئی۔ سرکاری وکیل، مجسٹریٹ اور دوسرے عہدیدار بڑی مشکل میں پڑ گئے تھے۔ ان کی سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ کیا کریں۔ سرکاری وکیل مجسٹریٹ پر زور ڈال رہا تھا کہ مقدمے کی پیشی بڑھادی جائے مگر میں نے کہا اس کی کوئی ضرورت نہیں میں خود اپنے جرم کا اقرار کرتا ہوں کہ میں نے چمپارن سے چلے جانے کے حکم کی تعمیل نہیں کی۔ اس کے بعد میں نے حسب ذیل بیان پڑھ کر سنایا۔

”میں عدالت کی اجازت سے بہت اختصار کے ساتھ یہ عرض کرنا چاہتا ہوں کہ میں نے اس حکم کی، جو دفعہ 144 تعزیرات ہند کے مطابق جاری کیا گیا تھا گلہری عطف درزی کیوں کی۔ میری ناقص رائے میں بت صرف اتنی ہے کہ میرے اور مقامی حکام کے نقطہ نظر میں فرق ہے میں اس علاقے میں انسانی اور قومی خدمت کی نیت سے داخل ہوا تھا۔ مجھ سے اصرار کیا گیا تھا کہ یہاں آکر کسانوں کی مدد کروں جن کے ساتھ نیل کی کوٹھی والے ناانصافی کا برتاؤ کرتے ہیں۔ میں بغیر واقعات کی تحقیقات کے کوئی مدد نہیں کر سکتا اس لئے یہ چاہتا ہوں کہ، اگر ہو سکے تو حکام اور کوٹھی والوں کی مدد سے، صورت حال کا مطالعہ کروں۔ میری کوئی اور غرض نہیں ہے اس لئے میں نہیں سمجھتا کہ میرے آنے سے نقص امن یا کشت و خون کا اندیشہ ہے مجھے یہ دعویٰ ہے کہ میں ان معاملات میں بہت کئی تجربہ رکھتا ہوں۔ مگر حکام کا خیال کچھ اور ہے مجھے خوب معلوم ہے کہ ان کے فرائض بہت نازک ہیں اور انہیں اس کے سوا چارہ نہیں کہ جو اطلاع ملے اس کی بنیاد پر کارروائی کریں۔ ایک پابند قانون شہری کی حیثیت سے میری طبیعت کا تقاضا یہی تھا کہ ان کے حکم کی تعمیل کروں۔ لیکن اگر ایسا کرتا تو ان کسانوں سے بے وفائی ہوتی جن کے بلانے سے میں آیا ہوں۔ مجھے یقین ہے کہ ان کی خدمت کے لئے میرا یہاں رہنا ضروری ہے اس لئے مجھے

اپنے فعل سے چمپارن سے جانا گوارا نہیں ہوا۔ فرائض کی اس کشمکش میں میرے لئے سوائے اس کے کوئی صورت نہیں تھی کہ اپنے اخراج کی ذمہ داری حکام پر ڈالوں۔ میں اس بات کو پوری طرح محسوس کرتا ہوں کہ میری جیسی حیثیت کے آدمی کو بہت سمجھ بوجھ کر کوئی مثال قائم کرنا چاہیے۔ مجھے کامل یقین ہے کہ اس پیچیدہ دستور اساسی کے ماتحت جو آج کل ہندوستان میں رائج ہے، ایسی صورت میں جو درپیش ہے۔ ہر خود دار اور محتاط آدمی کے لئے یہی مناسب ہے کہ میری طرح سول نافرمانی کرے اور چپ چاپ اس کی سزا بھگتے۔

میں یہ بیان اس غرض سے نہیں دے رہا ہوں کہ مجھے جو سزا دی جانے والی ہے اس میں تخفیف ہو جائے بلکہ مجھے صرف یہ دکھانا ہے کہ میں نے مجسٹریٹ کے حکم کی خلاف ورزی سوراوب کی بنا پر نہیں کی بلکہ فطرت انسانی کے بلند و برتر قانون یعنی ضمیر کے حکم کی تعمیل میں۔

اس کے بعد پیشی بڑھانے کی کوئی وجہ نہ تھی لیکن چونکہ مجسٹریٹ اور سرکاری وکیل میری اس تقریر کے لئے تیار نہ تھے اس لئے مقدمہ ملتوی کر دیا گیا۔ اس عرصے میں میں نے دائرہ رائے پستہ کے احباب، پنڈت مدن موہن مالوی اور دوسرے لیڈروں کو تار کے ذریعے سارے واقعات کی اطلاع دے دی تھی۔

دوسری پیشی ہے پہلے مجسٹریٹ کی تحریر پہنچی کہ لفٹنٹ گورنر نے مقدمہ واپس لینے کا حکم دیا ہے اور کلکٹر نے لکھا کہ آپ جو تحقیقات کرنا چاہتے ہیں شوق سے کیجئے اگر آپ کو حکام سے کسی قسم کی بددکی ضرورت ہوگی تو وہ خوشی سے دیں گے۔

میں مسٹر بیٹاک، کلکٹر سے ملا۔ وہ بڑے اچھے اور انصاف پسند آدمی معلوم ہوتے تھے انہوں نے کہا کہ آپ کو جن کاغذات کی ضرورت ہو بے تکلف طلب کیجئے اور جب جی چاہے مجھ سے ملئے۔ اس طرح سے ہندوستان نے سول نافرمانی کا پہلا عملی سبق سیکھا۔ اس مسئلے پر مقامی حلقوں میں اور اخباروں میں خوب بحثیں ہوئیں اور خلاف توقع میری تحقیقات کی بڑی اشاعت ہوئی۔ میری تحقیقات کے لئے حکومت کا غیر جانبدار رہنا ضروری تھا مگر اخباروں کے نامہ نگاروں کی تائید اور ان کے افتتاحی مقالوں سے مجھے کوئی فائدہ نہ تھا بلکہ سچ پوچھئے تو صورت حال اس قدر نازک تھی کہ زیادہ سخت تنقید یا مبالغہ آمیز اطلاعوں سے میرے مقصد کو نقصان پہنچنے کا اندیشہ تھا۔ اس لئے میں نے بڑے بڑے اخباروں کے اڈیٹروں کو لکھا کہ آپ نامہ نگار سمجھنے کی زحمت نہ کیجئے جس چیز کی اشاعت کی ضرورت ہوگی میں خود آپ کو لکھ بھیجوں گا اور واقعات کی اطلاع برابر دیتا رہوں گا۔

میں جانتا تھا کہ حکومت کا ہمدردانہ رویہ چمپارن کے کوٹھی والوں کو سخت ناگوار ہے اور حکام بھی چاہے زبان سے کچھ نہ کہیں مگر دل میں خوش نہیں ہیں اس لئے اگر بے سرو پایا غلط فہمی پیدا کرنے والی اطلاعیں شائع ہوں گی تو یہ لوگ اور زیادہ جھلائیں گے اور اپنا غصہ مجھ پر اتارنے کے بجائے غریب، خوف زدہ کسانوں پر اتاریں گے جس کی وجہ سے مجھے صحیح حالات معلوم کرنے میں بڑی دشواری ہوگی۔

اس احتیاط کے باوجود کوٹھی والے میرے خلاف زہر لگنے سے باز نہ رہے اخباروں میں میرے اور میرے رفیقوں کے متعلق طرح طرح کی جھوٹی خبریں شائع ہوتی رہیں مگر میں اس قدر پھونک پھونک کر قدم رکھتا تھا اور چھوٹی سے چھوٹی بات میں سچائی کا اتنا خیال رکھتا تھا کہ حریفوں کی تلواریں کند ہو گئیں۔

کوٹھی والوں نے بر جکشور بابو کو بدنام کرنے میں کوئی دقیقہ اٹھا نہیں رکھا لیکن وہ اس معاملے میں جتنا بہتنام کرتے تھے اتنی ہی بابو صاحب کی عزت لوگوں کی نظروں میں بڑھتی جاتی تھی۔

ایسی نازک حالت میں مجھے یہ مناسب نہیں معلوم ہوا کہ دوسرے صوبوں کے لیڈروں کو چمپارن بلاؤں۔ پنڈت مالوی جی نے کہلا بھیجا تھا کہ تمہیں جب میری ضرورت ہو مجھے بلا بھیجو۔ مگر میں نے انہیں زحمت نہیں دی۔ میرا یہ تجربہ ہے کہ غیر سیاسی معاملات کو خواہ ان کی غرض سیاسی ہی کیوں نہ ہو، سیاست کارنگ دینا مضر ہے اور سیاست سے بچائے رکھنا مفید ہے۔ چمپارن کے معرکے سے یہ ثابت ہو گیا کہ لوگوں کی بے غرض خدمت سے خواہ وہ کسی شعبے میں کی جائے ملک کو ایک نہ ایک دن سیاسی فائدہ بھی ضرور پہنچتا ہے۔

کام کے طریقے

اگر میں اس تحقیقات کے تفصیلی حالات بیان کروں تو گویا مجھے چمپارن کے کسانوں کی اتنے دن کی پوری تاریخ لکھنا پڑے گی۔ ظہر ہے کہ یہاں اس کی گنجائش نہیں ہے۔ چمپارن کی تحقیقات اہمسا اور حق کی تلاش کی ایک دلیرانہ سعی تھی اور میں ان ہفتہ وار مضامین میں صرف انہی باتوں کا ذکر کروں گا جو اس نقطہ نظر سے اہمیت رکھتی ہیں جن حضرات کو تفصیلی حالات معلوم کرنا ہوں وہ بابور احمد پرشاد کی چمپارن کی ستیاگرہ کی تاریخ پڑھیں یہ کتب ہندی میں ہے اور اس کا انگریزی ترجمہ (1) بھی چھپ رہا ہے۔

اس جملہ معترضہ کے بعد میں اصل واقعے کی طرف رجوع کرتا ہوں مجھے یہ دقت تھی کہ تحقیقات کہاں کی جائے گور کہ بابو کے گھر میں یہ بکھیرا ہوتا تو اس بچارے کو گھر غلی کرنا پڑتا۔ دوسرے مکان کی تلاش تھی مگر ابھی تک موتیہاری کے لوگ ہمیں اپنا مکان کرائے پر دیتے ڈرتے تھے تاہم بڑ جکشور بابو نے تالیف قلوب سے کام لے کر ہمیں ایک مکان دلوا دیا جس کے احاطے میں ایک کشادہ میدان بھی تھا۔

اس کام کے لئے کچھ نہ کچھ روپے کی ضرورت تھی۔ اب تک کبھی اس قسم کے کام کے لئے چندہ نہیں ہوا تھا۔ بڑ جکشور بابو خود اور ان کے دوست زیادہ تر دکیل تھے جو ضرورت کے وقت یا تو خود چندہ دیتے تھے یا اپنے احباب سے دلواتے تھے۔ وہ کہتے تھے کہ جب ہم خود دے سکتے ہیں تو دوسروں سے کس منہ سے مانگیں۔ یہ میں نے بالکل طے کر لیا تھا کہ چمپارن کے کسانوں سے ایک پیسہ بھی نہیں لوں گا۔ ایسا کرتا تو لوگوں کو شبہہ کرنے کا موقع ملتا۔ ملک میں عام چندہ کرنا بھی مجھے مستور نہیں تھا

کیونکہ اس سے تحقیقات میں سیاسی رنگ آجانے کا اندیشہ تھا۔ بمبئی کے چند دوستوں نے پندرہ ہزار روپیہ دینا چاہا مگر میں نے شکریے کے ساتھ انکار کر دیا۔ آخر میں میں نے یہ فیصلہ کیا برکشور بابو کی مدد سے بہار کے دوسرے مقامات میں آسودہ حال لوگوں سے چندہ کروں اور اگر یہ کافی نہ ہو تو اپنے رنگوں کے دوست ڈاکٹر جے۔ پی۔ مہتا کو تکلیف دوں انہوں نے میرے لکھنے پر بڑی خوشی سے وعدہ کر لیا کہ مجھے جتنے روپے کی ضرورت ہوگی بھیجیں گے۔ غرض ادھر سے ہمیں پورا اطمینان ہو گیا۔ ہمیں کوئی بہت بڑی رقم درکار نہیں تھی کیونکہ چھپارن والوں کی غربت کا لحاظ کرتے ہوئے ہم بہت کفایت سے کام لیتے تھے۔ میرا خیال ہے کہ ہم نے سب مل کر تین ہزار روپے سے زیادہ خرچ نہیں کیا اور جہاں تک مجھے یاد ہے جو چندہ جمع ہوا تھا اس میں سے دو چار سو روپے بچ رہے۔

شروع شروع میں میرے رفیق جس ٹھاٹ سے رہتے تھے اس کی خوب ہنسی اڑتی تھی۔ ہر دو کیل کے ساتھ ایک خدمت گار اور ایک باورچی تھا۔ ہر ایک کا باورچی خانہ الگ تھا اور یہ لوگ بارہ بجے رات کو کھانا کھاتے تھے۔ یہ اپنے مصارف خود برداشت کرتے تھے پھر بھی مجھے ان کے لابلہ پن سے تکلیف ہوتی تھی۔ میں ان کا مصحفہ اڑاتا تھا مگر ہمارے آپس میں اس قدر گہرے تعلقات ہو گئے تھے کہ وہ کبھی برا نہیں مانتے تھے۔ آخر یہ طے ہوا کہ نوکر رخصت کر دیئے جائیں سب کا کھانا ایک جگہ پکے اور کھانے کے اوقات کی پابندی کی جائے۔ سب لوگ نباتاتی نہیں تھے مگر چونکہ دو جگہ کھانا پکنے میں خرچ زیادہ تھا اس لئے سب نے نباتاتی غذا پر بسر کرنا منظور کر لیا۔ کھانے میں سادگی بھی اختیار کی گئی۔

اس انتظام کی بدولت خرچ بہت کم ہو گیا اور بہت سادگت جو فضول ضائع ہوتا تھا بچ گیا۔ ان دونوں چیزوں میں کفایت ہمارے لئے بہت ضروری تھی۔ کسانوں کے گروہ کے گروہ بیان دینے کے لئے آتے تھے اور اپنے ساتھ اوروں کو بھی لاتے تھے۔ سارے احاطے اور بازار میں تل رکھنے کی گنجائش نہیں تھی۔ میرے دوستوں نے بہت کوشش کی کہ مجھے درشن کی مصیبت سے بچائیں مگر کوئی نامدہ نہیں ہوا مقررہ اوقات پر میری نمائش درشن کے لئے ہوتی تھی۔ پانچ سات رضا کار بیانات لکھتے پھر بھی کچھ لوگ رہ جاتے اور انہیں بغیر بیان لکھائے واپس جانا پڑتا ان میں سے سب بیان ضروری نہیں تھے۔ اکثر لوگ انہیں باتوں کو دھراتے جو دوسرے ان سے پہلے کہہ چکے تھے مگر کسانوں کو بغیر اپنی اپنی پتا سنائے چین نہیں آتا تھا اور مجھے ان کے اس جذبے سے ہمدردی تھی۔

بیان لکھنے والوں کو مقررہ قواعد کی پابندی کرنی پڑتی تھی۔ ہر کسان سے خوب جرح کی جاتی اور جو لوگ جرح میں ٹوٹ جاتے ان کی شہادت رو ہو جاتی۔ اس میں بہت دقت صرف ہو جاتا تھا۔ مگر اس سے یہ

فائدہ ہوا کہ جتنے بیانات لکھے گئے ان میں سے اکثر پوری طور پر قابل اعتماد تھے۔

ان بیانات کے لکھتے وقت ایک خفیہ پولیس کا عہدہ دار موجود رہتا تھا۔ اگر ہم چاہتے تو اسے نہ رہنے دیتے مگر ہم نے شروع سے یہ طے کر لیا تھا کہ خفیہ پولیس والوں کی مزاحمت نہیں کریں گے بلکہ ان کے ساتھ اخلاق سے پیش آئیں گے اور حتی الامکان انہیں ہر طرح کی معلومات فراہم کرنے میں مدد دیں گے۔ اس سے ہمارا کوئی برج نہیں ہوا بلکہ خفیہ پولیس کے عہدہ داروں کے سامنے بیان ہونے سے کسانوں کی ہمت اور بڑھ گئی۔ ایک طرف تو یہ فائدہ ہوا کہ ان کے دل میں خفیہ پولیس والوں کا رعب کم ہو گیا اور دوسری طرف ان عہدہ داروں کی موجودگی کے سبب سے انہیں اپنے بیان میں مبالغہ کرنے کا موقع نہیں ملا۔ وہ جانتے تھے کہ خفیہ پولیس والے انہیں پھانسنے کی فکر میں رہتے ہیں اس لئے بہت احتیاط سے کام لیتے تھے۔

مجھے کوٹھی والوں کو اشتعال دلانا مستور نہیں تھا بلکہ میں نرمی اور ملاحظت سے انہیں پرچانا چاہتا تھا۔ اس لئے میں نے یہ التزام کر لیا تھا کہ جن لوگوں کی سختی کی زیادہ شکایت کی جاتی ان سے خط و کتابت کرتا اور ان کے گھر جا کر ان سے ملتا۔ میں نے کوٹھی والوں کی انجمن کے کارکنوں سے بھی ملاقات کی، انہیں کسانوں کی شکایتیں سنائیں اور ان کے جواب سنے۔ ان میں سے بعض مجھ سے نفرت کرتے تھے، بعض بے توجہی برتتے تھے اور دو چار ایسے بھی تھے جو میرے ساتھ اخلاق سے پیش آتے تھے۔

حوالہ

1 - یہ انگریزی ترجمہ اب دیس کیمن نے تریپلیکین مدراس سے شائع کر دیا ہے۔

میرے ساتھی

برج کشور بابو اور راجندر بابو جیسے دو آدمی مشکل سے ملیں گے۔ ان کے غلوں اور انہماک کا مجھ پر یہ اثر ہوا کہ میں کوئی کام ان کے بغیر نہیں کرتا تھا۔ ان کے چیلے یار رفیق شمشو بابو، انوگرہ بابو، دھرنی بابو، رام نومی بابو اور دوسرے دکیل ہر وقت ہم لوگوں کے ساتھ رہتے تھے۔ دندھیا بابو اور جنکدھری بابو بھی کبھی کبھی آکر ہماری مدد کرتے تھے۔ یہ سب بہاری تھے۔ ان کا کام زیادہ تر کسانوں کے بیانات لکھنا تھا۔

پروفیسر کرپلائی بھلا ہمارا ساتھ دیئے بغیر کیسے رہ سکتے تھے؟ ہونے کو تو وہ سندھی تھے۔ مگر اصل میں بہاریوں سے زیادہ بہاری تھے۔ میں نے بہت کم لوگ ایسے دیکھے ہیں جو ان کی طرح دل و جان سے اپنے مجازی وطن کے ہو رہیں کسی کو یہ گمان بھی نہیں ہو سکتا تھا کہ یہ کسی دوسرے صوبے کے ہیں۔ یہ میرے میر صاحب تھے ان دنوں انہوں نے اپنی زندگی اس کام کے لئے وقف کر دی تھی کہ مجھے ”درشن“ کے طالبوں سے بچائیں۔ وہ کبھی اپنی علقی غرافت سے اور کبھی پیالہ کی دھمکیوں سے کام لے کر فنیم کو پسپا کر دیتے تھے۔ رات کو وہ معلم بن جاتے تھے اور اپنے ساتھیوں کو اپنی تاریخی تحقیقات سے محفوظ کیا کرتے تھے اگر اتفاق سے کوئی کچھ لایا جائے تو ان کی باتیں سن کر بھیرے شیر بن جاتا تھا۔

مولانا مظہر الحق نے اپنا نام امیدوار رضا کاروں کی فہرست میں لکھوایا تھا کہ جب مجھے ضرورت ہو ان سے مدد لوں اور مہینے میں دو ایک بار ضرور میرے پاس ہو جایا کرتے تھے۔ ان کی اس زمانے کی شان و شوکت اور آج کل کی سادگی میں زمین و آسمان کا فرق ہے وہ ہم سے اس غلوں سے ملتے تھے کہ ہم انہیں اپنا رفیق سمجھتے تھے حالانکہ کوئی اجنبی ان کے ٹھانڈے دیکھتا تو اسے یہ یقین نہ آتا۔

بہار سے زیادہ واقفیت حاصل نہ ہو جانے کے بعد مجھے یہ یقین ہو گیا کہ جب تک یہاں کے

دیہات میں تعلیم نہ ہو کوئی مستقل کام نہیں کیا جاسکتا۔ کسانوں کی جہالت بہت افسوسناک تھی۔ ان کے بچے یا تو بیکار مارے مارے پھرتے تھے یا نیل کے کھیتوں میں صبح سے شام تک دو تین پیسے روز پر کام کرتے تھے۔ ان دنوں مزدوری کی شرح مردوں کے لئے ڈھائی آنے، عورتوں کے لئے ڈیڑھ آنے اور بچوں کے لئے تین پیسے سے زیادہ نہ تھی جو شخص چار آنے روز کمالے وہ بڑا خوش قسمت سمجھا جاتا تھا۔ اپنے رفیقوں کے مشورے سے میں نے یہ طے کیا کہ چھ گاؤں میں ابتدائی مدارس کھولے جائیں، گاؤں والوں کے ساتھ ایک شرط یہ تھی کہ تم مدرس کے کھانے اور رہنے کا انتظام کر دو باقی مصارت ہمارے سر رہیں گے۔ گاؤں والوں کے پاس نقد روپیہ تو تھا نہیں مگر وہ کھانے کی چیزیں فراہم کر سکتے تھے۔ انہوں نے غلہ اور دوسری خام اجناس دینے کا وعدہ کر لیا۔

اب یہ سوال تھا کہ مدرس کہاں سے آئیں؟ مقامی لوگوں میں ایسے مدرس ملنا مشکل تھا جو بلا معاوضہ یا کم معاوضے پر کام کریں۔ ایسے دیسے لوگوں کو میں رکھنا نہیں چاہتا تھا۔ میری نظر میں علمی قابلیت کی اتنی اہمیت نہ تھی جتنی اخلاقی صفات کی تھی۔

اس لئے میں نے رضا کار مدرسوں کے لئے عام اپیل کیا۔ اس کا فوراً اثر ہوا۔ گنکادھر راڈ جی دیشپانڈے نے بابا صاحب سومن اور پنڈارک کو بھیج دیا۔ بمبئی سے مسز اوتسکائی کو کھلے اور پونا سے انندی بائی آگئیں۔ آشرم سے میں نے چھوٹا لال، سریندر ناتھ اور اپنے بیٹے دیو داس کو بلا لیا۔ اسی زمانے میں بہار دیو دیسائی اور زہری پارکھ اپنی بیویوں کو لے کر ہم سے آئے۔ کستور ابائی کو بھی میں نے اس کام میں شریک کر لیا۔ کام کرنے والوں کی تعداد اچھی خاصی ہو گئی۔ اوتسکابائی اور انندی بائی اچھی خاصی تعلیم یافتہ تھیں۔ مگر مسز درگادیسائی اور مسز منی ہیں پارکھ صرف تھوڑی بہت گجراتی جانتی تھیں۔ کستور ابائی اس سے محروم تھیں۔ سوال یہ تھا کہ یہ خواتین بچوں کو ہندی کے ذریعے کیوں کر تعلیم دیں۔

میں نے انہیں سمجھایا کہ آپ بچوں کو لکھنا پڑھنا اور حساب سکھانے کی زیادہ فکر نہ کیجئے بلکہ انہیں صفائی اور ٹائپنگی سکھائیے۔ میں نے یہ بھی کہا کہ گجراتی، ہندی اور مرہٹی حروف میں امتیاز نہیں ہے جتنا آپ سمجھتی ہیں اور مکتب میں حروف تہجی اور ہند سے سکھانے میں آپ کو زیادہ دقت نہیں ہوگی۔ ان خواتین کی کوششوں کا نتیجہ یہ ہوا کہ ان کی جماعتیں سب سے زیادہ کامیاب ہوئیں۔ اس تجربے کی بدولت انہیں اپنے کام میں زیادہ دلچسپی پیدا ہو گئی اور ان کی ہمت بڑھ گئی۔ اوتسکابائی کا مدرسہ دوسرے مدرسوں کے لئے نمونہ بن گیا۔ انہیں اپنے کام میں یچھ انہماک تھا انہوں نے اپنی خداداد قابلیت کا پورا

استعمال کیا۔ ان خواتین کے ذریعے سے ہم نے گاؤں کی عورتوں کی بھی تھوڑی بہت اصلاح کی۔ مگر میں صرف ابتدائی تعلیم پر اکتفا نہیں کرنا چاہتا تھا۔ گاؤں بے حد گندے تھے گلیاں غلاظت سے پٹی ہوئیں تھیں، کنوؤں کے گرد کیچڑ اور سڑی گلی چیزوں کے دلدل تھے اور مکانوں کے صحن گھورے سے بدتر تھے۔ بالنگوں کو صفائی کی تعلیم دینا بہت ضروری تھا۔ یہ سب کے سب جلدی امراض میں مبتلا تھے۔ اس لئے ہم نے یہ طے کیا کہ صفائی پر انتہائی زور دیا جائے اور ان کی زندگی کے ہر شعبے کی اصلاح کی جائے

اس کام کے لئے ڈاکٹروں کی ضرورت پڑی۔ ہم نے انجمن خدام ہند سے درخواست کی کہ ڈاکٹر دیو آنجہانی کو ہماری مدد کے لئے بھیجیے۔ وہ میرے بڑے دوست تھے اور میری درخواست پر چھ مہینے کے لئے چلے آئے۔ سب پڑھانے والوں اور پڑھانے والیوں کو ان کی ماتحتی میں کام کرنے کی ہدایت کر دی گئی۔

میں نے ان سب کو تاکید کر دی کہ نیل کے کاشتکاروں کی شکایتوں اور سیاسی معاملات سے مطلق سروکار نہ رکھیں۔ جو شخص شکایت کرے اسے میرے پاس بھیج دیں کوئی اپنے دائرہ عمل سے باہر قدم نہ رکھے۔ میرے دوستوں نے نہایت وفاداری سے ان ہدایتوں کی تعمیل کی مجھے یاد نہیں کہ کبھی ذرا سی عطف ورزی بھی ہوئی ہو۔

دیہات کی اصلاح

جہاں تک ہو سکا ہم نے ہر بھد سے کو ایک معلم اور ایک معلمہ کی نگرانی میں رکھا دوسرے رضاکار دواؤں کی تقسیم اور حقائقان صحت کے انتظام کے لئے تعینات کئے گئے عورتوں کی امداد کے لئے عورتیں مقرر ہوئیں۔

طبی امداد کا طریقہ بالکل سہل اور سادہ تھا۔ رضاکاروں کے پاس صرف کونین ارنڈی کا تیل اور گندھک کا مرہم رہتا تھا۔ اگر مریض کی زبان میلی نظر آئے یا وہ قبض کی شکایت کرے تو اسے ارنڈی کا تیل پلایا جاتا تھا اگر بخار ہو تو ارنڈی کے تیل کے ہلکے مسہل کے بعد کونین دی جاتی تھی اور خارش یا پھنسیاں ہوں تو انہیں اچھی طرح دھو کر گندھک کا مرہم لگا دیا جاتا تھا۔ کسی مریض کو دوا گھر پر لے جانے کی اجازت نہیں تھی۔ جب کسی مرض میں کوئی پیچیدگی نظر آتی تھی تو ڈاکٹر دیوبلائے جاتے تھے۔ یوں بھی وہ ہفتے میں چند بار ہر مرکز کے معائنے کے لئے جایا کرتے تھے۔

بہت سے لوگ اس سیدھے سادے علاج سے فائدہ اٹھا رہے تھے۔ یہ طریقہ بظاہر انوکھا معلوم ہوتا تھا لیکن بات یہ تھی کہ یہی دوچار بیماریاں قبض، بخار، خارش عام طور پر پھیلی ہوئی تھیں اور ان کا علاج آسانی سے بغیر ڈاکٹر کی مدد کے ہو سکتا تھا۔ مریضوں کو بھی اسی میں سہولت تھی۔

حقیقتان صحت کا معاملہ ذرا مشکل تھا۔ گاؤں کے لوگ خود ہاتھ پیر ہلانے پر تیار نہ تھے مزدوروں تک کو یہ گوارا نہ تھا کہ اپنا پاخانہ خود اٹھائیں اور اپنے گھر میں جھاڑ دیں۔ مگر ڈاکٹر دیوبلائے نے ہمارے دالے آدمی نہیں تھے۔ انہوں نے اور رضاکاروں نے اپنی ساری محنت ایک گاؤں کی صفائی چمے صرف کر دی تاکہ وہ دوسروں کے لئے معیار بن جائے۔ پہلے انہوں نے خود سڑکوں اور گھروں میں جھاڑ دی، کنوؤں کو صاف کیا قریب کے گڑھوں کو مٹی سے بھرا اس کے بعد نرمی اور محبت سے گاؤں والوں کو رضاکار

بننے پر آمادہ کیا۔ بعض گاؤں میں انہوں نے لوگوں کو غیرت دلا کر ان سے کام لیا۔ یہاں تک کہ دو ایک جگہ کے لوگوں میں اتنا جوش پیدا ہو گیا کہ انہوں نے میری موٹر کے جانے کے لئے سڑک بھی تیار کر دی۔ ان خوشگوار تجربوں کے ساتھ لوگوں کی بے پروائی کے تلخ تجربے بھی ہوئے مجھے یاد ہے کہ بعض گاؤں میں لوگوں نے صاف صاف کہہ دیا تھا کہ ہم اس کام کو پسند نہیں کرتے۔

مناسب ہو گا کہ میں یہاں ایک واقعہ کا ذکر کر دوں جسے میں اپنی تقریروں میں اکثر بیان کر چکا ہوں، بھئی باروا ایک چھوٹا سا گاؤں تھا اور اس میں ہمارا ایک مدرسہ تھا۔ وہاں جاتے ہوئے میں ایک مزرعہ سے گزرا جہاں چند عورتیں بہت میلے کپڑے پہنے نظر آئیں۔ میں نے مسز گاندھی سے کہا ان سے پوچھئے کہ یہ اپنے کپڑے کیوں نہیں دھوتیں۔ انہوں نے ان عورتوں سے گفتگو شروع کی۔ ان میں سے ایک انہیں اپنی جھونپڑی میں لے گئی اور کہنے لگی ”دیکھ لو یہاں نہ کوئی صندوق ہے نہ الماری جس میں اور کپڑے رکھے ہوں جو سازی میں پہنے ہوں اس کے سوا میرے پاس کوئی کپڑا نہیں۔ مہاتما جی سے کہو مجھے ایک سازی اور لے دیں پھر میں روز نہا کر کپڑے بدلا کر دوں گی۔“

ایسی جھونپڑیاں ہندوستان کے بہت سے گاؤں میں پائی جاتی ہیں نہ جانے کتنے غریب ایسے ہیں جن کے گھرا ایک چٹائی تک نہیں اور جن کے پاس سوائے اس چھتھڑے کے جس سے وہ ستر پوشی کرتے ہیں اور کوئی کپڑا نہیں۔

میں ایک اور تجربہ بھی لکھوں گا۔ چمپارن میں تپا اور بانس بہت کثرت سے ہیں۔ بھئی باروا میں مدرسے کے لئے انہیں چیزوں کا ایک جھونپڑا بنادیا گیا تھا۔ ایک رات کسی شخص نے۔ ممکن ہے کہ نیل کی کوٹھی والوں کا آدمی ہو۔ اس میں آگ لگا دی اس کے بعد یہ مناسب نہیں معلوم ہوا کہ پھر تپا اور بانس کا جھونپڑا بنایا جائے۔ اس مدرسے کی نگرانی سومن جی اور مسز گاندھی کے سپرد تھی سومن جی نے یہ طے کیا کہ پکا مکان بنانا چاہیے وہ خود اس مستعدی سے کام کرنے لگے کہ بہت سے لوگ ان کے ساتھ شریک ہو گئے۔ چند ہی روز میں اینٹوں کا مکان تیار ہو گیا۔ اب آگ لگنے کا خوف نہیں رہا۔

غرض رضا کاروں کے اسکولوں حفاظان صحت کے کام اور طبی امداد کی بدولت لوگ انہیں عزت کی نظر سے دیکھنے لگے اور ان پر بھروسہ کرنے لگے ان کے اثر سے کسانوں کی زندگی میں بہت کچھ اصلاح ہو گئی۔

مگر مجھے افسوس کے ساتھ یہ اعتراف کرنا پڑتا ہے کہ میں اس تعمیری کام کو مستقل بنانے میں کامیاب نہیں ہوا۔ یہ رضا کار عارضی طور پر آئے تھے، ان کے جانے کے بعد نہ باہر کے لوگ آئے اور نہ

بہار کے مستقل اعزازی کارکن مل سکے مجھے خود چمپارن کا کام ختم کرنے کے بعد دوسری جگہ جہاں میری ضرورت تھی، چلا جانا پڑا۔ پھر بھی اس چند مہینے کے کام نے چمپارن والوں کی زندگی میں اتنی تبدیلی کر دی تھی کہ اس کا اثر کسی نہ کسی صورت میں آج تک نظر آتا ہے۔

گورنر کی نیک دلی

ایک طرف تو یہ اصلاحی کام ہو رہا تھا اور دوسری طرف کسانوں کے بیانات لکھے جا رہے تھے۔ ان بیانات کی تعداد ہزاروں تک پہنچ گئی کوٹھی دالوں نے جب یہ رنگ دیکھا تو ان کا غصہ اور بھڑکا اور انہوں نے میری تحقیقات کو روکنے میں کوئی کوشش نہیں اٹھار کھی۔

ایک دن میرے پاس بہار کے گورنر کی طرف سے اس مضمون کا خط آیا ”آپ کی تحقیقات کو بہت طول ہو گیا ہے۔ کیا یہ مناسب نہ ہو گا کہ آپ اسے جلد ختم کر دیں اور بہار سے رخصت ہو جائیں۔“ خط بہت نرم اور مہذب الفاظ میں لکھا گیا تھا لیکن اس کا مطلب بالکل صاف تھا۔

میں نے اس کے جواب میں لکھا کہ ایسی تحقیقات میں طول ہونا لازمی ہے اور میں نے مصمم ارادہ کر لیا ہے کہ جب تک اس کے ذریعے سے کسانوں کی شکایتیں دور نہ ہو جائیں میں بہار سے نہیں جاؤں گا۔ اگر حکومت چاہتی ہے کہ یہ تحقیقات رد کر دی جائے تو اس کی تدبیر بہت سہل ہے یا تو وہ کسانوں کی شکایتوں کو تسلیم کر لے اور چارہ جوئی کرے یا کم سے کم ان کے بیانات کو قابل توجہ سمجھ کر فوراً ایک سرکاری تحقیقاتی کمیٹی مقرر کر دے۔

لغنت گورنر، سر ایڈورڈ گیٹ نے مجھے بلا کر مجھ سے گفتگو شروع کی اور کہا ”میں تحقیقاتی کمیٹی مقرر کرنے کو تیار ہوں اور اگر آپ چاہیں تو آپ کو بھی اس کا ممبر بنا دوں گا۔ میں نے کمیٹی کے دوسرے ممبروں کے نام دریافت کئے اور اپنے رفیقوں سے مشورہ کرنے کے بعد کہا کہ میں تین شرطوں پر کمیٹی کی شرکت قبول کرتا ہوں۔ ایک یہ کہ مجھے دوران تحقیقات میں اپنے رفیقوں سے مشورہ کرنے کی اجازت ہو۔ دوسرے گورنمنٹ یہ تسلیم کر لے کہ کمیٹی کا ممبر ہونے کے ساتھ ساتھ میں کسانوں کا پیردکار بھی رہوں۔ تیسرے اگر میں تحقیقات کے نتیجے سے مطمئن نہ ہوں تو مجھے یہ اختیار ہو

کہ میں رعایا کو ان کے آئندہ طرز عمل کے متعلق مشورہ دوں۔

سرایڈور ڈگیٹ نے ان شرطوں کو معقول سمجھ کر قبول کر لیا اور تحقیقات کا اعلان کر دیا۔ سرفر نیک سلانی آنجہانی کمیٹی کے صدر مقرر ہوئے۔

کمیٹی نے کسانوں کے موافق رپورٹ دی اور یہ تجویز کی جو رقبہ کوٹھی والوں نے کمیٹی کے نزدیک ناجائز طور پر وصول کی ہیں ان کا کچھ حصہ ان سے واپس دلایا جائے اور ”تنگتھیا“ کا طریقہ منسوخ کر دیا جائے۔

کمیٹی میں اتفاق رائے پیدا کرنے میں اس کی تجویز کے مطابق مسودہ قانون پاس کرانے میں سر ایڈورڈگیٹ کی کوشش کو بہت کچھ دخل ہے۔ اگر وہ انتہائی استقلال اور موقع شناسی سے کام نہ لیتے تو نہ کمیٹی کی رپورٹ متفقہ ہوتی اور نہ قانون مزارعین پاس ہوتا۔ کوٹھی والوں کا بہار میں بے انتہا اثر تھا۔ باوجود اس کے کہ رپورٹ ان کے خلاف تھی انہوں نے مسودہ قانون کی مخالفت میں کوئی دقیقہ نہیں اٹھا رکھا۔ لیکن سر ایڈورڈگیٹ آخر تک ثابت قدم رہے اور انہوں نے کمیٹی کی تجاویز پر پوری طرح عمل کیا۔

اس طرح ”تنگتھیا“ کا طریقہ جو سو سال سے جاری تھا منسوخ ہو گیا اور کوٹھی والوں کے راج کا خاتمہ ہوا۔ رعایا کو جو ہمیشہ سے پامال ہوتی آئی تھی تھوڑے بہت حقوق مل گئے اور لوگوں کے دل سے یہ خیال خام دور ہو گیا کہ نیل کا دھبا کبھی نہیں مٹ سکتا۔

میں چاہتا تھا کہ چند سال تک ہمپارن میں تعمیری کام جاری رکھوں اور مدرسے کھولوں اور دیہات کی زیادہ گہری اصلاح کروں اس کے لئے زمین بھی تیار ہو چکی تھی، مگر جیسا پہلے کئی بار ہو چکا تھا مشیت ایزدی سے میرا یہ ارادہ دل کا دل ہی میں رہ گیا۔ تقدیر کو کچھ اور منظور تھا۔ اس نے میرے لئے دوسرا کام تجویز کر رکھا تھا۔

مزدوروں سے سابقہ

ابھی میں تحقیقاتی کمیٹی کا کام ختم نہیں کر پایا تھا کہ موہن لال جی پانڈے اور شنکر لال جی چارکھ کا خط پہنچا کہ کھیدا نسلع میں فضل ماری گئی لگان کا تقاضا ہے اور کسان اس کے ادا کرنے سے معذور ہیں آپ بتائیے کہ انہیں کیا کرنا چاہیے مجھ میں نہ اتنی قابلیت اور ہمت تھی اور نہ میرا جی چاہتا تھا کہ بغیر موقعے کا معائنہ کئے ہوئے کسی قسم کا مشورہ دوں۔

ادھر احمد آباد سے انسویا بائی نے وہاں کے مزدوروں کی حالت لکھی۔ ان لوگوں کو مزدوری بہت کم ملتی تھی۔ بیچارے بہت دن سے ہاتھ پیر مار رہے تھے کہ کچھ اضافہ ہو جائے مگر کوئی شنوائی نہیں ہوتی تھی۔ میری دلی خواہش تھی کہ اگر ہو سکے تو ان کی مدد کروں۔ مگر اس چھوٹے سے کام کو بھی میں دور بیٹھ کر چلانے کی جرات نہیں کر سکتا تھا اس لئے موقع ملتے ہی میں احمد آباد روانہ ہو گیا۔ مجھے یہ امید تھی کہ ان دونوں قصوں کو میں جلدی سے نبٹا کر چمپارن لوٹ آؤں گا اور یہاں کے تعمیری کام کی نگرانی کروں گا۔

مگر احمد آباد اور کھیدا میں مجھے بہت دن لگ گئے اور میں چمپارن نہ جاسکا جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ وہاں کے سارے مدرسے ایک ایک کر کے بند ہو گئے میرے اور میرے رفیقوں کے شیخ چلی کے سے منصوبے خاک میں مل گئے۔

ہماری تجویز یہ تھی کہ چمپارن میں تعلیم اور حفظان صحت کے علاوہ گنور کشا کا انتظام بھی کر لیں۔ میں نے اپنے سفر کے سلسلے میں یہ دیکھا تھا کہ گنور کشا اور ہندی کا پرچار مارواڑیوں کا حصہ ہو گیا ہے۔ بنیاد میں مجھے ایک مارواڑی دوست کے دھرم شالے میں ٹھہرنے کا اتفاق ہوا۔ وہاں کے مارواڑیوں نے مجھے اپنا گنوشالہ دکھایا۔ میں گنور کشا کے متعلق ایک خاص رائے رکھتا تھا اور اب تک اس پر قائم

ہوں۔ میرے نزدیک اس میں مویشی کی افزائش نسل اصلاح نسل بیلوں سے رحمدلی کا برتاؤ اعلیٰ درجے کی ڈیری فارم قائم کرنا وغیرہ شامل ہیں۔ مارواڑی بھائیوں نے اس کام میں پوری مدد دینے کا وعدہ کیا تھا مگر چونکہ میرا مستقل قیام بیلیا میں نہ ہو سکا اس لئے یہ تجویز رہ گئی۔

بیلیا کا گنٹوالہ اب تک قائم ہے مگر اس نے اعلیٰ درجے کے ڈیری فارم کی حیثیت نہیں اختیار کی ہے۔ چمپارن میں ابھی تک بیلوں سے حد سے زیادہ کام لیا جاتا ہے نام کے ہندو ابھی تک ان بے زبان جانوروں کو بیدردی سے مارتے ہیں اور اپنے دھرم کو بدنام کرتے ہیں۔

مجھے آج تک افسوس ہے کہ یہ تجویز پوری نہ ہو سکی۔ جب کبھی میں چمپارن جاتا ہوں اور بہاری اور مارواڑی بھائیوں کی دوستانہ شکایتیں سنتا ہوں تو ان منصوبوں کا خیال کر کے آہ سرد بھرتا ہوں۔ اے بسا آرزو کہ خاک شدہ۔

تعلیمی کام کسی نہ کسی صورت میں بہت سے مقامات پر اب بھی جاری ہے مگر گنٹوالہ کا کام ابھی طرح جمنے نہیں پایا تھا اس لئے اس میں حسب دلخواہ ترقی نہیں ہوئی۔

کھیدا کے کسانوں کا مسئلہ ہنوز زیر بحث تھا کہ میں نے احمد آباد کے مزدوروں کا معاملہ اپنے ہاتھ میں لے لیا۔

یہ میرے لئے بڑا نازک موقع تھا۔ مزدوروں کی شکایتیں واجبی تھیں۔ اس جنگ میں کارخانوں کے مالکوں کے سپہ سالار امبالال جی سارا بھائی تھے۔ ان کی سگی بہن السویا بائی مزدوروں کی طرف سے ان کا مقابلہ کر رہی تھیں۔ میرے اور مالکوں کے دوستانہ تعلقات تھے اس لئے یہ لڑائی اور بھی دشوار ہو گئی تھی۔ میں نے ان سے کئی بار گفتگو کی اور انہیں سمجھایا کہ اس معاملے کو بچوں کے سپرد کر دیجئے۔ مگر انہوں نے کہا کہ ہم مزدوروں کے مقابلے میں پنجائت کے اصول کو تسلیم نہیں کرتے۔ اس لئے مجھے سوائے اس کے کوئی چارہ کار نظر نہ آیا کہ مزدوروں کو ہڑتال کا مشورہ دوں۔ مگر اس سے قبل میں نے مزدوروں اور ان کے لیڈروں سے اچھی طرح میل جول پیدا کر لیا تھا اور انہیں سمجھا دیا تھا کہ ہڑتال کے کامیاب ہونے کی چار شرطیں۔

(1) کبھی بھول کر تشدد سے کام نہ لو۔

(2) جو لوگ تمہارا ساتھ چھوڑ کر کام پر جانا چاہیں انہیں نہ سناؤ۔

(3) خیرات کا پیسہ ہرگز نہ لو۔

(4) چاہے ہڑتال کتنے ہی دن چلے استقلال کو ہاتھ سے نہ جانے دو اور کسی جائز طریقے سے روٹی

کما کر کھاؤ۔

ہڑتال کے بیڑوں نے ان شرطوں کی اہمیت تسلیم کر لی اور انہیں قبول کر لیا۔ مزدوروں نے عام جلسے میں یہ عہد کیا کہ جب تک ان کے مطالبات پورے نہ ہوں گے یہ معاملہ پنچوں کے سپرد نہ کیا جائے گا ہرگز کام پر نہ جائیں گے۔

اسی ہڑتال کے سلسلے میں مجھ سے دلبرہ بھائی پنیل اور شکر لال جی بنیکر سے ملاقات ہوئی۔ انسویا بانی سے میں پہلے سے اچھی طرح واقف تھا۔

ہم لوگ روز سابر متی کے کنارے ایک درخت کے سائے میں ہڑتالیوں کے جلسے کیا کرتے تھے۔ یہ لوگ ہزاروں کی تعداد میں جمع ہوتے تھے اور میں انہیں ان کا عہد یاد دلا کر امن و امان اور خود داری قائم رکھنے کی تاکید کرتا تھا۔ روزانہ ان کا پرامن جلوس شہر کی سڑکوں پر نکلتا تھا۔ ان کے ہاتھوں میں جھنڈے ہوتے تھے جن پر یہ الفاظ لکھے تھے ”ایک ٹیک (عہد پر قائم رہو)“

یہ ہڑتال اکیس دن جاری رہی۔ اس کے دوران میں میں دتھنا فوٹھنا مالکوں سے ملتا رہتا تھا اور ان سے انصاف کی درخواست کرتا رہتا تھا وہ کہا کرتے تھے ”ہم کو بھی تو اپنا عہد پورا کرنا ہے۔ ہمارے اور مزدوروں کے تعلقات ایسے ہیں جیسے باپ بیٹوں کے ہوتے ہیں۔ ہم اس معاملے میں باہر والوں کی مداخلت کیسے گوارا کر لیں، باپ بیٹوں کے بیچ میں بیچ کا کیا کام۔“

آشرم کی ایک جھلک

قبل اس کے کہ میں ہڑتال کے اور حالات بیان کروں کچھ تھوڑا سا ذکر آشرم کا کر دینا ضروری ہے۔ چمپارن کے قیام کے زمانے میں آشرم کے خیال سے غافل نہیں رہا۔ جب موقع ملتا تھا وہ ایک دن کے لئے وہاں ہوتا تھا۔

ان دنوں آشرم احمد آباد کے قریب کو چرب نام گاؤں میں تھا۔ اس گاؤں میں طاعون پھوٹا اور مجھے چھوٹے بچوں کی طرف سے بہت اندیشہ پیدا ہو گیا۔ آشرم کے اندر لاکھ صفائی سہی مگر آس پاس کی گندگی کے اثرات سے بچنا ناممکن تھا اس زمانے میں ہم اس قابل نہ تھے کہ کو چرب کے لوگوں سے حفظانِ صحت کے اصول کی پابندی کرائیں یا ان کی کوئی اور خدمت کر سکیں۔

ہم یہ چاہتے تھے کہ آشرم گاؤں اور شہر کے درمیان ایسی جگہ پر ہو کہ دونوں سے علیحدہ بھی رہے اور آمد و رفت میں زیادہ دشواری بھی نہ ہو ہم نے طے کر لیا تھا کہ کسی نہ کسی دن اپنی ذاتی زمین خرید لیں گے اور اس پر اپنی بستی بسائیں گے۔

طاعون کو میں اپنے قافلے کے لئے بانک درا سمجھا۔ احمد آباد کے ایک تاجر سینہ پنجا بھائی میرا چند کو آشرم سے خاص تعلق تھا اور انہوں نے بارہا خلوص اور بے غرضی سے ہماری مدد کی تھی۔ وہ احمد آباد سے خوب واقف تھے۔ انہوں نے کہا کہ میں آشرم کے لئے ایسی زمین جو ہر لحاظ سے مناسب ہو تلاش کر دوں گا۔ میں ان کے ساتھ کو چرب کے شمال اور جنوب میں زمین کی تلاش میں پھرتا رہا۔ آخر میں میری یہ رائے ہوئی کہ تین چار میل شمال کی طرف ہٹ کر کوئی قطعہ منتخب کیا جائے انہوں نے وہ جگہ تجویز کی جہاں آج آشرم قائم ہے۔ یہ مقام مجھے اس لئے اور پسند آیا کہ ساہرمتی کے سنٹرل جیل سے قریب تھا۔ ستیا گریہوں کے لئے جن کا کام ہی تیل جانا ہے، اس سے اچھی جگہ کون سی ہو سکتی تھی۔ پھر میں یہ بھی جانتا تھا کہ جو موقع جیل کے لئے منتخب کیا جاتا ہے وہ عموماً صاف ستھرا ہوتا ہے۔

آٹھ روز کے اندر زمین خرید لی گئی۔ یہاں کسی عمارت یا درخت کا نام تک نہ تھا لیکن دو بڑی خوبیاں تھیں، دریا کا کنارہ اور تنہائی۔

ہم نے یہ بٹے کیا کہ جب تک مستقل عمارت بنے خیموں میں رہیں گے اور باورچی خانے کے لئے نین کا سامبان ڈال لیں گے۔

آشرم والوں کی تعداد میں آہستہ آہستہ اضافہ ہوا تھا۔ اب ہم لوگ عورت، مرد بچے ملا کر چالیس سے زیادہ تھے اور سب ساتھ کھانا کھاتے تھے یہ ساری تجویز میری تھی مگر اسے عمل میں لانا حسب معمول مگر لال کا کام تھا۔

مستقل عمارت بننے سے پہلے ہمیں بڑی دقتیں اٹھانا پڑیں۔ برسات قریب تھی اور کھانے کا سامان چار میل جا کر شہر سے لانا پڑتا تھا۔ زمین بخر پڑی تھی اس لئے وہاں سانپوں کی بڑی کثرت تھی اور پھوٹے بچوں کے ساتھ یہاں رہنا بڑے خطرے کا کام تھا۔ ہم سانپوں کو مارتے نہیں تھے۔ مگر ان کا ڈر ہم سب کو لگا رہتا تھا اور اب تک وہی حال ہے۔

زہریلے کیردوں کو نہ مارنا ہمارا اصول تھا اور فنیکس، ٹالسٹائے فارم اور ساہر متی میں اس کی پابندی ہوتی رہی ہے تینوں جگہ ہمیں بخر زمین پر بستی بسانا پڑی۔ مگر آج تک ہمارے یہاں کوئی سانپ کے کانٹے سے نہیں مرا۔ میری چشم عقیدت کو اس میں اس رحمن رحیم کی کار سازی نظر آتی ہے۔ ممکن ہے کوئی نقل کل یہ کہے کہ خدا کو کیا پڑی ہے کہ کسی کو بچائے اور اسے اتنی فرصت کہاں کہ انسانوں کے معاملات میں دخل دیتا پھرے۔ مگر اس مویشی کی کوئی ضرورت نہیں۔ یہ میرا برسوں کا تجربہ ہے اور اس کا جو اثر میرے دل پر ہے اس کے ظاہر کرنے کے لئے میرے پاس اور کوئی الفاظ نہیں، انسان کی زبان جب خدا کی کار سازیوں کو بیان کرتی ہے تو اسی ناقص طریقے سے کرتی ہے۔ میں خوب جانتا ہوں کہ یہ چیزیں فہم اور بیان سے باہر ہیں۔ لیکن جب انسان ان کے ذکر کی جرات کرے تو اسے انہیں بے معنی آوازوں سے جنہیں لفظ کہتے ہیں کام لینا پڑتا ہے۔ اگر یہ میری ضعیف الاعتقادی ہے کہ میں پچیس سال تک سانپوں کو نہ مارنے کے باوجود ان کے شر سے محفوظ رہنا محض اتفاق نہیں بلکہ تائید غیبی سمجھتا ہوں تو یہی سہی۔ یہ ضعیف الاعتقادی میری جان کے ساتھ ہے۔

جن دنوں مزدوروں نے ہڑتال کی تھی اسی زمانے میں آشرم میں بنائی کے کام کے لئے ایک سامبان کی بنیاد ڈالی جا رہی تھی۔ ابھی آشرم والوں کا شغل زیادہ تر کپڑا بنتا تھا۔ کتائی کا کام ہنوز جاری نہیں ہو سکا تھا۔

اپاس

پہلے دو ہفتوں میں مزدوروں نے بڑی بہادری اور ضبط نفس سے کام لیا اور روزانہ بڑے تنظیم
الشان جلسے کرتے رہے۔ میں ان جلسوں میں انہیں ان کا عہد یاد دلاتا تھا اور وہ بلند آواز سے کہا کرتے تھے
کہ ہمارا قول جان کے ساتھ ہے۔

مگر آخر میں ان کے قدم ڈگمگانے لگے۔ جس طرح جسمانی کمزوری کی علامت یہ ہے کہ آدمی بات
بات پر جھلانے لگتا ہے اسی طرح ہڑتال کی کمزوری اس سے ظاہر ہونے لگی کہ ہڑتالیوں کا رویہ ان
لوگوں کے ساتھ جو کام پر جایا کرتے تھے روز بروز زیادہ تہدید آمیز ہوتا گیا اور مجھے یہ اندیشہ پیدا ہو گیا کہ
کہیں یہ لوگ فساد نہ کر بیٹھیں۔ جلسوں کی حاضری بھی رفتہ رفتہ کم ہونے لگی۔ جو لوگ آتے بھی تھے ان
کے چہروں پر مایوسی اور بے دلی برستی تھی۔ آخر ایک دن یہ اطلاع آئی کہ ہڑتالی کندھا ڈالے دیتے ہیں۔
میں بہت گھبرا یا اور اس تردد میں پڑ گیا کہ اب میرا فرض کیا ہے۔ مجھے جنوبی افریقہ میں ایک بہت بڑی
ہڑتال کا تجربہ تھا مگر یہاں بالکل نئی صورت تھی۔ مزدوروں نے میرے کہنے سے عہد کیا تھا اور اسے
میری موجودگی میں بارہا دہرایا تھا۔ مجھے اس عہد کے توڑنے کا خیال بھی گوارا نہ تھا۔ اب خدا جانے اس
کی تہہ میں میرا غرور تھا یا مزدوروں کی محبت یا حق کی لگن۔

ایک دن صبح کو مزدوروں کے جلسے میں یکا یک مجھے اس تاریکی میں روشنی کی جھلک نظر آئی۔ خود
بخود میری زبان پر یہ الفاظ جاری ہو گئے۔ ”جب تک ہڑتالی ہمت سے کام لے کر اس ہڑتال کا کوئی
تفسیہ نہ کرالیں یا کارخانوں سے ہمیشہ کے لئے قطع تعلق نہ کر لیں اس وقت تک میں اپاس کروں گا۔“
مزدور سنانے میں آگئے۔ انسو یا بین کے رخساروں پر آنسو ٹپ ٹپ کرنے لگے۔ ہڑتالیوں کے
مجھے سے آواز آئی ”آپ نہیں، ہم اپاس کریں گے۔ غضب خدا کا ہم آپ کو اپنی خاطر اپاس کرنے دیں

! ہماری ڈھما معاف کر دیجئے۔ اب ہم اپنے عہد سے ہرگز نہ ہنیں گے۔“

میں نے کہا ”تمہیں اپاس کرنے کی ضرورت نہیں تمہارے لئے یہی کافی ہے کہ اپنے عہد پر قائم رہو۔ تم جانتے ہو کہ ہمارے پاس روپیہ ختم ہو گیا ہے اور ہمیں خیرات کے پیسے سے ہڑتال چلانا منظور نہیں اس لئے تمہیں چاہیے کہ کسی قسم کی مزدوری کر کے پیٹ پالو۔ پھر ہڑتال چاہے جب تک چلے کوئی پروا نہیں۔ اب رہا میرا اپاس یہ تو تمہی نوٹے گا جب ہڑتال کا تصفیہ ہو۔“

اس عرصے میں دلہہ بھائی کوشش کر رہے تھے کہ میونسپلٹی میں ہڑتالیوں کے لئے کام نکالیں مگر اس کی کوئی صورت نظر نہیں آتی تھی۔ مگن لال گاندھی نے یہ بات سمجھائی کہ ہمیں آشرم میں بنائی کے مدرسے کی بنیادیں قائم کرنے کے لئے ریت کی ضرورت ہے۔ کچھ لوگ ریت اٹھانے کے کام میں کمپ سکتے ہیں۔ ہڑتالیوں نے بڑی خوشی سے منظور کر لیا۔ آگے آگے انسویا ہیں سر پر ایک ٹوکری رکھ کر چلیں اور ان کے پیچھے مزدوروں کا تانگا لگ گیا، یہ لوگ ندی کنارے سے ریت کے ٹوکے بھر بھر کے لانے لگے یہ منظر دیکھنے کے قابل تھا مزدوروں میں نئے سرے سے جان پڑ گئی اور انہیں مزدوری بانٹنے والے تھک تھک گئے۔

میرے اپاس میں ایک بڑی خرابی تھی۔ میں پہلے کہہ چکا ہوں کہ مجھ سے اور کارخانے کے مالکوں سے بڑے گہرے تعلقات تھے اور ان کے فیصلے پر میری فاقہ کشی کا اثر پڑنا لازمی تھا۔ میں جانتا تھا کہ ستیا گرہی کی حیثیت سے میرے لئے ان کی مخالفت میں اپاس کرنا جائز نہیں بلکہ مجھے چاہیے کہ انہیں صرف مزدوروں کی ہڑتال سے متاثر ہونے دوں۔ اس لئے میں نے یہ اپاس مالکوں کے کسی تصور کی بنا پر نہیں کیا تھا بلکہ مزدوروں کی غلطی کی مکافات میں، جس میں میں بھی اپنے آپ کو شریک سمجھتا تھا۔ مالکوں کو سمجھانے بھجانے کا تو مجھے حق تھا مگر ان کی مخالفت میں اپاس کرنا گویا ان پر بے جا دباؤ ڈالنا تھا۔ غرض اس اپاس کو مالکوں سے کوئی سروکار نہیں تھا۔ پھر بھی میں یہ جانتا تھا کہ اس کا اثر ان پر پڑے گا۔ مگر میں بالکل مجبور تھا۔ میرا سر سچی فرض تھا کہ میں اپاس کروں۔

میں نے مالکوں کو اطمینان دلانے کے لئے ان سے کہا ”آپ لوگوں کو میری خاطر اپنا طرز عمل بدلنے کی ضرورت نہیں“ مگر انہوں نے میرے یہ الفاظ سرد مہری سے سنے بلکہ مجھ پر چھپے طعنوں کی بوچھاڑ کر دی۔ سچ پوچھئے تو انہیں اس کا حق بھی تھا۔

مالکوں کی ضد کے ذمہ دار اصل میں سینہ امبالال تھے۔ ان کے استقلال اور خلوص کا میرے دل پر بہت اثر ہوا۔ ایسے شخص کا مقابلہ کرنے میں مجھے لطف آتا تھا۔ اسی لئے مجھے اس کا اور قلق تھا کہ میرے

اپاس سے مخالفوں کے گردہ پر جس کے وہ سردار تھے، دباؤ پڑ رہا تھا۔ ان کی بیوی سارلا دیوی مجھ سے بہنوں کی طرح محبت کرتی تھیں۔ میرے اس فعل سے انہیں جو صدمہ تھا وہ مجھ سے دیکھا نہیں جاتا تھا۔

پہلے دن انسویا بین اور چند اور دوستوں نے جن میں بعض مزدور بھی شامل تھے میرے ساتھ اپاس کیا۔ مگر میں نے سمجھا بھجا کر بڑی مشکل سے انہیں اس کے جاری رکھنے سے روکا۔

اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ صلح و آشتی کی فضا پیدا ہو گئی۔ کارخانوں کے مالک پیسے اور تصفیے کی صورتیں تلاش کرنے لگے۔ انسویا بین کا گھرانے کے مشوروں کا مرکز بن گیا۔ انڈیا شکر جی و حردانے بچے میں پڑ کر مصالحت کی گفتگو شروع کی اور آخر میں وہی سرخچ مقرر کئے گئے۔ میرے اپاس کو تین ہی دن گزرے تھے کہ ہڑتال کا خاتمہ ہو گیا۔ مالکوں نے اس کی خوشی میں مزدوروں کو منٹائی بانٹی اور اکیس دن کی ہڑتال کے بعد اس بھگڑے کا تصفیہ ہو گیا۔

تصفیے کی خوشی منانے کے لئے جو جلسہ ہوا اس میں کارخانوں کے مالک اور کمشنر صاحب بھی شریک تھے۔ صاحب نے اس موقع پر مزدوروں کو نصیحت کی کہ ”تمہیں ہمیشہ مسز گاندھی کے مشورے پر عمل کرنا چاہئے“ اس کے بعد ہی مجھ سے اور ان حضرت سے مقابلہ پڑا۔ مگر اس عرصے میں صورت حال تبدیل ہو گئی تھی اور اس کے ساتھ صاحب بھی بدل گئے تھے اب وہ کسیدار کے پٹی داروں کو سمجھانے لگے کہ خبہ دار گاندھی کی باتوں میں نہ آنا۔

اس باب کو ختم کرنے سے پہلے میں ایک واقعہ بیان کروں گا جو مضحک بھی ہے اور افسوسناک بھی۔ اس کا تعلق شیرینی کی تقسیم سے ہے۔ مالکوں نے بہت سی منٹائی منگوائی تھی۔ مگر اسے ہزاروں مزدوروں میں بانٹنا کچھ سہل نہ تھا۔ آخر یہ قرار پایا کہ منٹائی کھلے میدان میں اسی درخت کے نیچے بانٹی جائے جس کے تلے مزدوروں نے ہڑتال کا عہد کیا تھا کیونکہ کسی اور جگہ ان سب کو جمع کرنا مشکل تھا۔ مجھے یقین تھا کہ جن لوگوں نے اکیس دن تک انتہائی انضباط سے کام لیا ہے وہ منٹائی کی تقسیم کے وقت ترتیب سے کھڑے رہیں گے اور آپس میں دھکم دھکا نہیں کریں گے۔ مگر جب امتحان کا وقت آیا تو وہ طوفان بد تمیزی برپا ہوا کہ تقسیم کرنا ناممکن ہو گیا۔ ہر وہ منٹ کے بعد ان کی صفوں میں ابتری پڑ جاتی تھی۔ مزدوروں کے لیڈروں نے کوشش کی کہ ترتیب قائم رکھیں مگر کوئی فائدہ نہیں ہوا۔ اس ریل پیل دھکم دھکائیں بہت سی منٹائی گر کر پیروں سے کھلی گئی۔ آخر تقسیم موقوف کرنا پڑی اور بقیہ منٹائی بڑی مشکلوں سے مرزا پور میں سیٹھ امبالال کے بھٹکے پر پہنچائی گئی۔ دوسرے دن اس بھٹکے کے احاطے میں بڑی آسانی سے منٹائی بٹ گئی۔

اس واقعے کا مصحک پہلو تو ظاہر ہے مگر اس کے افسوسناک پہلو کے متعلق دوا ایک لفظ کہنے کی ضرورت ہے۔ تحقیقات سے معلوم ہوا کہ کہیں احمد آباد کے فقیروں نے یہ بات سن پائی تھی کہ ”ایک نیک درخت کے تلے مٹھائی تقسیم ہوگی اور ان کے گروہ کے گروہ وہاں آپہنچے تھے۔ یہی لوگ بے صبری سے تھپنے پڑتے تھے جس کی وجہ سے یہ ابتری پیدا ہوئی۔

ہمارا ملک افلاس کی چکی میں اس طرح پس رہا ہے کہ ہر سال فقیروں کی تعداد بڑھتی جاتی ہے اور ان بے چاروں کو فاقوں کے مارے خود داری اور انسانیت کا احساس تک باقی نہیں رہتا اور ہمارے محیر حضرات، بجائے اس کے کہ ان کے لئے کام مہیا کریں اور انہیں اپنے قوت بازو سے روٹی کمانے پر مجبور کریں۔ انہیں بھیک دے کر ٹال دیتے ہیں۔

کھیدا کی ستیاگرہ

تقدیر نے مجھے دم لینے کی بھی مہلت نہیں دی۔ احمد آباد کے مزدوروں کی ہڑتال ختم ہوتے ہی مجھے کھیدا کی ستیاگرہ میں شریک ہونا پڑا۔

کھیدا ضلع میں فصل کے برباد ہو جانے سے قحط کی سی صورت پیدا ہو گئی تھی اور وہاں کے پنی دار لگان کی وصولی ملتوی کرانے کے مسئلے پر غور کر رہے تھے۔ قبل اس کے کہ میں کاشتکاروں کو کوئی مشورہ دوں امرت لال جی ٹھکر واقعات کی تحقیق کرنے کے بعد کمشنر سے مل کر گفتگو کر چکے تھے۔ موہن لال جی پانڈیا اور شنکر لال جی پارکہ بھی اس تحریر میں شریک تھے اور انہوں نے دلبرہ بھائی پنیل اور سرگو کلداس کاہنڈاس پارکہ آنجہانی کے توسط سے بمبئی کی مجلس وضع قوانین میں یہ مسئلہ اٹھایا تھا۔ گورنر کے پاس بھی اس سلسلے میں کئی وفد جا چکے تھے۔

میں ان دنوں گجرات سبھا کا صدر تھا سبھا کی طرف سے حکومت کو درخواستیں بھیجی جا رہی تھیں اور تار دیئے جا رہے تھے۔ کمشنر کے اہانت آمیز برتاؤ اور ان کی دھمکیوں کو سبھا صبر سے برداشت کر رہی تھی۔ اس موقع پر حکام کا طرز عمل اس قدر مہمل اور اوجھا تھا کہ آج اس کا ذکر کیا جائے تو لوگوں کو مشکل سے یقین آئے گا۔ کاشتکاروں کا مطالبہ بالکل صاف تھا اور اس قدر معقول کہ اس کے قبول کرنے میں مشکل سے عذر ہو سکتا تھا۔

مال گزاری کے قواعد کی رو سے جب فصل روپے میں چار آنے یا اس سے کم ہو تو کاشتکار سال رواں کا لگان ملتوی کرانے کا مطالبہ کر سکتے تھے۔ سرکاری اطلاع یہ تھی کہ فصل چار آنے سے زیادہ ہے اور کاشتکاروں کا دعویٰ تھا کہ چار آنے سے کم ہے۔ مگر حکومت ان کی فریاد کی شنوائی نہیں کرتی تھی اور اس کے خیال میں کاشتکاروں کا یہ مطالبہ کہ اس کا فیصلہ پنچایت کے ذریعے کیا جائے بغاوت سے کم نہ تھا۔ آخر جب ساری درخواستیں اور التجائیں بیکار گئیں تو میں نے اپنے دوستوں سے صلاح کرنے کے

بعد پئی داروں کو یہ مشورہ دیا کہ ستیاگرہ شروع کر دیں۔

کسیدا کے رضا کاروں کے علاوہ اس معرکے میں میرے ساتھ دلہہ بھائی پنیل شنکر لال جی پینکر، انسویا بین، اندولال جی یا جنک، مہادیو دیسانی اور کچھ حضرات اور بھی شریک تھے۔ دلہہ بھائی پنیل کو اس کام کی خاطر اپنی دکالت، جو بڑے زور و شور سے چل رہی تھی ملتوی کرنا پڑی، اور حقیقت یہ ہے کہ انہیں پھر کسبی اس کے دوبارہ شروع کرنے کا موقع نہیں ملا۔

ہم نے اپنا صدر مقام ندیاد کے انا تھ آشرم کو قرار دیا کیونکہ اور کوئی مکان نہیں مل سکا۔ جس میں اتنے آدمیوں کی گنجائش ہو۔

ستیاگرہیوں نے حسب ذیل حلف نامے پر دستخط کئے۔

اس علم کی بنا پر کہ ہمارے علاقے کی فصلیں روپے میں چار آنے سے کم ہیں ہم نے حکومت سے درخواست کی کہ لگان کی وصولی آئندہ سال تک ملتوی کر دی جائے۔ مگر حکومت نے ہماری التجا نہیں سنی۔ اس لئے ہم لوگ اس حلف کے ذریعے سے عہد کرتے ہیں کہ ہم اس سال حکومت کو پورا لگان یا اس کا جتنا حصہ باقی ہے نہ خود ادا کریں گے اور نہ اپنی رضامندی سے ادا ہونے دیں گے۔ حکومت جو قانونی کارروائی کرے ہم اس میں کوئی مداخلت نہیں کریں گے اور اپنی عدم ادائیگی کے نتائج کو خوشی سے برداشت کریں گے۔ چاہے ہماری زمینیں ضبط ہو جائیں مگر ہم اپنی مرضی سے لگان ادا کر کے اپنے دعوے کو سمجھنا نہیں ہونے دیں گے اور اپنی عزت میں بے نہیں لگنے دیں گے۔ البتہ اگر حکومت سارے ضلع میں لگان کی دوسری قسم کی وصولی ملتوی کر دے تو ہم میں سے جتنے ادائیگی کی استطاعت رکھتے ہیں وہ پورا لگان یا اس کا جتنا حصہ باقی ہے ادا کر دیں گے۔ جو لوگ ادائیگی کا مقدر رکھتے ہیں ان کے ادا نہ کرنے میں یہ مسلمت ہے کہ کہیں ان کی دیکھا دیکھی ان کے غریب بھائی اپنے مویشی بچ کر یا روپیہ قرض لے کر لگان نہ دے دیں اور اپنے ہاتھوں مصیبت میں مبتلا نہ ہو جائیں۔ ایسی صورت میں ہمارے نزدیک مقدرت والوں کا بھی یہ فرض ہے کہ اپنے غریب بھائیوں کی خاطر لگان ادا کرنے سے انکار کر دیں۔

یہاں اس لڑائی کا حال بیان کرنے کے لئے دو باب سے زیادہ کی گنجائش نہیں۔ اس لئے بہت سی باتیں، جن کی یاد مجھے پیاری ہے چھوڑنا پڑیں گی۔ جو لوگ اس اہم معرکے کا زیادہ گہرا مطالعہ کرنا چاہیں وہ کسیدا کی ستیاگرہ کی مفصل اور مستند تاریخ پڑھیں۔ جو شنکر لال جی پارکھ ساکن کھٹلال ضلع کسیدا نے لکھی ہے۔

”پیاز کا چور“

ہمپارن ہندوستان کے دور افتادہ حصے میں واقع تھا اور ہم نے وہاں کے معرکے کی مفصل کیفیت اخباروں میں چھپنے نہیں دی تھی۔ اس لئے وہاں باہر کے لوگ نہیں آتے تھے۔ مگر کسیدہ کی حالت دوسری تھی۔ یہاں کے واقعات کی روز کی خبریں اخباروں میں شائع ہوتی رہتی تھیں۔

گجراتیوں کے لئے یہ بالکل نیا تجربہ تھا اور انہیں اس سے بے حد لچھسی تھی۔ لوگ اس کام کے لئے اپنا دھن دولت دینے کو تیار تھے ہم ان سے کہتے تھے کہ ستیاگرہ صرف روپے سے نہیں چل سکتی۔ اس میں روپے کی ضرورت اور چیزوں کے مقابلے میں بہت کم ہوتی ہے۔ مگر یہ بات ان کی سمجھ میں نہیں آتی تھی۔ باوجود میرے سمجھانے کے بمبئی کے سوداگروں نے ضرورت سے زیادہ روپیہ بھیج دیا چنانچہ جب ستیاگرہ ختم ہوئی تو ہمارے پاس کچھ رقم بچ رہی۔

ستیاگرھی رضا کاروں نے اس معرکے میں سادگی کے نئے سبق سکھے۔ یہ تو میں نہیں کہہ سکتا کہ انہوں نے بالکل سادہ زندگی اختیار کر لی مگر اتنا ضرور ہوا کہ انہوں نے بہت سے تکلفات ترک کر دیئے۔ پٹی دار کاشتکاروں کے لئے بھی یہ لڑائی بالکل نئی چیز تھی۔ اس لئے ہمیں گاؤں گاؤں پھر کر انہیں اس کے اصول سمجھانے پڑتے تھے۔

اصل کام یہ تھا کہ کسانوں کے دل سے خوف دور کر دیا جائے اور یہ بات انکے ذہن نشین کر دی جائے کہ سرکاری ملازم ان کے آقا نہیں بلکہ خادم ہیں کیونکہ ان کو محصول ادا کرنے والوں کے روپے سے تنخواہ ملتی ہے۔ اس سے بھی زیادہ مشکل ان کے دل میں اس قرض کا احساس پیدا کرنا تھا کہ نذر ہونے کے ساتھ ساتھ انہیں حفظ مراتب کا بھی خیال رکھنا چاہیے۔ جہاں ان کے دل سے عہدہ داروں کا خوف دور ہوا وہ ان کی بد تمیزیوں کا ترکی بہ ترکی جواب دینے پر آمادہ ہو جاتے تھے اور ان کو روکنا ہمارے

لئے قریب قریب ناممکن تھا۔ مگر ہم جانتے تھے کہ اگر انہوں نے ذرا سی بد تمیزی کی تو ستیاگرہ کی ساری خوبی جاتی رہے گی۔ جس طرح سنگھیا کے ایک قطرے سے سارا دودھ زہریلا ہو جاتا ہے۔

ہم نے انہیں یہ اصول سمجھانے کی پوری کوشش کی مگر آگے چل کر معلوم ہوا کہ انہوں نے یہ سبق میری توقع سے کم سیکھا مجھے تجربے سے معلوم ہوا کہ حسن اخلاق ستیاگرہ کی جان ہے۔ یہاں حسن اخلاق سے مراد محض ظاہری شیریں کلامی نہیں بلکہ باطنی شیریں مزاجی اور اپنے مخالفوں کی دلی خیر خواہی ہے۔ سچے ستیاگرہی کے ہر فعل میں ان صفتوں کا رنگ جھلکتا ہے۔

ابتدا میں باوجود اس کے کہ لوگوں نے بڑی ہمت سے مقابلہ کیا، حکومت کی طرف سے کوئی سختی نہیں ہوئی۔ مگر جب اس نے دیکھا کہ ان لوگوں کے قدم کو کسی طرح لغزش نہیں ہوتی تو تشدد شروع کر دیا۔ قرق اسمینوں نے لوگوں کے مویشی بیچ ڈالے اور جو چیز ہاتھ آئی قرق کر لی۔ جرمانے کے نوٹس جاری کئے گئے اور کہیں کہیں تیار فصلوں کی قرتی بھی ہوئی۔ اس سے کسان گھبرا گئے۔ بعض نے لگان ادا کر دیا اور بعض نے یہ کوشش کی کہ ان کی منقولہ جائیداد بیچ کر مطالبہ وصول کر لیا جائے مگر کچھ ایسے بھی تھے جو آخر تک لانے کے لئے تیار رہے۔

اسی اثناء میں شنکر لال جی پارکھ کے ایک اسامی نے لگان ادا کر دیا۔ اس سے بڑی بے چینی پھیل گئی۔ شنکر لال جی نے فوراً اس کی تلافی میں وہ زمین جس کا لگان ادا کیا گیا تھا مصارف خیر کے لئے وقف کر دی۔ اس طرح انہوں نے اپنی عزت رکھ لی اور دوسروں کے لئے عمدہ مثال قائم کر دی۔

سچدلوں کے دل منسوب کرنے کے لئے میں نے لوگوں کو مشورہ دیا کہ موہن لال جی پانڈیا کی سرکردگی میں ایک پیاز کے کمیٹی سے جس کی فصل بے انصافی سے قرق کر لی گئی تھی، پیاز کاٹ لائیں۔ میں نے لوگوں سے کہا کہ میرے نزدیک یہ فعل سول نافرمانی میں داخل نہیں اور فرض کیجئے کہ وہ بھی تو بھی کوئی ہرج نہیں، پیاز کی فصلوں کی قرتی چاہے قانوناً درست ہو مگر اخلاقاً ناجائز ہے اور لوٹ سے کم نہیں اس لئے لوگوں کا فرض ہے کہ قرتی کے حکم کی خلاف ورزی کریں اور فصل کاٹ لائیں۔ یہ لوگوں کو اس کی تعلیم دینے کا بڑا اچھا موقع تھا کہ ستیاگرہ میں اپنی خواہش سے قید یا جرمانے کی سزا کیوں کر حاصل کی جاتی ہے۔ موہن لال جی پانڈیا کی تو یہ دلی آرزو تھی انہیں یہ پسند نہ تھا کہ یہ معرکہ یونہی ختم ہو جائے اور کوئی شخص ستیاگرہ کی راہ میں قید کی مصیبت نہ جمیل سکے۔ اس لئے وہ بڑی خوشی سے پیاز کی فصل کاٹنے پر راضی ہو گئے اور سات آٹھ منچلے بھی ان کے ساتھ شریک ہو گئے۔

حکومت انہیں گرفتار کرنے پر مجبور تھی۔ ان کی گرفتاری سے لوگوں کا جوش اور بڑھ گیا۔ جب

جیل جانے کی جھجک جاتی رہے تو حکومت کی سختی لوگوں کی ہمتیں بڑھا دیتی ہے۔ مقدمے کی پیشی کے دن ہزاروں آدمیوں نے کچھری کو گھیر لیا۔ پانڈیا اور ان کے ساتھ مجرم قرار دیئے گئے اور انہیں تھوڑے دن کی امید ہو گئی۔ میرے خیال میں یہ سزا بجا تھی کیونکہ تعزیرات ہند میں چوری کی جو تعریف کی گئی ہے وہ ان کے اس فعل پر عائد نہیں ہوتی تھی۔ مگر ہم لوگ عدالتوں سے دور رہنا چاہتے تھے اس لئے ہم نے اپیل دائر نہیں کیا۔

”مجرموں“ کے ساتھ ایک بہت بڑا جلوس جیل خانے کے دروازے تک گیا اور اس دن سے موہن لال جی پانڈیا کو لوک دنگلی چور (پیاز کا چور) کے معزز لقب سے پکارنے لگے۔ اس سٹیگرہ کا انجام میں دوسرے باب میں بیان کروں گا۔

کھیدا کی ستیاگرہ کا انجام

یہ ستیاگرہ خلاف توقع بہت جلد ختم ہو گئی۔ لوگوں میں مقابلے کا دم نہیں رہا تھا اور میں اس خیال سے کہ کہیں یہ غریب بالکل تباہ نہ کر دیئے جائیں لڑائی کو جاری رکھنے سے بچکچاتا تھا۔ مجھے یہ فکر تھی کہ اسے ختم کرنے کی کوئی ایسی معقول صورت نکل آئے جو ایک ستیاگرہی کے لئے قابل قبول ہو۔ بالکل خلاف توقع ایسی صورت پیدا ہو گئی۔ نڈیا دتعلقے (1) کے معاملت دار نے مجھ سے کہلا بھیجا کہ اگر خوشحال اپنی دار لگان ادا کر دیں تو غریب لوگوں سے وصولی ملتوی کر دی جائے گی۔ میں نے اس مضمون کی تحریر مانگی۔ اس نے بھیج دی لیکن چونکہ معاملت دار صرف اپنے تعلقے کا ذمہ دار تھا اس لئے میں نے کلکٹر سے پوچھا کہ کیا آپ سارے نسلے کے متعلق یہی وعدہ کرتے ہیں۔ اس نے جواب دیا کہ اس التوا کے احکام پہلے ہی جاری ہو چکے ہیں۔ مجھے اس کا علم نہیں تھا۔ میں نے اپنے دل میں کہا کہ اگر یہ سچ ہے تو کسانوں کا عہد پورا ہو گیا۔ یہ احکام بالکل ان کی خواہش کے مطابق تھے۔ اس لئے ہم ان کی تعمیل پر راضی ہو گئے۔

مگر اس تصفیے کے عملدرآمد میں وہ شفقت اور ملاحظت نہ تھی جو ستیاگرہ کے خاتمے پر ہونا چاہیے اس لئے مجھے اس سے کوئی خوشی نہیں ہوئی۔ کلکٹر نے ایسا انداز اختیار کیا کہ گویا کوئی تصفیہ ہی نہیں ہوا۔ غریبوں سے التوا کا وعدہ کیا گیا مگر اس پر عمل بہت کم ہوا۔ یہ طے کرنا کہ کون کون غریب ہیں اصل میں خود کسانوں کا حق تھا مگر وہ اس سے کام نہ لے سکے۔ افسوس یہ ہے کہ ان میں اپنے اس حق سے فائدہ اٹھانے کی طاقت ہی نہ تھی۔ لوگوں نے ستیاگرہ کی فتح کی خوشیاں منائیں مگر میرے دل میں ذرا بھی جوش نہ تھا کیونکہ یہ فتح محض برائے نام تھی۔ ستیاگرہ کی تحریک کامیاب بھی کہلا سکتی ہے جب اس کے خاتمے کے وقت ستیاگرہیوں کی ہمت اور قوت پہلے سے بڑھ گئی ہو۔

مگر اس معرکے کے بالواسطہ اثرات بہت گہرے تھے اس وقت جو پودا لگایا گیا تھا وہ آج پھل دے رہا ہے۔ کمیدا کی ستیاگرہ سے گجرات کے کسانوں کی بیداری اور ان کی سیاسی تعلیم شروع ہوئی۔ اس میں شک نہیں کہ ڈاکٹر اینی جسٹین کی ہوم رول کی تحریک کا تھوڑا بہت اثر کسانوں پر ہوا تھا مگر کمیدا کی مہم کی بدولت تعلیم یافتہ لوگوں کو کسانوں کی واقعی زندگی سے واقفیت حاصل کرنے اور ان کے دکھ درد میں شریک ہونے کا موقع ملا۔ انہیں اپنا حقیقی دائرہ عمل معلوم ہو گیا اور ان میں ایثار اور قربانی کی صلاحیت بڑھ گئی اور پھر یہ کیا کم ہے کہ دسبہ بھائی کو اس معرکے میں معلوم ہو گیا کہ انہیں خدا نے کس کام کے لئے بنایا ہے اس نعمت کی قدر ہمیں پارساں سیلاب زدوں کی امداد کی مہم میں اور اس سال برودلی کی ستیاگرہ میں ہوئی۔ گجرات کی قومی زندگی میں نیا زور اور نئی اہمیت پیدا ہو گئی۔ پٹی دار کسانوں کو اپنی قوت کا پورا اندازہ ہو گیا لوگوں کے دل پر یہ بات نقش ہو گئی کہ ان کی نجات خود ان کے ہاتھ میں ہے اور ان کے ایثار اور قربانی پر منحصر ہے۔ کمیدا کے معرکے سے ستیاگرہ نے گجرات میں جو پکڑ لی۔

اس لئے اگرچہ مجھے ستیاگرہ کے خاتمے پر کچھ زیادہ خوشی نہ تھی لیکن کمیدا کے کسان کامیابی کا جشن منا رہے تھے کیونکہ وہ جانتے تھے کہ ہم نے جو کامیابی حاصل کی ہے وہ ہماری کوشش کے لحاظ سے بہت ہے اور اب ہمیں ایسی تدبیر ہاتھ آگئی ہے جس کے ذریعہ سے ہم حکومت کو دادرسی پر مجبور کر سکتے ہیں۔

پھر بھی کمیدا کے کسانوں نے ستیاگرہ کے اصلی ہمد کو نہیں سمجھا تھا۔ آئندہ بابوں میں معلوم ہو گا کہ اس کی انہیں کیا سزا ملی۔

حوالہ

1 - گجرات میں تحصیل کو "تعلقہ" اور تحصیلدار کو "معاملت دار" کہتے ہیں۔

اتحاد کی گرما گرمی

جس زمانے میں کسیدا کا معرکہ شروع ہوا ہے یورپ کی جہلک جنگ جاری تھی۔ اب اس میں ایک بڑا نازک موقع آن پڑا اور دائسراٹے نے ہر خیال کے لیڈروں کو دہلی میں ”دار کانفرنس“ میں شریک ہونے کے لئے بلایا۔ میں کہہ چکا ہوں کہ مجھ سے اور لارڈ چیمفورڈ سے بہت اچھے تعلقات تھے انہوں نے مجھ سے بھی کانفرنس کی شرکت کے لئے اصرار کیا۔

میں نے یہ دعوت قبول کر لی اور دہلی پہنچ گیا۔ مگر کئی وجوہ سے مجھے کانفرنس میں شامل تھا۔ جن میں سے ایک وجہ یہ تھی کہ اس میں علی برادران شامل نہیں کئے گئے تھے۔ یہ دونوں ان دنوں جیل میں تھے۔ مجھ سے ان سے صرف دو ایک بار کی ملاقات تھی مگر میں نے ان کا ذکر بہت سنا تھا۔ ہر شخص ان کی خدمات اور ان کی ہمت کی تعریف کرتا تھا۔ حکیم صاحب سے مجھے کبھی سابقہ نہیں پڑا تھا۔ مگر پرنسپل رور اور دین بندھو اینڈ ریوز نے مجھ سے ان کی بہت تعریف کی تھی۔ شعیب قریشی صاحب اور خواجہ صاحب سے میں کلکتے کی مسلم لیگ میں مل چکا تھا۔ ڈاکٹر انصاری اور ڈاکٹر عبدالرحمن سے بھی میری ملاقات ہو سکتی تھی مجھے اچھے مسلمانوں کی صحبت کی تلاش تھی۔ میں چاہتا تھا کہ ان میں جو پاک نفس اور وطن پرست لوگ ہیں ان سے مل کر مسلمانوں کی طبیعت کا اندازہ کروں اس لئے میں ہر جگہ ان کے ساتھ جانے کے لئے تیار رہتا تھا تاکہ ان سے اچھی طرح ربط ضبط ہو جائے۔

مجھے جنوبی افریقہ میں اس کا احساس ہو چکا تھا کہ ہندوؤں اور مسلمانوں کے دل ایک دوسرے کی طرف سے صاف نہیں ہیں۔ میں انتہائی کوشش کرتا تھا کہ باہمی اتحاد کی راہ میں جو رکاوٹیں ہیں وہ دور ہو جائیں۔ اپنی خودداری کھو کر یا فوشاد کر کے لوگوں کو خوش کرنا مجھے نہیں آتا تھا مگر جنوبی افریقہ کے

تجربوں سے مجھے یہ یقین ہو گیا تھا کہ ہندو مسلم اتحاد کے معاملے میں میری اہمسا کا بڑا سخت امتحان ہو گا اور مجھے اہمسا کے نئے تجربوں کے لئے بڑا وسیع میدان ملے گا۔

جنوبی افریقہ سے واپسی کے وقت یہ عقیدہ میرے دل میں راسخ ہو چکا تھا اس لئے میں نے علی برادران کی ملاقات کو ایک نعمت سمجھا۔ مگر ابھی ان سے اچھی طرح راہ درسم نہیں ہونے پائی تھی کہ وہ نظر بند کر دیئے گئے۔ مولانا محمد علی مجھے بتیول اور جھنڈوارے کے جیل سے بہت مفصل خط لکھا کرتے تھے۔ میں نے علی برادران سے ملنے کی اجازت مانگی مگر میری درخواست منظور نہیں ہوئی۔

ان دونوں بھائیوں کی گرفتاری کے بعد کلکتے میں مسلم لیگ کا اجلاس ہوا جس میں میرے مسلمان دوستوں نے مجھے بھی مدعو کیا۔ وہاں مجھ سے تقریر کی فرمائش ہوئی میں نے اس موضوع پر تقریر کی کہ مسلمانوں کا فرض ہے کہ جیسے بنے علی برادران کو رہا کرالیں اس کے کچھ دن بعد ہی دوست مجھے علی گڑھ کالج لے گئے وہاں میں نے نوجوانوں کو دعوت دی کہ فقیری اختیار کر کے مادر وطن کی خدمت کریں۔

اس کے بعد میں نے حکومت سے علی برادران کی رہائی کے متعلق خط و کتابت شروع کی اسی سلسلے میں میں نے اس سے واقفیت حاصل کی کہ خلافت کے مسئلے میں ان دونوں بھائیوں کے خیالات کیا ہیں اور انہوں نے اس کے متعلق کیا کچھ کیا ہے مجھ سے اور مسلمان دوستوں سے ان امور پر بحث ہوا کرتی تھی۔ مجھے یہ محسوس ہوا کہ اگر میں مسلمانوں کا سچا دوست بنتا چاہتا ہوں تو مجھے چاہیے کہ علی برادران کی رہائی اور مسئلے خلافت کے تصفیے کی کوشش میں ہر طرح کی مدد دوں مجھے اس سے بحث نہ تھی کہ اس مسئلے کی مذہبی صورت کیا ہے میرے لئے یہی کافی تھا کہ یہ مسلمانوں کا مطالبہ ہے اور اس میں کوئی بات اخلاق کے منافی نہیں۔

مذہب کے معاملے میں لوگوں کے عقائد مختلف ہوتے ہیں اور ہر شخص اپنے عقیدے کو صحیح سمجھتا ہے۔ اگر یہ اختلاف نہ ہوتا تو اتنے مذہب کیوں ہوتے۔ آگے چل کر مجھے یہ معلوم ہوا کہ انگلستان کے وزیر اعظم نے تسلیم کر لیا ہے کہ مسلمانوں کا مطالبہ خلافت کے بارے میں صحیح ہے اس لئے میں نے اپنا فرض سمجھا کہ وزیر اعظم کو عہد کی پابندی پر مجبور کرنے میں مسلمانوں کا ساتھ دوں۔ یہ عہد اس قدر صاف لفظوں میں تھا کہ مجھے اس کے بعد مسلمانوں کے مطالبات کی زیادہ چھان بین کرنے کی ضرورت نہ تھی۔ میں نے جو کچھ کیا اپنے ضمیر کو مطمئن کرنے کے لئے کیا۔

دوستوں نے اور نکتہ چینوں نے خلافت کے بارے میں میرے رویہ پر بہت کچھ اعتراضات کئے ہیں مگر اس کے باوجود مجھے مسلمانوں کا ساتھ دینے کا مطلق افسوس نہیں۔ اگر ایسا موقع پھر آئے تو میں

پھر وہی طرز عمل اختیار کروں گا۔

غرض جب میں دہلی گیا تو میں نے پوری طرح ارادہ کر لیا تھا کہ مسلمانوں کے مطالبات دائسراے کے سامنے پیش کروں گا۔ اس دقت تک خلافت کے مسئلے کی وہ صورت نہیں تھی جو آگے چل کر ہو گئی۔

دہلی پہنچ کر ایک بات اور پیدا ہو گئی جس کی وجہ سے مجھے ”دار کانفرنس“ کی شرکت میں تامل ہوا۔ دین بند ہوا اینڈریوز نے مجھ شیپے میں ڈال دیا کہ کانفرنس میں میری شرکت اخلاقاً جائز ہے یا نہیں۔ انہوں نے کہا انگلستان کے اخباروں میں یہ مسئلہ چھڑا ہوا ہے کہ برطانیہ نے اطلالہ سے خفیہ معاہدہ کر لیا ہے اگر یہ صحیح ہے تو آپ کی شرکت کانفرنس میں کہاں تک مناسب ہے؟ مجھے اس خفیہ معاہدے کا علم نہیں تھا مگر میرے لئے اینڈریوز کا قول کافی تھا میں نے لارڈ چیمفورڈ کو ایک خط لکھا جس میں اپنے شبہات بیان کر دیئے انہوں نے جواب دیا کہ آپ مجھ سے مل کر گفتگو کر لیجئے۔ ان سے اور ان کے پراسیویٹ سیکرٹری نے مسٹر میفے سے طول و طویل بحث کے بعد میں کانفرنس میں شریک ہونے پر راضی ہو گیا۔ دائسراے کی دلیلوں کا خلاصہ یہ تھا ”کیا آپ یہ سمجھتے ہیں کہ ہندوستان کے دائسراے کو برطانوی مجلس وزراء کے سب فیصلوں کی خبر ہوتی ہے؟ میں یہ دعویٰ نہیں کرتا اور میں کیا کوئی بھی نہیں کر سکتا کہ برطانوی حکومت معصوم ہے۔ لیکن اگر آپ یہ مانتے ہیں کہ برطانوی سلطنت مجموعی حیثیت سے دنیا کے لئے مفید ہے اور ہندوستان کو اس کے سابقے سے مجموعی حیثیت سے فائدہ پہنچا ہے تو کیا آپ کے خیال میں ہر ہندوستانی کا یہ فرض نہیں ہے کہ ایسی ضرورت کے وقت اس کی مدد کرے؟ میں نے بھی انگلستان کے اخباروں میں خفیہ معاہدے کی بحث دیکھی ہے میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ ان اخباروں کی تیس آرائیوں کے سوا مجھے کوئی اطلاع نہیں ملتی ہے اور انہیں میں مطلقاً قابل اعتبار نہیں سمجھتا کیونکہ یہ اکثر بے سرو پا خبریں گھڑ دیا کرتے ہیں کیا آپ ان اخباری چہ میگوئیوں کی بنا پر ایسے نازک وقت میں سلطنت کی مدد سے منہ موڑیں گے؟ لڑائی ختم ہو جانے دیجئے۔ پھر آپ دل کھول کر اخلاقی بحثیں چھیڑیئے گا اور جو اعتراض کرنا ہو کر لیجئے گا آج اس کا موقع نہیں۔“

یہ استدلال نیا نہیں تھا۔ مگر یہ ایسے موقع پر اور ایسے انداز میں پیش کیا گیا کہ مجھے نیا معلوم ہوا اور میں نے کانفرنس کی شرکت قبول کر لی۔ مسلمانوں کے مطالبات کے متعلق یہ طے ہوا کہ میں دائسراے کو ایک خط لکھوں۔

رنگروٹوں کی بھرتی

غرض کہ میں کانفرنس میں شریک ہوا۔ دائسراے کا بہت اصرار تھا کہ تم رنگروٹوں کی بھرتی کے رزولوشن کی تائید کرو۔ میں نے ہندی میں تقریر کرنے کی اجازت چاہی۔ دائسراے نے اسے منظور کر لیا۔ مگر اس شرط کے ساتھ کہ جو کچھ ہندی میں کہو اس کا ترجمہ انگریزی میں بھی کر دو مجھے کوئی طویل تقریر نہیں کرنا تھی۔ میں نے صرف ایک جملہ کہا جس کا مضمون یہ تھا۔ ”میں اپنی ذمہ داری کے پورے احساس کے ساتھ اس رزولوشن کی تائید کرتا ہوں۔“

بہت سے لوگوں نے مجھے ہندوستانی میں تقریر کرنے پر مبارک باد دی۔ انہوں نے کہا یہ پہلا موقع ہے کہ ایسے جلسے میں ہندوستانی زبان سنتے میں آئی۔ جب میں نے یہ مبارکباد سنی اور مجھے یہ معلوم ہوا کہ دائسراے کے مشورے کے جلسوں میں مجھ سے پہلے کسی نے ہندوستانی میں تقریر نہیں کی تو مجھے اپنی قوم کی حالت پر بڑا صدمہ ہوا۔ یہ معلوم ہوا جیسے میرا دل مر جھا کر رہ گیا ہو۔ غضب خدا کا ہندوستان کے اندر جلسہ ہو، ہندوستان کے معاملات پیش ہوں اور ہندوستانی زبان میں تقریر کرنا ممنوع ہو اور میری طرح کوئی اپنی زبان میں تقریر کر گزرے تو مبارکباد کے قابل سمجھا جائے! اسی قسم کے واقعات سے پتہ چلتا ہے کہ ہماری پستی کس حد تک پہنچ چکی ہے۔

یہ ایک جملہ جو میں نے کانفرنس میں کہا میرے لئے بڑی اہمیت رکھتا تھا۔ اس کانفرنس اور اس رزولوشن کا خیال میرے دل پر چھا گیا۔ دہلی کے قیام کے دوران میں مجھے ایک فرض انجام دینا تھا یعنی دائسراے کو خط لکھنا تھا۔ یہ کوئی سہل کام نہ تھا میں حکومت اور ملک دونوں کی اغراض کو مد نظر رکھ کر اپنا فرض سمجھتا تھا کہ اس خط میں یہ ظاہر کر دوں کہ میں کانفرنس میں کیوں شریک ہوا اور صاف صاف بتا دوں کہ ملک کو حکومت سے کیا توقعات ہیں۔

میں نے اس میں اس بات پر افسوس کا اظہار کیا کہ لوگمانیہ تلک اور علی برادران جیسے لیڈر کانفرنس میں شریک نہیں کئے گئے اور بہت تفصیل سے لکھا کہ جنگ نے جو صورت حال پیدا کر دی ہے اس کے سبب سے ہندوستانی کم از کم اس قدر سیاسی حقوق چاہتے ہیں اور مسلمانوں کے مخصوص مطالبات یہ ہیں۔

دائسراٹے کانفرنس کے بعد ہی شملے چلے گئے تھے۔ اس لئے میں نے یہ خط وہیں بھیجا۔ میں اس کے مضمون کو بہت اہم سمجھتا تھا اور جواب جلدی چاہتا تھا اس لئے اسے ڈاک سے نہیں بھیج سکتا تھا۔ مگر باوجود عجلت کے کسی ایسے دیے شخص کے ہاتھ بھیجنا مناسب نہیں معلوم ہوا۔ میں چاہتا تھا کہ کوئی پاک نفس آدمی خود جا کر دائسراٹے لاج میں خط پہنچا دے۔ پرنسپل رورا اور آئیڈریوز نے کیرج مشن کے نیک دل پادری مسٹر آئرلینڈ کو تجویز کیا انہوں نے کہا "اگر آپ مجھے یہ خط دکھادیں اور میں اس کے مضمون کو اچھا سمجھوں تو میں اس کے لئے جانے کے لئے حاضر ہوں۔ مجھے خط دکھانے میں کوئی عذر نہیں تھا کیونکہ اس میں کوئی نچ کی بات نہیں تھی۔ انہوں نے وہ خط پڑھا اس کا مضمون پسند کیا اور اسے پہنچانے پر تیار ہو گئے۔ میں نے دوسرے درجے کا کرایہ دینا چاہا مگر انہوں نے کہا کہ میں ڈیوڑھے درجے میں سفر کرنے کا عادی ہوں چنانچہ باوجود اس کے کہ رات کا سفر تھا وہ ڈیوڑھے ہی درجے میں گئے۔ ان کی سادگی اور صاف گوئی کی وجہ سے مجھے ان سے محبت ہو گئی۔ ایسے پاک نفس آدمی کے ہاتھ خط بھیجنے کی برکت سے نتیجہ حسب دلخواہ نکلا۔ اس سے مجھے بڑا اطمینان ہوا اور میرا راستہ صاف ہو گیا۔

میرا دوسرا فرض یہ تھا کہ رنکروٹ بھرتی کروں۔ اس کی یہی صورت تھی کہ میں کھیدا سے ابتدا کروں اور سب سے پہلے اپنے رفیقوں کو بھرتی ہونے کی دعوت دوں۔ چنانچہ نڈیاد پہنچتے ہی میں نے دلبر بھائی اور دوسرے دوستوں کو مشورے کے لئے جمع کیا ان میں سے بعض نے اس تجویز کو ناپسند کیا۔ جنہوں نے پسند کیا انہیں بھی اس کی کامیابی میں بہت شبہ تھا۔ جن لوگوں کو میں دعوت دینا چاہتا تھا انہیں سرکار سے بالکل محبت نہ تھی۔ سرکاری ملازموں کا جو تلخ تجربہ انہیں ہوا تھا اس کی یاد ابھی تازہ تھی۔

پھر بھی دوستوں کی یہ رائے ہوئی کہ کام شروع کر دینا چاہیے۔ پہلا قدم اٹھاتے ہی میری آنکھوں سے پردہ ہٹ گیا۔ میری امیدوں کا طلسم ٹوٹ گیا۔ ستیاگرہ کے زمانے میں تو لوگ بیل گاڑی بے کرائے کے دے دیا کرتے تھے اور جہاں ایک رضا کار کی ضرورت ہوتی تھی وہاں دو موجود ہو جاتے تھے مگر اب رضا کار تو ایک طرف گاڑی تک کرائے پر نہیں ملتی تھی۔ مگر ہم لوگ ہمت ہارنے والے اسامی نہ تھے۔ ہم نے یہ فیصلہ کیا کہ پیدل سفر کریں تاکہ گاڑی کا جھگڑا ہی نہ رہے۔ ہمیں روز بیس میل

پیدل چلنا پڑتا تھا۔ ظاہر ہے کہ جب لوگ گاڑی تک نہیں دیتے تھے تو ان سے یہ توقع کرنا فضول تھا کہ ہمیں کھانا کھلائیں گے اور ہمارے لئے مناسب بھی نہ تھا کہ ان پر اس کا بار ڈالیں۔ اس لئے یہ طے ہوا کہ ہر رضا کار اپنے اپنے تھیلے میں اپنا کھانا لے چلے۔ بستر کی ضرورت ہی نہ تھی کیونکہ گرمی کے دن تھے۔ ہم ہر جگہ چلے کرتے جاتے تھے۔ جلسوں میں مجمع تو خاصا ہو جاتا تھا مگر رنکروٹ ایک دو سے زیادہ نہیں بنتے تھے۔ لوگ ہم سے اس قسم کے سوال کیا کرتے تھے ”آپ اہمسا کے قائل ہو کر ہمیں ہتھیار اٹھانے کی صلاح کیسے دیتے ہیں؟“ گورنمنٹ نے ہندوستان کے لئے کیا کیا ہے جو ہم اس کا ساتھ دیں؟

پھر بھی ہماری کوششوں کا اثر ہونے لگا۔ لوگوں نے خاصی تعداد میں نام لکھوائے اور ہمیں یہ امید ہو گئی کہ پہلی کھیپ بھیجنے کے بعد بھرتی کا سلسلہ بندہ جائے گا۔ میں نے کمشنر سے اس بارے میں مشورہ شروع کر دیا کہ رنکروٹ کہاں رکھے جائیں۔

ہر قسمت کے کمشنر دہلی کی دار کانفرنس کے نمونے پر مشورے کے جلسے کر رہے تھے۔ چنانچہ گجرات میں بھی جلسہ ہوا اور مجھے اور میرے رفیقوں کو شرکت کی دعوت دی گئی۔ ہم لوگ شریک تو ہوئے مگر مجھے یہاں دہلی کے جلسے سے بھی زیادہ یہ بات محسوس ہوئی کہ ایسی جگہ میرے جیسے شخص کے لئے گنجائش نہیں۔ اس غلامی اور چاپلوسی کی فضا میں میرا دم الجھتا تھا۔ میں نے یہاں کسی قدر طویل تقریر کی مجھے جو کچھ کہنا تھا اس میں حکام کو خوش کرنے والی کوئی بات نہ تھی بلکہ دو چار جملے ایسے تھے جس سے انہیں تکلیف ہوئی ہوگی۔

میں لوگوں کو رنکروٹ بننے کی ترغیب دلانے کے لئے چھوٹے چھوٹے رسالے چھپوا کر شائع کیا کرتا تھا ان میں میں نے منجملہ اور دیلیوں کے اس دلیل سے کام لیا تھا ”برطانوی حکومت نے ہندوستان میں جو مظالم کئے ہیں ان میں سے وہ قانون جس کی رو سے قوم کی قوم ہتھیاروں سے محروم کر دی گئی۔ تاریخ کی نظر میں سب سے بڑا ظلم سمجھائے جائے گا۔ اگر ہم قانونِ اسلام کو منسوخ کرنا چاہتے ہیں اور ہتھیاروں کا استعمال سیکھنا چاہتے ہیں تو اس سے اچھا موقع اور کیا ہو گا۔ اگر متوسط طبقہ اس آڑے دقت میں حکومت کا ساتھ دے تو حکومت کے دل سے بے اعتمادی دور ہو جائے گی اور ہتھیاروں کی بندش اٹھادی جائے گی۔“

یہ بات کمشنر کو ناگوار ہوئی۔ انہوں نے اپنی تقریر میں اس کا ذکر کیا اور کہا کہ مجھے بہت خوشی ہے کہ باوجود اس کے کہ ہمارے آپ کے خیالات میں اختلاف ہے آپ اس کانفرنس میں شریک

ہوئے۔ میں نے جہاں تک ہو سکا نرم اور مہذب الفاظ میں اپنے نقطہ نظر کی حمایت کی۔
میں نے دائسرائے کے نام جو خط لکھا تھا اس کا مضمون یہ ہے۔

”آپ کو یاد ہو گا کہ میں نے اپنے 26 اپریل کے خط میں وہ وجوہ عرض کی تھیں جن کی بنا پر مجھے کانفرنس کی شرکت میں تامل تھا۔ مگر آپ سے ملاقات اور گفتگو کا شرف حاصل کرنے کے بعد میں اس میں شریک ہونے پر راضی ہو گیا جس کا بڑا سبب وہ خلوص تھا جو مجھے آپ کی ذات سے ہے۔ مجھے کانفرنس کی شرکت میں سب سے قوی اعتراض یہ تھا کہ لوگمانیہ تلک مسز ہسٹنٹ اور علی براذران جیسے بااثر لیڈر اس میں نہیں بلائے گئے۔ میرا اب تک یہی خیال ہے کہ یہ بہت بڑی غلطی تھی اور میری ناقص رائے میں اس غلطی کی تلافی اس طرح ہو سکتی ہے کہ حکومت ان لیڈروں کو صوبہ دار کانفرنسوں میں جواب ہونے والی ہیں مدعو کرے اور ان کے مشورے سے فائدہ اٹھائے۔ میری مؤدبانہ گزارش ہے کہ کسی حکومت کو یہ جرات نہیں کرنا چاہیے کہ ایسے لیڈروں کو جو اتنی بڑی جماعتوں کے نمائندے ہیں ناقابل توجہ سمجھے خواہ ان کے خیالات کتنے ہی مختلف کیوں نہ ہوں۔ اسی کے ساتھ میں بڑی خوشی سے اعتراف کرتا ہوں کہ کانفرنس کی کمیٹیوں میں مختلف خیال کے لوگوں کو آزادی سے اظہار رائے کی اجازت دی گئی۔ خود میں نے اپنی رائے کا اظہار اس کمیٹی میں جس کی ممبری کا مجھے فخر تھا اور کانفرنس میں غاص کر کے نہیں کیا میں سمجھتا تھا میرے لئے کانفرنس کی خدمت کا سب سے اچھا طریقہ یہ ہے کہ جو رزولوشن پیش ہوں ان کی تائید کروں چنانچہ میں نے بغیر کسی شرط کے تائید کی۔ میں اپنے قول کو عمل کی صورت دینے کے لئے تیار ہوں اور اس خط کے ساتھ اپنی درخواست بھیج رہا ہوں۔ اس کے مستور ہوتے ہی کام شروع کر دوں گا۔“

”میں یہ تسلیم کرتا ہوں کہ ہمیں اس نازک وقت میں اپنے وعدے کے مطابق سلطنت برطانیہ کی دل کھول کر مدد کرنا چاہیے جس کے زیر سایہ عنقریب نوآبادی کا درجہ حاصل کرنے کی ہمیں آرزو ہے مگر سچی بات یہ ہے کہ ہم سلطنت کا ساتھ اسی توقع کی بنا پر دے رہے ہیں کہ اس کے ذریعے سے ہم اپنا مقصد زیادہ جلد حاصل کر لیں گے۔ جو اپنا فرض ادا کرتا ہے اس کا حق خود بخود قائم ہو جاتا ہے اس لئے اگر ہندوستان والے یہ سمجھتے ہیں کہ جن اصطلاحات کی طرف آپ کی تقریر میں اشارہ کیا گیا ہے وہ کانگریس بیگ اسکیم کے عام اصولوں پر مبنی ہوں گی تو کچھ بیجا نہیں سمجھتے۔ مجھے یقین ہے کہ اسی خیال سے کانفرنس کے بہت سے ممبروں نے حکومت کی پوری پوری امداد کرنے کا وعدہ کیا ہے۔

”اگر میرے ہموطن میرے کہنے پر چلتے تو میں کانگریس کے تمام رزولوشن واپس کر لیتا اور جنگ

کے دوران میں "ہوم رول" یا "ذمہ دار حکومت" کا نام بھی نہ آنے دیتا میں مادہ ہند کے سارے صحیح الجسم نوجوانوں کو ایسے نازک دلت میں سلطنت کی خدمت کے لئے حاضر کر دیتا اور مجھے یقین ہے کہ اس قربانی کی بدولت ہندوستان سلطنت کا محبوب ترین رفیق بن جاتا اور نسل و قوم کے امتیازات خود بخود مٹ جاتے لیکن واقعہ یہ ہے کہ ہندوستان کا تعلیم یافتہ طبقہ اس گرجوشی سے حکومت کا ساتھ دینے کے لئے تیار نہیں اور ملک پر اب اسی طبقے کا اثر ہے۔ مجھے جنوبی افریقہ سے آنے کے بعد کسانوں سے بہت سابقہ رہا ہے اور میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ وہ ہوم رول کی تحریک سے متاثر ہو چکے ہیں۔ میں کانگریس کے پچھلے اجلاس میں موجود تھا اور میں نے اس رزولوشن کی تائید کی تھی کہ ہندوستان کو اس میعاد کے اندر جو پارلیمنٹ تجویز کرے کامل ذمہ دارانہ حکومت دے دی جائے۔ مجھے معلوم ہوا ہے کہ یہ اقدام خطرے سے خالی نہیں مگر جب تک ہندوستان کو جلد سے جلد ہوم رول حاصل ہونے کی امید نہ دلائی جائے، ان کا مطمئن ہونا ممکن نہیں۔ آپ یقین کیجئے کہ ہم میں سے بہت سے لوگ اس مقصد کے لئے بڑی سے بڑی قربانی کرنے کو تیار ہیں اور یہ بھی اچھی طرح جانتے ہیں کہ اس سلطنت کی جاں نثاری ہمارا فرض ہے جس کے سایہ عاطفت میں ہمیں نوآبادی کا درجہ حاصل کرنے کی آرزو اور امید ہے۔ ہمارا مقصد جلد تر حاصل ہونے کی یہی صورت ہے کہ ہم دل و جان سے سلطنت کی خدمت میں مصروف ہو جائیں اور اسے دشمنوں کے زغے سے بچائیں۔ ہماری قوم اس بدیہی حقیقت کو نہ سمجھے تو خود کشی کی مرتکب ہوگی اگر ہم اس نازک دلت میں سلطنت کے آڑے آئیں تو ہوم رول ہمیں خود بخود مل جائے گا۔"

غرض اس کا تو مجھے یقین ہے کہ ہمیں جتنے آدمی مل سکیں سلطنت کی حفاظت کے لئے حاضر کر دینا چاہیے مگر مالی امداد کے بارے میں مجھے تامل ہے۔ کسانوں سے ملنے جلنے اور ان کی حالت دیکھنے کے بعد میں اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ ہندوستان پہلے ہی اپنی مقدرت سے زیادہ رقم سلطنت کے خزانے کی نذر کر چکا ہے۔ یہ صرف میری ہی رائے نہیں بلکہ میرے اکثر ہم وطنوں کا یہی خیال ہے۔

میں اور میرے بہت سے بھائی یہ سمجھتے ہیں کہ اس کانفرنس نے ہمیں سلطنت کے مشترکہ مفاد کے لئے اپنی جانیں نثار کرنے کی دعوت دے کر، نوآبادیوں کے دوش بدوش کھڑا کر دیا ہے۔ مگر ہماری حالت ان سے مختلف ہے ہم ابھی تک شرکائے سلطنت کے زمرے سے باہر ہیں۔ ہماری جاں نثاری آئندہ ترقی کی امید پر مبنی ہے میں نے صاف صاف عرض کر دیا ہے کہ یہ امید کیا ہے۔ اگر ایسا نہ کرتا تو آپ سے اور اپنے ملک سے بے وفائی ہوتی۔ میں اس معاملے میں سودا نہیں کرنا چاہتا مگر یہ سمجھ لیجئے کہ

امیدیں پوری نہ ہوں تو اعتبار اٹھ جاتا ہے۔ ایک اور بات عرض کر دینا ضروری ہے آپ نے ہم سے اپیل کیا ہے کہ اندرونی جھگڑے منادو۔ اگر اس کے معنی یہ ہیں کہ ہم حکام کے ظلم چپ چاپ سہیں تو اس کی تعمیل میرے امکان سے باہر ہے جب تک میرے دم میں دم ہے میں باضابطہ جبر و تشدد کا مقابلہ کروں گا۔ آپ کو اپیل کرنا ہے تو حکام سے کیجئے کہ کسی متنفس سے بد سلوکی نہ کریں، ہر معاملے میں رائے عامہ سے مشورہ کریں اور اس کا احترام ہر وقت مد نظر رکھیں۔

چمپارن میں میں نے اس ظلم کا انسداد کر کے، جو پشتہا پشت سے ہوتا چلا آیا تھا۔ یہ دکھا دیا کہ ایک نہ ایک دن برطانوی انصاف کا بول بالا ہو کر رہتا ہے۔ کھیدا میں جو لوگ حکومت کو کوستے تھے انہیں آج یہ محسوس ہو گیا ہے کہ جب حق ان کی طرف ہو اور وہ اس کی خاطر قربانی کرنے پر آمادہ ہو جائیں تو حکومت ان کے آگے سر جھکا دیتی ہے۔ اس طرح میں نے جو کام چمپارن اور کھیدا میں کیا ہے اسے میری نمایاں اور مخصوص خدمات جنگ میں شمار کرنا چاہیے۔ یہی جدوجہد میری جان ہے مجھ سے یہ فرمائش کرنا کہ اسے روک دو گویا مجھے خود کشی کی دعوت دینا ہے اگر میں ہر شخص کو بہیمی قوت کی جگہ، روحانی قوت یعنی محبت کی قوت سے کام لینے پر آمادہ کر سکوں تو آپ کو دکھا دوں کہ ساری دنیا مل کر بھی ہندوستان کا بال بیکا نہیں کر سکتی۔ اس لئے میں دن رات اس ریاضت میں مصروف رہتا ہوں کہ اپنی ذات کو قربانی کے ابدی قانون کا نمونہ بنا کر اہل نظر کے سامنے پیش کروں جب کبھی میں کوئی اور مسئلہ اختیار کرتا ہوں تو اسی نیت سے کرتا ہوں کہ اس قانون کی فضیلت ظاہر ہو جائے۔

میری آخری درخواست آپ سے یہ ہے کہ برطانوی وزیر ارے سے کہئے کہ اسلامی ممالک کے بارے میں ہمیں پوری طرح مطمئن کر دیں میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ ہر مسلمان کا دل ان کے درد سے بے چین ہے اور میں بھی ہندو ہونے کی حیثیت سے اس درد سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا۔ ان کی مصیبت ہماری مصیبت ہے سلطنت کی حفاظت کی یہی صورت ہے کہ اسلامی ممالک کے حقوق کی دل و جان سے حمایت کی جائے، مقامات مقدمہ کے بارے میں مسلمانوں کے جذبات کا پورا احترام مد نظر رکھا جائے، اور ہندوستان کے مطالبہ ہوم رول کا جلد سے جلد منصفانہ تصفیہ کر دیا جائے۔ میری یہ گزارش اس لئے ہے کہ مجھے انگریز قوم سے محبت ہے اور میں ہر ہندوستانی کو انگریزوں کا وفادار بنانا چاہتا ہوں۔

قریب مرگ

رنگروٹوں کی بھرتی میں میں نے اتنی محنت کی کہ میری صحت نے جواب دے دیا۔ ان دنوں میری غذا مونگ پھلی کا تیل اور لیمو تھے۔ مجھے معلوم تھا کہ ذرا سی غفلت میں تیل کا استعمال اعتدال سے بڑھ جاتا ہے اور صحت کو ضرر پہنچ جاتا ہے پھر بھی مجھ سے بے اعتدالی ہو ہی گئی۔ اس کے اثر سے مجھے خفیف سی پیش ہو گئی۔ میں نے اس کا کچھ خیال نہیں کیا۔ شام کو جیسا میں اکثر کیا کرتا تھا، آشرم چلا گیا۔ اس زمانے میں میں حتی الامکان دوا کا استعمال نہیں کرتا تھا۔ میں نے سوچا کہ اگر ایک دولت کھانا نہ کھاؤں تو طبیعت ٹھیک ہو جائے گی اور واقعی دوسرے دن صبح کا ناشتہ ناغہ کر دینے سے مجھے بہت سکون ہو گیا۔ مگر میں جانتا تھا کہ پوری صحت تب ہی ہوگی جب میں کئی دولت کافاقہ کروں یا اگر بہت خواہش ہو تو پھلوں کے افشردے پر قناعت کروں۔

ایک روز کوئی تہوار تھا۔ میں نے کستور ابائی سے کہہ دیا تھا کہ میں دن کا کھانا نہیں کھاؤں گا مگر انہوں نے ترغیب دلائی اور میں لالچ میں آ گیا۔ چونکہ میں یہ عہد کر چکا تھا کہ دودھ یا دودھ کی کوئی چیز استعمال نہیں کروں گا اس لئے انہوں نے خاص میرے لئے گیسوں کا میٹھا دلیہ پکایا تھا اور اس میں گھی کی جگہ جیل ڈالا تھا۔ اس کے علاوہ انہوں نے پیالہ بھر مونگ کی دال بھی میرے سامنے رکھ دی۔ یہ دونوں چیزیں مجھے بہت مرغوب تھیں اس لئے میں نے بڑے شوق سے کھائیں۔ میں سمجھتا تھا کہ بس اتنا کھاؤں گا کہ نقصان کا اندیشہ نہ ہو، کستور ابائی کی خوشی ہو جائے اور مجھے ذائقے کی لذت مل جائے۔ مگر شیطان تاک میں بیٹھا تھا۔ تھوڑا سا کھانے کی جگہ میں نے خوب پیٹ بھر کر کھایا۔ موت کے فرشتے کے لئے یہ دعوت کافی تھی۔ ایک گھنٹہ بھی نہیں گزرا تھا کہ مجھے بہت سخت پیش ہو گئی۔

اسی دن شام کو مجھے ندیاد واپس جانا تھا۔ بڑی مصیبت سے میں سابر متی کے اسٹیشن تک پہنچا جس کا فاصلہ آشرم سے سو میل سے زیادہ نہیں ہے۔ احمد آباد سے دلجو بھائی ساتھ ہوئے انہیں میرے چہرے سے معلوم ہو گیا کہ میری طبیعت اچھی نہیں ہے مگر میں نے ان پر یہ ظاہر ہونے نہیں دیا کہ مجھے کس قیامت کی تکلیف ہے۔

دس بجے رات کو ہم ندیاد پہنچے۔ ہندو آشرم جہاں ہم لوگ مقیم تھے اسٹیشن سے صرف آدھ میل ہے مگر میرے لئے یہ فاصلہ اس وقت دس میل سے کم نہ تھا۔ کسی نہ کسی طرح میں آشرم پہنچ گیا۔ مگر درد کی شدت بڑھتی جاتی تھی۔ پاخانہ کسی قدر دور تھا اس لئے مجھے اپنے رفیقوں سے یہ کہنا پڑا کہ پاس کے کمرے میں ایک کموڈر کھوادیا جائے۔ مجھے یہ کہتے ہوئے بڑی شرم آئی مگر مجبوری تھی۔ پھول چند جی نے فوراً کموڈر مہیا کر دیا۔ سب لوگ تردد کی حالت میں میرے گرد جمع ہو گئے وہ بڑی محنت سے میری خدمت کر رہے تھے لیکن میرے درد کو دور کرنا ان کے بس کی بات نہیں تھی اور میری ضد نے انہیں اور بے دست و پا کر دیا۔ میں نے طبی امداد سے قطعی انکار کیا۔ مجھے اپنی حماقت کی سزا بھگتنا قبول تھا مگر دوا کرنا قبول نہ تھا اس لئے وہ بیچارے حسرت سے دیکھتے تھے اور کچھ نہیں کر سکتے تھے۔ مجھے چوبیس گھنٹے میں تیس چالیس دست آئے۔ میں نے غذا بالکل ترک کر دی۔ یہاں تک کہ ابتداء میں پھلوں کے افشردے سے بھی پرہیز کیا۔ بھوک نام کو نہ تھی۔ میں سمجھا کرتا تھا کہ میری کاٹی لوہے کی ہے مگر اب دیکھنا تو میرا جسم مٹی کا ایک ڈھیر ہو کر رہ گیا ہے اس میں مرض سے مقابلے کی قوت بالکل نہیں رہی تھی۔ ڈاکٹر کانوگالے نے آکر مجھے بہت سمجھایا کہ دوا پی لو مگر میں نے کسی طرح منظور نہیں کیا پھر انہوں نے کہا اچھا میں انجکشن دیتا ہوں (1) میں اس پر راضی نہیں ہوا۔ اس زمانے میں انجکشن کے متعلق میری معلومات اس قدر غلط تھی کہ میں سمجھتا تھا کہ ہر انجکشن میں سیرم (2) ہوتا ہے آگے چل کر مجھے معلوم ہوا کہ جو انجکشن ڈاکٹر صاحب نے تجویز کیا تھا وہ نباتاتی مادے کا تھا۔ مگر اس وقت یہ علم بے کار تھا۔ دست برابر جاری رہے اور میں بالکل پست ہو گیا اس تکان سے مجھے بخار ہو آیا اور سرسامی کیفیت پیدا ہو گئی۔ میرے دوست اور گھبرائے اور انہوں نے اور ڈاکٹروں کو بلایا۔ مگر وہ ایسے مریض کا کیا علاج کرتے جو ان کی بات سنا ہی نہ تھا؟

سکینھا مبالال اپنی نیک دل بیوی کے ساتھ ندیاد پہنچے۔ انہوں نے میرے دوستوں سے مشورہ کیا اور مجھے نہایت احتیاط سے اپنے مرزا پور (احمد آباد) والے بنگلے میں لے گئے اس بیماری میں جس محبت اور بے نفسی سے میری خدمت کی گئی شاید ہی کبھی کسی کو نصیب ہوئی ہو۔ مگر ایک خفیف سی حرارت

ہر وقت رہتی تھی اور میرے جسم کو روز بروز تحلیل کر رہی تھی۔ مجھے یہ خیال ہو گیا کہ میری بیماری طول پکڑے گی اور میں جانبر نہ ہو سکوں گا۔ اس لئے گو سکیٹھا مبالال کے یہاں میری خبر گیری انتہائی محبت اور توجہ سے ہوتی تھی مگر میری طبیعت الجھنے لگی اور میں نے بار بار یہ کہنا شروع کیا کہ مجھے آسٹرم پہنچا دو۔ میرے اصرار سے وہ بچارے مجبور ہو گئے۔

میں آسٹرم میں بستر عیالت پر بے چینی سے کروٹیں بدل رہا تھا کہ دلہ بھائی پنٹیل یہ خبر لائے کہ جرمنی کو کامل شکست ہو گئی ہے اور کمشنر نے کہلا بھیجا ہے کہ اب رنگروٹوں کی ضرورت نہیں یہ سن کر مجھے بڑی تسکین ہوئی کہ اب اس معاملے میں درد سہی نہیں کرنا ہوگی۔

اب میں پانی کا علاج کر رہا تھا۔ اس سے کسی قدر فائدہ تھا مگر جسم کو از سر نو بنانا کوئی سہل کام نہ تھا میرے طبی مشیر بہت تھے اور انہوں نے طرح طرح کے مشورے دیئے مگر میں کسی غذا یا دوا کے استعمال پر راضی نہیں ہوا۔ ان میں دو تین نے کہا آپ دودھ کے ترک کا عہد کر چکے ہیں اس لئے مناسب ہو گا کہ سنخنی پیا کیجئے اور اس کے جواز میں آیور وید کی سند پیش کی۔ ایک نے انڈے کے استعمال پر اصرار کیا مگر میرے پاس سب کے لئے ایک ہی جواب تھا "مجھے معاف کیجئے۔"

میں غذا کے بارے میں شاستر کی سند کا قائل نہیں تھا۔ یہ مسئلہ میری زندگی کا اہم جز تھا اور میری زندگی کے اصول بیرونی سند کے پابند نہیں تھے۔ اگر میرا جینا ان اصولوں کے ترک کرنے پر موقوف تھا تو مجھے ایسا جینا منظور نہیں تھا۔ بھلا یہ کیسے ہو سکتا تھا کہ میں اپنے بارے میں اس اصول کو توڑ دوں جس کی پابندی پر میں بارہا اپنے بیوی بچوں اور دوستوں کو مجبور کر چکا تھا!

میری عمر میں یہ پہلی طویل بیماری تھی۔ اس میں مجھے اپنے اصولوں کے امتحان کا بہت اچھا موقع ملا۔ ایک رات میں بالکل مایوس ہو گیا۔ ایسا معلوم ہوا کہ موت آنے لگی ہے میں نے سویا بین کو بلا بھیجا۔ وہ بچاری فوراً دوزی آئیں۔ دلہ بھائی ڈاکٹر کانوٹکا کو لے کر پہنچے انہوں نے میری نبض دیکھی اور کہا "آپ کی نبض اچھی خاصی چل رہی ہے۔ کسی قسم کا خطرہ مطلق نہیں ہے۔ بات یہ ہے کہ انتہائی کمزوری سے اعصاب نے جواب دے دیا ہے۔ مگر مجھے اس سے اطمینان نہیں ہوا۔ ساری رات جاگتے گزری۔

صبح ہو گئی اور موت نہیں آئی۔ پھر بھی میرے دل سے یہ خیال کسی طرح نہیں نکلتا تھا کہ خاتمہ نزدیک ہے اور میں سوائے سونے کے اوقات کے ہر وقت آسٹرم والوں سے گیتا پڑھوا کر سنتا تھا۔ میں خود پڑھ نہیں سکتا تھا۔ بولنے کو جی نہیں چاہتا تھا۔ جہاں ذرا بات کی دماغ ہل جاتا تھا۔ زندگی کی خواہش مطلق نہیں رہی تھی کیونکہ محض جینے کی خاطر جینا مجھے کبھی گوارا نہیں ہوا۔ اس بے بسی اور معذوری کی

حالت میں نفس شماری کرنا اور اپنے دوستوں اور رفیقوں سے خدمت لینا اور اپنے جسم کو تحلیل ہوتے دیکھنا میرے لئے سوہان روح تھا۔

ایک دن اسی طرح موت کے انتظار میں پڑا تھا کہ ڈاکٹر نلوا لکرا ایک عجیب و غریب آدمی کو ساتھ لے کر آئے۔ یہ مہاراشٹر کے رہنے والے تھے یہ کوئی مشہور آدمی نہ تھے مگر میں ان کی صورت دیکھتے ہی سمجھ گیا کہ یہ بھی میری طرح خضطی ہیں وہ اپنا علاج آزمانے کے لئے آئے تھے انہوں نے گرانٹ میڈیکل کالج میں اپنی تعلیم کی قریب قریب تکمیل کر لی تھی مگر سند نہیں لی تھی۔ بعد میں معلوم ہوا کہ یہ برہمن سماج کے رکن تھے۔ یہ کیلکرجی کہلاتے تھے۔ ان کے منوج میں بے حد خود رانی اور ضد تھی۔ یہ برف کے علاج کا کلمہ پڑھتے اور مجھے اپنا تختہ ر مشق بنانا چاہتے تھے۔ ہم نے ان کا نام برف کا ڈاکٹر رکھ دیا۔ انہیں یقین ہے کہ انہوں نے بہت ایسی باتیں معلوم کی ہیں جن کی باقاعدہ ڈاکٹروں کو ہوا بھی نہیں لگی۔ اپنی اور میری بد قسمتی سے وہ مجھے اپنے طریقہ علاج کا مستعد نہ کر سکے۔ میں ان کے اصولوں کو ایک خاص حد تک تسلیم کرتا ہوں لیکن میرے خیال میں انہوں نے بعض نتیجے نکالنے میں بہت عجلت سے کام لیا ہے۔

بہر حال ان کے دریافت کئے ہوئے اصول صحیح ہوں یا غلط میں اس پر راضی ہو گیا کہ وہ میرے جسم کو تختہ مشق بنائیں۔ مجھے خارجی علاج میں کوئی تامل نہ تھا ان کا علاج یہ تھا کہ سارے جسم پر برف رکھ دیا جائے۔ ان کو میرے علاج میں جس کامیابی کا دعویٰ ہے اس کی تو میں تصدیق نہیں کر سکتا مگر اس میں شک نہیں کہ ان کے علاج سے میرے دل میں نئے سرے سے امید اور قوت پیدا ہو گئی اور اس کا اثر لامحالہ میرے جسم پر بھی ہوا۔ مجھے بھوک لگنے لگی اور میں دس پانچ منٹ آہستہ آہستہ ٹہلنے لگا۔ اب انہوں نے میری غذا کی اصلاح پر توجہ کی۔ انہوں نے کہا ”میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ اگر آپ کچے انڈوں کا استعمال کریں تو آپ کی طاقت بہت جلد عود کر آئے گی انڈا دودھ کی طرح بے ضرر چیز ہے اسے ہرگز گوشت نہیں کہہ سکتے۔ اور آپ یہ بھی جانتے ہیں کہ سب انڈوں میں بچے نہیں ہوتے؟ بازار میں خالی انڈے بھی ملتے ہیں۔“ مجھے خالی انڈوں کا استعمال بھی گوارا نہ تھا پھر بھی مجھے اتنا افاقہ ہو گیا کہ میں ملکی مسائل کی طرف توجہ کرنے لگا۔

حوالہ جات

- 1 - بازو میں سوئی چھو کر پچکاری کے ذریعے جسم میں دوا پہنچانے کو انجکشن کہتے ہیں
- 2 - یرم جانوروں کے جسم میں دبائی جراثیم داخل کر کے ان کے خون سے بنتا ہے اور چھپک ہیضہ وغیرہ کے ٹیکے میں استعمال ہوتا ہے۔

رولٹ بل اور میری کشمکش

میرے دوستوں نے اور ڈاکٹروں نے مجھے یقین دلایا کہ اگر تم تبدیل آب و ہوا کے لئے ماتھران چلے جاؤ تو تمہاری طاقت بہت جلد عود کر آئے چنانچہ میں وہاں گیا لیکن ماتھران کا پانی بہت شور تھا اس لئے وہاں کے قیام میں مجھے بڑی تکلیف ہوئی۔ پیش کے سبب سے بواسیر کی سی کیفیت پیدا ہو گئی تھی اور قضائے حاجت کے وقت بہت شدید درد ہوتا تھا اس لئے میں غذا کے خیال سے لرزتا تھا۔ ایک ہفتے کے اندر ہی مجھے ماتھران سے بھاگنا پڑا۔ اب شکر لال پنکر میری صحت کے محافظ بن گئے اور انہوں نے اصرار کیا کہ ڈاکٹر دلال کو دکھاؤ۔ چنانچہ ڈاکٹر دلال بلائے گئے مجھے ان کی یہ بات بہت پسند آئی کہ وہ ہر معاملے کا فیصلہ فوراً کر دیتے تھے۔

انہوں نے کہا جب تک آپ دودھ نہ استعمال کریں آپ کے بدن میں طاقت نہیں آسکتی اور اگر اسی کے ساتھ آپ فولاد اور سنکھیا کے انجکشن بھی لیں تو پھر میں ذمہ لیتا ہوں کہ آپ کو پھر سے مضبوط اور توانا بنا دوں گا۔

میں نے کہا ”آپ انجکشن شوق سے دیجئے، مگر دودھ کا معاملہ اور ہے۔ اس کے متعلق میں عہد کر چکا ہوں“ ڈاکٹر نے پوچھا ”آخر معلوم تو ہو آپ کا عہد ہے کیا؟“

میں نے انہیں اپنے عہد کی ساری تاریخ سنائی کہ جب سے یہ معلوم ہوا کہ گائے بھینسوں کے تھن بلائے جاتے ہیں مجھے دودھ سے نفرت ہو گئی۔ علاوہ اس کے میرا ہمیشہ سے یہ خیال تھا کہ دودھ انسان کی قدرتی غذا نہیں ہے۔ اس لئے میں نے اس کے ترک کا عہد کر لیا۔ کستور ابائی جو میری پٹی کے پاس کھڑی یہ باتیں سن رہی تھیں بول اٹھیں ”تو پھر آپ کو بکری کا دودھ پینے میں کیا عذر ہو سکتا ہے۔“ ڈاکٹر بھی ان کے ہمنوا ہو گئے۔ انہوں نے کہا ”آپ بکری کا دودھ پیئیں تب بھی کام چل جائے

کا۔ "میں لالچ میں آ گیا۔ ستیاگرہ شروع کرنے کے شوق نے میرے دل میں زندگی کی دہلی ہوئی آرزو کو ابھار دیا تھا۔ اس لئے میں نے اپنے عہد کی لفظی پابندی پر اکتفا کی اس کے اصل منشا کے گلے پر چھری پھیر دی۔ یہ سچ ہے کہ عہد کرتے وقت میرے دل میں صرف گائے اور بھینس کے دودھ کا خیال تھا مگر ظاہر ہے کہ اس کا مفہوم سب جانوروں کے دودھ پر حاوی تھا۔ اس کے علاوہ جب میرا یہ عقیدہ تھا کہ دودھ انسان کی قدرتی غذا نہیں ہے تو پھر میرے لئے کسی قسم کے دودھ کا استعمال جائز نہ تھا۔ ان سب باتوں کے علم کے باوجود میں بکری کا دودھ پینے پر راضی ہو گیا۔ زندگی کی خواہش حق کی محبت پر غالب آگئی اور غالب حق نے ستیاگرہ کی لڑائی چھیرنے کے شوق میں اپنے پاک نصب العین کا دامن مصلحت کے پھینٹوں سے ناپاک کر دیا۔ یہ بات اب تک میرے دل میں کانٹے کی طرح کھٹکتی ہے اور گناہ کی حجابت مجھے چین نہیں لینے دیتی۔ میں ہمیشہ اس فکر میں رہتا ہوں کہ بکری کا دودھ چھوڑ دوں۔ لیکن ہنوز دنیا داری کی آخری زنجیر یعنی خدمت کا شوق مجھے پابند کئے ہوئے ہے۔ مجھے اپنے غذائیاتی تجربے اس لئے عزیز ہیں کہ میں انہیں اہمسا کی منزل کے مرحلے سمجھتا ہوں۔ لیکن بکری کا دودھ پینے میں مجھے اہمسا کے ترک کے خیال سے اتنی تکلیف نہیں ہوتی جتنی ترک حق یعنی نقص عہد کے خیال سے ہوتی ہے۔ میں یہ سمجھتا ہوں کہ مجھے حق کی معرفت اہمسا کی معرفت سے زیادہ حاصل ہے اور میرا تجربہ کہتا ہے کہ اگر تو نے حق کا دامن چھوڑ دیا تو اہمسا کا معنہ کبھی حل نہ ہو گا۔ حق کا یہ تقاضا ہے کہ انسان جو عہد کرے اسے لفظ اور معنی دونوں کے اعتبار سے پورا کرے۔ موجودہ صورت میں میں نے اپنے عہد کی لفظی پابندی تو کی مگر اس کے معنی کا گلا گھونٹ دیا۔ یہ سب جاننے کے باوجود مجھے راہ عمل صاف نظر نہیں آئی یا شاید یہ بات ہے کہ مجھ میں سیدھے راستے پر چلنے کی ہمت نہیں۔ سچ پوچھئے تو ان دونوں باتوں میں کوئی فرق نہیں کیونکہ شک جھمی ہوتا ہے کہ ایمان نہ ہو یا ایمان میں استواری نہ ہو۔ میں دن رات دعا مانگتا ہوں "اے میرے داتا مجھے ایمان عطا کر۔"

غرض میں نے بکری کے دودھ کا استعمال شروع کر دیا۔ اس کے چند ہی روز کے بعد ڈاکٹر دلال نے مجھ پر آپریشن کیا اور وہ کامیاب ہوا۔ جوں جوں میرے بدن میں طاقت آتی گئی میرے دل میں زندگی کی خواہش بڑھتی گئی خاص کر اس لئے کہ خدا کو مجھ سے ایک کام لینا تھا۔ ابھی مجھے اچھی طرح صحت نہیں ہو پائی تھی کہ اخبار دیکھتے دیکھتے میری نظر رولٹ کمیٹی کی رپورٹ پر پڑ گئی۔ اس کی تجویزیں دیکھ کر میرے ہوش اڑ گئے۔ شکر لال بینکر اور عمر سبحانی نے مجھ سے درخواست کی کہ آپ کو اس معاملے میں فوری کارروائی کرنا چاہیے۔ مگر میں ایک مہینے کے بعد اس قابل

ہوا کہ احمد آباد جاسکوں۔

دلجو بھائی قریب قریب روزانہ مجھے دیکھنے آیا کرتے تھے۔ میں نے ان سے اپنے اندیشے کا ذکر کیا اور کہا کہ کچھ نہ کچھ کرنا چاہیے۔ وہ کہنے لگے ”ہم ایسی صورت میں کیا کر سکتے ہیں؟“ میں نے جواب دیا۔ اگر چند آدمی بھی ایسے مل جائیں جو مقاومت کے حلف نامے پر دستخط کر دیں اور اس پر بھی یہ قانون پاس ہو جائے تو ہم فوراً ستیاگرہ شروع کر سکتے ہیں۔ اگر میری یہ حالت نہ ہوتی تو میں تنہا اس مقابلے کے لئے کھڑا ہو جاتا اور رفتہ رفتہ اور لوگ بھی میرا ساتھ دیتے مگر اس بے بسی کی حالت میں میں اس مہم کا بیڑا نہیں اٹھا سکتا۔ اس گفتگو کا یہ اثر ہوا کہ میرے دوستوں کو جمع ہو کر مشورہ کرنے کی دعوت دی گئی۔ میرے خیال میں روٹ کمیٹی کی تجاویز ان شہادتوں کی بنا پر جو اس کے ساتھ شائع ہوئی تھیں، ہرگز جائز نہیں قرار دی جاسکتی تھیں اور کوئی قوم جس میں ذرا سی خودداری بھی ہو انہیں کسی طرح قبول نہیں کر سکتی تھی۔

خدا خدا کر کے مجوزہ جلسہ آشرم میں منعقد ہوا، اس میں ہیں آدمی سے زیادہ نہیں بلائے گئے تھے۔ مجھے ان میں سے دلجو بھائی کے علاوہ مسز سرد جینی ناٹو، مسٹر ہارنمین، سیٹھ عمر سبحانی شکر لال بینکر اور انسویا بین کے نام یاد رہ گئے ہیں اس جلسے میں ستیاگرہ کا حلف نامہ مرتب کیا گیا اور جہاں تک مجھے یاد ہے سب حاضرین نے اس پر دستخط کر دیئے۔ میں اس زمانے میں کوئی اخبار نہیں نکالتا تھا مگر کبھی کبھی روزانہ اخباروں میں اپنے خیالات کا اظہار کرتا رہتا تھا۔ یہی صورت میں نے اس موقع پر اختیار کی۔ شکر لال بینکر نے بڑے زور و شور سے یہ تحریک اٹھائی اور مجھے پہلی بار ان کی بے نظیر قوت عمل اور قوت تنظیم کا اندازہ ہوا۔

مجھے ملک کی کسی انجمن سے یہ توقع نہ تھی کہ وہ ستیاگرہ کے نئے حربے سے کام لینے پر تیار ہوگی، اس لئے میری تحریک پر ایک خاص انجمن ستیاگرہ سبھا کے نام سے قائم کی گئی۔ اس کے ممتاز اراکین سب بمبئی کے تھے اس لئے وہی اس کا صدر مقام قرار پایا۔ تھوڑے دن میں کئیا کی لڑائی کا سارا نقشہ آنکھوں میں پھر گیا۔ ہزار ہا آدمی حلف نامے پر دستخط کر رہے تھے پبلیشن نکالے جا رہے تھے، جدھر دیکھئے عام جلنے ہو رہے تھے۔ میں ستیاگرہ سبھا کا صدر بنایا گیا مجھے بہت جلد یہ محسوس ہو گیا کہ مجھ میں اور سبھا کے تعلیم یافتہ ممبروں میں اتفاق رائے نہیں ہو سکتا۔ میرا اس پر زور دینا کہ سبھا کی کارروائی گجراتی میں ہو اور اسی قسم کی اور انوکھی باتیں، ان کے لئے بڑی زحمت کا باعث تھیں۔ مگر اس کا مجھے اعتراف ہے کہ ان میں سے اکثر نے میرے مراق کو برداشت کرنے میں بڑی فراخ دلی دکھائی۔

پھر بھی ابتدا سے کچھ ایسا نظر آتا تھا کہ یہ سبھا زیادہ دن چلنے والی نہیں۔ مجھ پر یہ بہت ظاہر ہو گئی تھی کہ اس کے بعض ممبروں کو میرا حق اور اہمسا پر زور دینا ناگوار ہے۔ پھر بھی شروع میں ہماری تحریک زور شور سے چلی اور روز بروز قوت پکڑتی گئی۔

وہ شاندار منظر!

ادھر تو رولٹ کمیٹی کی رپورٹ کے خلاف شورش بڑھ رہی تھی اور ادھر حکومت کو کہہ تھی کہ کمیٹی کی تجاویز پر عمل کر کے رہے گی۔ چنانچہ اس نے رولٹ بل چھپ کر شائع کر دیا۔ میں عمر بھر میں ایک بار ہندوستان کی مجلس وضع قوانین میں تماشائی کی حیثیت سے شریک ہوا ہوں اور یہ وہی موقع تھا جب رولٹ بل پر بحث ہو رہی تھی۔ شاستری جی نے ایک پر جوش تقریر میں حکومت کو آگاہ کر دیا کہ سمجھ بوجھ کر قدم اٹھائے۔ ان کی خطابت کا دریا موجیں مار رہا تھا اور دائسرا نے ان کے چہرے پر نظر جمائے، محویت کے عالم میں ان کی تقریر سن رہے تھے ان کے الفاظ میں اس قدر سچائی اور اس قدر جوش تھا کہ مجھے تھوڑی دیر کے لئے یہ گمان ہو گیا کہ دائسرا نے کے دل پر بھی ان کا اثر پڑا ہو گا۔

لیکن جاگے تو وہ جو سوتا ہو۔ جو جان بوجھ کر سوتا بن جائے اسے کون جگا سکتا ہے،

حکومت کی بعینہ یہی حالت تھی۔ اسے تو بس یہی فکر تھی کہ قانونی ضابطے کی رسم پوری ہو جائے اسے جو فیصلہ کرنا تھا پہلے ہی کر چکی تھی۔ شاستری جی کے متنبہ کرنے کا اس پر کچھ اثر نہ ہوا۔ ایسی صورت میں میری فریاد گویا نثار خانے میں طوطی کی آواز تھی۔ میں نے دائسرا نے کو منت سماجت سے سمجھایا، ان کے نام نچ کے خط لکھے، ضابطے کی درخواستیں بھیجیں مگر یہ ساری کوششیں بے کار گئیں۔

یہ مسودہ ابھی تک قانون کی حیثیت سے گزٹ میں شائع نہیں ہوا تھا کہ میرے پاس مدد اس والوں کی طرف سے دعوت آئی۔ میں بہت کمزور تھا اور سفر بہت دور دراز کا تھا مگر میں نے یہی فیصلہ کیا کہ چاہے جو کچھ ہو جانا ضرور چاہیے۔ ان دنوں میں اتنی بلند آواز میں گفتگو نہیں کر سکتا کہ سارا جلسہ سن سکے۔ یہ

معذوری ایک حد تک اب بھی باقی ہے اگر میں کھڑے ہو کر تقریر کروں تو تھوڑی دیر میں سارے بدن سے کانپنے لگتا ہوں اور شدت سے اختلاج شروع ہو جاتا ہے۔

جنوبی ہند والوں کی صحبت میں بہت جلد گھل مل جاتا ہوں۔ تامل اور تیلگیا بھائیوں پر میں خاص طور سے اپنا حق سمجھتا ہوں کیونکہ جنوبی افریقہ میں میں نے برسوں ان کے ساتھ مل کر کام کیا ہے اور ان نیک لوگوں نے بھی ہمیشہ اس حق کو نبھا ہے۔ میرے پاس جو دعوت نامہ آیا تھا اس پر کستوری رنگ آئنگر آنجہانی کے دستخط تھے۔ مگر راہ میں مجھے یہ معلوم ہوا کہ اس دعوت کے محرک در پردہ راجا گوپال چاری ہیں۔ اصل میں یہ میری ان کی پہلی ملاقات تھی۔

راجا گوپال چاری ان دنوں نئے نئے سلم سے مدراس آئے تھے۔ ان کے دوستوں نے جن میں کستوری رنگ آئنگر آنجہانی بھی تھے، انہیں مجبور کیا تھا کہ مدراس میں رہ کر دکالت کریں۔ اس میں یہ مصلحت تھی کہ یہاں انہیں قومی کام کا موقع زیادہ ملے گا۔ ہم لوگ مدراس میں انہیں کے یہاں ٹھہرے۔ یہ بات مجھے دو دن کے بعد معلوم ہوئی کہ ہم ان کے مہمان ہیں۔ وہ مکان کستوری رنگ آئنگر جی کا تھا اس لئے میں یہ سمجھتا تھا کہ وہی ہمارے میزبان ہیں مگر جہاد یو دیسائی نے میری یہ غلط فہمی دور کر دی۔ انہوں نے راجا گوپال چاری سے جو اپنے غلطی حجاب کے سبب دور دور رہتے تھے، بہت جلد دوستی پیدا کر لی اور مجھ سے بھی کہا کہ دیکھئے ان سے ضرور تعلقات بڑھائیے۔

میں نے یہی کیا۔ ہم روزانہ لائے کے منصوبوں پر بحث کیا کرتے تھے۔ مگر اس وقت تک مجھے سوائے جلے کرنے کے اور کوئی پروگرام نہیں سوچا تھا۔ میری سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ اگر رولٹ بل تمام مدارج سے گزر کر قانون بن جائے تو مجھے سول نافرمانی کا کیا طریقہ اختیار کرنا چاہیے۔ اس کی نافرمانی اسی صورت میں ہو سکتی تھی کہ حکومت اس کا موقع دے میں ہو چتا تھا کہ اگر ایسا موقع نہ ملے تو ہمارے لئے دوسرے قوانین کی سول نافرمانی کرنا جائز ہے یا نہیں اور اگر جائز ہے تو کس حد تک؟ یہ مسئلہ اور اسی قسم کے اور مسائل ہمارے موضوع بحث رہا کرتے تھے۔

آئنگر جی نے لیڈروں کی ایک چھوٹی سی کانفرنس اس معاملے کے سبب پہلوؤں پر غور کرنے کے لئے منعقد کی منجملہ اور لوگوں کے دجیار راگھو چاری جی نے بھی اس میں نمایاں حصہ لیا۔ انہوں نے مجھے یہ رائے دی کہ ستیاگرہ کے فن کا ایک مفصل دستور العمل مرتب کر دو جو تمام جزئیات پر حاوی ہو۔ میں نے کہا کہ یہ کام میرے بس کا نہیں۔

ابھی یہ مشورے ہو ہی رہے تھے کہ خبر آئی کہ رولٹ بل قانون کی حیثیت سے شائع کر دیا گیا۔ اس

رات کو میں اس مسئلے پر غور کرتے کرتے سو گیا۔ پچھلے پہر میری آنکھ معمولی وقت سے ذرا پہلے کھل گئی۔ ابھی میں خواب و بیداری کی سرحد پر تھا کہ یکا یک اس مسئلے کا حل میری سمجھ میں آ گیا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے میں نے خواب دیکھا ہو۔ میں نے یہ سارا قصہ راجا گوپال چاری سے بیان کیا۔

رات مجھے خواب میں یہ خیال آیا کہ اس قانون کے جواب میں ہمیں سارے ملک میں عام ہڑتال کرانا چاہیے۔ ستیاگرہ تڑکیہ نفس کا نام ہے ہماری لڑائی مقدس لڑائی ہے اس لئے میرے خیال میں یہی مناسب ہے کہ ہم اس کا آغاز تڑکیہ نفس کے عمل سے کریں۔ اس لئے ایک دن مقرر کیا جائے اور اس دن سارے ہندوستانی اپاس کریں، اپنا کاروبار موقوف رکھیں اور اپنا دولت عبادت میں بسر کریں۔ مسلمانوں کے یہاں ایک دن سے زیادہ کاروزہ ناجائز ہے اس لئے اپاس چوبیس گھنٹے کا رکھا جائے اس کا اندازہ مشکل ہے کہ سب صوبے ہماری اس التجا کو قبول کریں گے یا نہیں مگر بمبئی، مدراس، بہار اور سندھ کی طرف سے مجھے اطمینان ہے۔ میرے خیال میں اگر انہی چار صوبوں میں اچھی طرح ہڑتال ہو جائے تو کافی ہے۔

یہ تجویز راجا گوپال چاری کے دل میں کھب گئی اور دوستوں سے ذکر آیا تو انہوں نے بھی اسے بہت پسند کیا۔ میں نے ایک مختصر سی اپیل کا مسودہ بنایا۔ ہڑتال کے لئے 30 مارچ 1919ء رکھی گئی مگر آگے چل کر یہ تاریخ بدل دی گئی اور 16 اپریل مقرر ہوئی۔ ظاہر ہے کہ لوگوں کو تیاری کی مہلت بہت کم ملی۔ لیکن ہمیں اس کام میں عجلت مد نظر تھی اس لئے اس سے زیادہ دور کی تاریخ رکھنا مناسب نہ تھا۔

انسان کی عقل یہ سمجھنے سے قاصر ہے کہ اتنی جلدی سب انتقام کیونکر ہو گیا۔ اس دن سارے ہندوستان کے ایک ایک شہر میں، ایک ایک گاؤں میں مکمل ہڑتال ہوئی۔ کتنا شاندار تھا وہ مستقر!

وہ یادگار ہفتہ! (۱)

جنوبی ہند میں ایک مختصر سا دورہ کرنے کے بعد میں 4 اپریل کو بمبئی پہنچ گیا۔ شکر لال بینکر نے مجھے تار دے دیا تھا کہ 6 اپریل کے معرکے میں آپ کو بمبئی میں موجود رہنا چاہیے۔

دہلی میں 30 مارچ کو ہڑتال ہو چکی تھی وہاں سوامی شردھانند جی اور حکیم اجمل خان صاحب مرحوم کا طوطی بولتا تھا۔ انہی ہڑتال کے اتوا کا تار دیر میں پہنچا اس لئے اس کی تعمیل نہ کر سکے دہلی میں جیسی ہڑتال اس دن ہوئی اس سے پہلے کبھی نہ ہوئی تھی۔ ہندو مسلمان ایک دل ہو گئے۔ سوامی شردھانند جی سے جامع مسجد میں تقریر کرائی گئی۔ بھلا حکام ان باتوں کو کیسے برداشت کر سکتے تھے؟ پولیس نے ہڑتال کے جلوس کو اسٹیشن کی راہ میں روکا اور ان پر گولی چلائی بہت سے لوگ زخمی ہوئے بہت سے مارے گئے دہلی میں جبر و تشدد کا دور دورہ ہو گیا۔ شردھانند جی نے مجھے تار دیا کہ فوراً دہلی پہنچو۔ میں نے تار پر جواب دیا کہ بمبئی میں 6 اپریل منا کر میں سیدھا دہلی آؤں گا۔

جو واقعہ دہلی میں پیش آیا تھا قریب قریب وہی لاہور امرت سر میں گزرا۔ امرت سر سے میرے پاس ڈاکٹر ستیہ پال اور ڈاکٹر کچلو کی تاکیدی دعوت آئی۔ میں اس دلت تک دونوں صاحبوں سے بالکل واقف نہیں تھا مگر میں نے ان سے وعدہ کیا کہ دہلی سے امرت سر آؤں گا۔

6 اپریل کی صبح کو بمبئی والے ہزاروں کی تعداد میں چوپائی پر جمع ہوئے اور انہوں نے سمندر میں اٹھان کیا۔ اس کے بعد ان کا جلوس ٹھاکر دادار کی طرف روانہ ہوا اس جلوس میں کچھ عورتیں اور بچے بھی نظر آتے تھے اور مسلمان بہت بڑی تعداد میں شامل تھے۔ ٹھاکر دادار سے مسلمان بھائی ہم میں سے کچھ لوگوں کو قریب کی ایک مسجد میں لے گئے اور وہاں انہوں نے مجھ سے اور مسز نانڈو سے تقریریں کرائیں۔ میٹھ وٹھل داس جی حیرا جینی نے یہ تجویز پیش کی کہ اسی جگہ لوگوں سے ہندو مسلم اتحاد اور

سودیشی کا عہد لیا جائے لیکن میں نے اس تجویز کی مخالفت کی اور کہا کہ عہد کرنے یا عہد لینے میں جلدی نہیں کرنا چاہیے۔ اس وقت لوگ جو کچھ کر رہے ہیں وہی کیا کم ہے۔ عہد کرنے کے بعد اس سے پھرنے کا موقع نہیں رہتا اس لئے اس بات کی ضرورت ہے کہ پہلے لوگ سودیشی کے عہد کے معنی اچھی طرح سمجھ لیں اور ہندو مسلم اتحاد کی پوری ذمہ داری محسوس کر لیں۔ میری رائے میں جو لوگ عہد کرنا چاہتے ہیں وہ کل صبح پھر کسی جگہ جمع ہوں۔

یہ کہنے کی ضرورت نہیں کہ بمبئی میں ہڑتال پوری طرح کامیاب ہوئی۔ سول نافرمانی کی تیاریاں بھی مکمل ہو چکی تھیں۔ اس سلسلے میں دو تین تجویزوں پر غور کرنے کے بعد یہ طے ہوا تھا کہ صرف وہی قوانین سول نافرمانی کے موضوع بنائے جائیں جن کی خلاف ورزی عام طور پر ممکن ہو۔ لوگ ان دنوں نمک کے محصول کے بہت مخالف تھے اور عرصے سے اسے منسوخ کرانے کی کوشش ہو رہی تھی اس لئے میں نے یہ تجویز پیش کی کہ لوگ سمندر کے پانی سے اپنے گھروں میں نمک بنائیں اور اس طرح قانون نمک کی خلاف ورزی کریں میری دوسری تجویز ممنوعہ کتابوں کی فروخت سے متعلق تھی۔ میری دو کتابیں ہندو سوراج اور دویا (1) جو ممنوع قرار دی جا چکی ہیں اس مقصد کے لئے بہت موزوں تھیں۔ سول نافرمانی کا سب سے سہل طریقہ یہی نظر آیا کہ یہ دونوں کتابیں چھاپ کر کھلم کھلا بیچی جائیں۔ اس لئے یہ کتابیں مناسب تعداد میں چھپوائی گئیں اور یہ طے ہوا کہ شام کو فاقہ شکنی کے بعد جو عظیم الشان جلسہ ہونے والا ہے اس کے ختم ہونے پر ان کے نسخے فروخت کئے جائیں۔

اس لئے 6 اپریل کی شام کو دانشوروں کی فوج کی فوج ممنوع کتابوں کو لے کر بیچنے کے لئے مکلی میں اور مسز نانڈ موڑ میں بیٹھ کر چلے۔ تھوڑی دیر میں سب نسخے بک گئے ان کتابوں کی آمدنی سول نافرمانی کے معرکے کے لئے مخصوص کر دی گئی تھی۔ ان کی قیمت چار چار آنے تھی۔ مگر شاید ہی کسی نے مقررہ قیمت دینے پر اکتفا کی ہو۔ بہت سے لوگوں نے تو اپنی جیبیں جھاڑ کر جو کچھ تھا ایک نسخے کی قیمت میں دے دیا۔ پانچ پانچ اور دس دس روپے کے نوٹ ہر طرف سے برس رہے تھے اور مجھے یاد ہے کہ ایک شخص نے مجھ سے ایک نسخہ پچاس روپے میں خریدا! یہ بات اچھی طرح لوگوں کے ذہن نشین کر دی گئی تھی کہ ممنوع کتابوں کے خریدنے سے وہ گرفتاری اور قید کے مستوجب ہوں گے۔ مگر تھوڑی دیر کے لئے لوگوں نے جیل کا خوف دل سے نکال دیا تھا۔

آگے چل کر معلوم ہوا کہ حکومت نے آسانی کے لحاظ سے یہ قانونی نکتہ نکالا ہے کہ ان کتابوں کا بیچنا ممنوعہ کتابوں کی فروخت کی حد میں نہیں آسکتا۔ ممانعت پہلے ایڈنیشن کے بیچنے کی تھی اور یہ نسخے جو

بیچے گئے ہیں حکومت کے خیال میں نئے ایڈیشن کے تھے اس خبر سے سب کو بڑی مایوسی ہوئی۔ دوسرے دن صبح کو ایک اور جلسہ سوڈیشی اور ہندو مسلم اتحاد کا عہد لینے کے لئے کیا گیا۔ دھل دا اس جی جیراجنی کو پہلی بار یہ تجربہ ہوا کہ ہر جملے دلی چیز سونا نہیں ہوتی جلسے میں بہت کم لوگ آئے۔ ان میں سے دو چار خواتین کے نام مجھے اب تک یاد ہیں۔ مرد بھی محدودے چند تھے میں حلف نامے کا مسورہ اپنے ساتھ لایا تھا۔ اس پر دستخط لینے سے پہلے میں نے اس کا مطلب سب لوگوں کو اچھی طرح سمجھا دیا۔ حاضرین کی کمی پر مجھے نہ افسوس ہوا اور نہ تعجب میں جانتا ہوں کہ عوام شورش اور ہنگامے کو پسند کرتے ہیں اور خاموش تعمیری کاموں سے گھبراتے ہیں۔ اس کا تجربہ مجھے آج تک ہو رہا ہے۔

غرض 7 اپریل کی شام کو میں دہلی اور امرتسر کے قصد سے روانہ ہو گیا۔ 8 کو مسترا پہنچ کر میں نے یہ چرچا سنا کہ حکومت مجھے گرفتار کرنے دلی ہے۔ مسترا کے بعد جس اسٹیشن پر گاڑی کھڑی ہوئی وہاں اچار یا گڈ دانی مجھ سے ملنے آئے۔ انہوں نے اس خبر کی تصدیق کی اور کہا کہ میرے لائق کوئی خدمت ہو تو میں حاضر ہوں۔ میں نے ان کا شکریہ ادا کیا اور کہا کہ اگر ضرورت ہوگی تو میں آپ کو ضرور تکلیف دوں گا۔

پول کا اسٹیشن آنے سے پہلے مجھے ایک حکمنامہ دکھایا گیا جس کا مضمون یہ تھا کہ آپ کو پنجاب کی سرحد میں داخل ہونے کی ممانعت کی جاتی ہے کیونکہ آپ کی موجودگی سے نقص امن کا اندیشہ ہے۔ پولیس والوں نے مجھ سے کہا کہ آپ اگلے اسٹیشن پر اتر جائیے میں نے اترنے سے انکار کیا اور کہا ”مجھے پنجاب والوں نے بہت اصرار سے بلایا ہے۔ میں وہاں شورش بھڑکانے نہیں بلکہ فرد کرنے جا رہا ہوں مجھے افسوس ہے کہ میں سرکاری حکم کی تعمیل سے معذور ہوں۔“

اتنے میں گاڑی پول پونجی۔ مہادیو دیسائی میرے ساتھ تھے۔ میں نے ان سے کہا کہ آپ دہلی جا کر شردھانند جی کو اس واقعے کی اطلاع دیجئے اور وہاں کے لوگوں سے کہیے کہ سکون سے کام لیں انہیں میری عدول حکمی کی وجہ سمجھا دیجئے اور اچھی طرح ان کے ذہن نشین کر دیجئے کہ ہماری فتح اسی میں ہے کہ اگر مجھے سزا بھی ہو جائے تو وہ پوری طرح امن قائم رکھیں۔

پول کے اسٹیشن میں گاڑی سے اتار کر پولیس کی حراست میں دے دیا گیا۔ تھوڑی دیر میں دہلی سے ایک گاڑی آئی۔ میں اس میں ایک تھمرے درجے میں بٹھایا گیا اور پولیس والے میرے ساتھ بیٹھے۔ مسترا میں یہ لوگ مجھے پولیس لین لے گئے مگر وہاں کسی کو نہیں معلوم تھا کہ میرے متعلق کیا صورت اختیار کی جائے گی اور میں کہاں بھیجا جاؤں گا۔ دوسرے دن صبح چار بجے میں سونے سے اٹھا کر ایک بمبئی

جانے دالی گاڑی میں سوار کر دیا گیا۔ دوپہر کو سوئی مادھو پور میں پھرتا ناپڑا۔ ڈاک گاڑی سے مسٹر براؤن انسپکٹر پولیس لاہور سے آئے اور انہوں نے مجھے اپنی حراست میں لے لیا۔ اب میں ان کے ساتھ فرسٹ کلاس میں بٹھایا گیا۔ پہلے معمولی قیدی تھا اب ”جمنٹلمین“ قیدی بن گیا۔ انسپکٹر صاحب نے سرانکل اور ڈائر کی تصدیق خواتی شروع کی۔ انہوں نے کہا لاٹ صاحب کا خیال تو آپ کے متعلق خراب نہیں مگر انہیں اندیشہ تھا کہ آپ کے پنجاب آنے سے نقص امن ہو گا۔ اسی قسم کی اور باتیں کرتے رہے آخر میں انہوں نے مجھ سے درخواست کی کہ آپ خود ہی بمبئی واپس چلے جائیے اور یہ وعدہ کر لیجئے کہ پنجاب کی سرحد میں قدم نہ رکھیے گا۔ میں نے کہا کہ میں حکومت پنجاب کے اس حکم کی تعمیل سے معذور ہوں اور اپنی خوشی سے ہرگز واپس نہیں جاؤں گا۔ انسپکٹر نے جب اور کوئی چارہ نہ دیکھا تو کہا کہ اب مجھے مجبوراً قانونی کارروائی کرنا پڑے گی۔ میں نے پوچھا ”مگر یہ تو بتائیے کہ آخر میرے متعلق آپ کی تجویز کیا ہے؟“ انہوں نے کہا ”یہ تو مجھے خود نہیں معلوم۔ میں مزید احکام کا انتظار کر رہا ہوں۔ فی الحال تو میں آپ کو بمبئی لئے چلتا ہوں۔“

سورت پہنچ کر میں ایک دوسرے پولیس افسر کے سپرد کر دیا گیا۔ بمبئی پہنچ کر اس نے مجھ سے کہا۔ اب آپ آزاد ہیں۔ مگر مناسب یہ ہے کہ آپ میرین لائن کے قریب اتر جائیں میں وہاں گاڑی کھڑی کرالوں گا۔ تلابھ اسٹیشن پر تو غالباً بڑی بھیر ہوگی۔ میں نے کہا کہ میں خوشی سے آپ کے ارشاد کی تعمیل کروں گا۔ اس پر وہ خوش ہو گیا اور اس نے میرا شکریہ ادا کیا۔

غرض میں میرین لائن پر اترا۔ اتفاق سے ایک دوست کی گاڑی ادھر سے گزری۔ انہوں نے مجھے ڈاکٹر جوہری کے گھر پہنچا دیا۔ راہ میں ان سے معلوم ہوا کہ میری گرفتاری کی خبر سن کر لوگ بہت برہم ہیں اور ان کا جوش جنون کی حد تک پہنچ گیا ہے پائند ہونی کے قریب فساد کا اندیشہ ہے اور مجسٹریٹ اور پولیس وہاں پہنچ گئی ہے۔

میں نے ڈاکٹر جوہری کے یہاں قدم رکھا ہی تھا کہ انسویا بین اور عمر بھانی آپہنچے اور انہوں نے مجھ سے کہا کہ آپ فوراً ہمارے ساتھ موٹر میں پائند ہونی چلے لوگوں میں بھد بے چینی پھیل گئی ہے ہمارے سنبھالے نہیں سنبھلتے۔ بغیر آپ کے کام نہیں چلے گا۔

میں ان کے ساتھ موٹر میں بیٹھ گیا۔ پائند ہونی کے قریب پہنچ کر آدمیوں کا جنگل نظر آیا۔ لوگ مجھے دیکھ کر خوشی سے دیوانے ہو گئے۔ فوراً ایک جلوس مرتب ہو گیا اور ”بندے ماترم“ اور ”اللہ اکبر“ کی صدائیں آسمان کی خبر لانے لگیں۔ پائند ہونی پر سوار پولیس کا ایک دستہ نظر آیا۔ بالا خانوں سے اینٹیں

برس رہی تھیں۔ میں نے لوگوں سے ہاتھ جوڑ کر کہا کہ سکون سے کام لیں مگر ایسا معلوم ہوتا تھا کہ ہم ایبتوں کی بوچھار سے بچ کر نہیں نکل سکیں گے۔

یہ جلوس عبدالرحمن اسٹریٹ سے مڑ کر کرافڈ مارکٹ جا رہا تھا کہ چوراہے پر پولیس سے مڈ بھیڑ ہوئی۔ جو اس لئے آئی تھی کہ ہمیں فورٹ کی طرف نہ جانے دے، مجمع بہت گھنٹا تھا۔ لوگ پولیس کی صف کو توڑ کر آگے بڑھنے لگے۔ اس ہنگامے میں میری آواز کام نہیں دے سکتی تھی۔ یکا یک سواروں کے افسر نے مجمعے کو منتشر کرنے کا حکم دیا اور سواروں نے نیزے تان کر لوگوں پر حملہ کر دیا۔ پہلے میں یہ سمجھا کہ میں بھی زخمی ہو جاؤں گا۔ مگر میرا خیال غلط نکلا۔ نیزے موڑ کو چھوتے ہوئے نکل گئے اور نیزہ بردار تیزی سے آگے بڑھ گئے۔ مجمع درہم برہم ہو گیا اور بھگدڑ مچ گئی۔ کچھ لوگ روندے گئے کچھ زخمی ہوئے اس آدمیوں کے جھگڑ میں نہ تو گھوڑوں کے گزرنے کی جگہ تھی نہ لوگوں کو بھاگنے کی راہ ملتی تھی۔ نیزہ بردار اندھا دھند کچلتے روندتے آگے بڑھتے چلے جاتے تھے۔ انہیں کچھ خبر نہ تھی کہ ہم کیا کر رہے ہیں۔ عجیب ہونا ک منقر تھا۔

مجمع منتشر کر دیا گیا۔ ہمارے موڑ کو آگے بڑھنے کی اجازت ملی۔ میں کیشنر کے دفتر کے سامنے اتر پڑا کہ ان سے پولیس کے ظلم کی شکایت کروں۔

حوالہ

1 - رسکن کی مشہور کتاب Unts this Isat کا آزاد ترجمہ گجراتی زبان میں۔

وہ یادگار ہفتہ! (۲)

میں مسز گریفتھ کے دفتر میں داخل ہوا۔ زینے کے دونوں جانب فوجی سپاہی سر سے پیر تک مسلح کھڑے تھے گویا لام پر جانے کے لئے تیار ہیں۔ برآمدے میں بھی ہلچل مچی ہوئی تھی۔ اندر پہنچ کر دیکھا کہ مسز گریفتھ کے پاس مسز براڈنگ بیٹھے ہوئے ہیں۔

میں نے جو مسترد کیے تھے ان کی روداد کمنشنر سے بیان کی۔ انہوں نے یہ مختصر جواب دیا۔ ”میں جلوس کو فورٹ نہیں جانے دینا چاہتا تھا کیونکہ وہاں ضرور فساد ہوتا جب لوگ سمجھانے سے نہیں مانے تو میں نے مجبور آپولیس کو حملہ کرنے کا حکم دیا۔“

میں نے کہا ”مگر آپ جانتے تھے کہ اس کا نتیجہ کیا ہو گا لوگوں کو گھوڑوں سے روندنا جانا لازمی تھا۔ آخر سواروں کا دستہ سمجھنے کی کیا ضرورت تھی؟“

مسز گریفتھ بولے ”ان باتوں کو آپ نہیں جانتے ہم پولیس والے آپ سے بہتر سمجھتے ہیں کہ آپ کی تعلیم کالوگوں پر کیا اثر پڑے گا اگر ہم سختی سے کام نکالیں معاملہ ہمارے قابو سے باہر ہو جائے۔ آپ میری بات یاد رکھئے کہ لوگ آپ سے سنبھالے نہیں سنبھل سکتے وہ قانون توڑنے پر تو فوراً آمادہ ہو جاتے ہیں مگر امن کی تعلیم ان کی سمجھ سے باہر ہے۔ مانا کہ آپ کے اصول اچھے ہیں مگر عوام تو انہیں نہیں سمجھتے وہ تو اپنی فطرت کے مطابق عمل کریں گے۔“

میں نے جواب دیا۔ ”اسی میں تو مجھے آپ سے اختلاف ہے لوگ فطرتاً تشدد پسند نہیں بلکہ امن پسند ہیں۔“ دیر تک یہی بحث ہوتی رہی۔ آخر میں مسز گریفتھ نے کہا۔ ”فرض کیجئے آپ کو یقین ہو جائے کہ لوگ آپ کی تعلیم کو مطلق نہیں سمجھتے ہیں تو پھر آپ کیا کیجئے گا۔“

میں نے کہا ”اگر مجھے یہ یقین نہ جائے تو میں سول نافرمانی فور آروک دوں گا۔“

”ہیں! آپ نے تو مسٹر براؤنگ سے کہا تھا کہ میں رہا ہوتے ہیں سیدھا پنجاب جاؤں گا۔“

”ہاں میں سب سے پہلی ٹرین سے جانا چاہتا تھا مگر آج تو یہ ناممکن ہے۔“

”اگر آپ ذرا سا غور کریں تو آپ کو یقین ہو جائے کہ لوگ آپ کے اصول کو نہیں سمجھ سکتے۔“

آپ کو معلوم ہے کہ امرتسر میں کیا ہوا اور احمد آباد میں کیا ہو رہا ہے؟ جہاں دیکھیے لوگ آپ سے باہر ہیں۔ مجھے اب تک پوری خبریں معلوم نہیں۔ بعض جگہ تار کٹ دیئے گئے ہیں۔ اب آپ ہی انصاف کیجئے کہ ان بلوؤں کی ذمہ داری آپ ہی پر ہے یا کسی اور پر۔“

میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ جہاں مجھے اپنی غلطی محسوس ہوئی میں سارا الزام اپنے سر لے لوں گا۔ اگر احمد آباد کے بلوے کی خبر صحیح نکلی تو مجھے بے حد تعجب اور صدمہ ہو گا۔ اب رہا امرتسر تو وہاں جو کچھ ہوا اس کی ذمہ داری مجھ پر نہیں نہ میں کبھی پنجاب گیا اور نہ مجھے وہاں کوئی جانتا ہے مگر یہ مجھے یقین ہے کہ اگر حکومت نے مجھے پنجاب جانے سے روکا ہوتا تو میرے سبب سے وہاں امن قائم رکھنے میں بہت آسانی ہوتی۔ میرا داخلہ بند کر کے حکومت نے لوگوں کو خواہ مخواہ اشتعال دلایا۔“

غرض اس بحث کا سلسلہ بہت دیر تک جاری رہا۔ آخر میں کمشنر سے یہ کہہ کر رخصت ہو گیا کہ میں چوپائی پر ایک جلسہ کر کے لوگوں کو امن قائم کرنے کی ہدایت کروں گا۔

چوپائی کے جلسے میں میں نے بہت دیر تک تقریر کی جس میں لوگوں کو عدم تشدد کے فرض کا احساس دلایا اور ستیاگرہ کی پابندیاں سمجھائیں۔ آخر میں میں نے کہا ”ستیاگرہ حق پرستوں کا حربہ ہے۔ ستیاگرہی عدم تشدد کا پابند ہوتا ہے۔ جب تک آپ خیال قول اور فعل سب میں عدم تشدد نہ برتیں گے میں عام ستیاگرہ کو نہیں چلا سکتا۔“

انسویا بین نے بھی احمد آباد کے بلوے کی خبر سنی تھی۔ وہاں کسی نے یہ افواہ پھیلا دی تھی کہ انسویا بین گرفتار ہو گئی ہیں۔ کارخانوں کے مزدور یہ افواہ سن کر غصے سے مجنون ہو گئے۔ انہوں نے کام بند کر دیا اور مار دھاڑ شروع کر دی اس ہنگامے میں ایک پولیس کانسپرنٹنڈنٹ جان سے مارا گیا۔

میں احمد آباد پہنچا۔ وہاں مجھے معلوم ہوا کہ لوگوں نے نندیاد کے اسٹیشن کے قریب ریل کی پٹری اکھاڑ ڈالنے کی کوشش کی، ویرام گام میں ایک سرکاری افسر قتل کر دیا گیا اور احمد آباد میں مارشل لا جاری ہے۔ لوگ خوف سے نیم جان تھے انہوں نے مجنونانہ جوش میں تشدد کیا اور اب وہ اس کی دگنی چوگنی سزا بھگت رہے تھے۔

ایشین پر ایک پولیس کانسٹیبل نے کھڑا تھا۔ وہ مجھے مسٹر ریٹ کمشنر کے پاس لے گیا۔ میں نے دیکھا کہ وہ غصے میں بھرے بیٹھے ہیں۔ میں نے ان سے بہت نرمی سے کہا کہ ”مجھے اس بلوے کا بے حد افسوس ہے، مگر میرے خیال میں مارشل لا کی ضرورت نہیں۔ میں امن قائم کرنے میں ہر قسم کی مدد دینے کو تیار ہوں۔ میں نے ان سے برمتی آئٹم میں عام جلسہ کرنے کی اجازت مانگی۔ انہوں نے اس تجویز کو پسند کیا اور جہاں تک مجھے یاد ہے 13 اپریل کو اتوار کے دن جلسہ ہوا۔ اسی روز یا اس کے دوسرے دن مارشل لا اٹھایا گیا۔ میں نے جلسے میں لوگوں کو ان کے جرم کا احساس دلایا اور کہا کہ میں اس جرم کے کفارے میں تین دن اپاس کروں گا آپ لوگ بھی اپاس کریں اور آپ میں سے جن لوگوں نے تشدد کی حرکتیں کی ہیں وہ اپنے جرم کا اقرار کر لیں۔

مجھے اپنے فرض کا پورا احساس تھا۔ یہ صدمہ میرے لئے ناقابل برداشت تھا کہ انہی مزدوروں نے جن کے ساتھ میں بہت دن رہا تھا اور جن سے مجھے بہت امیدیں تھیں اس بلوے میں حصہ لیا۔ میں بھی اپنے آپ کو ان کا شریک جرم سمجھتا تھا۔

جس طرح میں نے لوگوں کو نصیحت کی تھی کہ اپنے جرم کا اقرار کر لیں اسی طرح حکومت کو مشورہ دیا کہ ان کے جرم سے درگزر کرے۔ مگر فریقین میں سے کسی نے میری صلاح نہ مانی۔

سررامنی بھائی آنجہانی اور احمد آباد کے دوسرے معززین نے آکر مجھ سے کہا کہ ستیاگرہ کو ملتوی کر دو ان کے کہنے کی ضرورت نہ تھی کیونکہ میں خود ہی ارادہ کر چکا تھا کہ اس وقت تک ستیاگرہ موقوف رکھوں گا جب تک لوگ امن کا سبق نہ سیکھ لیں یہ سب دوست خوش خوش واپس گئے۔

مگر کچھ لوگ ایسے بھی تھے جنہیں میرے اس فیصلے سے تکلیف ہوئی ان کا یہ خیال تھا کہ اگر میں ہر جگہ امن کی توقع رکھوں اور ستیاگرہ کو اس پر مشروط کر دوں تو پھر عام ستیاگرہ کا کوئی امکان ہی نہیں ہے مجھے افسوس کے ساتھ ان کی رائے کی مخالفت کرنا پڑی۔

میں نے کہا اگر وہ لوگ جن کے ساتھ کام کرتا ہوں اور جن سے میں عدم تشدد اور ملاکشی کی توقع رکھتا ہوں تشدد سے باز نہ رہ سکیں تو واقعی ستیاگرہ کا چلانا ناممکن ہے۔ میرا محکم عقیدہ تھا کہ جو لوگ عوام سے ستیاگرہ کرنا چاہتے ہیں انہیں ان پر اتنا قابو ہونا چاہیے کہ انہیں مقررہ حد تک عدم تشدد کا پابند رکھ سکیں۔ اسی عقیدے پر میں آج بھی قائم ہوں۔

میری ہمالیہ برابر غلطی

احمد آباد کے جلے کے بعد میں سیدھا ندیا د گیا۔ وہیں میں نے اپنی تقریر میں ہمالیہ برابر غلطی کا فقرہ استعمال کیا جو آگے چل کر اس قدر مشہور ہوا مجھے احمد آباد ہی میں اپنی غلطی کا کچھ دھندلا سا احساس ہونے لگا تھا مگر جب ندیا د پہنچ کر وہاں کی حالت دیکھی اور کھیدا ضلع کے ہزاروں آدمیوں کی گرفتاری کی خبر سنی تو مجھے یقین ہو گیا کہ میں نے کھیدا اور دوسرے مقامات کے لوگوں کو قبل از وقت ستیاگرہ کی دعوت دینے میں بڑی سخت غلطی کی۔ میں نے عام جلے میں اس کا اعتراف کیا۔ اس پر میرا خوب مضحکہ اڑایا گیا۔ لیکن مجھے یہ اعتراف کرنے پر کبھی افسوس نہیں ہوا۔ میرا ہمیشہ سے یہ خیال ہے کہ جب تک انسان اپنی غلطیوں کو بڑھا کر اور دوسروں کی غلطیوں کو گھٹا کر نہ دیکھے اسے دونوں میں صحیح تناسب کا اندازہ نہیں ہو سکتا اور میرے نزدیک ہر ستیاگرہی کو اس اصول پر سختی سے عمل کرنا چاہیے۔

آئیے اب ذرا یہ دیکھیں کہ اس ہمالیہ برابر غلطی کی حقیقت کیا ہے۔ انسان سول نافرمانی کے قابل تبھی ہوتا ہے جب وہ ادب اور خلوص سے سلطنت کے قوانین کی اطاعت کر چکا ہو۔ ہم زیادہ تر قانون کی پابندی سزا کے خوف سے کرتے ہیں۔ خصوصاً ان ضابطوں کی جن کی بنا کسی اخلاقی اصول پر نہیں ہوتی۔ مثلاً ایک ایماندار اور شریف آدمی کبھی چوری کا مرتکب نہیں ہوتا خواہ سزا کا خوف ہو یا نہ ہو۔ مگر یہی شخص بے تکلف اس ضابطے کی خلاف ورزی کرتا ہے جس کی رو سے اندھیرا ہو جانے کے بعد بائیسکل بغیر لیمپ کے نہیں چلانا چاہیے اور اسے ذرا بھی ندامت کا احساس نہیں ہوتا بلکہ اگر کوئی سمجھائے کہ اس معاملے میں احتیاط کیا کرو تو برا مانتا ہے۔ ہاں اگر یہ خوف ہو کہ میں گرفتار کر کے عدالت میں پیش کیا جاؤں گا تو وہ چار و ناچار ایسے ضابطوں کی پابندی کرتا ہے اس قسم کی پابندی اس کا بل اطاعت کے حکم میں نہیں آتی جو ستیاگرہی سے مطلوب ہے ستیاگرہی اجتماعی قوانین کی پابندی سمجھ بوجھ کر اور دل سے کرتا ہے

کیونکہ وہ اسے اپنا پاک فرض سمجھتا ہے۔ جو شخص اس قدر سختی سے اجتماعی قوانین کی پابندی کر چکا ہو وہی یہ فیصلہ کرنے کا اہل ہے کہ کون قاعدے اچھے اور منصفانہ ہیں اور کون برے اور غیر منصفانہ۔ اسی کو یہ حق حاصل ہوتا ہے کہ معینہ صورتوں میں بعض مخصوص قوانین کی نافرمانی کرے۔ میری غلطی یہ تھی کہ میں نے اس ضروری شرط کا خیال نہیں رکھا۔ میں نے لوگوں کو سول نافرمانی کی دعوت دے دی حالانکہ وہ ابھی تک اس کے اہل نہ تھے۔ یہی خطا مجھے ہمالیہ کے برابر معلوم ہوئی۔ جیسے ہی میں کھیدا ضلع میں داخل ہوا ہوں وہاں کی پرانی ستیاگرہ کے واقعات میری نظروں میں پھر گئے اور مجھے اپنے اوپر تعجب ہوا کہ ایسی کھلی ہوئی بات میری سمجھ میں نہیں آئی۔ بہر حال اب مجھے یہ اچھی طرح محسوس ہوا کہ جب تک لوگ سول نافرمانی کی باریکسوں کو نہ سمجھتے ہوں وہ اسے برستے کے قابل نہیں ہوتے۔

یہاں اس اعتراض کی گنجائش ہے کہ جب ہماری قوم اور بہت سی قوموں کی طرح قانون کا حکم ٹالنے کی عادی ہے تو اس سے یہ توقع کیوں کر ہو سکتی ہے کہ دفعتاً سول نافرمانی کے اصلی اصول کو سمجھ جائے گی اور اس کے حدود سے باہر قدم نہ رکھے گی۔ اس میں شک نہیں کہ ہزاروں لاکھوں آدمیوں کے گردہ کے لئے ان شرائط کی پوری پوری پابندی ناممکن ہے۔ اسی لئے میں یہ ضروری سمجھتا ہوں کہ عام سول نافرمانی شروع کرنے سے پہلے آزمائے ہوئے پاک نفس رضا کاروں کی ایک جماعت تیار کی جائے۔ جو ستیاگرہ کے اصولوں کو کما حقہ سمجھتی ہو۔ یہ رضا کار عوام کو ان اصولوں کی تعلیم دیں اور ہر وقت چوکس رہیں کہ لوگ راہ راست سے ہٹنے نہ پائیں۔

انہیں خیالات میں ڈوبا ہوا میں ہمیں بہمی پہنچا۔ یہاں میں نے ستیاگرہ سبھا کے ذریعے سے رضا کار بھرتی کئے اور ان کی مدد سے لوگوں کو ستیاگرہ کے اصول سمجھانا شروع کیا اس کی صورت یہ تھی کہ اس مضمون پر چھوٹے چھوٹے رسالے چھپوا کر لوگوں کو تقسیم کئے جاتے تھے۔

اس کام کے دوران میں مجھے یہ محسوس ہوا کہ لوگوں کو باامن ستیاگرہ کا شوق دلانا بہت مشکل ہے رضا کار بہت کم ملے جو ملے بھی ان میں اکثر ایسے تھے جو باقاعدہ تربیت حاصل کرنے کی زحمت نہیں اٹھاتے تھے۔ نئے رنگ دونوں کی تعداد روز بروز کم ہونے لگی۔ مجھ پر یہ حقیقت کھل گئی کہ سول نافرمانی کی تربیت کے کامیاب ہونے میں میری توقع سے کہیں زیادہ دیر لگے گی۔

”نوجیون“ اور ”ینگ انڈیا“

ادھر عدم تشدد کی تحریک آہستہ آہستہ ترقی کر رہی تھی اور ادھر حکومت کے جبر و تشدد کا بازار گرم تھا۔ خصوصاً پنجاب میں تو اس نے ظاہر داری کا پردہ بھی اٹھا دیا تھا۔ بیڈر ٹیڈ میں تھے، فوجی قانون (مارشل لا) جو محض نام کو قانون ہے، جاری تھا، غیر معمولی عدالتیں قائم تھیں ان عدالتوں کو عدل و انصاف سے کوئی سروکار نہ تھا۔ بلکہ وہ ایک مطلق العنان حاکم کے استبداد کا آلہ کار تھیں۔ بغیر کافی شہادت کے سزائیں دی جا رہی تھیں اور انصاف کا خون ہو رہا تھا۔ امرتسر میں بے گناہ مرد اور عورتیں کیزوں کی طرح پیٹ کے بل ریٹنگ پر مجبور کی جا رہی تھیں۔ اس ذلت کے آگے میری نظروں میں جلیانوالہ باغ کا قتل عام جس نے سارے ہندوستان بلکہ ساری دنیا کو پنجاب کی طرف متوجہ کر دیا، کوئی حقیقت نہیں رکھتا تھا۔

ایسی صورت میں میرا پنجاب جانا بہت ضروری تھا۔ میں نے دائسراٹے سے خط لکھ کر اجازت مانگی، تار بھی دیا۔ مگر کوئی نتیجہ نہیں نکلا۔ مجھے معلوم تھا کہ اگر میں بغیر اجازت کے جاؤں گا تو حکومت مجھے پنجاب کی سرحد میں داخل ہونے سے روک دے گی اور مجھے مجبوراً سول نافرمانی کرنا پڑے گی۔ اس وقت میں عجب کشمکش میں مبتلا تھا۔ سول نافرمانی کے لئے امن و امان کی فضا ضروری ہے مگر یہاں یہ صورت تھی کہ حکومت کے مظالم نے پنجاب کے لوگوں کے دل میں غصے کی آگ بھڑکار رکھی تھی۔ ایسی حالت میں میرے نزدیک داخلہ پنجاب کے حکم کی خلاف ورزی کرنا سول نافرمانی کے اصول کے خلاف تھا۔ اگر مجھے سول نافرمانی کا موقع بھی ملتا تو یہ خوف تھا کہ لوگوں کا اشتعال اور بڑھ جائے گا۔ اس لئے باوجود اس کے کہ میرے دوست مجھے پنجاب جانے کی رائے دے رہے تھے میں نے اسے مناسب نہ

سمجھا۔ یہ میرے لئے زہر کا گھونٹ تھا مگر مجبوراً پینا پڑا۔ پنجاب سے روز نئے ظلم و جبر کی خبریں آتی تھیں اور میں بے بسی میں تلملا کر رہ جاتا تھا۔

اسی زمانے میں حکومت نے دفعتاً مسٹر ہارنیمین کو جن کی ادارت میں بمبئی کرانیکل نے بڑا زبردست اثر پیدا کر لیا تھا، ملک بدر کر دیا۔ حکومت کا یہ فعل میرے نزدیک اس قدر مکروہ تھا کہ آج تک اس خیال سے گمن آتی ہے مجھے اچھی طرح معلوم ہے کہ مسٹر ہارنیمین شورش اور فساد کے حامی نہیں تھے۔ انہوں نے مجھ پر اعتراض کیا تھا کہ آپ کو ستیاگرہ کمیٹی کی اجازت کے بغیر حکومت پنجاب کے انتظامی حکم کی خلاف ورزی کا کیا حق تھا اور جب میں نے سول نافرمانی کو روکا تو انہوں نے میری تائید کی تھی بلکہ میرے اس فیصلے سے پہلے انہوں نے مجھے خط لکھا تھا جس میں اتوار کا مشورہ دیا تھا۔ یہ محض اتفاق ہے کہ ان کا خط میرے فیصلے کے بعد پہنچا۔ غرض ان کے لکا ایک ملک بدر کر دیئے جانے سے مجھے بے حد تعجب اور صدمہ ہوا۔

جب بمبئی کرانیکل مسٹر ہارنیمین کی خدمات سے محروم ہو گیا تو اس کے ڈائریکٹروں نے مجھ سے کہا کہ آپ اس کی نگرانی اپنے ہاتھ میں لے لیجئے۔ بریلوی صاحب موجود ہی تھے اس لئے میرا کام محض برائے نام تھا۔ پھر بھی میری طبیعت ایسی واقع ہوئی ہے کہ اس ذمہ داری کے قبول کر لینے سے میری مصروفیت بہت بڑھ جاتی۔ مگر حکومت نے کرانیکل کو بند کرا کے مجھے اس مشکل سے بچالیا۔

ان دنوں کرانیکل کا انتظام سیٹھ عمر سبحانی اور شنکر لال پینکر کے ہاتھ میں تھا اور ”ینگ انڈیا“ کو بھی وہی چلا رہے تھے۔ انہوں نے مجھ سے کہا کہ کرانیکل تو بند ہو گیا اب آپ ”ینگ انڈیا“ کی ادارت قبول کر لیجئے اور کرانیکل کی کمی پوری کرنے کے لئے اسے ہفتہ وار کی جگہ سے روزہ کر دیجئے۔

میں خود بھی چاہتا تھا مجھے یہ ضرورت محسوس ہو رہی تھی کہ لوگوں کو ستیاگرہ کے حقیقی اصول سمجھاؤں اور مجھے امید تھی کہ اس اخبار کے ذریعے میں حکومت کو پنجاب کی دادرسی پر مجبور کر دوں گا۔ کیونکہ اسے خوب معلوم تھا کہ میری ہر تحریر ستیاگرہ کا پیش خیمہ ہوتی ہے۔ چنانچہ میں نے ان دوستوں کی تجویز کو خوشی سے قبول کر لیا۔ مگر یہ بڑی مشکل تھی کہ انگریزی اخبار عام لوگوں کو ستیاگرہ کی تعلیم دینے کے لئے بیکار تھا۔ میرے کام کا خاص میدان گجرات تھا اس لئے مجھے ایک گجراتی اخبار کی ضرورت تھی۔ ان دنوں اندولال جی یا جنگ، سیٹھ عمر سبحانی اور شنکر لال پینکر کے حلقے میں شامل تھے۔ وہ اپنے دوستوں کی مالی امداد سے گجراتی میں ایک ماہوار رسالہ نوجیون نکال رہے تھے۔ ان دوستوں نے نوجیون میرے حوالہ کر دیا اور اندولال جی میرے ساتھ کام کرنے پر راضی ہو گئے۔ اس رسالے کو ہم

نے ہفتہ وار اخبار کر دیا۔

اس عرصے میں کرائسٹل پھر جاری ہو گیا۔ اس لئے ینگ انڈیا بدستور ہفتہ وار کر دیا گیا۔ دو ہفتہ وار اخبار دو مختلف مقامات سے نکالنے میں مجھے بڑی دقت تھی اور مصارف بھی زیادہ تھے۔ نوجیون احمد آباد سے نکلتا تھا میری درخواست پر ینگ انڈیا بھی احمد آباد منتقل کر دیا گیا۔

اس تبدیلی مقام کی اور وجوہ بھی تھیں۔ مجھے انڈین ادیبین سے یہ تجربہ ہوا تھا کہ اس قسم کے اخباروں کے لئے اپنے مطبع کی ضرورت ہے اس کے علاوہ اس زمانے میں مطبع کا قانون اس قدر سخت تھا کہ اگر میں اپنے خیالات آزادی سے ظاہر کرنا چاہتا تو موجودہ مطبعے جو کاروباری اصول پر قائم کئے گئے تھے ان کو شائع کرنے میں آمادہ نہ ہوتے۔ اس لئے اپنا مطبع قائم کرنا اور بھی ضروری تھا۔ ایسا مطبع قائم کرنے کے لئے احمد آباد ہی میں آسانی تھی۔ اس لئے ینگ انڈیا یہیں لانا پڑا۔

ان اخباروں کے ذریعے سے میں نے پڑھے لکھے لوگوں کو ستیاگرہ کی تعلیم کی پوری کوشش شروع کر دی۔ ان دونوں اخباروں کے خریدار بہت بڑھ گئے اور ایک زمانے میں ہر ایک کی اشاعت کم و بیش چالیس ہزار تک پہنچ گئی۔ مگر نوجیون کی اشاعت ایک دم سے بڑھی اور ینگ انڈیا کی آہستہ آہستہ میرے قید ہونے کے بعد ان کے خریدار بہت کم ہو گئے اور اب آٹھ ہزار سے زیادہ نہیں۔

میں نے شروع ہی سے یہ طے کر لیا کہ ان اخباروں میں اشتہار نہیں چھاپوں گا۔ میرے خیال میں اس سے انہیں کوئی نقصان نہیں پہنچا بلکہ میں تو یہ سمجھتا ہوں کہ انہیں اپنی آزادی رائے قائم رکھنے میں بہت مدد ملی۔

ان اخباروں سے مجھے بھی یہ ضمنی فائدہ ہوا کہ یہ ایک حد تک میرا سکون قلب قائم رکھنے کا باعث ہوئے۔ جب تک ستیاگرہ کا دقت نہیں آیا میں ان کے ذریعے سے اپنے خیالات آزادی سے ظاہر کرتا رہا اور لوگوں کو ہمت دلاتا رہا اس طرح میرے خیال میں یہ دونوں اخبار آڑے دقت قوم کے کام آئے اور انہوں نے اپنی بساط بھر مارشل لا کے مظالم کو روکا

پنجاب میں

سرماٹیکل اور ڈائر نے مجھے پنجاب کے بلووں کا ذمہ دار ٹھہرایا اور چند غصہ دار نوجوان پنجابیوں نے مارشل لا کا الزام میرے سر رکھا۔ ان کا یہ دعویٰ تھا کہ اگر میں سول نافرمانی کو نہ روکتا تو جلیانوالہ کا قتل عام نہ ہوتا۔ بعض تو اتنے خفا تھے کہ انہوں نے مجھے دھمکایا کہ اگر تم نے پنجاب میں قدم رکھا تو ہم تمہیں قتل کر دیں گے۔

مگر میرا یہ خیال تھا کہ میرا طرز عمل بالکل درست اور ناقابل اعتراض ہے اور کسی سمجھ دار آدمی کو اس کے متعلق غلط فہمی نہیں ہو سکتی۔

میں پنجاب جانے کے لئے بے چین تھا۔ مجھے اس سے پہلے کبھی وہاں جانے کا اتفاق نہیں ہوا تھا اس لئے میرا اور جی جی چاہتا تھا کہ وہاں جا کر اپنی آنکھ سے سب حالات دیکھوں۔ ڈاکٹر ستیہ پال، ڈاکٹر کچلو اور پنڈت رام پنچ دت چودھری، جنہوں نے مجھے پنجاب بلایا تھا قید ہو چکے تھے۔ مگر مجھے یقین تھا کہ حکومت ان لوگوں کو اور ان کے ساتھیوں کو زیادہ دن تک قید نہیں رکھ سکتی۔ جب کبھی میں بمبئی جاتا تھا تو بہت سے پنجابی مجھ سے ملنے آتے تھے۔ میں ایسے موقعوں پر ایک آدھ ہمت افزائی کا کلمہ کہہ دیتا تھا جس سے انہیں تقویت ہو جاتی تھی۔ ان دنوں مجھے اپنے اوپر اس قدر بھروسہ تھا کہ جس سے ملتا تھا اسے گرما دیتا تھا۔ لیکن مجھے پنجاب جانے کا ارادہ بار بار ملتوی کرنا پڑا۔ جب کبھی میں نے واسرائل سے اجازت مانگی انہوں نے یہی جواب دیا۔ ”ابھی نہیں“ اسی طرح بات ٹلتی رہی۔

اسی زمانے میں اعلان ہوا کہ ہنٹر کمیٹی اس کی تحقیقات کرے گی کہ مارشل لا کے زمانے میں حکومت پنجاب کا طرز عمل کہاں تک جائز تھا۔ مسٹر سی تف اینڈریوز پنجاب پہنچ گئے تھے۔ ان کے خطوں میں جو جانگداز حالات لکھے گئے انہیں پڑھ کر مجھے یہ اندازہ ہوا کہ مارشل لا کے مقابلہ کی اصلیت ان

خبروں سے کہیں زیادہ ہے جو اخباروں میں آئی تھیں میں نے پھر دائرے کو تار دے کر جانے کی اجازت مانگی۔ انہوں نے جواب دیا کہ آپ فلاں تاریخ کے بعد جاسکتے ہیں مجھے وہ تاریخ ٹھیک یاد نہیں شاید 17 اکتوبر تھی۔

لاہور پہنچ کر میں نے جو مسترد دیکھا وہ ہمیشہ میرے دل میں نقش رہے گا۔ اسٹیشن پر آدمیوں کا سمندر اٹھ آیا تھا۔ شہر کے سارے باشندے اس اشتیاق اور بیتابی سے گھروں سے نکل پڑے تھے جیسے کسی مدتوں کے بچھڑے عزیز سے ملنے جا رہے ہیں۔ جسے دیکھنے خوشی سے دیوانہ تھا۔ میں پنڈت رام بھج دت کے بھٹکے میں ٹھہرایا گیا اور میری مہمانداری کی زحمت سارا دیوی چودھرائی کے حصے میں آئی۔ یہ زحمت کوئی معمولی زحمت نہ تھی کیونکہ پہلے بھی یہی صورت تھی جو اب ہے کہ جس گھر میں ٹھہرتا ہوں وہ کاررواں سرائے بن جاتا ہے۔

پنجاب کے بڑے لیڈر سب جیل میں تھے اس لئے ان کی جگہ مالوی جی موتی لال جی اور شرودھانند جی کام کر رہے تھے اور یہی مناسب بھی تھا۔ مالوی جی اور شرودھانند جی کو تو میں پہلے سے اچھی طرح جانتا تھا مگر موتی لال جی سے میرا پہلا سابقہ تھا۔ یہ سب حضرات اور وہ مقامی لیڈر جو جیل جانے سے محروم رہ گئے تھے، مجھ سے اس طرح گھل مل گئے کہ مجھے اس صحبت سے مطلق اجنبیت کا احساس نہیں ہوا۔

ہمارا یہ متفقہ فیصلہ کہ ہنزہ کمیٹی کے سامنے شہادت نہ دی جائے قومی تاریخ کا جزو بن گیا ہے۔ جن وجوہ کی بنا پر ہم نے یہ فیصلہ کیا تھا وہ اسی زمانے میں ضائع کر دی گئی تھیں یہاں انہیں دہرانے کی ضرورت نہیں۔ صرف اتنا کہہ دینا کافی ہے کہ اتنے دن کے بعد غور کرنے پر بھی مجھے کمیٹی کے مقاطعے کا فیصلہ بالکل صحیح اور مناسب نظر آتا ہے۔

ہنزہ کمیٹی کے مقاطعے کا لازمی نتیجہ یہ تھا کہ کانگرس کی طرف سے ایک غیر سرکاری تحقیقاتی کمیٹی مقرر کی جائے۔ چنانچہ یہی ہوا اور مالوی جی نے پنڈت موتی لال نہرو دیش سندھو، سی آر داس، آنجہانی، مسٹر ایم، آر جیکار، عباس طیب جی صاحب کو اور مجھے اس کمیٹی میں نامزد کیا۔ ہم لوگوں نے مختلف مقامات پر الگ الگ تحقیقات کی۔ کمیٹی کے سامنے جو شہادتیں پیش ہوئیں انہیں ترتیب دینا میرے ذمے رکھا گیا اور سب سے زیادہ مقامات پر تحقیقات کرنے کا شرف بھی مجھی کو حاصل ہوا اس لئے مجھے پنجاب کے لوگوں اور وہاں کے دیہات کی حالت کا گہرا مطالعہ کرنے کا موقع ملا۔

اپنی تحقیقات کے دوران میں مجھے پنجاب کی عورتوں سے بھی ملنے کا اتفاق ہوا۔ وہ مجھ سے اس قدر مانوس ہو گئیں جیسے میرا ان کا برسوں کا ساتھ رہا ہو۔ میں جہاں کہیں جاتا تھا یہ دیویاں جوق در جوق آتی

تھیں اور میرے سامنے اپنے کاتے ہوئے سوت کا ڈھیر لگا دیتی تھیں۔ اس طرح مجھے اس تحقیقات کے دوران میں یہ بات معلوم ہوئی کہ پنجاب کھدر کے کام کا بہت بڑا مرکز بن سکتا ہے۔

لوگوں پر جو مقام ہوئے تھے ان کی تحقیقات کے دوران حکومت کے ظلم اور استبداد کے وہ قصے سنتے میں آئے جن کا گمان بھی نہ تھا۔ انہیں سن کر مجھے جو اذیت ہوئی اسے میرا ہی دل جانتا ہے۔ مجھے تعجب تھا، اور آج تک ہے، کہ جس صوبے نے جنگ کے زمانے میں حکومت برطانیہ کو سب سے زیادہ سپاہی دیئے تھے اس نے ان دشمنانہ مقالہ کو چپ چاپ کیوں کر سہہ لیا۔

کمیٹی کی رپورٹ لکھنے کا کام بھی میرے ہی ذمے تھا۔ جو لوگ یہ معلوم کرنا چاہتے ہیں کہ پنجاب کے لوگوں پر کیا کیا ستم توڑ دیئے گئے وہ اس رپورٹ کا مطالعہ کریں۔ یہاں صرف اتنا کہنا چاہتا ہوں کہ اس میں اول سے آخر تک کہیں جان بوجھ کر مبالغہ نہیں کیا گیا اور جو کچھ لکھا گیا کافی شہادت کی بنا پر لکھا گیا۔ جتنی شہادتیں شائع کی گئیں وہ ان کا عشر عشر بھی نہیں جو کمیٹی کے سامنے پیش ہوئی تھیں جس بیان کے متعلق ذرا سا بھی شبہ تھا وہ رپورٹ میں نہیں آنے دیا گیا۔ اس رپورٹ سے جو محض احقاق حق کے لئے لکھی گئی ہے۔ پڑھنے والوں کو اندازہ ہو جائے گا کہ برطانوی حکومت اپنی قوت قائم رکھنے کے لئے کیا کچھ کر گزرتی ہے اور کیسی کیسی انسانیت سوز اور دشمنانہ حرکتوں کی مرتکب ہوتی ہے۔ جہاں تک مجھے معلوم ہے اس رپورٹ کا ایک فقرہ بھی غلط ثابت نہیں کیا جاسکا۔

خلافت کے بدلے گنور کھشا؟

پنجاب کی درد انگیز داستان کو۔ بہیں چھوڑتا ہوں۔

کانگریس کی طرف سے پنجاب کی ڈائرکٹوری کی تحقیقات ابھی شروع ہی ہوئی تھی کہ میرے پاس ہندو مسلمانوں کی اس مشترکہ کانفرنس میں شریک ہونے کی دعوت آئی جو مسئلہ خلافت پر غور کرنے کے لئے دہلی میں ہو رہی تھی۔ اس دعوت نامے پر منجملہ اور لوگوں کے حکیم اجمل خان صاحب مرحوم اور مسٹر آصف علی کے دستخط تھے۔ اس میں یہ بھی لکھا تھا کہ کانفرنس میں سوامی شردھانند جی بھی شریک ہوں گے۔ جہاں تک مجھے یاد ہے سوامی جی اس کانفرنس کے نائب صدر منتخب ہوئے تھے اور اس کا اجلاس نومبر میں قرار پایا تھا۔ اس کانفرنس کا مقصد اس صورت حال پر غور کرنا تھا جو خلافت کے معاملے میں حکومت کی بد عہدی سے پیدا ہو گئی تھی اور یہ طے کرنا تھا کہ ہندو مسلمان صلح میں شرکت کریں یا نہ کریں۔ دعوت نامے میں یہ بھی لکھا تھا کہ کانفرنس میں علاوہ خلافت کے گنور کھشا کے مسئلے پر بھی بحث ہوگی اور یہ اس کے طے کرنے کا بہترین موقع ہے۔ مجھے گنور کھشا کا ذکر اس سلسلے میں پسند نہیں آیا میں نے اس دعوت نامے کے جواب میں جو خط لکھا اس میں شرکت کا وعدہ کرتے ہوئے یہ تجویز پیش کی کہ ان دونوں مسئلوں کو گڈ مڈ نہیں کرنا چاہیے۔ اگر ان دونوں کے متعلق بحث کرنا ہے تو اس طرح نہ کیجئے جیسے سودا پکایا جاتا ہے بلکہ دونوں کے حسن و قبح پر الگ الگ غور کیجئے۔

یہ خیالات دل میں لئے ہوئے میں کانفرنس میں گیا اس میں مجمع بہت کافی تھا مگر اسنا نہیں جتنا اس کے بعد کے جلسوں میں ہوا۔ میں نے اس مسئلے پر جس کا ذکر آچکا ہے سوامی شردھانند جی آنجہانی سے گفتگو کی۔ انہوں نے میری تجویز کو پسند کیا اور کہا کہ آپ اسے کانفرنس میں پیش کیجئے۔ میں نے حکیم صاحب سے بھی مشورہ کر لیا کانفرنس میں میں نے یہ کہا کہ اگر خلافت کا مسئلہ جیسا کہ میں سمجھتا ہوں حق پر مبنی ہے اور اگر حکومت نے اس معاملے میں صریحی بے انصافی کی ہے تو ہندوؤں کا فرض ہے کہ وہ اس

کی تلافی کے مطالبے میں مسلمانوں کا ساتھ دیں۔ ان کے لئے یہ بات نازیبا ہے کہ اس موقع پر سو رکھشا کا مسئلہ سچ میں لے آئیں اور صورت حال سے فائدہ اٹھا کر مسلمانوں سے سودا چکائیں اور مسلمانوں کے لئے بھی اس پر یہ شرط گاڈ کشی بند کرنا نامناسب ہے کہ ہندو خلافت کے معاملے میں ان کا ساتھ دیں۔ یہ دوسری بات ہے کہ مسلمان ہندوؤں کے مذہبی جذبات کے لحاظ سے ہمسائیگی اور ملکی برادری کے حقوق کو مد نظر رکھتے ہوئے اپنی خوشی سے گاڈ کشی ترک کر دیں۔ ان کا یہ سلوک بہت خوشتا اور قابل تعریف ہو گا۔ لیکن ظاہر ہے کہ اگر مسلمان گاڈ کشی بند کرنا فرض ہمسائیگی سمجھتے ہیں تو انہیں ہر حال میں بند کر دینا چاہیے۔ ہندو خلافت کے مسئلے میں ان کا ساتھ دیں چاہے نہ دیں ایسی صورت میں مناسب ہے کہ ان دونوں مسئلوں پر الگ الگ بحث کی جائے اور یہ کانفرنس صرف خلافت کے مسئلے پر غور کرے میرا یہ استدلال حاضرین کو پسند آیا اور گنور کھشا کے سوال پر کانفرنس میں بحث نہیں ہوئی۔ لیکن اس کے باوجود مولانا عبدالباری صاحب نے اپنی تقریر میں کہا ”خواہ ہندو ہماری مدد کریں خواہ نہ کریں مسلمانوں کو اپنے برادران وطن کے جذبات کا لحاظ کر کے گاڈ کشی ترک کر دینا چاہیے“ اور ایک زمانے میں واقعی یہ حالت تھی کہ معلوم ہوتا تھا کہ مسلمان گاڈ کشی بالکل موقوف کر دیں گے۔

بعض لوگوں کی تجویز تھی کہ پنجاب کا مسئلہ بھی خلافت کے ساتھ نتھی کر دیا جائے مگر میں نے اس کی مخالفت کی۔ میں نے کہا پنجاب کا معاملہ ثقافتی ہے اس لئے اس کا فیصلہ کرنے میں کہ جشن صلح میں شرکت کی جائے یا نہ کی جائے اس کو مد نظر رکھنا مناسب نہیں۔ یہ خلاف مصلحت ہے کہ مقامی معاملات کو مسئلہ خلافت کے ساتھ جو براہ راست شرائط صلح سے تعلق رکھتا ہے، مخلوط کر دیں۔ اسے بھی لوگوں نے مان لیا۔

مولانا حسرت موہانی اس جلسے میں موجود تھے۔ میں انہیں پہلے سے جانتا تھا مگر یہ اس کانفرنس میں معلوم ہوا کہ وہ کس غضب کے لانے والے ہیں۔ مجھ میں اور ان میں ابتدا سے اختلاف رائے تھا اور بعض مسئلوں میں اب تک ہے۔

منجملہ اور بہت سے رزولوشنوں کے جو کانفرنس میں پاس ہوئے ایک یہ بھی تھا کہ ہندو اور مسلمان سودیشی چیزوں کے استعمال کا عہد کر لیں اور اس بنا پر بدیشی چیزوں کا مقاطعہ کریں۔ کھدر کی ابھی تک اتنی قدر نہ تھی جتنا ہونا چاہیے تھی۔ یہ رزولوشن حسرت صاحب کے مذاق کا نہ تھا۔ وہ چاہتے تھے کہ اگر خلافت کے معاملے میں سلطنت برطانیہ انصاف نہ کرے تو اس سے اس کا بدلہ لیا جائے۔ اس لئے انہوں نے اس کے مقابلہ میں یہ تجویز پیش کی کہ جہاں تک ممکن ہو صرف برطانوی چیزوں کا مقاطعہ کیا جائے۔ میں نے اصولی اور عملی نقطہ نظر سے اس تجویز کی مخالفت کی اور انہیں دسیلوں سے کام لیا

جن سے اب لوگ اچھی طرح واقف ہو گئے ہیں میں نے کانفرنس کے سامنے اپنا عدم تشدد کا اصول بھی پیش کیا۔ میں نے دیکھا کہ حاضرین پر میری دلیلوں کا بہت اثر ہوا۔ مجھ سے پہلے حسرت صاحب کی تقریر پر اس قدر نعرہ ہائے تحسین بلند ہوئے تھے کہ مجھے خوف تھا کہ میری بات کوئی نہیں سنے گا۔ میں نے محض اس خیال سے زبان کھولنے کی جرأت کی کہ اگر میں اپنے خیالات کانفرنس کے سامنے پیش نہ کروں تو یہ ادائے فرض میں کوتاہی ہوگی لیکن مجھے یہ دیکھ کر تعجب ہوا اور خوشی ہوئی کہ حاضرین نے میری تقریر بہت توجہ سے سنی اور جو لوگ پلیٹ فارم پر تھے انہوں نے یکے بعد دیگرے میری تائید میں تقریریں کیں۔ لیڈروں کی سمجھ میں یہ بات آگئی کہ برطانوی چیزوں کا مقاطعہ چلنے والا نہیں اس کی کوشش سے کچھ حاصل نہ ہو گا بلکہ مفت میں جگ ہنائی ہوگی۔ اس مجمع میں شاید ہی کوئی شخص ہو جس کے جسم پر برطانوی ساخت کی کوئی نہ کوئی چیز موجود نہ ہو اس لئے اکثر حاضرین کو یہ محسوس ہوا کہ ایسا رزوبیوشن پاس کرنے سے جس کی تعمیل خود دوٹ دینے والوں کے لئے ناممکن تھی سراسر نقصان ہوگا۔ مولانا حسرت موہانی نے اپنی تقریر میں کہا ”محض بدیشی کپڑے کا مقاطعہ ہمارے لئے کافی نہیں۔ خدا جانے کب وہ دن آئے کہ سودیشی کپڑا کافی مقدار میں تیار ہو سکے اور بدیشی کپڑے کا مقاطعہ پوری طرح کامیاب ہو۔ ہمیں تو کسی ایسی چیز کی ضرورت ہے جس کا برطانیہ والوں پر فوراً اثر پڑے آپ شوق سے بدیشی کپڑے کا مقاطعہ کیجئے ہمیں اس میں کوئی عذر نہیں مگر اس کے علاوہ کوئی ایسی تجویز بھی ہونا چاہیے جس پر فوراً عمل ہو سکے۔“

جس وقت وہ یہ الفاظ کہہ رہے تھے میں اپنے دل میں سوچ رہا تھا کہ واقعی ہمیں بدیشی کپڑے کے مقاطعے کے علاوہ کسی اور چیز کی کبھی ضرورت ہے۔ میرا بھی یہی خیال تھا کہ بدیشی کپڑے کا فوری مقاطعہ ناممکن ہے اس وقت تک مجھے یہ نہیں معلوم تھا کہ اگر ہم چاہیں تو اپنی ضروریات کے لئے کافی کھدر تیار کر سکتے ہیں۔ یہ حقیقت مجھ پر آگے چل کر کھلی مگر اتنا میں جانتا تھا کہ اگر ہم بدیشی کپڑے کے مقاطعے میں ملوں کے پابند رہیں تو دھوکا کھائیں گے۔ میں اسی الجھن میں تھا کہ مولانا کی تقریر ختم ہو گئی۔ میرے لئے یہ بڑی مشکل تھی کہ اپنا مطلب ہندی یا اردو کے مناسب الفاظ میں ادا نہیں کر سکتا تھا۔ مجھے ایسے مجمعے میں، جو زیادہ تر شمالی ہندوستان کے مسلمانوں پر مشتمل تھا، مدلل تقریر کرنے کا یہ پہلا اتفاق تھا۔ میں نے کلکتے کی مسلم لیگ میں اردو میں تقریر کی تھی۔ مگر وہاں تو صرف چند الفاظ میں اپنے محبت اور خلوص کا اظہار کر دیا تھا۔ یہاں صورت دوسری تھی یہاں مجھے ایسے مجمع کو اپنا زاد یہ نظر سمجھانا اور اپنا ہم خیال بنانا تھا جس سے مخالفت نہیں تو تنقید کا اندیشہ ضرور تھا مگر میں نے دل میں سوچا کہ جینے سے کام نہیں چلے گا۔ میں یہاں اس لئے نہیں آیا ہوں کہ دہلی کے مسلمانوں کی فصیح اور سستہ اردو

میں تقریر کروں بلکہ اس لئے کہ ٹوٹی پھوٹی ہندی میں اپنے خیالات ظاہر کر دوں۔ چنانچہ میں نے یہی کوشش کی اور اس میں مجھے کامیابی ہوئی۔ مجھ پر یہ ثابت ہو گیا کہ ہندی اردو ہندوستان کی عام زبان بن سکتی ہے۔ اگر میں انگریزی میں تقریر کرتا تو حاضرین پر اتنا اثر کبھی نہ ہوتا اور مولانا کو چیلنج دینے کی ضرورت نہ پڑتی۔ یا وہ چیلنج دیتے تو میں اس کا موثر جواب نہ دے سکتا۔

میرے ذہن میں جو خیال تھا اسے ظاہر کرنے کے لئے مجھے کوئی مناسب ہندی یا اردو لفظ نہیں ملتا تھا۔ اسے میں ذرا گھبرا یا مگر آخر میں نے اسے انگریزی لفظ ”نان کو آپریشن“ (1) کے ذریعے سے ادا کر دیا۔ یہ لفظ میں نے پہلی بار اس جلسے میں استعمال کیا۔ مولانا کی تقریر کے دوران میں مجھے یہ خیال آیا کہ جس حکومت کے ساتھ یہ بہت سی باتوں میں اتحاد عمل کر رہے ہیں اس کا مقابلہ کرنے کی ان کے لئے ایک ہی صورت ہے یعنی ہتھیاروں سے کام لینا اور وہ نامناسب یا ناقابل عمل ہے۔ پھر مقابلے کا خیال ہی فضول ہے۔ مقابلہ اگر ہو سکتا ہے تو اسی طرح کہ حکومت سے اتحاد عمل ترک کر دیا جائے۔ اسی سلسلے میں مجھے ”نان کو آپریشن“ کا لفظ سوچا۔ اس وقت اس تجویز کے کل پہلو میرے پیش نظر نہ تھے اس لئے میں نے اس کے بیان کرنے میں زیادہ تفصیل سے کام نہیں لیا۔ میں نے اس کے متعلق صرف یہ الفاظ کہے۔

”آپ حضرات نے ایک نہایت اہم ریزولوشن پاس کیا ہے کہ اگر خدا نخواستہ صلح کے شرائط آپ کے خلاف ہوئے تو آپ حکومت سے اتحاد عمل ترک کر دیں گے میرے نزدیک یہ ہر قوم کا خدا داد حق ہے کہ وہ ایسی صورت میں حکومت کے ساتھ اتحاد عمل کرنے سے انکار کر دے۔ اگر حکومت ہمارے ساتھ خلافت کے مہتمم بالشان مسئلے میں عہد شکنی کرے تو ہمارے لئے ”نان کو آپریشن“ کے کوئی چارہ نہیں اور ہمارا یہ ”نان کو آپریشن“ بالکل جائز ہو گا۔“

لیکن ابھی وہ وقت نہیں آیا تھا کہ ”نان کو آپریشن“ کا لفظ سارے ملک میں رائج ہو جائے۔ اس میں کئی مہینے کی دیر تھی۔ اس وقت تو یہ کانفرنس رزولوشنوں کے اخبار میں دب کر رہ گیا۔ بلکہ ایک مہینے کے بعد خود میں نے امرتسر کانگریس میں ”کو آپریشن“ کے رزولوشن کی تائید کی۔ میں سمجھتا تھا کہ حکومت ہمیں دھوکا نہیں دے گی۔

حوالہ

1 - ترک موالات

امر تسر کانگریس

حکومت پنجاب ان سیکڑوں پنجابیوں کو جنہیں ماشل لا کے زمانے میں برائے نام عدالتوں بے بنیاد شہادتوں پر جیل میں بھر دیا تھا کب تک اس قید فرنگ میں رکھ سکتی تھی۔ ان کے اس صحیحی ظلم پر وہ شور احتجاج بلند ہوا کہ اسے مجبور ہو کر ان لوگوں کو رہا کرنا پڑا بہت سے لوگ کانگریس کے اجلاس سے پہلے اور لالہ ہرکشن لال اور دوسرے لیڈر دوران اجلاس میں رہا کر دیئے گئے۔ علی برادران جیل سے رہا ہوتے ہیں سیدھے۔ یہیں آئے۔ لوگ تھے کہ خوشی سے پھولے نہ سماتے تھے۔ پنڈت موتی لال نہرو جنہوں نے اپنی اعلیٰ درجے کی وکالت قربان کر کے پنجاب میں ڈیرہ ڈالا تھا کانگریس کے صدر تھے اور سوامی شردهاندھی آنجانی مجلس استقبالیہ کے صدر۔

میں نے ایک کانگریس میں صرف اتنا حصہ لیا تھا کہ سمندر پار کے ہندوستانیوں کے مطالبات پر بندی میں ایک تقریر کر کے بندی کی عملی حمایت کا ثبوت دیا تھا اس کے بعد میں سمجھتا تھا کہ اس سال مجھ سے کوئی اور کام نہیں لیا جائے گا۔ لیکن جیسا کہ پہلے اکثر ہو چکا تھا دفعتاً مجھ پر بہت بڑی ذمہ داری کا بوجھ پڑ گیا۔

اسی وقت شاہی اعلان نئی اصلاحات کے متعلق شائع ہوا تھا۔ ان اصلاحات سے میں خود پوری طرح مطمئن نہ تھا اور دوسرے تو انہیں بالکل قابل قبول نہیں سمجھتے تھے مگر ان دنوں میرا یہ خیال تھا کہ گویہ اصلاحات ناقص ہیں پھر بھی ہمیں منظور کر لینا چاہیے مجھے شاہی اعلان کی زبان میں لارڈ سنہا کا قلم کار فرما نظر آتا تھا جس نے مایوسی کی تاریکی میں ایک امید کا تو پر تو پیدا کر دیا تھا۔ مگر لوکمانیہ اور دیشندھو پترنجن داس جس پختہ کاراے فریب نظر سمجھتے تھے مالوی جی غیر جانبدار تھے۔

پنڈت مالوی جی نے مجھے اپنے کمرے میں ٹھہرایا تھا۔ مجھے ہندو یونیورسٹی کے تالیس (1) کے

جلے میں ان کے طرز زندگی کی سادگی کا کچھ تھوڑا سا اندازہ ہوا تھا لیکن اس بار ان کے ساتھ رہ کر ان کے روزمرہ مشاغل کو اچھی طرح دیکھنے کا موقع ملا جس سے میں بے حد متاثر ہوا ان کے کمرے پر غریبوں کی سرائے کا دھوکا ہوتا تھا لوگوں کے جوم کا یہ حال تھا کہ ایک سرے سے دوسرے سرے تک گزرنا دشوار تھا ہر شخص کو اجازت تھی کہ وقت نا وقت جب چاہے پہنچ جائے اور جب تک چاہے ان سے باتیں کرے۔ اس جھونپڑے کے ایک کونے میں میری چار پائی اس منظر کی شان کو دو بلا کر رہی تھی۔

غرض مالوی جی کے ساتھ رہنے کی وجہ سے مجھے ان سے روزمرہ گفتگو کرنے کا موقع ملتا تھا اور وہ برادرانہ شفقت سے مجھے مختلف پارٹیوں کا زاویہ نظر سمجھایا کرتے تھے مجھے یہ محسوس ہوا کہ ریفرمس (اصلاحات) کے رزولوشن کی بحث میں میرا اثر یک ہونا لازمی ہے کانگریس کی طرف سے پنجاب کے مظالم کے متعلق جو رپورٹ لکھی گئی تھی اس کی ذمہ داری ایک حد تک مجھ پر بھی تھی۔ اس لئے مجھے یہ فکر تھی کہ اس معاملے کو انجام تک پہنچاؤں۔ پھر خلافت کا مسئلہ بھی پیش نظر تھا۔ میں سمجھتا تھا کہ مسٹر مانٹیگو ہندوستان سے بیوفائی نہیں کریں گے اور اس کے حقوق کو پامال نہیں ہونے دیں گے۔ علی برادران اور دوسرے لیڈروں کی رہائی میرے نزدیک بہت اچھی علامت تھی۔ ان سب باتوں کو مد نظر رکھ کر میری یہ رائے تھی کانگریس کے لئے اصلاحات کا رد کرنا مناسب نہیں بلکہ اسے ان کی منظوری کا رزولوشن پاس کرنا چاہئے۔ مگر ویشندھو چتر بجن داس اس پر اڑے ہوئے تھے کہ اصلاحات کو بالکل ناکافی اور ناقص قرار دے کر رد کر دینا چاہئے۔ لوکمانیہ تلک آنجہانی نے اس معاملے میں کوئی قطعی رائے قائم نہیں کی تھی مگر یہ کہہ دیا تھا کہ جس رزولوشن کو ویشندھو پسند کریں گے اس کی میں تائید کروں گا۔ میرے لئے ان آزمودہ سرد گرم چشیدہ محترم لیڈروں سے اختلاف رائے کرنا بہت تکلیف دہ تھا۔ لیکن میرا ضمیر مجھے اس پر مجبور کر رہا تھا میں نے چاہا کہ کانگریس سے بھاگ جاؤں۔ میں نے پنڈت مالوی جی اور موتی لال جی سے کہا کہ قومی مفاد کے لحاظ سے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ میں کانگریس کے بقیہ اجلاسوں سے غیر حاضر رہوں تاکہ مجھے ایسے محترم لیڈروں سے اختلاف کا اظہار نہ کرنا پڑے۔

مگر ان دونوں بزرگوں نے میری تجویز کو پسند نہیں کیا۔ کہیں لالہ ہرکشن لال کو میرے اس ارادے کی خبر ہو گئی۔ انہوں نے کہا کہیں ایسا غضب بھی نہ کرنا۔ اس سے پنجابیوں کے جذبات کو بہت سخت سدھ پہنچے گا۔ میں نے لوکمانیہ ویشندھو اور مسٹر جناح سے گفتگو کی مگر اس مشکل کے حل کرنے کی کوئی صورت نہیں نکلی۔ آخر میں نے مالوی جی سے اپنی پریشانی بیان کی۔ میں نے ان سے کہا "مصلحت کا کوئی موقع نظر نہیں آتا۔ اگر میں نے رزولوشن پیش کیا تو ووٹ لینا پڑیں گے اور اس کا یہاں

کوئی معقول انتقام نہیں ہے۔ کانگریس کے عام جلسے میں اب تک یہ دستور رہا ہے کہ رائے لینے کے لئے ہاتھ اٹھوائے جاتے ہیں اور اس میں نمائندوں اور تماشائیوں کی کوئی تفریق نہیں رہتی۔ اب رہا تحریری ووٹ لینا اس کی اتنے بڑے مجھے میں کوئی صورت نظر نہیں آتی۔ مگر لالہ ہرکشن لال نے اس مشکل میں میری دستگیری کی۔ انہوں نے کہا ”جس دن اس رزولوشن پر رائے لی جائے گی ہم تماشائیوں کو کانگریس کے پنڈال میں داخل نہیں ہونے دیں گے۔ اب رہا ووٹ جمع کرنا اسے میں دیکھ لوں گا مگر آپ کو کانگریس سے غیر حاضر ہرگز نہیں ہونا چاہئے۔“

میں نے سر تسلیم خم کر دیا۔ جب میں رزولوشن کا مشودہ تیار کر کے پیش کرنے کے لئے چلا تو میرا دل دھڑک رہا تھا۔ مالوی جی اور مسز جناح میرے موید تھے میں نے یہ دیکھا کہ ہر چند ہمارے باہمی اختلافات میں کسی قسم کی تلخی نہیں تھی اور ہماری تقدیریں محض نفس امر سے متعلق تھیں مگر لوگوں کو ہمارا یہ اختلاف ہی ناگوار تھا ان کے چہروں سے دل سدھ کا اظہار ہوتا تھا وہ اتفاق رائے کے آرزو مند تھے۔

ادھر تقریریں ہو رہی تھیں اور ادھر اس اختلافات کو دور کرنے کی کوشش جاری تھی لیڈرا ایک دوسرے کو رقعے بچ رہے تھے۔ مالوی جی انتہائی سرگرمی سے مصالحت کی سعی میں مصروف تھے۔ اتنے میں جبرام دوس نے مجھے اپنی ترمیم دکھائی اور اپنی مخصوص دلکش انداز میں کہا کہ نمائندے عجب کشمکش میں پڑ گئے ہیں جیسے بنے انہیں اس مشکل سے بچائے اور رائی شماری کی نوبت نہ آنے دیجئے میں نے ان کی ترمیم پڑھی اور وہ مجھے پسند آئی۔ مالوی جی پہلے ہی چاروں طرف نظر دوڑ رہے تھے کہ شاید کہیں امید کی جھلک دکھائی دے میں نے ان سے کہا کہ جبرام داس کی ترمیم دونوں پارٹیوں کے لئے قابل قبول ہے اس کے بعد یہ ترمیمی لوکمانیہ کو دکھائی گئی تو انہوں نے کہا اگر داس منظور کر لیں تو مجھے کوئی عذر نہیں بڑی قلیل و قال کے بعد ویشبند ہو کچھ اور انہوں نے پن چندر پال جی کی طرف دیکھا۔

مالوی جی کا دل امید سے معمور ہو گیا۔ ابھی ویشبند ہونے پوری طرح رضامندی بھی ظاہر نہیں کی تھی کہ انہوں نے ترمیم کا مسودہ چھین لیا اور چلا اٹھے ”بھائیو، آپ یہ سن کر خوش ہوں گے کہ مصالحت ہوگی۔“ اس کے بعد جو منظر دیکھنے میں آیا وہ بیان نہیں ہو سکتا۔ سارا پنڈال تالیوں کے شور سے گونج اٹھا اور افسردہ چہرے خوشی سے دکنے لگے۔

یہاں ترمیم کا مضمون بیان کرنے کی ضرورت نہیں مجھے تو صرف یہ دکھانا تھا کہ میں نے ان تجربوں کے سلسلے میں جن کا اس کتاب میں ذکر ہے۔ یہ رزولوشن کس طرح پیش کیا۔

اس مصالحت سے میری ذمہ داری اور بڑھ گئی۔

حوالہ

Foundation - 1

کانگریس کے اندرونی حلقے میں

امر تسر کی کانگریس میں میں نے جو حصہ لیا اسے میں اپنا باقاعدہ داخلہ کانگریس کی سیاست میں نہیں سمجھتا۔ اس سے پہلے کی کانگریسوں میں تو میں محض عہد و فاداری کی تجدید کے لئے شریک ہوا کرتا تھا۔ میں اپنے آپ کو ایک معمولی سپاہی سمجھتا تھا اور اسی پر قانع تھا۔

امر کے تجربے سے یہ معلوم ہوا کہ مجھے بعض ایسے کاموں سے مناسبت ہے جو کانگریس کے لئے مفید ثابت ہو سکتے ہیں۔ میں نے دیکھا کہ لوکمانیہ ویشنندھو پنڈت موتی لال جی اور دوسرے لیڈروں کو میری خدمات جو میں نے مقام پنجاب کی تحقیقات کے سلسلے میں انجام دی تھیں پسند آئیں وہ مجھے اپنی خاص صحبتوں میں بلانے لگے جہاں سبکٹ کمیٹی کے پیچیدہ مسئلے حل ہوا کرتے تھے۔ ان جلسوں میں صرف وہی لوگ بلائے جاتے تھے جن پر لیڈروں کو خاص طور سے اعتماد ہو اور جن سے انہیں کام لینا ہو۔ مگر کبھی کبھی ناخواندہ مہمان بھی آہنچتے تھے۔

آئینہ سال کانگریس کے پیش نظر دو چیزیں ایسی تھیں جن سے مجھے مناسبت اور دلچسپی تھی۔ ان میں سے ایک جلیانوالہ باغ کے قتل عام کی یادگار تھی۔ کانگریس نے بڑے جوش و خروش سے یہ رزولوشن پاس کیا تھا کہ شہیدوں کی یادگار قائم کی جائے اس کے لئے پانچ لاکھ روپیہ جمع کرنا تھا۔ ٹرسٹیوں کی کمیٹی میں میرا نام بھی تھا۔ مالوی جی این دنوں قومی فقیروں کے بادشاہ کہلاتے تھے مگر میں جانتا تھا کہ میں بھی بمسک مانگنے میں ان سے کم نہیں۔ جنوبی افریقہ میں مجھے اپنے اس کمال کا اندازہ ہو چکا تھا۔ مالوی جی کا جادو ریسوں پر خوب چلتا تھا۔ والیان ملک سے شاہانہ عطیے وصول کرنے میں ان کا مقابلہ نہیں کر سکتا تھا۔ مر جلیانوالہ باغ کی یادگار کے لئے ریسوں سے چندہ مانگنے کا کوئی موقع نہ تھا۔ اس لئے جیسا کہ میں سمجھتا تھا، اس چندے کی ذمہ داری زیادہ تر مجھ پر عائد کی گئی۔ بمسبئی کے فیاض باشندوں نے

میری جھولی بھردی اور یادگار کے لئے معقول سرمایہ اکٹھا ہو گیا جو اب تک بینک میں جمع ہے۔ مگر آج ملک کے سامنے یہ مسئلہ درپیش ہے کہ جس زمین پر ہندو مسلمان اور سکھ شہیدوں کے پاک خون کی آمیزش ہوئی تھی وہاں کس شکل میں یادگار تعمیر کی جائے ان تینوں مذہبوں کے پیروں کی محبت اور اخلاص کے رشتوں کو توڑ کر باہمی جنگ میں مصروف ہیں اور قوم حیران ہے کہ یادگار کے سرمایہ کو کس کام میں صرف کرے۔

چندہ جمع کرنے کے علاوہ مجھ میں مسودے تیار کرنے کی صلاحیت تھی اور یہ بھی کانگریس کے کام آسکتی تھی۔ کانگریس کے لیڈروں نے دیکھا کہ مجھے مختصر اور جامع عبارت لکھنے کا ملکہ ہے یہ بات میں نے مدت کی مشق میں حاصل کی تھی۔ کانگریس کا موجودہ دستور اساسی گو کھلے کا بنایا ہوا تھا۔ انہوں نے چند قواعد قلمبند کر دیئے تھے جن کے مطابق کانگریس چل رہی تھی۔ ان قواعد کے مرتب کئے جانے کی دلچسپ داستان میں نے خود گو کھلے کی زبانی سنی تھی۔ مگر کانگریس کا کام روز بروز بڑھتا جاتا تھا اور ہر شخص محسوس کر رہا تھا کہ موجودہ قواعد اس کی رہنمائی کے لئے ناکافی ہیں۔ یہ مسئلہ کئی سال سے کانگریس میں پیش ہو رہا تھا۔ ان دنوں کانگریس کے پاس کوئی مستقل عملہ نہیں تھا جو سالانہ اجلاس کے بعد بھی کام کرتا رہے اور نئے سال کے دوران میں جو اتفاقی معاملے پیش آجائیں ان سے عہدہ برآ ہو سکے۔ موجودہ قواعد کی رو سے چمن سیکرٹری منتخب ہوتے تھے مگر اصل میں صرف ایک شخص کام کرتا تھا اور وہ بھی اپنا پورا وقت نہیں دیتا تھا۔ سچ پوچھئے تو اتنا کام ایک شخص کے بس کا تھا بھی نہیں کہ کانگریس کے دفتر کو چلائے، اگلے اجلاس کی فکر کرے اور پچھلے اجلاس کے رزولوشنوں کی تعمیل کرے۔ ہر شخص جانتا تھا کہ اس سال یہ مسئلہ اور بھی اہم ہو گیا ہے۔ کانگریس کے عام اجلاس میں وہ چپقلش ہوتی تھی کہ قومی معاملات پر بحث کرنا ناممکن تھا۔ نمائندوں کو کوئی تعداد مقرر نہ تھی۔ ہر صوبہ جتنے نمائندے چاہتا بھیج دیتا۔ اس بے ترتیبی کو رفع کرنے کی ضرورت عام طور پر محسوس کی جا رہی تھی۔ میں نے دیکھا کہ ملک میں سب سے زیادہ اثر لوگمانیہ اور ویشبندھو کا ہے اس لئے میں نے درخواست کی کہ یہ حضرات رائے عامہ کے نمائندوں کی حیثیت سے میرے ساتھ اس کمیٹی میں کام کریں جو دستور اساسی کو ترتیب دینے کے لئے مقرر کی جا رہی ہے۔ مگر معلوم ہوا کہ ان حضرات کو خود اس کام میں شریک ہونے کی فرصت نہیں اس لئے میں نے یہ تجویز پیش کی کہ کمیٹی تین ممبروں پر مشتمل ہو جن میں سے دو ان دونوں صاحبوں کے معتمد ہوں اور ایک میں خود۔ اس تجویز کو لوگمانیہ اور ویشبندھو نے پسند کیا اور ان کی رائے سے لے کیلکر جی اور آئی۔ بی۔ سین بابوان کے نمائندے مقرر کر دیئے گئے۔

اس کمیٹی کا جلسہ ایک بھی نہ ہو سکا۔ مگر ہم تینوں میں خط و کتابت کے ذریعے سے مشورہ ہوتا رہا اور آپس میں ہم نے متفقہ رپورٹ پیش کر دی مجھے ایک حد تک اس دستور اساسی کے بنانے پر ناز ہے۔ میرا دعویٰ ہے کہ اگر اس پر پوری طرح عمل ہو تو یہی ہمیں سوراخ دلانے کے لئے کافی ہے۔ جب سے میں نے یہ ذمہ داری اپنے سر لی اس وقت سے میں واقعی کانگریس کی سیاست میں شریک ہو گیا۔

کھدر کی تحریک کا حتم

1900ء میں جب میں نے "ہند سراج" میں کھدر کو ہندوستان کے روز افزوں افلاس کا علاج قرار دیا، اس وقت تک مجھے کبھی چرخیہ یا کرگھادیکھنے کا اتفاق نہیں ہوا تھا اس کتاب میں نے یہ بات ایک بدیسی اصول کے طور پر پیش کی کہ جو ہندوستانیوں کو افلاس کی چکی میں پیسنے سے بچائے اس سے گویا سراج قائم کر دیا۔ ہندوستان کا افلاس دور ہوتے ہی سراج خود بخود مل جائے گا۔ 1912ء میں جنوبی افریقہ سے واپسی تک مجھے چرخیہ دیکھنا نصیب نہیں ہوا تھا جب ساہرستی میں ستیاگرہ آشرم قائم ہوا تو چند کرگھے بھی منگائے گئے مگر مشکل یہ تھی کہ سب وکیل مختار یا کاروباری لوگ تھے ہم میں سے کوئی دستکار نہ تھا۔ ایک کاریگر کی ضرورت تھی جو ہمیں بتا سکھائے۔ اس کے بغیر کرگھے بیکار تھے خدا خدا کر کے پالن پور سے ایک شخص لایا گیا۔ مگر اس نے بھی ہمیں اپنا ہنر پوری طرح نہیں بتایا۔ تاہم لگن لال گاندھی سے بچ کر جہاں جاسکتا تھا۔ انہیں دستکاری سے فطری مناسبت تھی اور انہوں نے تموزے ہی دن میں اس فن پر عبور حاصل کر لیا۔ آشرم میں یکے بعد دیگرے کئی آدمیوں نے بنائی کا کام سیکھ لیا۔

ہمارا مقصود یہ تھا کہ ہم سب اپنے ہاتھوں سے تیار کئے ہوئے کپڑے پہنیں اس لئے ہم نے مل کے بنے ہوئے کپڑے پہنتا چھوڑ دیا اور یہ عہد کر لیا کہ صرف ہاتھ کے بنے ہوئے کپڑے پہنیں گے اور وہ بھی ہندوستان کے کتے ہوئے سوت کے۔ اس تجویز پر عمل کرنے سے ہمیں بہت سے نئے تجربے حاصل ہوئے۔ ہمیں جلاہوں سے ملنے جلنے کا اتفاق ہوا اور یہ معلوم کرنے کا موقع ملا کہ ان کی زندگی کیونکر بسر ہوتی ہے، کارکردگی کتنی ہے، انہیں سوت ملنے میں کیا کیا دشواریاں ہوتی ہیں، ان کے

ساتھ کیسی کیسی دغا بازیاں کی جاتی ہیں اور وہ کس طرح روز بروز قرض کے جال میں پھنستے جاتے ہیں۔ ہم فی الحال خود اتنا کپڑا بن سکتے تھے جتنا ہمیں درکار تھا اس لئے سوائے اس کے کوئی صورت نہ تھی کہ جلاہوں سے کپڑا خریدیں مگر ہندوستانی ملوں سے تیار کیا ہوا کپڑا بڑی مشکل سے دستیاب ہوتا تھا۔ یہ جلاہے جتنا بار ایک کپڑا بنتے تھے سب باہر کے سوت سے کیونکہ ہندوستانی مل بار ایک سوت تیار نہیں کر سکتے تھے۔ آج بھی ہندوستان کے ملوں میں اوسط درجے کا بار ایک سوت بہت کم کاتا جاتا ہے اور زیادہ بار ایک سوت کاتنا تو ان کے لئے ممکن ہی نہیں بڑی مشکلوں سے چند جلاہے اس پر راضی ہوئے کہ ہمارے لئے سودیشی سوت کا کپڑا بنیں اور وہ بھی اس شرط پر کہ وہ جتنا کپڑا تیار کریں آشرم سب خریدیں۔ غرض ہم لوگوں نے خود بھی مل کے سوت کا کپڑا بہت شروع کیا اور اپنے دوستوں میں بھی اس کا پرچار کیا۔ اس طرح ہم کتائی کا کام کرنے والے ہندوستانی ملوں کے رضا کار ایجنٹ بن گئے اس ذریعے سے ہمیں ملوں کے انتظامات اور ان کی دقتوں سے بھی واقفیت ہو گئی۔ ہم نے دیکھا کہ ان ملوں کا مقصد یہ ہے کہ جتنا سوت کاتیں اسے خود ہی بنا بھی کریں وہ اپنی خوشی سے جلاہوں سے اتحاد عمل نہیں کرتے ہیں بلکہ مجبوری ہے اور یہ تعلق محض عارضی ہے ہمیں یہ فکر پیدا ہوئی کہ ہم اپنے لئے خود سوت کاتا کریں کیونکہ بغیر اس کے ہم ملوں کے محتاج رہیں گے ہمیں یہ محسوس ہوا کہ ہم ملوں کے ایجنٹ کی حیثیت سے ملک کی کوئی خدمت نہیں کر سکتے۔

اب ہمیں پہلے سے بھی زیادہ مشکلوں کا سامنا ہونا کہیں چرخہ دستیاب ہوتا تھا اور نہ کوئی کاتتے والا ملتا تھا جو ہمیں کاتنا سکھائے۔ آشرم میں چند چرنے تھے جن سے نیم لکڑیوں پر سوت چڑھاتے تھے مگر ہمیں یہ خبر نہ تھی کہ ان سے سوت بھی کاتا جاسکتا ہے۔ ایک بار کلیدس جوہری کو ایک عورت ملی جو بقول ان کے کاتنا سکھانے کے لئے تیار تھی آشرم کا ایک طالب علم جسے نئی چیزیں سیکھنے سے خاص مناسبت تھی اس عورت کے پاس بھیجا گیا مگر وہ بھی اس راز کو معلوم کئے بغیر لوٹ آیا۔

غرض اسی طرح وقت گرتا رہا اور ہماری بے صبری بڑھتی گئی۔ آشرم کے آنے جانے والوں میں سے جس شخص کی نسبت یہ خیال ہوتا تھا کہ شاید یہ کتائی سے واقف ہو اس سے میں اس فن کے متعلق سیکڑوں سوال کر ڈالتا تھا۔ لیکن معلوم یہ ہوا کہ یہ فن عورتوں تک محدود ہے اور ان میں بھی قریب قریب معدوم ہو چکا ہے جو اکاد کا کاتتے والیاں رہ گئی ہیں ان کا پتہ کسی عورت ہی سے چلے گا۔

1917 میں میرے گجراتی دوستوں نے مجھے بڑوچ کا تعلیمی کانفرنس کی صدارت کے لئے مدعو

کیا۔ وہاں گنگا بن موزدار سے ملاقات ہوئی ان خاتون کی ذات عجیب و غریب صفات کا مجموعہ تھی۔ یہ

ایک بیوہ عورت تھیں مگر ان کا حوصلہ دیکھ کر مردوں کو رشک آتا تھا وہ کچھ زیادہ پڑھی لکھی نہ تھیں مگر ہمت و جرات اور سمجھ بوجھ میں عام تعلیم یافتہ عورتیں ان کا مقابلہ نہیں کر سکتی تھیں۔ انہوں نے چھوت چھات کا تعصب دل سے نکال دیا تھا اور بے تکلف اچھوتوں سے ملتی جلتی اور ان کی خدمت کرتی تھیں۔ وہ اپنے گھر سے خوش تھیں مگر ان کی ضروریات بہت محدود تھیں۔ ان کا جسم خاصہ مضبوط تھا اور جہاں چاہتی تھیں اکیلی چلی جاتی تھیں انہیں گھوڑے کی سواری کی خاصی مشق تھی مجھے ان سے گودھرا کی کانفرنس میں زیادہ تفصیل سے بات چیت کرنے کا موقع ملا۔ میں نے انہیں بھی اپنا چرنے کا دکھرا کہہ سنایا انہوں نے وعدہ کیا کہ چرنے کی تلاش میں دل و جان سے کوشش کروں گی۔ اس سے میرے دل کا بوجھ بہت ہلکا ہو گیا۔

مل گیا

گنگابین نے چرنے کی تلاش میں تمام گجرات چھان مارا اور آخر اسے دیہجاپور (ریاست بڑودہ) میں ڈھونڈ نکالا وہاں اکثر لوگوں کے گھروں میں چرنے تھے مگر مدت ہوئی انہوں نے بے کار سمجھ کر کباڑ کو ٹھہری میں ڈال دیئے تھے۔ انہوں نے کہا اگر ہمیں پونیاں ملتی رہیں اور کوئی سوت خرید لیا کرے تو ہم پھر چرغا کا سنا شروع کر دیں۔ گنگابین نے یہ خوشخبری مجھے سنائی۔ پونیوں کا انتظام کرنا ہمارے لئے دشوار تھا۔ عمر سوبانی مرحوم سے اس کا ذکر آیا تو انہوں نے فوراً وعدہ کر لیا کہ جتنی پونیوں کی ضرورت ہوگی اپنے مل سے بھیج دیا کریں گے یہ مشکل بھی آسان ہو گئی عمر سوبانی کے یہاں سے جو پونیاں آتی تھیں وہ گنگابین کو بھیج دیا کرتا تھا۔ تھوڑے دنوں میں اتنا سوت آنے لگا کہ ہمیں بتنا مشکل ہو گیا۔

سینٹ عمر سوبانی دریا دل آدمی تھے مگر آخر ہم کب تک ان کی فیاضی سے فائدہ اٹھاتے مجھے یہ اچھا نہیں معلوم ہوتا تھا کہ ہم ان سے پونیاں لیتے چلے جائیں۔ اس کے علاوہ میرے نزدیک مل کی پونیاں استعمال کرنا اصولاً ناجائز تھا کیونکہ مل کی پونیوں سے کام لینا ایسا ہی تھا جیسا مل کا کتا ہوا سوت استعمال کرنا۔ میں نے سوچا کہ آخر پرانے زمانے میں لوگ چرغا کاتتے تھے تو پونیاں کہاں سے آتی تھیں؟ کیا وہ بھی ملوں سے لیا کرتے تھے؟

ان خیالات کی بنا پر میں نے گنگابین سے کہا کہ دھنیے تلاش کیجئے جو پونیاں بنا کر دیا کریں۔ انہوں نے کہا بہت اچھا یہ کونسی بڑی بات ہے۔ چنانچہ انہوں نے ایک دھنیا پینتیس روپے مہینے پر رکھ لیا اور کئی لڑکوں کو پونیاں بنانا سکھا دیا۔ میں نے بمبئی میں روٹی کی بھیک مانگی۔ یشونت پرشاد دیسائی نے میری جھولی بھر دی گنگابین کا کام امید سے بڑھ کر سرسبز ہوا۔ انہوں نے دیہجاپور کے کتے ہونے سوت کو بننے کے لئے جلا ہے بھی ڈھونڈ نکالے اور تھوڑے دن میں دیہجاپور کا کھدر مشہور ہو گیا۔

اس عرصے میں آشرم میں بھی چر خا چلنے لگا۔ مگن لال گاندھی نے پانی قوت انتزاع سے کام لے کر چر خے میں بہت کچھ اصلاح کی اور چر خے اور ان کے کل لوازمات آشرم میں تیار ہونے لگے۔ گھدر کا پہلا تھان آشرم میں تیار ہوا اس پر سترہ آنے فی گز لاگت آئی میں نے بے تامل اپنے دوستوں سے اصرار کیا کہ یہ موٹا بھدا کپڑا ان داموں میں خریدیں انہوں نے خوشی سے قبول کر لیا۔

میں بمبئی میں بستر علات پر پڑا ہوا تھا۔ مگر اتنی طاقت تھی کہ چر خے کو تلاش جاری رکھوں آخر مجھے دو کاتے دایاں مل گئیں۔ وہ مجھ سے اٹھائیں تو لے سوت کا ایک روپیہ لیتی تھیں میں ان دنوں گھدر کے کاروباری پہلو سے نادائق تھا ہاتھ کا کا تھا سوت میرے نزدیک کسی طرح مول مکانا تھا ان کی شرح کا مقابلہ دیہا پور کی شرح سے کیا تو معلوم ہوا کہ وہ مجھے ٹھگ رہی ہیں۔ میں نے انہیں بہت سمجھایا مگر وہ کسی طرح کمی پر راضی نہ ہوئیں۔ اس لئے مجبوراً انہیں رخصت کرنا پڑا۔ مگر ان سے جو کام لینا تھا وہ لیا جا چکا تھا۔ اوتھکا بانی، رامی بانی، کانداز شکر لال بینکر کی والدہ اور واسومتی بین نے ان سے چر خا کا تنا سیکھا لیا تھا میرے کمرے میں چر خا چلنے لگا اور میں بلا مبالغہ کہتا ہوں کہ اس کے جانفزا نغمے نے میری شفا یابی میں بہت مدد دی۔ میں مانتا ہوں کہ اس کا اثر جسمانی نہیں بلکہ نفسیاتی تھا۔ مگر اس سے تو یہی ثابت ہوتا ہے کہ انسان کی جسمانی حلت بڑی حد تک اس کی نفسی کیفیت کے تابع ہے۔ میں نے بھی چر خا کا تنا چاہا مگر اس وقت کچھ کامیابی نہ ہوئی۔

بمبئی میں پھر وہی پونیوں کی دلت پیش آئی۔ دیوا شکر جی کے مکان کے قریب سے ایک دھنیا روز اپنی دھنکی بجاتا گزرا کرتا تھا۔ میں نے اسے بلوایا تو معلوم ہوا کہ تو شکوں میں بھرنے کے لئے روئی دھنکتا ہے وہ پونیوں کے لئے روئی دھنکنے پر راضی ہو گیا مگر اس نے دام بہت مانگے اور مجھے دینا پڑے میں یہ کہتا ہوا سوت بعض دیشنو دوستوں کو دیدیا کرتا تھا کہ وہ پوترا کادشی کے تہوار کے لئے اس کے ہار بنوائیں شیوجی نے بمبئی میں کتائی کا ایک کلاس بھی کھول دی۔ ان سب تجربوں میں خرچ بہت ہو جاتا تھا مگر وطن پرست احباب گھدر پر عقیدہ رکھتے تھے خوشی سے یہ تمام مصارف برداشت کرتے تھے۔ میری ناقص رائے میں یہ روپیہ برباد نہیں ہوا۔ اس سے ہمیں بڑے قیمتی تجربے حاصل ہوئے اور یہ معلوم ہوا کہ چر خے کی کامیابی کے لئے کتنا وسیع میدان ہے۔

اب مجھے یہ جوش اٹھا کہ خالص گھدر کا لباس اختیار کروں۔ ابھی تک میں مل کے سوت کی بنی ہوئی دھوتی باندھتا تھا موٹا گھدر کا کپڑا جو آشرم میں یاد دیہا پور میں بنا جاتا تھا اس کا عرض صرف 30 انچ تھا۔ میں نے گنگا بین سے کہہ دیا کہ اگر آپ نے مجھے ایک مہینے کے اندر پینتالیس انچ کے عرض کی دھوتی

تیار کرنا کہ نہ دی تو میں اسی چھوٹے عرض کے کھدر کی دھوتی باندھنا شروع کر دوں گا۔ وہ اس ایشیمنٹ سے بہت گھبراہیں مگر انہوں نے وہ کام کر دکھایا جو میں چاہتا تھا۔ ایک مہینے سے پہلے ہی انہوں نے 45 انچ عرض کے کھدر کا دھوتیوں کا جوڑا بھیج دیا۔

اسی زمانے میں لکشمی داس جی، رام جی کولی اور ان کی بیوی گنگا بین کو لاٹھی گاؤں سے آشرم میں لائے۔ اب آشرم میں بھی دھوتی بنی جانے لگی۔ ان میاں بیوی کی بدولت کھدر کی ترقی میں بہت مدد ملی۔ انہوں نے گجرات میں اور دوسرے مقامات پر بہت سے لوگوں کو ہاتھ کے کتے ہوئے سوت کا کپڑا بننا سکھا دیا۔ گنگا بین کو کچھ پر کام کرتے دیکھ کر دل پر بڑا اثر ہوا ہے جب وہ بتنا شروع کرتی ہیں تو اس قدر محو ہو جاتی ہیں کہ کچھ بھی ہو جائے انہیں خبر نہیں ہوتی اور ان کی نظر اپنے پیارے کرگے سے نہیں ہنتی۔

ایک سبق آموز مکالمہ

ملوں کے مالک پہلے ہی دن سے کھدر کی تحریک سے جو اس زمانے میں سودیشی کی تحریک کہلاتی تھی اختلاف رکھتے تھے۔ عمر سوبانی مرحوم جو خود اپنے مل بڑی قابلیت سے چلاتے تھے مجھے اپنی معلومات اور تجربے سے مدد دیا کرتے تھے اور دوسرے مل والوں کے خیالات سے مطلع کرتے رہتے تھے۔ ان میں سے ایک صاحب کے اقدال کا مجھ پر بہت اثر ہوا انہوں نے مجھ سے ملنے پر اصرار کیا۔ میں راضی ہو گیا۔ عمر سوبانی صاحب نے ہم دونوں کی ملاقات کا انتظام کر دیا۔ میٹھ صاحب نے گفتگو ان الفاظ سے شروع کی ”آپ کو معلوم ہے کہ پہلے بھی سودیشی کی جدوجہد ہو چکی ہے؟“ میں نے کہا ”جی ہاں معلوم ہے۔“

آپ یہ بھی جانتے ہیں کہ تقسیم بنگال کے زمانے میں ہم مل والوں نے سودیشی کی تحریک سے فائدہ اٹھا کر لوگوں کو خوب لونا جب یہ تحریک شباب پر پہنچی تو ہم نے کپڑے کی قیمت بڑھادی اور اس سے بھی زیادہ شرمناک حرکتیں کیں۔

”ہاں میں یہ سن چکا ہوں اور اس سے مجھے بہت دکھ پہنچا۔“

”بے شک آپ کو رنج ہوا ہو گا لیکن میرے نزدیک اس میں رنج کی کوئی بات نہیں ہم اپنا کاروبار کچھ خلق خدا کی خدمت کے لئے تو نہیں چلاتے ہمیں نفع کمانا ہے اور اپنے حصہ داروں کو خوش کرنا ہے۔ چیزوں کی قیمت ان کی مانگ پر موقوف ہے طلب اور رسد (1) کے قانون پر عملدرآمد کون روک سکتا ہے؟ بنگالیوں کو پہلے ہی سمجھ لینا چاہئے تھا کہ ان سے ایجنٹیشن سے سودیشی کی مانگ بڑھے گی اور قیمتیں خود بخود چڑھ جائیں گی۔“

میں نے ان کی بات کاٹ کر کہا کہ بنگالی بھی میری طرح سادہ دل تھے۔ وہ خوش عقیدگی سے یہ

سمجھتے تھے کہ ملوں کے مالک اتنے خود غرض اور بے حمیت بھی کیا ہوں گے کہ اپنے ملک کو دولت پر دھوکا دیں اور بے ایمانی سے بدیشی کپڑے کو سودیشی کہہ کر بیچیں۔

انہوں نے جواب دیا ”میں آپ کی سادہ دلی سے واقف ہوں اسی لئے میں نے آپ کو یہاں آنے کی زحمت دی۔ میں آپ کو آگاہ کئے دیتا ہوں کہ کہیں وہی غلطی نہ کیجئے گا جو ان بھولے بھالے بنگالیوں نے کی تھی۔

یہ کہہ کر انہوں نے منشی کو اشارہ کیا اور اس نے ان کے مل کا بنا ہوا کپڑا لا کر مجھے دکھایا سٹھ صاحب نے کہا ”دیکھئے یہ نیا مال ہمارے یہاں تیار ہوا ہے۔ اس کی ہر طرف سے مانگ آرہی ہے۔ یہ ہم ادنیٰ درجے کی روٹی سے بناتے ہیں اس لئے بہت سستا ہوتا ہے۔ ہم اسے شمال میں ہمالیہ کی وادیوں تک بھیجتے ہیں۔ ہماری اجنسیاں سارے ملک میں پھیلی ہوئی ہیں ہمارے گمناشے ایسے ایسے مقامات پر موجود ہیں جہاں نہ آپ کی آواز پہنچ سکتی ہے اور نہ آپ کے کارکن۔ ہمیں اور اجنتوں کی ضرورت ہے۔ اس کے علاوہ آپ جانتے ہوں گے کہ ہندوستان میں جتنے کپڑے کی کھپت ہے اس سے بہت کم پیدا ہوتا ہے۔ اس لئے سودیشی کے مسئلے کا سبب سے اہم پہلو یہ ہے کہ کپڑے کی پیدائش (1) بڑھائی جائے۔ جب ہم کافی مقدار میں اچھا کپڑا بنانے لگیں گے تو باہر کا کپڑا آنا خود بخود بند ہو جائے گا۔ اس لئے میں آپ کو یہی مشورہ دیتا ہوں کہ آپ جدوجہد اب کر رہے ہیں اسے چھوڑ دیجئے اور نئے مل کھلوانے کی کوشش کیجئے۔ ملک کو اس کی ضرورت نہیں کہ جو مال موجود ہے اس کی مانگ بڑھے بلکہ اور مال کی ضرورت ہے۔“

میں نے کہا ”پھر تو آپ کو میری کوششوں کی قدر کرنی چاہئے۔ میں وہی کر رہا ہوں جو آپ چاہتے ہیں۔ انہوں نے کسی قدر تعجب سے پوچھا یہ کیسے؟ کیا آپ نئے مل کھلوانے کی فکر کر رہے ہیں؟ اگر ایسا ہے تو یقیناً آپ مبارک باد کے مستحق ہیں۔“

میں نے جواب دیا۔ یہ تو نہیں مگر میں چرنے کو دوبارہ رواج دینے کی کوشش کر رہا ہوں اب دنا اور بھی چکرائے اور کہنے لگے ”یہ کیا چیز ہے؟“

میں نے چرنے کی داستان انہیں سنائی اور کہا میں آپ کی رائے سے بالکل متفق ہوں اس سے کوئی فائدہ نہیں کہ میں ملوں کا رضا کار اجنت بن جاؤں بلکہ اس میں ملک کا نقصان ہے۔ ہمارے ملوں کے لئے عرصے تک گاہکوں کی کمی نہیں: دگی۔ میرا کام یہ: دنا چاہئے اور ہے کہ ہاتھ کاکتا ہاتھ کا بنا کپڑا تیار کر اڈں اور اس کی فروخت کا انتظام کر دوں۔ اس لئے میں اپنی پوری توجہ کھدر کی پیدائش پر صرف کر رہا

ہوں۔ میں سودیشی کی اس شکل پر اس لئے جان دیتا ہوں کہ اس کے ذریعے سے ہندوستان کی عورتوں کا بھلا ہو جنہیں کافی کام نہیں ملتا اور پیٹ بھر روٹی میسر نہیں آتی۔ میں یہ چاہتا ہوں کہ یہ عورتیں سوت کاتیں اور اس سے جو کھدر بنا جائے اسے ہندوستان کے لوگ پہنیں۔ مجھے نہیں معلوم کہ یہ تحریک کہاں تک کامیاب ہوگی۔ ابھی تو یہ محض ابتدائی حالت میں ہے مگر میرا عقیدہ ہے کہ میرا ایک دن ضرور پھلے پھولے گی۔ بہر صورت اس میں کسی نقصان کا اندیشہ تو ہو ہی نہیں سکتا۔ اس سے ملک کے کپڑے کی پیدائش میں خفیف سا اضافہ بھی ہو جائے تو کچھ نہ کچھ فائدہ ہی ہو گا۔ اب تو غالباً آپ یہ تسلیم کریں گے اس تحریک میں وہ کمزوریاں نہیں ہیں جن کا آپ نے ذکر کیا تھا۔

مہر نے جواب دیا ”اگر اس تحریک کے چلانے سے آپ کا مقصد یہ ہے کہ کپڑے کی پیدائش بڑھے تو مجھے اس پر کوئی اعتراض نہیں۔ رہا یہ کہ مشینوں کے زمانے میں چرخا چل سکتا ہے یا نہیں یہ دوسرا سوال ہے۔ بہر حال میری یہی تمنا ہے کہ آپ کی تحریک کامیاب ہو۔“

حوالہ جات

Demanand supply - 1

Production - 2

چڑھتا دریا

میں یہاں کھدر کی مزید نشوونما کا ذکر نہیں کر سکتا۔ اس کتاب میں مختلف تحریکوں کی پوری تاریخ کی گنجائش نہیں۔ خصوصاً کھدر کی داستان بیان کرنے کے لئے تو ایک جداگانہ کتاب کی ضرورت ہے۔ مجھے ان اوراق میں صرف یہ دکھانا ہے کہ تلاش حق کے سلسلے میں کس طرح بعض نکتے مجھے خود بخود سوجھ گئے۔

اس لئے میں اس ذکر کو چھوڑ کر ترک موالات کی کہانی پوری کرتا ہوں۔ علی برادران کی شروع کی ہوئی تحریک خلافت شباب پر تھی۔ مجھ سے مولانا عبدالباری مرحوم اور دوسرے علماء سے اس کے متعلق طول طویل بحثیں ہوا کرتی تھیں۔ خصوصاً یہ مسئلہ درپیش رہا تھا کہ ایک مسلمان کس حد تک عدم تشدد کا پابند رہ سکتا ہے۔ آخر سب علماء اس بات پر متفق ہو گئے کہ اسلام میں عدم تشدد پالیسی کے طور پر اختیار کرنے کی ممانعت نہیں ہے بلکہ جتنے عرصے کے لئے مسلمان اس پالیسی کو برتتے کا عہد کر لیں اتنے دنوں اس کی پابندی ان پر فرض ہے بہت غور و تامل کے بعد پاس ہو گیا۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے ایک بار اللہ آباد میں کمیٹی رات بھر اس مسئلے پر غور کرتی رہی۔ ابتدا میں حکیم صاحب مرحوم کو عدم تشدد پر مبنی ترک موالات کے قابل عمل ہونے میں شبہہ تھا۔ لیکن جب ان کا یہ شبہہ رفع ہو گیا تو وہ دل و جان سے اس تحریک میں شریک ہو گئے اور ان کی شرکت سے اسے بے حد تقویت پہنچی۔

اس کے کچھ دن بعد میں نے ترک موالات کارزولیشن گجرات کی پولیٹیکل کانفرنس میں پیش کیا۔ مخالف پارٹی نے پہلا اعتراض یہ کیا کہ ایک صوبے کی کانفرنس اس کی مجاز نہیں کہ کانگریس پر سبقت کر کے کوئی رزولیشن پاس کرے میں نے اس کے جواب میں کہا کہ یہ قید صرف پیچھے ہٹنے کے معاملے

میں ہے۔ آگے قدم بڑھانے کا ماتحت انجمنوں کو ہر وقت اختیار ہے بلکہ اگر ان میں ہمت اور حوصلہ ہو تو ان کا فرض ہے اگر ماتحت انجمن کانگریس کا اتھار بڑھانے کے لئے کوئی تدبیر عمل میں لانا چاہئے تو اجازت کی ضرورت نہیں ہے شریکہ وہ جو کچھ کرے اپنی ذمہ داری پر کرے۔ اس کے بعد نفس تجویز پر غور کیا جانے لگا۔ دونوں طرف سے بحث میں بڑی گرم گرمی رہی مگر تحمل اور معقولیت کے ساتھ ووٹ لئے گئے تو منافقین کی تعداد بہت زیادہ نکلی اور رزولوشن کثرت رائے سے پاس ہو گیا۔ یہ کامیابی زیادہ تر ڈمبہ بھائی اور عباس طیب جی کی ذات سے ہوئے۔ طیب جی صدر تھے اور ان کا رجحان ترک موالات کے رزولوشن کی طرف تھا۔

آل انڈیا کانگریس کمیٹی نے یہ طے کیا کہ ستمبر 1921ء میں اس مسئلے پر غور کرنے کے لئے جلسہ خاص منعقد کیا جائے۔ لالہ لاجپت رائے صدر منتخب ہوئے کانگریس کی تیاریاں بہت بڑے پیمانے پر ہوئیں بمبئی سے کانگریس اور خلافت کی اسپیلیں چھوئیں۔ غرض کلکتے میں نمائندوں اور تماشائیوں کا جم غفیر اکٹھا ہو گیا۔

مولانا شوکت علی کی فرمائش سے میں نے ریل میں ترک موالات کے رزولوشن کا مسودہ مرتب کیا۔ اب تک میں نے اپنے مسودوں میں Non violent کا لفظ لانے سے پرہیز کیا تھا مگر اپنی تقریر میں بے تکلف یہ لفظ استعمال کرتا تھا۔ اس موضوع کے متعلق ابھی میرے پاس الفاظ کا ذخیرہ مکمل نہیں ہوا تھا۔ میں نے یہ محسوس کیا تھا کہ مسلمانوں کے مجمعے میں Non-Violent کا مترادف سنسکرت لفظ استعمال کرتا ہوں تو لوگ میرا مطلب پوری طرح نہیں سمجھتے۔ اس لئے مولانا ابوالکلام سے کہا کہ اس کے لئے کوئی اردو کا لفظ بتائیے۔ انہوں نے اس کا ”ترجمتہ بالمان“ اور نان کو آپریشن کا ”ترک موالات“ تجویز کیا۔

غرض میں ہنوز نان کو آپریشن کے لئے ہندی گجراتی اور اردو کی مناسب اصلا میں ڈھونڈنے میں مصروف تھا کہ مجھے اس معرکے کی کانگریس میں ترک موالات کا رزولوشن پیش کرنا پڑا۔ اصل مسودے میں Non-violent کا لفظ رہ گیا تھا۔ رات کو مجھے اس غلطی کا خیال آیا۔ صبح اٹھتے ہی میں نے مہادیو کے ہاتھ پیغام بھیجا کہ مسودے کو اخباروں میں بھیجنے سے پہلے یہ غلطی درست کر دی جائے مگر مجھے خیال پڑتا ہے کہ مسودہ پہلے ہی چھپ چکا تھا اسی دن شام کو سبکدوش کمیٹی کا جلسہ ہونے والا تھا۔ مجھے چھپی ہوئی کاپیوں میں اپنے قلم سے یہ ترمیم کرنا پڑی آگے چل کر معلوم ہوا کہ اگر میرا مسودہ تیار نہ ہوتا تو بڑی مشکل پڑ جاتی۔

اب بھی میری حالت قابل رحم تھی۔ مجھے کچھ خبر نہ تھی کہ کون رزولوشن کی تائید کرے گا کون مخالفت کرے گا یہ بھی نہیں معلوم تھا کہ لالہ جی کارویہ کیا ہو گا البتہ یہ میں دیکھ رہا رہا تھا کہ اس معرکے کے لئے بڑے بڑے تجربہ کار نبرہ آزما کلکتے میں صف آرا ہیں جیسے ڈاکٹر سپینٹ پنڈت مالوی جی وجیارا گھو چاری جی، پنڈت موتی لال، دیشبندھو داس۔

میں نے اپنے رزولوشن میں ترک موالات کا مقصد صرف یہ قرار دیا تھا کہ حکومت کو خلافت اور پنجاب کے معاملے میں انصاف کرنے پر مجبور کیا جائے۔ یہ بات وجیارا گھو چاری جی کو پسند نہیں آئی۔ انہوں نے کہا: "اگر ترک موالات کرنا ہی ہے تو کسی ضمنی بے انصافی کو دور کرانے کے لئے کیوں کیا جائے۔ ملک پر سب سے بڑا ظلم یہ ہے کہ وہ سوراج سے محروم ہے۔ اسی کی چارہ جوئی کے لئے ترک موالات کرنا چاہئے، پنڈت موتی لال جی بھی یہی چاہتے تھے کہ رزولوشن میں سوراج کے مطالبے کا اٹھانہ کر دیا جائے میں نے یہ تجویز خوشی سے قبول کر لی اور اپنے رزولوشن میں سوراج کا مطالبہ بھی شامل کر لیا۔ کانگریس میں اس کے ہر پہلو پر نہایت سرگرمی سے بحث ہوئی اور جس میں کبھی کبھی ہندی اور تلخنی بھی پیدا ہو جاتی تھی۔ آخر رزولوشن کثرت رائے سے پاس ہو گیا۔

سب سے پہلے پنڈت موتی لال ہی اس تحریک میں شریک ہوئے۔ اس معاملے میں مجھ سے ان سے جو دوستانہ بحث ہوئی تھی۔ وہ مجھے اب تک یاد ہے۔ انہوں نے بعض اصلاحوں میں ترمیمیں تجویز کیں انہیں میں نے قبول کر لیا انہوں نے بیڑا اٹھایا کہ میں دیشبندھو کو بھی اس تحریک میں کھینچ لاؤں گا دیشبندھو کا دل خود اس طرف کھتا تھا مگر انہیں یقین نہ تھا کہ لوگ اس پر دوگرام پر عمل کرنے کی قابلیت رکھتے ہیں اصل میں وہ اور لالہ جی ناگ پور کی کانگریس میں اس تحریک میں دل سے شامل ہوئے۔

کانگریس کے اجلاس میں صرف میرا دل لوکمانیہ کی یاد میں تڑپتا تھا مجھے آج تک یقین ہے کہ اگر وہ زندہ ہوتے تو اس دقت مجھے شیر باد دیتے اور اگر وہ مخالفت بھی کرتے تو میں ان کی مخالفت کو اپنے لئے باعث عزت سمجھتا اور اس سے سبق حاصل کرتا ہم دونوں میں بعض باتوں میں اختلاف بھی تھا مگر اس کی وجہ سے کبھی ہمارے باہمی تعلقات میں تلخنی نہیں پیدا ہوئی۔

ان کا برتاؤ میرے ساتھ ہمیشہ دوستی اور محبت کا رہا۔ ان سطر و نکو لکھتے دقت ان کی موت کے واقعات میری آنکھوں میں پھر رہے ہیں۔ آدمی رات کو پٹور دھن نے جو ان دنوں میرے رفیق تھے ٹیلیفون سے ان کے انتقال کی خبر سنائی۔ میں اس دقت اپنے ساتھیوں کے حلقے میں پیشا ہوا تھا۔ میری

زبان پر خود بخود یہ الفاظ جاری ہو گئے میرا پشت و پناہ دنیا سے اٹھ گیا۔

ترک موالات کی تحریک پورے شہت پر تھی اور میں ان سے تقویت اور فیضان کا متوقع تھا کوئی نہیں کہہ سکتا ان کا رویہ ترک موالات کی آخری شکل کے متعلق کیا ہوتا مگر یہ یقینی ہے کہ ان کے انتقال سے کلکتے میں عام ادا سی چھائی ہوئی تھی اور ہر شخص افسردہ نظر آتا تھا۔ ہر شخص کو یہ محسوس ہو رہا تھا کہ قومی تاریخ کے اس نازک موقع پر ان کی ہدایت اور رہنمائی کی بڑی ضرورت تھی۔

ناگ پور میں

کلکتے میں کانگریس کے جلسہ خاص میں جو رزولوشن پاس ہوئے تھے وہ ناگ پور کی کانگریس میں منظوری کے لئے پیش ہوئے یہاں بھی کلکتے کی طرح نمائندوں اور تماشائیوں کا بڑا جھوم تھا ابھی تک نمائندوں کی تعداد محدود نہیں ہوئی تھی چنانچہ جہاں تک مجھے یاد ہے اس موقع پر چودہ ہزار نمائندے موجود تھے، لالہ جی میرے رزولوشن کے اس حصے میں جو اسکولوں کے مقاطعے متعلق تھا کچھ خفیف سی ترمیم چاہتے تھے جسے میں نے قبول کر لیا۔ اسی طرح دیشبندھو کی رائے سے کچھ ترمیمیں ہوئیں۔ اس کے بعد ترک موالات کارزولوشن اتفاق رائے سے پاس ہو گیا۔

اسی اجلاس میں کانگریس کے دستور اساسی کی ترمیم و نسخ کارزولوشن پیش ہونے والا تھا۔ کلکتے کے جلسہ خاص میں سب کمیٹی کے مرتب کئے ہوئے مسودے پر بحث ہو چکی تھی اور اس کے ہر پہلو سے غور کر لیا گیا تھا۔ ناگ پور میں وجہاں گھوچاری جی کے زیر صدارت سبجیکٹس کمیٹی نے ایک اہم تبدیلی کرنے کے بعد اسے پاس کر دیا۔ وہ تبدیلی یہ تھی کہ میرے مسودے میں غالباً نمائندوں کی تعداد 1500 تھی اور اب 6000 کر دی گئی۔ میری رائے میں یہ اضافہ نا عاقبت اندیشی پر مبنی تھا۔ اس کے بعد کے اجلاسوں میں جو تجربے ہوئے ان سے میری رائے کی تصدیق ہوتی ہے۔ یہ محض خیال ہی خیال ہے کہ نمائندوں کی تعداد زیادہ ہونے سے کام میں آسانی ہوتی ہے یا جمہوریت کے اصولوں پر عمل ہوتا ہے۔ پندرہ سو مخلص اور روشن خیال نمائندے جنہیں دل سے قوم کی بہبود کی فکر ہو ان چھ ہزار غیر ذمہ دار آدمیوں سے جو اٹکل پچو منتخب کر دیئے جائیں کہیں زیادہ جمہوریت کے ضامن ہوں گے۔ جمہوریت کی اصلی ضمانت یہ ہے کہ لوگوں میں آزادی، خوداری اور قومی اتحاد کا گہرا احساس ہو اور وہ انہیں لوگوں کو اپنا نمائندہ بنائیں جو نیک اور سچے ہوں لیکن سبجیکٹس کمیٹی کے دماغ پر تعداد کی زیادتی کا خیال

اس قدر مسلط تھا کہ وہ اس سے بھی زیادہ نامندہ رکھنا چاہتی تھی۔ بڑی مشکل سے چھ ہزار پر سمجھوتا ہوا۔ کانگریس کے نصب العین کے سوال پر بڑی گرما گرمی سے بحث ہوئی۔ میں نے اپنے دستور اساسی میں کانگریس کا نصب العین یہ رکھا تھا ”سوراج حاصل کرنا اگر ممکن ہو تو سلطنت برطانیہ کے اندر ورنہ اس کے باہر“ کانگریس کی ایک پارٹی یہ چاہتی تھی اس کا نصب العین سلطنت برطانیہ کے اندر سوراج حاصل کرنے تک محدود کر دیا جائے اس پارٹی کے خیالات پنڈت مالویہ جی اور مسٹر جناح نے کانگریس کے سامنے پیش کئے مگر انہیں زیادہ دوٹ نہ مل سکے۔ میرے مسودے میں یہ شرط بھی تھی کہ سوراج حاصل کرنے کے لئے باامن اور جائز ذریعے استعمال کئے جائیں۔ بعض لوگوں نے اس شرط کی مخالفت کی اور کہا کہ ذرائع کو محدود کر دینا مناسب نہیں۔ لیکن کانگریس نے بہت کچھ بحث و مباحثے کے بعد اصل مسودے کو پاس کر دیا۔ میرا یہ خیال ہے کہ اگر لوگ اس دستور پر سمجھ بوجھ کر دیانتداری اور خلوص سے عمل کرتے تو عوام کی تعلیم اور تنظیم میں بڑی کامیابی ہوئی اور یہ بجائے خود ہمیں سوراج دلانے کے لئے کافی تھا۔

اسی کانگریس میں ہندو مسلم اتحاد اور کھدر کی حمایت اور چھوت کی اصلاح کے رزولوشن بھی پاس ہوئے۔ اسی دن سے کانگریس کے ہندو ممبروں نے اپنے سر یہ ذمہ داری لے لی کہ ملک کو چھوت چھات کی لعنت سے پاک کر دیں گے اور کانگریس نے کھدر کے ذریعے سے ہندوستان کے فاقہ کش غریبوں سے ہمدردی اور محبت کا مضبوط رشتہ قائم کر لیا۔ خلافت کی تائید میں ترک موالات کی تحریک شروع کر کے ناگپور کی کانگریس نے ہندو مسلم اتحاد کی عملی بنیاد بھی ڈال دی۔

خدا حافظ

اب میں اس مقام پر پہنچ گیا ہوں جہاں ان اوراق کو ختم کر دینا چاہئے۔ اس کے بعد میری زندگی کے جتنے واقعات ہیں ان سے لوگ بخوبی واقف ہیں پھر ایک اور وجہ بھی ہے جو مجھے خاموشی پر مجبور کرتی ہے۔ 1921ء سے مجھ سے کانگریس کے لیڈروں سے اس قدر ربط ضبط رہا کہ اگر میں اس کے بعد کا کوئی واقعہ اپنی زندگی کا بیان کروں تو اپنے اور ان کے تعلقات کا ذکر کرنا پڑے گا۔ کیونکہ گو آج ڈرہانند جی ویشندھو حکیم صاحب اور لالہ جی دنیا میں نہیں ہیں مگر ہماری خوش نصیبی سے اور بہت سے پختہ کار کانگریس لیڈر ابھی موجود ہیں۔ کانگریس کی تاریخ میں ان تبدیلیوں کے بعد سے جن کا میں نے ذکر کیا ایک اہم دور آیا ہے جس کے اثرات ابھی پوری طرح ظاہر نہیں ہوئے پچھلے سات سال میں میں نے جتنے قابل ذکر تجربے کئے سب کانگریس کے ذریعے سے کئے اس لئے اگر ان تجربوں کی داستان چھیڑوں تو ان معاملات کا ذکر کرنا ناگزیر ہے جو میرے اور ان لیڈروں کے درمیان پیش آئے اور یہ کم سے کم اس وقت کسی طرح مناسب نہیں علاوہ اس کے جو تجربے میں نے حال میں کئے ہیں ان سے ابھی کوئی قطعی نتیجہ بھی نہیں نکالے جاسکتے اس لئے میں اپنا صریح فرض سمجھتا ہوں کہ اس داستان کو بہیں پر ختم کر دوں سچ پوچھئے تو میرا قلم آگے بڑھتا نہیں۔

اس کتاب کے پڑھنے والوں سے رخصت ہونا مجھ پر بہت شاق ہے۔ میں اپنے ان تجربوں کو بہت قیمتی سمجھتا ہوں۔ میں یہ دعویٰ نہیں کر سکتا کہ میں ان کے بیان کرنے میں پوری طرح کامیاب ہوا ہوں۔ البتہ یہ کہہ سکتا ہوں کہ میں نے ان کی سچی تصویر پیش کرنے میں اپنی طرف سے کوئی کوتاہی نہیں کی۔ میری اول سے آخر تک یہی کوشش رہی کہ حق کا جو جلوہ مجھے نظر آیا اور جس طرح نظر آیا اسے بے کم و کاست بیان کر دوں۔ اس مشق سے مجھے بڑا اطمینان قلب نصیب ہوا کیونکہ میرے دل میں ہمیشہ یہ امید رہی کہ شاید یہ کتاب سست اعتقادوں کے دل میں حق اور اہمسا کے عقیدے کو مستحکم کر دے اگر اس کا ہر ورق پڑھنے والوں سے پکار پکار کر یہ نہ کہے کہ حق کی معرفت کا لہجہ اہمسا کے کوئی وسیلہ نہیں تو میں یہ

سمجھو لگا کہ میری ساری محنت اکارت گئی۔ فرض کیجئے میری سعی تلاش حق میں ناکامیاب ثابت ہو تو اس میں مغلوب کا قصور نہیں طالب کی کوتاہی ہے۔ میری طلب کتنی ہی سچی کیوں نہ ہو پھر بھی ناتمام اور ناکافی ہے مجھے حق کے جو جلوے کبھی کبھی نظر آگئے ان سے اس نور محض کا کوئی اندازہ نہیں ہو سکتا جس کے آگے آفتاب ایک ذرہ بے نور ہے سچ پوچھئے تو میں نے جو کچھ دیکھا وہ فروغ تجلی کا ایک خفیف سا پرتو ہے مگر اتنا میں وثوق سے کہہ سکتا ہوں کہ حق کا کامل دیدار اسی کو نصیب ہو سکتا ہے جو اہمسا کی تکمیل کر چکا ہو۔

حق وہ روح کلی ہے جو ساری کائنات میں جاری و ساری ہے انسان اس کے جلوے کی تاب تھی لا سکتا ہے جب وہ ادنیٰ سے ادنیٰ مخلوق کو اپنی جان کے برابر عزیز رکھتا ہو۔ جسے اس کا حوصلہ ہو وہ زندگی کے کسی شعبے سے بے تعلق نہیں رہ سکتا یہی وجہ ہے کہ حق کی جستجو مجھے سیاست کے میدان میں کھیچ لائی ہے میری ناچیز رائے میں جو لوگ یہ کہتے ہیں کہ مذہب کو سیاست سے کوئی تعلق نہیں وہ مذہب کے مفہوم کو نا آشنا ہیں ہر ذی حیات سے روحانی اتحاد کا احساس بغیر تزکیہ نفس کے ناممکن ہے جب تک نفس آرائشوں سے پاک نہ ہو جائے اہمسا کے قانون کی پابندی محض خیال غام ہے جو شخص عفت سے محروم ہے اسے خدا کی معرفت کبھی حاصل نہیں ہو سکتی۔ تزکیہ نفس کے معنی یہ ہیں کہ زندگی کے ہر شعبے میں عفت برتی جائے پاک نفسی میں خدا نے بڑی تاثیر دی ہے اگر انسان اپنے نفس کا تزکیہ کرے تو اس کا ماحول بھی آلائشوں سے پاک ہو جاتا ہے۔

مگر تزکیہ نفس کی منزل بڑی کٹھن ہے۔ کامل عفت حاصل کرنے کے لئے ضروری ہے کہ انسان خیال قول اور فعل میں جذبات کی غلامی سے آزاد ہو جائے محبت اور عداوت رغبت اور نفرت کی دو جہتی سے نجات حاصل کر لے مجھے معلوم ہے کہ میں مسلسل سعی کے باوجود عفت کی یہ تینوں شرطیں اب تک پوری نہیں کر سکا ہوں اسی لئے دنیا کی تعریف میرے کانوں کو اچھی نہیں معلوم ہوتی۔ بلکہ اکثر میرے دل پر تیر کی طرح لگتی ہے میرے نزدیک روحانی قوت سے شب و روز جذبات کو مغلوب کرنا مشکل ہے اور جسمانی قوت سے دنیا کو فتح کرنا سہل ہے جب اسے میں ہندوستان واپس آیا ہوں میرے دل میں جذبات کی دہلی ہوئی آگ سلگتی رہتی ہے اس احساس سے مجھے ندامت ہوتی ہے مگر مایوسی نہیں ہوتی میرے روحانی تجربے میرے لئے تقویت اور مسرت کا باعث ہیں۔ مگر میں جانتا ہوں کہ ابھی مجھے بڑی کٹھن منزلوں سے گزرنا ہے جب تک میں خودی کو بالکل مٹانہ دوں مجھے چین نہیں آئے گا۔ انسان کی نجات اسی پر موقوف ہے کہ وہ اپنے آپ کو ہر ذی حیات سے کم تر سمجھنے لگے۔ اہمسا عاجزی و

انکساری کی آخری حد کا نام ہے۔
 با مفصل میں ناظرین سے رخصت ہوتا ہوں اور ان سے اس دعائیں شرکت کا طالب ہوں کہ حق
 تعالیٰ مجھے خیال، قول اور فعل میں اہمسا کی توفیق عطا کرے۔

ختم شد

فکشن ہاؤس کی علم و ادب پر نمائندہ کتابیں

Rs. 150/-	ڈاکٹر مبارک علی	تاریخ اور فلسفہ تاریخ
Rs. 150/-	ڈاکٹر مبارک علی	شامی گل
Rs. 125/-	ڈاکٹر مبارک علی	تاریخ شامی
Rs. 90/-	ڈاکٹر مبارک علی	تاریخ کی روشنی
Rs. 70/-	ڈاکٹر مبارک علی	تاریخ اور عورت
Rs. 250/-	صائتا گامھی	علاش حق (آپ جی)
Rs. 100/-	اجیت کور	خانہ بدوش (آپ جی)
Rs. 100/-	اجیت کور	فالتو عورت (اجیت کور کی کہانیاں)
Rs. 75/-	اجیت کور	گوری (ناول)
Rs. 125/-	سلی مسعود	خانماں برباد (ناول)
Rs. 125/-	جیلانی بانو	نئی عورت (النساء)
Rs. 80/-	دل ڈیورانت	انسانی تہذیب کا ارتقاء
Rs. 150/-	سید حسن راجہ سلیم	روشن خیالی
Rs. 175/-	احمد سلیم	نیا عالمی نظام اور پاکستان
Rs. 100/-	احمد سلیم	پشتون ایڈیلوج ہسٹری (انگریزی)
Rs. 150/-	انصار علی شیخ	خیال و خواب (سیاست)
Rs. 150/-	قاسم بخاری	تحریک آزادی اور باچا خان صوبہ سرحد کی انقلابی تحریکیں اور مولانا عبدالرحیم پوپلوی ظلیل جبران کے شاہکار النساء شاہکار سندھی النساء کلام سے کافرستان تک (سیاست) ہاپوں نامہ ہندوستانی معاشرہ حد وسطی میں لیض احمد فیض تنقیدی جائزہ یورپ کا بہترین ادب اردو ادب کی خواتین ناول نگار کرشن چندر اور افسانہ نگاری کشمیری انٹائیجے کانٹے ٹوٹے بکھرے لوگ (ناول) بیدی نامہ وہ عشق جو ہم سے روٹھ گیا (شاعری)
Rs. 125/-	ڈاکٹر عبدالجلیل پوپلوی	
Rs. 150/-	مرتب = ملک افلاق	
Rs. 100/-	مرتب = طاہر اصغر	
Rs. 75/-	محمد ہدیش شاہین	
Rs. 40/-	گبدن بیگم	
Rs. 150/-	ڈاکٹر کنور اشرف	
Rs. 150/-	خلیق انجم	
Rs. 60/-	سجاد بخاری	
Rs. 150/-	نیلیم فرزانه	
Rs. 75/-	ڈاکٹر احمد حسن	
Rs. 50/-	ڈاکٹر زمان	
Rs. 90/-	پویش کمار	
Rs. 250/-	ڈاکٹر شمس الحق عثمانی	
Rs. 50/-	ازہر منیر	

فکشن ہاؤس

۱۸-منگ روڈ، لاہور

